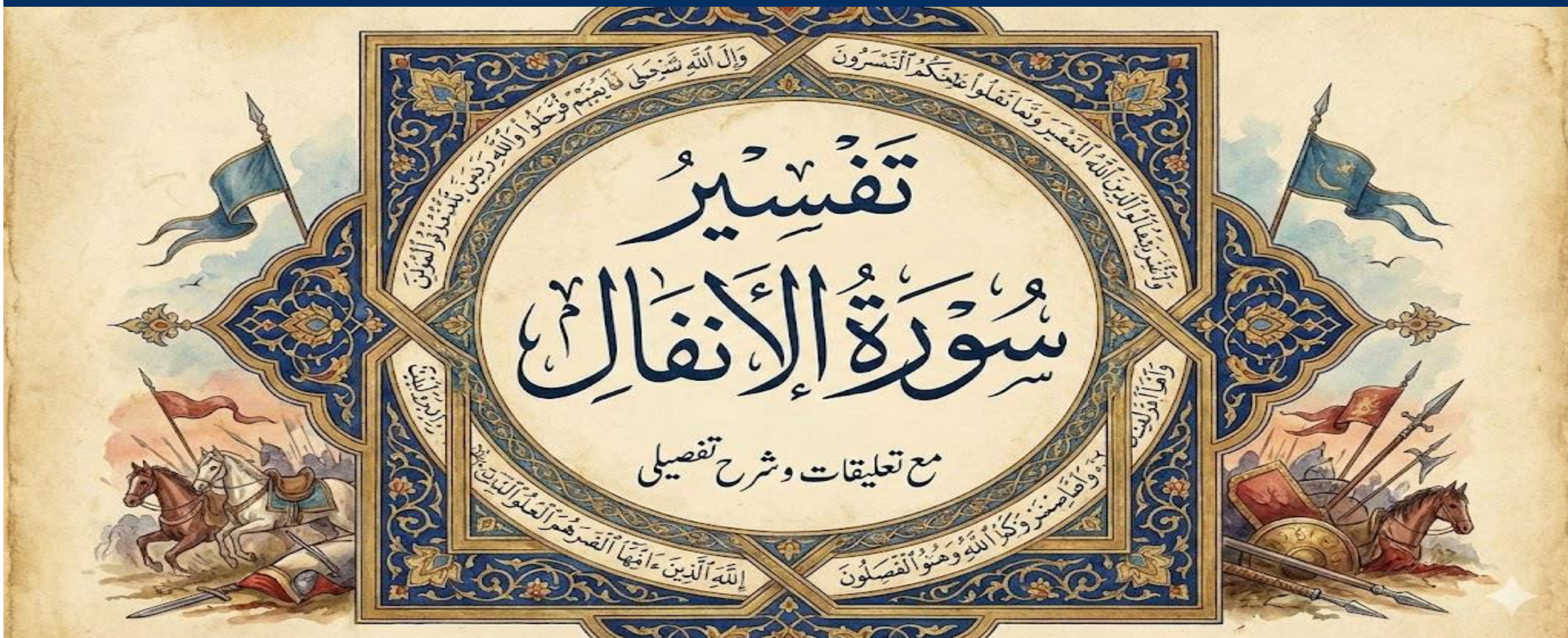


تحقیق و ترتیب

محمد طاہر ہاشمی

ایم۔اے علوم اسلامیہ

ایم۔اے تاریخ

سورۃ الانفال: کامیابی کے ابدی اصول

کامیابی کا دارو مدار تعداد پر نہیں بلکہ اللہ کی نصرت پر ہے۔



اتحاد اور اطاعتِ رسول ﷺ

آپس کے اختلافات سے بچیں، کیونکہ تنازعات قوم کی ہوا اکھاڑ دیتے ہیں اور کمزوری کا باعث بنتے ہیں۔

سچے مومن کی پانچ علامات

- راہِ خدا میں خرچ کرنا
- نماز کی پابندی
- توکل
- تلاوت سے ایمان میں اضافہ
- ذکرِ الٰہی سے دل کا ڈرنا

توکل بمقابلہ مادی طاقت



بدر میں 1000 مسلح کفار کے مقابلے میں مومنوں کا صرف **اللہ** پر بھروسہ ان کی جیت کا ضامن بنا۔

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ

وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

فہرست

خطبہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھۡتَدِیَ لَوۡلَا أَنۡ ھَدَانَا اللّٰہُ،

وَأَشۡھَدُ أَنۡ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہُ لَا شَرِیۡکَ لَہُ، وَأَشۡھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا

عَبۡدُہُ وَرَسُوۡلُہُ. صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحۡبِہٖ وَسَلَّمَ ☼

فَیَا عِبَادَ اللّٰہِ! إِنِّیۡ أُوۡصِیۡ نَفۡسِیۡ وَإِیَّاکُمۡ بِتَقۡوَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ،

قَالَ تَعَالٰی: {یَا أَیُّھَا الَّذِیۡنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَا

قَدَّمَتۡ لِغَدٍ} [سورۃ الحشر: 18]۔

أَمَّا بَعۡدُ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ط فَأَعُوۡذُ بِاللّٰہِ

مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ط بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

مقدمہ

سورۃ الانفال کا تعارف

سورۃ الانفال مدنی سورت ہے جو غزوۂ بدر کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس کا نام "الانفال" (غنیمتوں) سے ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہے۔ یہ سورت ایمان، اطاعت، اور جہاد فی سبیل اللہ کے اصولوں کی وضاحت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں مسلمانوں کو کامیابی کے راز، تقویٰ، اور اتحاد کی اہمیت سکھائی۔

پہلا رکن: غنیمتوں کی تقسیم میں انصاف

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ۖ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ} [الانفال: 1]

اللہ تعالیٰ غنیمتوں کو اپنے اور رسول کا حق بتلاتا ہے، لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ انصاف قائم کر کے مسلمانوں کے درمیان اصلاح کی جائے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ مال و دولت میں خدا کے احکام کی پابندی لازمی ہے۔

عملی سبق: آج ہمیں اپنے کاروبار اور مالی معاملات میں اللہ کے احکام کو ترجیح دینی چاہیے، رشوت اور ناانصافی سے بچنا چاہیے۔

دوسرا رکن: ایمان اور توکل

{وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ} [الانفال: 10]

غزوۂ بدر میں مسلمان 313 تھے اور کفار 1000، لیکن اللہ نے نصرت سے کامیابی دی۔ یہ واضح کرتا ہے کہ کامیابی تعداد یا اسلحہ سے نہیں، بلکہ اللہ کی مدد سے آتی ہے۔

عملی سبق: ہمیں اپنی مشکلات میں صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے، ناامیدی نہیں، کیونکہ اللہ کی قدرت ہر شے پر محیط ہے۔

تیسرا رکن: اتحاد اور اطاعت

{وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ} [الانفال: 46]

اللہ اطاعت اور اتحاد کا حکم دیتا ہے، اور تنازعات سے منع کرتا ہے کیونکہ یہ قوم کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں۔ صبر اور استقامت کی تاکید ہے۔

عملی سبق: آج کی مسلمان امت کو آپس کے اختلافات بھلا کر متحد ہونا چاہیے، مسجد، گھر، اور معاشرے میں یکجہتی قائم کرنی چاہیے۔

چوتھا رکن: جہاد فی سبیل اللہ

{وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ} [الانفال: 60]

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر ممکنہ طاقت تیار کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ دشمن کو روکا جاسکے۔ یہ جہاد کی اہمیت اور اس کی مسلسل تیاری کی طرف اشارہ ہے۔

عملی سبق: آج "جہاد" کا مطلب علم، صحت، معیشت اور دفاع میں خود کفالت ہے۔ ہمیں اپنے دین اور وطن کا دفاع کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ عِبَادَ اللَّهِ، وَأَطِيعُوهُ وَرَسُولَهُ، وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. أَقِمِ الصَّلَاةَ وَآتِ الزَّكَاةَ وَأَطِعِ الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ.

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي عَافَانِي مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهِ وَفَضَّلَنِي عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيلًا لَمْ يُصِبْهُ ذَلِكَ الْبَلَاءُ

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ.

وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ

یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ ایسا مرقع تیار ہوا جس میں تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بیان ہوا۔ میری کوشش تو بس یہی رہی کہ موجودہ کتب تفاسیر سے رس اس طرح لیا جائے کہ مفہوم و معانی نہایت شفاف طریقے سے مجتمع ہو سکیں۔

اللہ کریم اس کوشش کو بار آور فرمائے۔ اور نورِ قرآن کو عام فرمادے۔

ہمارے نوجوانوں کو اس سے بہرہ مند کرے۔ اور سب کے لئے اسے توشۂ آخرت بنادے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ

ناشر:	یکے از خانوادہ بنی ہاشم
تعداد	برقی
ہدیہ	دعائے برائے امت محمدیہ
الطبع	2025 دسمبر

انتساب

ان نفوس قدسیہ کے نام جن کے دم قدم
سے اس گلستان میں علوم کی نیرنگیاں ہیں

اِعتذار

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غلطیوں کی تصحیح واصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔ اگرچہ کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔ غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔ نیکی کے کام میں آپکا تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

کچھ اپنے بارے میں

ناچیز کا نام محمد طاہر ہاشمی ولد نور احمد ہاشمیؒ ہے۔ بندہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ والدین اللہ کی عظیم نعمت ہوتے ہیں۔ قبلہ والد گرامی اولیاء میں تھے زمیندار تھے کچھ عرصہ گاؤں کی نمبرداری کی لیکن چھوڑ دی۔ مزاج میں غنا اور تصوف کی فراوانی تھی زیادہ عرصہ فقر و درویشی میں گذارا۔ رجسٹرڈ پریکٹیشنر تھے لیکن طب کی پریکٹس کی نہیں کہتے تھے کہ اس سے دل مطمئن نہیں ہوتا یا تو انسان فی سبیل اللہ خدمت کرے۔ 58 سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اللہ کریم جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنائت فرمائے اور اپنی رحمت سے نوازے آمین! نے اور والدہ محترمہؒ نے چلنا پھرنا اور باتیں کرنا، قائدہ پڑھنا اور ابتدائی تعلیم کا آغاز کروایا۔

والدہ محترمہ کی علمی استعداد، معاملہ فہمی اور بروقت علمی پکڑ ہمیں آخر تک لاجواب کر دیتی تھی۔ امی جی سکول سے پڑھے ہوئے تو نہ تھے پر گھر میں اپنے والد گرامی قدر جناب محمد عظیمؒ ہاشمی قدس سرہ العزیز! سے تعلیم حاصل کی تھی جو پورے علاقے میں تقویٰ و بزرگی میں جانے پہچانے جاتے تھے، سے حاصل کی تھی۔ کمال کا حافظہ تھا۔ اللہ کریم انکی قبر پر اپنی کرم و فضل کی بارش ہمہ وقت فرماتا رہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِہٖ وصحبہ وبارك وَسَلِّمْ۔

اللھم اغفر لی وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِینَ والمؤمنات

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ

ابتدائی تعلیم اوکاڑہ کے دور افتادہ ایک گاؤں چک 18 جی ڈی میں حاصل کی۔ پرائمری میں سکول ٹاپ کیا اور وظیفہ کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا وظیفہ لگا لیکن ملا نہیں۔ قرآن پاک اور ابتدائی تعلیم ایک عظیم درویش و حافظ جناب قبلہ عبدالرشید صاحب سے حاصل کی۔ حافظ صاحب قبلہ نابینا تھے لیکن صاحب کرامت تھے۔ ان کی منزل سننا، ان کے لئے کتاب خوانی کرنا بندۂ ناچیز کے سپرد تھا۔ بالخصوص رمضان المبارک میں۔ وقت بغیر گھڑی دیکھے بتا دیتے تھے۔ تجوید و قرآت کچھ عرصہ قاری خوشی محمد الازہریؒ سے حاصل کی تھی۔ بلا کا حافظہ تھا۔ ایک دفعہ کوئی مل لیتا تو مدتوں بعد اسے پہچان لیتے۔ اللہ کریم ان کی مرقد کو اپنے نور سے منور کرے آمین!

پھر قبلہ ماموں "پھوپھا" جان جناب غلام یٰسین ہاشمی نور اللہ مرقدہٗ سے درس لیا۔ پورے علاقے میں ماہر طبیب اور اللہ کے برگزیدہ بندے کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جب تک حیات رہے پورے گاؤں میں صرف ایک جگہ جمعہ ہوتا تھا۔ خدمت خلق جبلت میں تھی۔ گھر سے کئی لوگوں کا کھانا جاتا تھا یہ خدمت بندہ کے حصہ میں تھی۔ دو تین تو یاد ہیں، ایک بابا جمعہ خادم مسجد، ایک محمد رفیق صوفی کھڈی کا کام کرتے تھے، اور عبد الحمید ڈسپنسر، باقی یاد نہیں۔

ماموں جان بڑے وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔ گاؤں کی پنچائت کے سربراہ تھے، زمیندار تھے اور ایک بڑے باغ کے مالک تھے۔

اس کے بعد بندہ کے والدین قدس سرہ العزیز! اوکاڑہ شفٹ ہو گئے۔ وہاں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا اور کلاس میں دوسری پوزیشن لی۔ اوکاڑہ ایک علمی شہر تھا۔ اس میں مولانا غلام علی اکاڑویؒ، جناب سید صاحب، کچھ عرصہ مفتی محمد شفیع اکاڑویؒ بعد ازاں کراچی چلے گئے، مفتی الہٰ یار، پہلے کچھ عرصہ جناب علامہ احمد سعید کاظمیؒ صاحب اور مفتی غلام سرور قادریؒ صاحب جو بعد ازاں لاہور اور ملتان بالترتیب منتقل ہو گئے تھے، علاوہ ازیں مفتی محمد اقبال چشتیؒ جو 2023 میں انتقال فرما گئے تھے کی خدمات لافانی ہیں۔ ان کے علاوہ اہل حدیث علماء جامعہ محمدیہ میں معین الدین لکھوی، اور عبد الحلیم صاحب بڑی علمی شخصیات تھیں، دیوبندی علماٗمیں محمد امین صفدر بڑے نامور علماٗ تھے۔ ان میں سے اکثر علماٗ سے دروس لئے۔

اس کے بعد ہم سمبڑیال شفٹ ہو گئے باقی تعلیم سیالکوٹ اور پسرور سے حاصل کی اور محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد فرائض سرانجام دئے۔ آخر میں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے ریٹائرمنٹ لی۔ 1985 سے 2014 تک مختلف مساجد میں خطابات جمعہ سرانجام دیئے۔ اور اب مختلف مضامین میں تحقیق کر کے وٹس ایپ پر گروپوں میں شئیر کر رہا ہے۔ اور انہیں ای بک بنا رہا ہے۔ اللہ کریم انہیں مقبول بنائے اور ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ!

الشکر والحمد للہ جل فی علاہ فالیہ ینسبی الفضل کلہ فی الکمال ویبقی للہ وحدہ

اللّٰهم لك الحمد أنت قلت وقولك الحقّ المبين، قل صدق الله، فاتّبعوا ملّة إبراهيم حنيفاً، ومن أصدق من الله قيلا، ومن أصدق من الله حديثاً، وأشهد أن لا إله إلاّ الله، المتوحّد في الجلال بكمال الجمال تعظيماً وتكبيراً، المتفرّد بتصريف الأمور على التّفصيل والإجمال تقديراً وتدبيراً، وأشهد إن نبيّنا محمّد عبده ورسوله، أرسله إلى عموم الثّقلين بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً،

لا إله إلاّ الله، ربّ الأرباب، ومسبّب الأسباب، وخالق خلقه من تراب، فسبحان من خضعت لعظمته الرّقاب، ولانت لجبروته الصّعاب، وذلّت له الشّدائد الصّلاب، غافر الذّنب وقابل التّوب شديد العقاب، ذو الطول لا إله إلا هو عليه توكّلت وإليه متاب، لا إله إلا الله، الكريم، الحليم، العظيم، ربّ العرش العظيم، ونحن على ما قال ربنا وخالقنا من الشّاهدين، ولم ألزم وأوجب غير جاحدين،

والحمد لله ربّ العالمين،

وصلوات الله وسلامه على سيّد الأوّلين والآخرين، وخاتم الأنبياء والمرسلين، وعلى أزواجه أمّهات المؤمنين، وعلى آله الطّيبين الطّاهرين، وعلى صحابته الغرّ الميامين،

اللّهم أرضى عنا معهم برحمتك يا أرحم الرّاحمين،

سورۃ الانفال

نام

اس سورۃ پاک کا نام الانفال ہے کیونکہ اس کا آغگاز انفال (اموال غنیمت) کے احکام بیان کرنے سے کیا گیا ہے۔ اس کی آیتوں کی تعداد پچھتر اور کلمات کی تعداد ایک ہزار پچھتر ہے۔ اگرچہ حضرت ابن عباس (رض) سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کی سات آیتیں اذیمکر بک الذین۔۔ الخ مکی ہیں۔ لیکن صحیح قول یہی ہے کہ یہ سورۃ بتمامہا مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔

زمانہ نزول

سورۃ کے مضامین میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا نزول سنہ ۲ھ غزوہ بدر کے فوراً بعد ہوا۔ کیونکہ اس سورۃ کا بیشتر حصہ غزوہ بدر سے متعلق ہے اس لیے اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس غزوہ کے محرکات واسباب اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے۔

غزوہ بدر

اللہ تعالیٰ کا پیارا حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کے جاں نثار غلام بارہ تیرہ سال تک کفار مکہ کے ظلم وستم کو صبر وسکون سے برداشت کرتے رہے۔ اور ان کے دل کی دنیا میں نور حق سے اجالا کرنے میں کوشاں رہے۔ لیکن اسلام کا پودا ان کے دلوں کی سنگلاخ سرزمین میں جڑ نہ پکڑ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے مکہ سے اڑھائی تین سو میل دور یثرب نامی ایک بستی کے رہنے والوں کو اسلام کی طرف مائل کر دیا۔ حج کے ایام میں وہاں کے کچھ لوگ حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوئے۔ نبوت کے بارہویں سال قبیلہ خزرج کا ایک قافلہ جو پچھتر افراد پر مشتمل تھا۔ مکہ آیا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دست حق پرست پر بیعت کی اور یہ بھی درخواست کی کہ حضور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں رونق افروز ہوں۔ انھیں ان خطرات اور مشکلات کا پورا احساس تھا جن سے انھیں دوچار ہونا تھا۔ لیکن وہ ان کا سامنا کرنے کے لیے بخوشی تیار تھے۔

ہجرت کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔ مکہ کے مظلوم وستم رسیدہ مسلمان مدینہ طیبہ میں جمع ہو گئے۔ وہاں کے دو بڑے قبیلوں اوس و خزرج میں اسلام کی روشنی بڑی تیزی سے پھیلنے لگی۔ قلیل مدت میں مسلمانوں کی ایک مضبوط جمعیت معرض وجود میں آگئی۔ اور اسلام کی اشاعت کا کام جو تیرہ سال مکی زندگی میں نہ ہو سکا وہ یہاں آکر چند ماہ میں ہو گیا۔

حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی مہاجرین وانصار کو آخرت کے رشتہ میں پرو دیا۔ ہر مہاجر کا کسی انصاری کے ساتھ بھائی چارہ قائم کر کے اسلامی سوسائٹی کو نہایت استوار بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ پھر یہودی قبائل جو مدینہ اور اس کے گردونواح میں اقامت پذیر تھے ان کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے جس میں ہر ایک کو مکمل مذہبی آزادی دینے کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ اگر کسی طرف سے مدینہ پر حملہ کیا جائے تو سب مل کر اس حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔

اہل مکہ ان حالات سے بے خبر نہ تھے۔ اسلام کی روزافزوں ترقی اور آس پاس بسنے والے قبائل سے مسلمانوں کے دوستانہ معاہدے ان کے لیے بڑی بے چینی اور اضطراب کا سبب تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اسلام کا عروج ان کے مشرکانہ عقائد اور جاہلانہ نظام حیات کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اس لیے انھوں نے مدینہ کی فضا کو بھی اسلام اور اہل اسلام کے لیے ناساز گار بنانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ مدینہ میں دو عناصر ایسے تھے جنہیں دو بڑی آسانی سے اسلام کی خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ عبداللہ بن ابی اور یہود۔ حضور کی تشریف آوری سے پہلے عبداللہ بن ابی کیلئے حالات اتنے ساز گار ہو گئے تھے کہ اس کی بادشاہت کا اعلان کیا جانے والا تھا اور ایک زرگر کے پاس اس کے لیے تاج شاہی تیار ہو رہا تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدم رنجہ فرمانے کے بعد اس کی امیدیں خاک میں مل گئیں اس لیے اس کے دل میں اسلام کے خلاف بغض و عناد کا ایک انمٹ جذبہ پیدا ہو گیا۔ اب اسے اور اس کے حواریوں کو اہل مکہ بڑی آسانی سے اپنا آلہ کار بنا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہود کے دلوں میں بھی حسد کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ ان بیچاروں نے تو اس خیال سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے استقبال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اس مقصد کے لیے مسلمانوں سے یارانہ گانٹھا تھا کہ وہ دل میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ مصیبت زدہ جلاوطن لوگ جن کی مالی حالت بھی سخت ناگفتہ بہ ہے ان کو یہ آسانی سے اپنا حلقہ بگوش بنالیں گے اور انھیں اپنے اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔ لیکن جب پیغمبر اسلام اور اس کے فداکاروں کی مضبوط الگ شخصیت اور اسلام سے ان کی بے پناہ عقیدت و محبت کا تجربہ ہوا اور ان کی توقعات بر آتی دکھائی نہ دیں تو ان کے تیور بھی بدل گئے اور وہ بھی ایسے موقع کی تاک میں رہنے لگے جب وہ مسلمانوں کی جمعیت کو پراگندہ کر کے پھر اپنی برتری کا سکہ یثربی کسانوں کے دلوں پر جما سکیں۔
چنانچہ اہل مکہ نے ان لوگوں سے اسلام کے خلاف ساز باز شروع کر دی اور مسلمانوں کو اپنی قوت سے مرعوب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً جتھے بھیجنے شروع کر دیئے جو مدینہ کی چراگاہوں سے مسلمانوں کے مویشی ہانک کے لے جاتے۔ اور اگر اکادکا کوئی مسلمان ہاتھ آجاتا تو اس پر حملہ کرنے سے بھی باز نہ آتے۔

ان حالات میں کیا مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہتے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے کہ کس طرح مخالفت کی تند آندھیاں اٹھتی ہیں اور شمع اسلام کو گل کر کے چلی جاتی ہیں۔ کس طرح طوفان امنڈ کر آتے ہیں اور ان کے نخل آرزو کو جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ مسلمان اس طبیعت کے لوگ نہ تھے۔ انھیں زندہ رہنا تھا صرف اپنے لیے نہیں بلکہ ساری گم کردہ راہ اولاد آدم (علیہ السلام) کے لیے تاکہ دنیا کا گوشہ گوشہ نور محمدی ﷺ سے منور ہو جائے۔ اس لیے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حضور کریم رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ضروری اقدامات فرمائے۔

کفار مکہ کو ان کے معاندانہ رویہ سے باز رکھنے انھیں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے روکنے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ ان کی تجارتی شاہ راہ پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے جو بحر احمر کے کنارے کنارے یمن سے شام کی طرف جاتی تھی اور جس پر اہل مکہ، طائف اور دوسرے قبائل کے تجارتی قافلے بیک وقت چلتے تھے۔ مشہور مستشرق سپرنجر کے اندازہ کے مطابق اڑھائی لاکھ پاؤنڈ کی تجارت تو صرف اہل مکہ کی تھی۔ اور ان کی تمام تر معیشت کا انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سب سے پہلے جہینہ، بنی ضمرہ، بنی مدلج وغیرہ قبائل سے معاہدے کیے جو اس شاہراہ کے اردگرد سکونت پذیر تھے۔ ان قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کے بعد کفار مکہ کو مرعوب کرنے اور ان کو اپنی بالادستی کا احساس دلانے کے لیے گاہے بگاہے چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔

ہجرت کا دوسرا سال تھا۔ اور شعبان کا مہینہ تھا (فروری یا مارچ سنہ ۶۲۳ء) جب ابوسفیان کی قیادت میں اہل مکہ کا ایک تجارتی کارواں جس میں پچاس ہزار پونڈ کی مالیت کا سامان تھا۔ شام سے مکہ کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس۔ کے ساتھ محافظ دستہ کی تعداد بہت کم تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں مسلمان اس کاروان کی اطلاع پا کر اس پر حملہ نہ کر دیں۔ ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو الغفاری کو اجرت دی اور اسے دوڑایا کہ جا کر اہل مکہ کو اطلاع دے کہ وہ اس قافلہ کو مسلمانوں کی دست برد سے بچانے کے لیے نکلیں۔ جب وہ مکہ پہنچا تو اس نے (حسب دستور جاہلیت) اپنے اونٹ کے کان کاٹ

ڈالے۔ اس کی ناک چیر دی۔ اپنے پالان کو الٹا دیا۔ اپنی قمیص کو آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

یامعشر قریش! اللطیمة! اموالکم مع ابی سفیان قدعرض لھا محمد فی اصحابہ لا اری ان تدرکوھا الغوث! الغوث!

اے گروہ قریش! تمہارا مال و اسباب تمہارا ساز و سامان۔ تمہارے اموال جو ابوسفیان کے قافلے میں تھے ان پر محمد (علیہ السلام) نے اپنے یاروں سمیت حملہ کر دیا ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ تم اس کی حفاظت کر سکو گے، فریاد کو پہنچو، فریاد کو پہنچو۔

یہ سنتے ہی ابوجہل نے لوگوں کو جنگ پر ابھارنا شروع کر دیا۔ تقریباً مکہ کا ہر گھر اس تجارت میں حصہ دار تھا اس لیے اس مہم میں ہر شخص کا ذاتی مفاد بھی تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کا لشکر جرار تیار ہو گیا اس میں ۶۰۰ زرہ پوش تھے اور سو سواروں کا دستہ بھی تھا۔ بڑے کر و فر سے یہ لشکر اپنے قافلہ کی حفاظت کے لیے نکلا۔ راستہ میں انھیں اطلاع ملی کہ قافلہ صحیح سلامت مسلمانوں کی زد سے بچ کر نکل آیا ہے۔ اس پر کئی لوگوں نے یہ رائے دی کہ ہماری اس مہم کا مقصد پورا ہو گیا ہے اس لیے اب ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیے لیکن ابوجہل اور لشکر کی بھاری اکثریت اس پر رضامند نہ ہوئی۔ کیونکہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی اس مختصر جمعیت کو آج ہی ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ ان کا مذہب اور ان کی تجارتی شاہراہ جو ان کی رگ حیات ہے اس مہیب خطرہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے اور اس کے ارد گرد بسنے والے قبائل بھی اتنے ہراساں اور خوفزدہ ہو جائیں کہ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات بھی نہ کر سکیں۔

حضور نبی کریم ﷺ تین سو تیرہ مسلمانوں کی معیت میں مدینہ سے نکلے جن میں ۸۳ مہاجر، ۶۱ قبیلہ اوس اور باقی (۱۷۰ کے قریب) قبیلہ خزرج کے انصار تھے۔ حضور ﷺ جب وادی ذفران میں پہنچے تو اطلاع ملی کہ ابوجہل ایک

لشکر جرار لے کر مکہ سے مدینہ کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ اب مسلمانوں کا مد مقابل وہ تجارتی قافلہ نہ تھا جس کے محافظوں کی تعداد تیس چالیس کے لگ بھگ تھی بلکہ جنگجو اور تجربہ کار بہادروں کا ایک لشکر عظیم تھا جس کی قیادت مکہ کا مشہور سردار ابو جہل کر رہا تھا جو تعداد میں مسلمانوں کی اس مختصر جماعت سے تین گنا تھا اور سازوسامان اور اسلحہ میں مسلمانوں کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ حضور رحمت عالم ﷺ بھی حالات کا گہری نظر سے مطالعہ فرما رہے تھے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ معلوم تھا کہ اگر آج کمزوری دکھائی گئی تو صرف یہی نہیں کہ کفار مکہ کے حوصلہ بڑھ جائیں گے اور وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی مساعی کو تیز تر کر دیں گے بلکہ خود مدینہ میں مسلمانوں کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ یہودی اور منافق جو ابھی تک سہمے سہمے رہتے ہیں وہ بھی دلیر ہو جائیں گے۔ اور داخلی امن بھی خطرہ کی نذر ہو جائے گا۔ اس لیے اب موقع تھا کہ جرات وہمت سے کام لے کر سر فروشانہ طور پر کفار کی طاقت سے ٹکر لی جائے۔

لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ایک مجلس مشاورت منعقد کی گئی جس میں مہاجرین اور انصار نے شرکت کی۔ ان کے سامنے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ساری صورت حال پیش فرمادی۔ حضرت صدیق وفاروق (رضی اللہ عنہم) نے اپنے جذبہ جانفروشی کا اظہار کیا۔ حضرت مقدادؓ بن عمرو کھڑے ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ!

امض لما اراك الله فنحن معك والله لا نقول لك كما قال بنوا اسرائيل لموسیٰ اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ولكن اذهب انت وربك فقاتلا انا معكما مقاتلون:

یارسول اللہ! جیسے اللہ کا حکم ہے تشریف لے چلیے ہم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہیں۔ بخدا ہم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں وہ بات نہیں عرض کریں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہم تو یہ عرض کریں گے کہ آپ اور آپ کا رب کریم دشمن سے نبرد آزما ہوں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ استروا علی ایها

الناس! اے لوگو بتاؤ تمہاری کیارائے ہے۔ اب انصار کو خیال گزرا کہ شاید روئے سخن ہماری طرف ہے تو انصار کے علمبردار سعد(رض) بن معاذ اٹھے اور عرض کی

کانت تریدنا یارسول اللہ! قال اجل۔ قال سعد: لقد آمنا بك وصدقناك وشهدنا ان ما جئت به هو الحق واعطيناك على ذالك عهودنا ومواثيقنا على السمع والطاعة فامض لما اردت فنحن معك فو الذى بعثك لو استعرضت بنا هذا البحر فخضته لخضناه معك وما تخلف منا رجل واحد۔۔ لعل الله يريك منا ما تقر به عينك فسر بنا على بركة الله:۔

"اے اللہ کے رسول! آپ ہماری رائے پوچھ رہے ہیں۔ حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایاہاں۔ تو سعد نے عرض کی۔ ہم آپ پر ایمان لائے آپ کی تصدیق کی۔ اور اس بات کی گواہی دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ حق ہے۔ اور آپ کی کامل اطاعت کا پختہ وعدہ کیا۔ جدھر کا قصد ہے تشریف لے چلیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر مبعوث فرمایا اگر آپ سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو سب آپ کے ساتھ اس میں چھلانگ لگا دیں اور کوئی ایک بھی پیچھے نہ رہے۔ میدان جہاد میں ہماری جانفروشیوں سے اللہ تعالیٰ آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے گا۔ اللہ کی برکت پر چلیے ہم سب بستگان فتراک نیاز حضور کے ہمرکاب ہیں"۔

اس طرح سرفروشوں کا یہ گروہ اپنے رب کے نام کو بلند کرنے کا عزم صمیم کرکے آگے بڑھا اور بدر کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ وہاں ایک طرف حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ٹھیرنے کے لیے ایک چھپر(عریش) بنادیا گیا۔ جنگ سے ایک روز پیشتر حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابہ کی معیت میں میدان جنگ کے نشیب و فراز کا جائزہ لینے کے لیے نکلے۔ سارے میدان کا چکر لگایا۔ اور اسی اثناء میں ان مقامات کی نشاندہی بھی فرماتے گئے جہاں کل ہونے والی جنگ میں مکہ کے سرداروں کی لاشیں گرنے والی تھیں هذا مصرع فلان: یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے، هذا مصرع فلان: یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے۔

رات کو سب لوگ محو خواب تھے۔ لیکن چشم مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء بیدار تھی۔ ساری رات اسلام کی نصرت اور مسلمانوں کی فتح مندی کے لیے دعائیں فرماتے ہے۔ صبح ہوئی مسلمانوں کی صفوں کو درست کیا۔ سامنے کفار کا لشکر جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ان کی سہ گنا قوت کو دیکھا اور مسلمانوں کی بے بسی کو ملاحظہ فرمایا۔ اپنے عریش میں واپس تشریف لائے اور بارگاہ خداوندی میں انتہائی عجز و نیاز سے عرض کی۔ "اللھم ھذا قریش قد اتت بخیلاءھا تحاول ان تکذب رسولك اللھم فنصرك الذی وعدتنی اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃ الیوم لا تعبد"۔

اے اللہ! یہ سامنے قریش ہیں جو نخوت و غرور کے سب سامان سے لیس ہو کر آئے ہیں تاکہ تیرے رسول کو جھٹلائیں۔ اے۔ اللہ! اب آجائے تیری وہ مدد جس کا تونے وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ! اگر ان مٹھی بھر مسلمانوں کو تو نے ہلاک ہونے دیا تو پھر تیری بھی عبادت نہیں کی جائے گی۔

رمضان کی سترہ تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ جب چشم آفتاب نے اور وادی بدر کے سنگریزوں نے اس انوکھی جنگ کا مشاہدہ کیا جس میں باطل اپنی پوری قوت و جبروت سے مسلح ہو کر حق کو کچلنے کے لیے نکلا تھا اور حق نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود باطل کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اگر اس روز اللہ تعالیٰ کی تائید اور مسلمانوں کی جانفروشی کے باعث حق کا بول بالا نہ ہوتا تو آج آفتاب صداقت کی یہ جلوہ سامانیاں نہ ہوتیں بلکہ یہ کائنات کفر و شرک کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہوتی۔ اسی لیے قرآن حکیم نے اس روز سعید کو یوم الفرقان فرمایا ہے۔ یعنی وہ دن جس نے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا۔

یہ ہے اس جنگ بدر کا سیاسی اور تاریخی پس منظر جس کے متعلق اس سورۃ میں گفتگو فرمائی گئی ہے۔ نیز اس میں مسلمانوں کو ان کی اپنی کوتاہیوں پر بھی آگاہ کر دیا تاکہ وہ اپنی پہلی فرصت میں ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ فتح و کامرانی محض اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا نتیجہ ہے اس لیے اس کی اور اس کے رسول

کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اطاعت میں کوشاں رہو تاکہ تائید غیبی ہمیشہ ہمیشہ تمہارے شامل حال رہے ایسا نہ ہو کہ تم اپنی بہادری اور شجاعت پر مغرور ہو کر احکام الٰہی اور ارشادات مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سر تابی کرنے لگو۔

مال غنیمت کی تقسیم کا طریقہ بھی واضح طور پر بیان کر دیا تاکہ اس کے متعلق بھی کسی قسم کا تنازع پیدا نہ ہو۔ اس کے ضمن میں صلح و جنگ کے متعلق معاہدوں کی پابندی کا حکم بھی فرمایا تاکہ یہ امت جس کے نبی کی بعث کی ایک بڑی غرض مکارم اخلاق کی تکمیل ہے وہ صلح و جنگ ہر حالت میں ان مکارم اخلاق کی علمبردار ہو۔

سورۃ کے آخری حصہ میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صحابہ کرام کی شان بھی بیان فرمادی جن کی سرفروشیوں قربانیوں، جانبازیوں، پیہم جدوجہد اور مسلسل سعی و عمل سے دین اسلام کو کامیابی اور عروج نصیب ہوا۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں ان کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہ کر اسی اخلاص، اسی للّٰہیت، اسی ایثار اور اسی جانفروشی سے پرچم اسلام کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف جہاد رہیں۔ اولئك هم المؤمنون حقا

(یہی لوگ سچے ایماندار ہیں)۔ کے کلمات سے ان حضرات قدسی صفات کے سچے اور کامل ایماندار ہونے کی خود خداوند علیم و خبیر نے شہادت دے دی اور پہلے ہی ان تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیا جو یاران مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثنا کے متعلق اسلام کے ظاہری اور باطنی دشمن قیامت تک اٹھانے والے تھے۔ تاکہ کوئی جان بوجھ کر ان شکوک و شبہات کا شکار بننا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے لیکن بے علمی اور بے خبری کی وجہ سے کوئی ان میں مبتلا نہ ہو۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

[بِسْمِ اللّٰهِ : اللہ کے نام سے] [الرَّحْمٰنِ : جو بے حد رحم والا] [الرَّحِيْمِ : نہایت مہربان ہے]

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سورۃ الانفال کا تعارف

انفال کا معنی ہے غنیمت کا مال۔ یہ سورۃ دس رکوع ۷۵ آیات اور ۱۰۷۵ کلمات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز ہی انفال کے متعلقہ سوال سے کیا گیا ہے۔ اس کی تمام آیات مدینہ یا اس کے گردونواح میں نازل ہوئیں ہیں۔ سورۃ کے واقعات اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی۔

اس کے بنیادی مسائل اور مرکزی مضامین درج ذیل ھیں۔

۱۔ ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔

۲۔ مال غنیمت پر قانونی حق اللہ اور اس کے رسول کا ہے اس کی تقسیم مجاہد کی مرضی پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہونی چاہیے۔

۳۔ بدر کی فتح اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت کا نتیجہ ہے ملائکہ کی کمک تو مجاہدین کے حوصلے بڑھانے کا بہانہ تھا۔

۴۔ بدر کے معرکہ کا مقصد اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور کفار کا غرور خاک میں ملانا تھا۔

۵۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں کسی قسم کی خیانت نہیں ہونی چاہیے۔

٦۔ اللہ ہی مومنوں کا مولیٰ اور بہترین مددگار ہے۔

۷۔ مال غنیمت میں پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے مخصوص ہے۔

۸۔ حالات جنگ میں بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنے کا حکم ہے۔

۹۔ آپس کے اختلاف سے بچنا چاہیے کیونکہ اس سے ساکھ اکھڑ جاتی ہے۔

۱۰۔ شیطان اپنے کارندوں کی نظروں میں ان کے اعمال خوبصورت کرکے دکھاتا ہے۔

۱۱۔ میدان بدر میں مسلمانوں کے جوش اور ملائکہ کی مدد دیکھ کر شیطان بھی ڈر کے مارے بھاگ گیا تھا
۱۲۔ جب تک لوگ نعمتوں کی ناشکری نہ کریں اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کو زحمت میں تبدیل نہیں کرتا۔
۱۳۔ اہل مکہ کا کردار اور آل فرعون کے کردار میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا اپنے اپنے انداز میں ہول ناک انجام ہوا۔
۱۴۔ اللہ کے نزدیک پوری مخلوق میں کون بدترین مخلوق ہے۔
۱۵۔ سربراہ قوم کو اپنی قوم ہر وقت جہاد پر آمادہ رکھنا چاہیے۔
۱۶۔ مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں اپنے گھوڑے جہاد کے لیے تیار رکھنے چاہیں۔
۱۷۔ کفار ایک دوسرے کے دوست اور مسلمان آپس میں خیر خواہ اور بھائی بھائی ہیں۔ (فہم القرآن)

آیۃ مبارکہ:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

لغۃ القرآن:

[يَسْـَٔلُوْنَكَ : یہ لوگ پوچھتے ہیں آپ سے] [عَنِ الْاَنْفَالِ: اموال غنیمت کے بارے میں] [قُلِ : آپ کہہ دیجیے] [الْاَنْفَالُ : اموال غنیمت] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے ہے] [وَالرَّسُوْلِ : اور ان رسول کے لیے ہے] [فَاتَّقُوا : پس تم لوگ تقوی اختیار کرو] [اللّٰهَ : اللہ کا] [وَاَصْلِحُوْا : اور اصلاح کرو] [ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠: تمہارے درمیان والی (رنجش) کی]

[وَاَطِيْعُوا : اور اطاعت کرو] [اللّٰهَ : اللہ کی] [وَرَسُوْلَهٗٓ: اور اس کے رسول کی] [اِنْ : اگر] [كُنْتُمْ : ہو تم] [مُّؤْمِنِيْنَ : مومن]

ترجمہ:

اے نبی مکرّم ﷺ !) آپ سے اموال غنیمت کی نسبت سوال کرتے ہیں۔ فرما دیجئے: اَموال غنیمت کے مالک اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی معاملات کو درست رکھا کرو اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کیا کرو اگر تم ایمان والے ہو

تشریح:

اسلام سے پہلے اہل عرب کسی قانون اور ضابطہ کے پابند نہ تھے۔

ان کی زندگی کی ساری سرگرمیاں ان کے لاابالی مزاجوں سے وابستہ تھیں۔ صلح وجنگ کے رسم ورواج میں عدل و انصاف کے بجائے قوت اور دھاندلی کا دور دورہ تھا۔ اسلام نے یک لخت ان کی اس بے راہ روی کو قانون کا پابند نہیں کردیا بلکہ آہستہ آہستہ حسب ضرورت احکام نافذ کیے۔ اس طرح وہ قوم جو ابھی چند سال پہلے انانیت اور سرکشی میں ضرب المثل تھی نظم وضبط کی علمبردار بن گئی۔ بدر کی جنگ کفر واسلام کی پہلی جنگ تھی۔ نئے مسائل جن سے مسلمان پہلے آشنا نہ تھے، کا وقوع پذیر ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اس سورۃ کا آغاز ایک ایسی ہی الجھن اور اس کے حل سے کیا گیا۔ بات یوں ہوئی کہ سبب نصرت ربانی سے مٹھی بھر نہتے مسلمانوں نے کفار کی عظمت و نخوت کو خاک میں ملا دیا اور ان کا لشکر جرار اپنے ستر سورماؤں کے لاشے اور ستر اسیر اور بہت سا سامان میدان میں چھوڑ کر بھاگا تو کچھ مسلمان دور تک ان کے تعاقب میں چلے گئے۔ اور بعض مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اس سامان پر قبضہ کرلیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے تقسیم کیسے کیا جائے۔ کیا عرب کے پرانے رسم ورواج کے مطابق کہ جو چیز جس کے ہاتھ لگے وہ لے کر چلتا بنے اور دوسرے منہ تکتے رہ جائیں یا اسلام اس کے متعلق بھی کوئی واضح ہدایت دے کر ہمیشہ کے لیے اس گڑبڑ کو ختم کردینا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم نے قل الانفال للّٰہ والرسول

فرما کر اس ساری آوارگی کو ہی ختم کر دیا کہ میدان جنگ میں ہاتھ آنے والا ساز و سامان افراد کی ملکیت ہی نہیں تا کہ وہ اس کی بٹائی میں ایک دوسرے سے جھگڑا شروع کریں بلکہ اس کا مالک تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔ اس لیے اللہ کا رسول اپنے مالک کے حکم سے جس طرح چاہے تقسیم فرما دے کسی کو اعتراض کا حق ہی نہیں۔ حضرت ابی امامۃ الباہلی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہ بن الصامت (رض) سے دریافت کیا کہ یہ آیت انفال کب نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ ہم بدریوں کے حق میں نازل ہوئی جب ہم نے مال غنیمت کے بارے میں جھگڑنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے اختیار سے نکال کر اپنے رسول کے حوالہ کر دیا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے برابر طور پر سب میں تقسیم فرمایا۔ فقال عبادۃ فینا معشر اصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل وساءت فیہ اخلاقنا فنزعہ اللہ من ایدینا وجعلہ الی الرسول فقسمہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من بواء یقول علی السواء (قرطبی)۔ انفال جمع ہے نفل کی۔ اس کا معنی ہے مال غنیمت۔ کیونکہ یہ بھی محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عطا ہے۔ الانفال یعنی الغنائم والنفل الغنم لانہا من فضل اللہ وعطاہ (مظہری)

آیت کے اس حصہ میں سابقہ حکم کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ مومن کی جنگ محض کلمہ حق کو سر بلند کرنے کے لیے ہونی چاہیے۔ دولت کے لالچ کا یہاں کیا دخل۔ اگر اموال غنیمت کی تقسیم افراد کی تحویل میں دے دی جاتی تو اس سے دو خطرے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس طرح حسد و عناد کی ایک ایسی راہ کھل جاتی جس سے مسلمانوں کی جمعیت پارہ پارہ ہو جاتی دوسرا یہ کہ اخلاص نیت جو مسلمان کے اعمال کی روح رواں ہے ختم ہو کر رہ جاتا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

شان نزول

اس آیت کے شان نزول سے متعلق مختلف روایات ہیں، ان میں سے دو روایات یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

(1)۔۔ حضرت ابو امامہ باہلی (رض) فرماتے ہیں، میں نے حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے آیت انفال کے نزول کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ”یہ آیت ہم اہل بدر کے حق میں نازل ہوئی جب غنیمت کے معاملہ

میں ہمارے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور بدمزگی کی نوبت آگئی تو اللہ تعالیٰ نے معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکال کر اپنے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سپرد کر دیا اور آپ نے وہ مال مسلمانوں میں برابر تقسیم کر دیا۔
(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے کہ سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ بدر کے دن ارشاد فرمایا: "جو تم میں سے یہ کام کر دکھائے اسے مال غنیمت میں سے یہ انعام ملے گا۔ چنانچہ نوجوان آگے بڑھ گئے اور عمر رسیدہ حضرات جھنڈوں کے پاس کھڑے رہے اور وہاں سے نہ ہٹے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں پر فتح عطا فرمائی تو بوڑھوں نے فرمایا: "ہم تمہارے پشت پناہ تھے، اگر تمہیں شکست ہو جاتی تو تم ہماری طرف آتے لہٰذا یہ نہیں کہ غنیمت تم لے جاؤ اور ہم خالی ہاتھ رہ جائیں۔ جوانوں نے اس بات سے انکار کیا اور کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارا یہ حق مقرر فرمایا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر صراط الجنان)

اموالِ غنیمت کا حکم اور صفات مومنین کا بیان

انفال یعنی اموال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا حق ہیں۔ وہ جس طرح چاہیں ان میں تصرف کر سکتے ہیں کیونکہ جہاد صرف اللہ اور اس کے رسول کے دین کی سربلندی کے لیے کیا جاتا ہے تو جہاد میں حاصل ہونے والا مال بھی اللہ و رسول ہی کا ہے۔ یاد رہے انفال نفل کی جمع ہے۔ نفل کا معنی زائد چیز ہے۔ اسی لیے فرض و واجب سے زائد عبادات کو نفل کہا جاتا ہے اور مال غنیمت بھی جہاد کے اصل مقصد سے زائد ہے جہاد کا حقیقی مقصد دین کی سربلندی ہے۔ اس لیے اموال غنیمت کو انفال کہا گیا۔
یہاں اَلْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ میں ختم نبوت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ الرسول معرف باللام ہے جو صرف ایک ہی ذات پر صادق آسکتا ہے یعنی محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ معلوم ہوا کہ قرآن جس امت کے لیے اتارا گیا ان کا صرف ایک ہی رسول ہے۔ ﷺ
اسی لیے حضرت عبداللہ بن ثابت (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

انا حظكم من النبيين وانتم حظی من الامم۔ "تمہارے حصہ کا نبی میں ہوں اور میرے حصہ کی امت تم ہو۔" (مسند احمد جلد 4 صفحہ 266 مطبوعہ دار الفکر بیروت) گویا قرآن مجید میں جہاں بھی حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو الرَّسُول یا رَسُولَہ سے تعبیر کیا گیا ایسے سب مقامات ختم نبوت پر دلالت کرتے ہیں۔

[2]۔ حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے مروی ہے کہ غزوہ بدر میں جب کفار بھاگ اٹھے تو صحابہ کرام (رض) کا ایک گروہ ان کے تعاقب میں گیا اور انہیں دور تک قتل کیا۔ دوسرا گروہ ان کے چھوڑے ہوئے اموال غنیمت جمع کرنے لگا، تیسرا گروہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت میں کھڑا ہو گیا۔ بعد میں اموال غنیمت جمع کرنے والوں میں سے کسی نے کہا یہ اموال صرف ہمارا حق ہیں۔ دوسروں نے کہا ان میں ہمارا بھی حق ہے یہ تنازع حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا تب یہ آیت مبارکہ اتری: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُ۔ (در منثور بروایت مسند احمد و ابن حبان و حاکم)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے رسول! آپ سے انفال کے بارہ میں پوچھا گیا۔ آپ فرمادیں انفال اللہ و رسول کا حق ہیں وہ جیسے چاہیں ان کے بارہ میں حکم فرمائیں تم اللہ سے ڈرو اور اپنے درمیان اصلاح رکھو جھگڑا نہ کرو اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ جو حکم دیں اس کی اطاعت کرو۔ اگر تم مومن ہو۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تمام مومنین میں بدر کے اموال غنیمت کو برابر تقسیم کیا۔ حتیٰ کہ کئی وہ لوگ جو کسی معذوری سے بدر میں شامل نہ ہوئے جیسے عثمان غنی (رض)۔ انھیں بھی پورا حصہ دیا اور کوئی خمس نہ نکالا۔ کیونکہ یہ پہلی جنگ تھی۔ ابھی تقسیم غنیمت کے مفصل احکام نہ اترے تھے بعد میں وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال: 41) اور مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (حشر: 7) جیسی آیات اتریں تو احکام غنائم مقرر ہوئے۔

یہاں سے

دو فوائد حاصل ہوئے

۱۔ مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی اہمیت۔

وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ میں زور دیا گیا ہے کہ مومنین آپس میں اصلاح رکھیں جھگڑوں میں نہ پڑیں اور اگر جھگڑا ہو جائے تو اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ کی روشنی میں حکم خدا اور رسول سے اس کا فیصلہ کریں۔

2۔ ختم نبوت:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ اسے دو طرح سے عقیدہ ختم نبوت ثابت ہوتا ہے: اس میں رَسُوۡلَہٗ سے واضح ہوا کہ قرآن کے مخاطبین کا ایک ہی رسول ہے۔ ورنہ اطیعوا اللہ ورسلہ ہونا چاہیے تھا، پھر اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ کہہ کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وہی مطاع مطلق قرار دیا گیا ہے۔ بالفرض اگر آپ کے بعد کوئی نبی آئے تو وہ بھی مطاع مطلق ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ "اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اسی لیے تھا تاکہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔" (نساء: 64) پھر اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ کو منسوخ و معطل ماننا پڑے گا کیونکہ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مطلق نہ رہیں گے بلکہ آپ کی اطاعت نئے نبی کی اطاعت سے مشروط ہو جائے گی۔ (تفسیر برہان القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "(اے رسول مکرم!) یہ آپ سے انفال (اموالِ غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے کہ انفال (کے حکم) کا اللہ اور اس کا رسول مالک ہے سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو اور اگر تم مومن (کامل) ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو"

انفال کا معنی اور اس کے مصداق میں مفسرین کے نظریات

انفال کے معنی میں صحابہ کرام اور اخیار تابعین کا اختلاف ہے، عکرمہ، مجاہد، ضحاک، قتادہ، عطاء اور حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے کہ انفال کا معنی ہے: اموال غنیمت۔

عطاء، ابن جریج اور حضرت ابن عباس (رض) سے ہی یہ بھی روایت ہے کہ انفرادی طور پر مشرکوں سے مسلمان جو چیز حاصل کرلیں مثلاً غلام یا سواری وغیرہ وہ انفال ہے، یا مشرکین سے جو چیز چھین لیں یا اس کے لباس سے اتار لیں مثلاً گھوڑا اور تلوار وغیرہ۔

حضرت ابن عباس (رض) سے یہ بھی روایت ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم سے جو چیزیں الگ کرلی جائیں وہ انفال ہیں۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباس (رض) سے پوچھا: انفال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا گھوڑا انفال میں سے ہے اور مشرکین سے چھینی ہوئی چیزیں انفال میں سے ہیں۔

نیز عطا نے کہا جو چیز بغیر جنگ کے مسلمان انفرادی طور پر مشرکین سے حاصل کرلیں وہ انفال ہے۔

مجاہد سے یہ بھی روایت ہے کہ انفال کا معنی خمس ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310 ھ نے فرمایا ان اقوال میں اولیٰ یہ ہے کہ انفال مال غنیمت سے وہ زائد چیز ہے جس کو امیر لشکر، لشکر کے بعض یا کل افراد کو بہ طور ترغیب اور تحریص عطا کرتا ہے جس میں ان کی یا تمام مسلمانوں کی بہتری ہو، اور چیز کفار سے چھینے ہوئے سامان میں سے ہوتی ہے یا امیر لشکر تک وہ زائد پہنچتی ہے یا مشرکین کے اسباب میں سے ہوتی ہے، ہم نے اس قول کو اولیٰ اس لیے کہا ہے کہ کلام عرب میں نفل اصل سے زائد چیز کو کہتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو لشکریوں کے حصہ مال غنیمت سے زائد ہو اور لشکری کو وہ چیز امیر لشکر نے عطا کی ہو جیسے کافر سے چھینا ہوا مال، وہ انفال ہے۔ (جامع البیان جز 9، ص 224۔ 228، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں انفال کے ان تمام معانی کا احتمال ہے اور بعض کی بعض پر ترجیح کی کوئی دلیل نہیں ہے، اگر حدیث سے کسی ایک معنی کی تعیین ثابت ہوجائے تو وہی معنی متعین ہوجائے گا۔ ان معانی میں تناقض نہیں ہے اس لیے ان تمام معانی کا ارادہ کرنا جائز ہے اور اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد خمس ہے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مال ہے اور آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے یا تقسیم کے بعد اس میں سے جس کو چاہیں بطور ترغیب عطا فرمادیں، اور جس مجاہد کو یہ ملے گا وہ اس کے حصہ مال غنیمت سے زائد ہوگا۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 449، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ کا مختار یہ ہے کہ انفال سے مراد مال غنیمت ہے، ان کا استدلال اس حدیث سے ہے:

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب نے عظیم غنیمت کو حاصل کیا، اس میں ایک تلوار بھی تھی، میں وہ تلوار لے کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا، اور عرض کیا مجھے یہ تلوار زیادہ دے دیں کیونکہ آپ کو میرا حال معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو وہیں رکھ دو جہاں سے اس کو لیا ہے میں اس کو وہاں رکھنے گیا، پھر میرے دل میں خیال آیا میں آپ کے پاس دوبارہ گیا اور کہا آپ مجھے یہ تلوار دے دیں! آپ نے بہ آواز بلند فرمایا اس کو وہیں رکھ دو جہاں سے اس کو لیا ہے اور تب یہ آیت نازل ہوئی: یسئلونك عن الانفال۔ (الانفال: 1)۔ (صحیح مسلم فضائل صحابہ: 43(2414)6121۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 2740، سنن الترمذی رقم الحدیث: 3090)

مال غنیمت کے استحقاق میں صحابہ کرام کا اختلاف

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ آپ سے انفال کے متعلق سوال کرتے ہیں، نیز فرمایا اور آپس میں صلح رکھو، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا مال غنیمت کے حکم میں اختلاف تھا، پھر انھوں نے اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ انفال (مال غنیمت) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کے تابع ہیں، وہ جس کو چاہیں اور جتنا چاہیں عطا کردیں۔ مال غنیمت کے حکم میں مسلمانوں کے اختلاف کی تفصیل حسب ذیل روایت سے معلوم ہوتی ہے:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے ایسا ایسا کام کیا اس کو فلاں چیز زائد ملے گی، پس نوجوان آگے بڑھے اور بڑے بوڑھے جھنڈوں کے پاس کھڑے رہے اور ان کے ساتھ نہیں گئے، جب اللہ نے ان کو فتح عطا فرمائی تو بوڑھوں نے کہا تم ہماری پناہ میں تھے، اگر تم شکست کھاتے تو ہماری طرف آتے، تو تم ہمارے بغیر مال غنیمت نہ لو، جوانوں نے اس کا انکار کیا اور کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ مال غنیمت ہمارے لیے رکھا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یسئلونك عن

الانفال الایہ۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 2637، السنن الکبری للنسائی ج 6، رقم الحدیث : 1197، المستدرک، ج 2، ص 326، حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی، جامع البیان جز 9، ص 228۔ الدر المنثور، ج 4، ص 6)

حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ باہر نکلے، میں آپ کے ساتھ بدر میں حاضر تھا، مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دے دی، مسلمانوں کی ایک جماعت ان کا پیچھا کر رہی تھی اور ان کو قتل کر رہی تھی اور مسلمانوں کی دوسری جماعت ان کا مال جمع کر رہی تھی، اور تیسری جماعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد آپ کی حفاظت کر رہی تھی، مبادا آپ کو دشمن کی طرف سے کوئی ضرر پہنچے، حتیٰ کہ جب رات ہو گئی اور مسلمانوں کی آپس میں ملاقات ہوئی تو جن مسلمانوں نے مال غنیمت جمع کیا تھا، انھوں نے کہا کہ اس مال میں اور کسی کا حق نہیں ہے اس مال غنیمت کو ہم نے اکٹھا کیا ہے، اور جن مسلمانوں نے دشمن کا پیچھا کیا تھا انھوں نے کہا تم ہم سے زیادہ اس مال غنیمت کے حقدار نہیں ہو ہم نے دشمن کو بھگایا ہے اور ہم نے اس کو شکست دی ہے، اور جن مسلمانوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی تھی انھوں نے کہا تم ہم سے زیادہ اس مال غنیمت کے حقدار نہیں ہو، ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی تھی، مبادا آپ کسی کافر کے حملہ کی زد میں آجائیں اور ہم آپ کی حفاظت میں مشغول رہے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آپ سے اموال غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے کہ انفال (کے حکم) کے اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مالک ہیں، سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مال غنیمت کو ان میں ان کے حصوں کے اعتبار سے تقسیم فرمایا۔ (مسند احمد ج 5۔ ص 524، طبع قدیم، مسند احمد ج 8، رقم الحدیث : 22826، طبع جدید، دار الفکر مسند احمد ج 16، رقم الحدیث : 22661، طبع دار الحدیث قاہرہ، شیخ احمد شاکر نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ المسترک، ج 2، ص 326، مجمع الزوائد، ج 7، ص 26، الدر المنثور، ج 4، ص 5)

تنفیل (کسی نمایاں کارنامہ پر مجاہدوں کو غنیمت سے زائد انعام دینے) میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی 668 ھ لکھتے ہیں : امام مالک (رح) کا مذہب یہ ہے کہ خمس (مال غنیمت کے پانچویں حصہ) میں سے امام اجتہاد سے جو انعامات عطا کرے وہ انفال ہیں، اور مال غنیمت کے باقی چار

حصوں میں سے نفل (یہ انعام) نہیں دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک اصل مال غنیمت سے نفل دینا اس لیے جائز نہیں کہ مال غنیمت کے مستحقین متعین ہیں اور وہ میدان جہاد میں گھوڑے دوڑانے والے مجاہدین ہیں، اور خمس میں سے عطا کرنا امام کی رائے پر موقوف ہے اور اس کے مستحقین غیر معین ہیں، امام مالک کا استدلال اس حدیث سے ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نجد کی طرف ایک لشکر بھیجا ان کو مال غنیمت میں بہت زیادہ اونٹ ملے اور مال غنیمت میں سے ان کا حصہ بارہ بارہ یا گیارہ گیارہ اونٹ تھے اور ان کو ایک ایک اونٹ زائد دیا گیا۔ الموطا رقم الحدیث: 987 اور سنن ابوداؤد میں ہے کہ ان کا حصہ بارہ بارہ اونٹ تھے ان کو ایک ایک اونٹ زائد دیا گیا تو ہر ایک کو تیرہ تیرہ اونٹ مل گئے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 2744)

نیز امام مالک نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے: عمرو بن شعیب بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حنین سے لوٹے اور جعرانہ کی طرف جانے لگے اور آپ کی چادر درخت کی شاخوں سے الجھ کر گر گئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری چادر اٹھا دو، کیا تم کو یہ خطرہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ مجھ کو عطا کیا ہے میں وہ تمہارے درمیان تقسیم نہیں کروں گا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے اگر اللہ مجھے تہامہ کے درختوں کے برابر اونٹ بھی عطا کرے تو میں ان کو تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا، پھر تم مجھے بخیل پاؤ گے نہ بزدل نہ جھوٹا۔ پھر جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں میں قیام کیا تو فرمایا کسی کے پاس سوئی یا دھاگہ بھی ہے تو دے دے کیونکہ مال غنیمت عار ہے اور نار کا سبب ہے۔ اس کے بعد آپ نے زمین کو کریدا اور اونٹ کا ایک بال یا کوئی چیز اٹھا کر فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو مال عطا فرمایا ہے اس میں سے خمس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے۔ (محل استدلال یہ اخری جملہ ہے کہ خمس بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے) (الموطا رقم الحدیث: 994۔ مسند احمد ج 6، رقم الحدیث: 17154)۔

(الجامع لاحکام القرآن ج 7، ص 356، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

تنفیل میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ ابو اسحاق ابراہیم بن علی الشیرازی الشافعی المتوفی 455ھ لکھتے ہیں:

جو شخص ایسا کارنامہ انجام دے جس کی وجہ سے دشمن پر فتح حاصل ہو، مثلاً وہ دشمن کی جاسوسی کرے اور اس کے راستوں کو یا اس کے قلعہ کا کھوج لگائے یا وہ ابتداء دار الحرب میں داخل ہو، یا سب کے بعد دار الحرب سے لوٹے تو امام کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کو نفل دے (مال غنیمت کے حصہ سے زیادہ دے) کیونکہ حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابتداء میں چوتھائی حصہ زائد عطا فرماتے تھے اور لوٹتے وقت تہائی حصہ، اور زائد کی مقدار لشکر کے امیر کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ وہ جنگی مصلحت کے لیے خرچ کرتا ہے اور بہ قدر عمل دیتا ہے، کیونکہ جو شخص ابتداء میں دار الحرب میں داخل ہوتا ہے اس وقت دشمن اس سے غیر محتاط ہوتا ہے۔ اور جو آخر میں دار الحرب سے لوٹتا ہے اس کو دشمن کے خوف کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابتداءً دار الحرب میں داخل ہونے والوں کی نسبت آخر میں لوٹنے والوں کو زیادہ حصہ دیتے تھے۔ زائد حصہ مسلمانوں کے بیت المال سے دینا بھی جائز ہے اور اس مال سے بھی دینا جائز ہے جو مشرکین سے لے کر جمع کیا جاتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے بیت المال سے دیا جائے تو یہ خمس کے پانچویں حصہ میں سے دیا جائے گا۔ کیونکہ سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو نفل (مال غنیمت سے زائد حصہ) خمس میں سے دیا جاتا تھا، اور اس لیے بھی کہ خمس وہ مال ہے جس کو کسی مصلحت میں خرچ کیا جاتا ہے اس لیے وہ خمس کے پانچویں حصہ میں سے دیا جائے گا اور نفل کی مقدار کا مجہول رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ایک عقد کا عوض ہے اور اگر نفل کفار کے مال سے دیا جائے تو پھر اس کا مجہول رکھنا جائز ہے، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابتداء میں چوتھائی حصہ رکھا اور لوٹنے میں تہائی رکھا اور یہ مال غنیمت کا ایک مجہول حصہ ہے۔ (کیونکہ مال غنیمت کی مقدار غیر معلوم ہے تو اس کا تہائی یا چوتھائی حصہ بھی غیر معلوم ہوگا)۔ (المہذب ج 2، ص 243، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

تنفیل میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ موفق الدین عبداللہ بن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

نفل کا معنی ہے کسی شخص کو اس کے حصہ سے زیادہ دینا، اور اس کی دو نوع ہیں:

نوع اول وہ ہے جس میں نفل کا استحقاق کسی شرط کی وجہ سے ہو، اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں: قسم اول یہ ہے کہ امیر جب دار الحرب میں جہاد کے لیے داخل ہو تو وہ اپنے سامنے ایک لشکر کو دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیجے اور ان کو پانچویں حصہ کے بعد چوتھائی حصہ دینے کا اعلان کرے، اور جب مال غنیمت اکٹھا ہو تو دونوں لشکروں کو حسب اعلان دے پھر باقی مال غنیمت ان دونوں لشکروں سمیت پورے بڑے لشکر میں تقسیم کرے۔ نوع اول کی دوسری قسم یہ ہے کہ امیر اس شخص کے لیے کسی زائد حصہ کا اعلان کرے جو مسلمانوں کے لیے کوئی مفید کام انجام دے، مثلاً امیر یہ کہے کہ جو شخص اس قلعہ میں داخل ہوگا اس کو یہ انعام ملے گا، یا یہ کہے کہ جو شخص قلعہ میں نقب لگائے گا، یا جو شخص کسی کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو یہ انعام ملے گا، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا جو شخص کسی قتیل (کافر) کو قتل کرے گا، اس کا سب سامان اس کو ملے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 2718)

اور یہ انعام مسلمانوں کے مال سے دینا بھی جائز ہے اور مشرکین سے لیے ہوئے مال سے دینا بھی جائز ہے۔ اگر مسلمانوں کے مال سے انعام کا اعلان کیا جائے تو اس کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے اور اگر مشرکین کے مال سے انعام کا اعلان کیا جائے تو پھر اس کی مقدار کا مجہول رکھنا بھی جائز ہے جیسے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے کسی قتیل کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا سامان اس کا ہے، اور سامان کی مقدار مجہول ہے۔

نوع ثانی یہ ہے کہ کسی مسلمان کی کسی خاص کارکردگی کی وجہ سے امام اس کو خصوصی زائد حصہ دے مثلاً اس نے جنگ میں زیادہ مشقت برداشت کی ہو یا کسی اہم معاملہ میں جاسوسی کی ہو یا وہ مقدمۃ الجیش میں ہو یا اور کوئی نمایاں کام کیا ہو تو اس میں بغیر پیشگی شرط کے بھی زائد حصہ دینا جائز ہے، جیسا کہ امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عیینہ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اونٹ لوٹ لیے، حضرت سلمہ بن الاکوع نے ان کا

پیچھا کیا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو سوار کا حصہ بھی دیا اور پیادہ کا حصہ بھی دیا۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 2697۔ الکافی، ج4، ص138۔139، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1414ھ)

تنفیل میں فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی المتوفی 593ھ لکھتے ہیں:

اگر امام حالت جنگ میں کسی شخص کے لیے تنفیل (زائد حصہ دینے) کا اعلان کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً یہ کہے کہ جس شخص نے کسی قتیل (کافر) کو قتل کیا تو اسے اس کا سلب (سامان) ملے گا، یا لشکر سے یہ کہے کہ خمس نکالے جانے کے بعد تمہیں اس کا چوتھائی حصہ ملے گا، کیونکہ جنگ پر ابھارنا مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یا ایھا النبی حرض المومنین علی القتال: (الانفال: 65) اے نبی آپ مسلمانوں کو جہاد پر ابھاریں۔

اور یہ اعلان بھی ایک قسم کا جنگ پر ابھارنا ہے۔ تنفیل (زائد حصہ دینے کا اعلان کرنا) اس طرح بھی ہو سکتا ہے اور کسی اور طرح بھی ہو سکتا ہے، لیکن امام کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کافروں سے حاصل کیے ہوئے تمام مال کا اعلان کر دے کیونکہ اس سے تمام مجاہدوں کا حق ضائع ہو گا، ہاں اگر تمام لشکر کے لیے اعلان کر دے تو یہ جائز ہے، اور جب مال غنیمت جمع کر کے دار الاسلام میں پہنچا دیا جائے تو پھر کسی کے لیے اعلان نہ کرے، کیونکہ اب اس میں دوسروں کا حق موکد ہو چکا ہے، البتہ خمس میں سے اب بھی اعلان کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خمس میں مال غنیمت لینے والوں کا بھی حق ہے اور جب کافر کا سلب (سامان) قاتل کو نہ دیا جائے تو وہ من جملہ مال غنیمت میں سے ہے اور قاتل اور غیر قاتل اس میں برابر ہیں اور کافر کا سلب اس کے کپڑے، اس کے ہتھیار اور اس کا سوار ہے اور سواری پر جو زین اور دیگر آلات ہوں وہ بھی اس میں داخل ہیں، اسی طرح سواری کے اوپر جو کافر کا سامان ہو وہ بھی اس میں شامل ہے اور ان کے علاوہ اور کوئی چیز اس میں داخل نہیں ہے۔ پھر تنفیل (خصوصی حصہ دینے کا اعلان) کا حکم یہ ہے کہ اس سے دوسروں کا حق منقطع ہو جاتا ہے اور مجاہدین اس کے مالک اس وقت ہوتے ہیں جب مال غنیمت دار الاسلام میں پہنچ جاتا ہے حتی کہ اگر امام نے یہ اعلان کیا کہ جس شخص کو کوئی باندی ملی وہ اس کی ہے اور کسی مجاہد کو ایک باندی مل گئی اور اس نے اس کا استبراء کر لیا (یعنی باندی کا حیض گزر گیا) تب بھی اس مجاہد کے لیے اس باندی سے مباشرت کرنا جائز ہے نہ اس کو فروخت کرنا۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا قول ہے، امام محمد کے نزدیک

یہ دونوں امر جائز ہیں۔ (ہدایہ اولین ص 578۔580، ملخصا، مطبوعہ مکتبہ شرکتہ علمیہ، ملتان) (تفسیر تبیان القراان)

پہلی امتوں میں جب کافروں سے جنگ ہوتی تھی اور ان کے اموال ہاتھ آتے تھے تو انہیں آپس میں بانٹنے اور استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ ان اموال کو کسی میدان میں جمع کر کے رکھ دیتے تھے اور آسمان سے ایک آگ نمودار ہو کر آتی تھی اور انہیں جلا دیتی تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مجاہدین کا جہاد قبول ہو گیا اگر مال غنیمت جمع کر کے رکھ دیا جاتا اور آگ نازل نہ ہوتی تو سمجھا جاتا کہ اس مال میں سے کسی شخص نے کچھ کوئی چوری کیا ہے اس لیے اس کی قبولیت موقوف ہو گئی۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر نے جہاد فرمایا اور فتح کے بعد اموال غنیمت جمع کئے گئے اس کے بعد آگ آئی تاکہ ان کو جلائے مگر آگ نے اس کو نہ کھایا یعنی نہیں جلایا پیغمبر نے اپنی قوم سے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے کسی شخص نے خیانت کی ہے کوئی چیز چھپائی ہے لہٰذا ہر قبیلہ کا ایک آدمی مجھ سے بیعت کرے بیعت کرتے کرتے ایک شخص کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چپک کر رہ گیا آپ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم ہی لوگوں میں سے کوئی شخص خیانت کرنے والا ہے اور اس کے بعد اس قبیلے کے لوگ بیل کے سر کے برابر سونا لے کر آئے جو انہوں نے چھپا کر اٹھایا تھا چنانچہ اس مال کو غنیمت میں ملا کر رکھ دیا تو آگ آئی اور اس نے مال غنیمت کو جلا دیا۔ (رواہ البخاری)

بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کے یہ نبی حضرت یوشع بن نون (علیہ السلام) تھے واللہ اعلم۔

اموال غنیمت کا امت محمدیہ کے لئے حلال ہونا

گزشتہ انبیاء کرام کی امتوں کے اکثر احکام سخت ہوتے تھے جیسے کہ اس کی تفصیل سورۃ اعراف کی آیت "**ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبئث** " کے تحت گزر چکی اس امت مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام احکام شرعیہ آسان اور نرم فرمائے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا " **الدین یسر** " دین اسلام کے احکام سہل اور آسان ہیں (رواہ البخاری)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ

مجھے انبیاء (علیہم السلام) پر چھ چیزوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی

ایک یہ کہ مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے (جو الفاظ مختصر ہوں اور بہت سے معانی پر دلالت کرتے ہو انہیں جوامع الکلم کہا جاتا ہے پورا قرآن حکیم اور احادیث مرویہ (الفاظ نبوت کے ساتھ) اس کی مثال اور نمونہ ہیں (جہاں دریا جتنے معانی ہیں مختصر کوزہ جتنے الفاظ میں بند ہیں)

دوسرا یہ کہ رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے کہ دور دور تک دشمن کے دلوں میں میرا رعب اور دہشت طاری رہے گی ایک ماہ کی مسافت تک دشمن مجھ سے خوفزدہ رہے گا آج ہمارے زمانہ میں بھی اس کی واضح مثال موجود ہے کہ دنیاوی وسائل اور محیر العقول اسلحہ سے 50 ملکوں کے متحد نیٹو فوج چند نہتے بے سروسامان بھوکے پیاسے غیر مسلح طالبان کا نام سن کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور فرعون کی طرح ان کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے شروع میں یہ کہتے تھے کہ صرف دس دن کے لئے آئے ہیں علاقہ فتح کر کے دوسرے ہفتے میں واپس جائیں گے مگر تمام طاقتوں کا مالک رب العزت سبحانہ کے حکم سے اتنے ذلیل و خوار اور شرمندہ ہوئے کہ دنیا کی تاریخ میں ان کی ذلت و رسوائی ثابت ہو گی اگر ان میں تھوڑی حیا اور شرم ہوتی تو آئندہ مسلمان قوم کا نام تک نہ لیتے مگر کافر میں شرم و حیا کہا ان میں حیا چونکہ ہوتی نہیں اس لئے دم دبا کر خاموشی کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔

تیسرے یہ کہ اموال غنیمت میرے لئے حلال کئے گئے جو دوسری امتوں کے لئے حلال نہ تھے

چوتھی یہ کہ پوری زمین میرے لئے سجدہ گاہ بنادی گئی اور طہارت کی جگہ بنادی گئی جہاں کہیں وقت ہو جائے نماز پڑھ لیں مسجد کی کوئی قید نہیں اور اگر پانی نہ ملے یا قدرت نہ ہو تو تیمّم کر لیں

پانچویں میں ساری مخلوق اور تمام کائنات کے جن وانس کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں مجھ سے پہلے تمام انبیاء (علیہم السلام) اپنی اپنی قوموں کے لیے اور خاص علاقوں کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔

چھٹے یہ کہ میری امت پر نبیوں کی آمد ختم کر دی گئی میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ (رواہ مسلم)

ضروری وضاحت

سورۃالانفال جہاد کی بنیادی سورۃ ہے اس میں قیامت تک کے لیے قوانین جنگ کا بھی بیان ہے اور جہاد کے بیس فوائد کا مفصل تذکرہ ہے اسی طرح مجاہدین کے 25 اوصاف کا بھی اس سورۃ مبارکہ میں واضح بیان ہے جبکہ اس میں سے 15 قوانین کا بھی بیان ہے اسی طرح مال غنیمت کی تقسیم کا بھی تذکرہ ہے۔ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ۔ لوگ آپ سے مال غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ۔ آپ فرما دیجئے کہ مال غنیمت نہ کسی بوڑھے کا حق ہے نہ کسی نوجوان کا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حکم ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت نازل نہ ہوتی تو مسلمانوں کو کیوں کر باوجود قلّت اور بے سروسامانی کے غلبہ حاصل ہو سکتا تھا؟ اس کی تفصیل آگے آنے والی ہے لہٰذا اس مال کا مالک یقیناً اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اس کے بعد نیابۃً اس کا رسول ہے جو حکم الٰہی کے تحت اس مال کو مجاہدین پر تقسیم کرے گا۔

اس سلسلے میں مسلمانوں کا فرض یہ ہونا چاہیے فَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو اور اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) کا واقعہ مسند احمد میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائی حضرت عمیر غزوہ بدر میں شہید ہوگئے میں نے انکے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کیا اور اس کی تلوار لے کر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے مگر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے حکم دیا کہ اس کو مال غنیمت میں جمع کردو میں حکم ماننے پر مجبور تھا مگر دل میرا اس کا سخت صدمہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا اور میں نے اس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی مگر بایں ہمہ تعمیل ارشاد کے لیے کے لئے مال غنیمت میں جمع کرنے کے لئے آگے بڑھا تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سورۃالانفال کی یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے مجھے بلا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرما دیں اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے تقسیم مال غنیمت کا فیصلہ فرما یا دیا جب مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے رسول اس کا نائب ہے لہٰذا میں نے اب یہ تلوار تمہیں دینے کا فیصلہ کر لیا تمہارے ذمہ یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرتے ہوئے وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ۔ آپس میں حالات

کی اصلاح کرو اور آپس میں تنازعات کو صلح جوئی سجدہ کر لیا کرو اور انتشار سے بچو اور اتفاق کی وجہ سے ضعف و بزدلی اور تفریق سے بچو تمہارے اندر قوت پیدا ہو جائے گی اور دشمن کے دلوں میں تمہارا رعب جم جائے گا جیسے آگے ارشاد ہے "ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ریحکم "اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔ یہ قاعدہ کلیہ کا بیان ہے کہ جہاد اور مال غنیمت ہو یا زندگی کے دوسرے امور و معاملات تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ ہر قدم پر اجتماعی اور انفرادی طور پر اطاعت الٰہی اور رسول کو اپنا شعار بنالو۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیۃ مبارکہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ۚ

لغۃ القرآن: [اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ] [الْمُؤْمِنُوْنَ : ایمان لانے والے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ ہیں جو کہ] [اِذَا : جب کبھی بھی] [ذُكِرَ : ذکر کیا جاتا ہے] [اللّٰهُ : اللہ کا] [وَجِلَتْ : تو کانپ اٹھتے ہیں] [قُلُوْبُهُمْ : ان کے دل] [وَاِذَا : اور جب کبھی] [تُلِيَتْ : پڑھ کر سنائی جاتی ہیں] [عَلَيْهِمْ : ان کو] [اٰيٰتُهٗ : اس کی آیات] [زَادَتْهُمْ : تو وہ زیادہ کرتی ہیں ان کو] [اِيْمَانًا : بلحاظ ایمان کے] [وَّعَلٰي : اور پر] [رَبِّهِمْ : اپنے رب] [يَتَوَكَّلُوْنَ : وہ توکل کرتے ہیں]

ترجمہ: ایمان والے (تو) صرف وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل (اس کی عظمت و جلال کے تصور سے) خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (کلام محبوب کی لذت انگیز اور حلاوت آفریں باتیں) ان کے ایمان میں زیادتی کر دیتی ہیں اور وہ (ہر حال میں) اپنے رب پر توکل (قائم) رکھتے ہیں (اور کسی غیر کی طرف نہیں تکتے)

تشریح:

جب مومنین کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے تو اس کی مخالفت کا تصور کر کے ان کے دل لرز اٹھتے ہیں اور وہ حکم الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور قرآن کی آیات سن کر ان کا دل نور ایمان سے بھر جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔ یعنی اس کا حکم پورا کرتے ہیں خواہ اس کی کوئی بھی قیمت چکانا پڑے۔

قرآن کریم کا دلوں پر اثر انداز ہونا

اس آیت میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف خدا سے بھر جاتے ہیں اور اللہ کا سب سے بڑا ذکر قرآن کریم ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں (حجر: 9)۔ اور بلاشبہ قرآن اہل ایمان پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے سن کر ان کے دل نرم پڑ جاتے اور آنکھیں بہہ پڑتی ہیں اور اسی وجہ سے اس جگہ آگے یہ فرمایا گیا: وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا الخ۔ اور اہل ایمان کی اسی صفت کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا:

وَاِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَى الرَّسُوۡلِ تَرٰۤى اَعۡيُنَهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَـقِّ‌ۚ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ۔ "اور جب وہ اس قرآن کو سنتے ہیں جو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارا گیا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسو بہنے لگتی ہیں، کیونکہ انھوں نے حق کو پہچان لیا، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، تو ہمیں گواہوں کے ساتھ شامل فرمالے۔" (مائدہ: 83)

اور ایک مقام پر قرآن مجید کی اسی تاثیر کا ذکر یوں کیا گیا:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ‌ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ۔ "اللہ نے سب سے خوبصورت کلام اتارا ہے یعنی وہ کتاب جس کی آیات باہم ملتی جلتی اور بار بار پڑھی جاتی ہیں اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے

ڈرتے ہیں پھر ان کی چمڑیاں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے نرم پڑ جاتے ہیں۔ " (زمر : 23) (تفسیر برہان القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والوں کے تین اوصاف بیان فرمائے ہیں۔

کامل ایمان والوں کے تین اوصاف

اس آیت میں اپنے ایمان میں سچے اور کامل لوگوں کا پہلا وصف یہ بیان ہوا کہ جب اللہ عَزَّوَجَلَّ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا خوف دو طرح کا ہوتا ہے

(1) عذاب کے خوف سے گناہوں کو ترک کر دینا۔ (2) اللہ عَزَّوَجَلَّ کے جلال، اس کی عظمت اور اس کی بے نیازی سے ڈرنا۔ پہلی قسم کا خوف عام مسلمانوں میں سے پرہیزگاروں کو ہوتا ہے اور دوسری قسم کا خوف انبیاء و مُرسَلین، اولیائے کاملین اور مُقَرَّب فرشتوں کو ہوتا ہے اور جس کا اللہ تعالیٰ سے جتنا زیادہ قرب ہوتا ہے اسے اتنا ہی زیادہ خوف ہوتا ہے۔

جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "میں تم سب سے زیادہ اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی معرفت رکھنے والا ہوں۔

خوفِ خدا سے متعلق آثار

حضرت حسن (رح) فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے ایک مرتبہ درخت پر پرندے کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اے پرندے! تیرے لیے کتنی بھلائی ہے کہ تو پھل کھاتا اور درخت پر بیٹھتا ہے کاش! میں بھی ایک پھل ہوتا جسے پرندے کھا لیتے۔

حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ (رض) فرماتے ہیں "میں نے حضرت عمر بن خطاب (رض) کو دیکھا کہ آپ نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر فرمایا: کاش! میں ایک تنکا ہوتا۔ کاش! میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ کاش! میں پیدا نہ ہوا ہوتا۔ کاش! میں بھولا بسرا ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:
جس مومن بندے کی آنکھ سے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے خوف سے آنسو نکلے، خواہ وہ مچھر کے سر جتنا ہو، پھر وہ آنسو رخسار کے سامنے کے حصے کو مس کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے۔

دوسرا وصف یہ بیان ہوا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی آیات سن کر ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ایمان میں زیادتی سے ایمان کی مقدار میں زیادتی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ایمان کی کیفیت میں زیادتی ہے۔

تیسرا وصف یہ بیان ہوا کہ وہ اپنے رب عَزَّوَجَلَّ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے تمام کام اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سپرد کر دیتے ہیں، اس کے علاوہ کسی سے امید رکھتے ہیں اور نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔

توکل کا حقیقی معنی اور توکل کی فضیلت

امام فخر الدین رازی (رح) فرماتے ہیں "توکل کا یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنی کوششوں کو مُہمَل چھوڑ دے جیسا کہ بعض جاہل کہتے ہیں بلکہ توکل یہ ہے کہ انسان ظاہری اسباب کو اختیار کرے لیکن دل سے ان اسباب پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت، اس کی تائید اور اس کی حمایت پر بھروسہ کرے۔ (6) اس کی تائید اس حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے چنانچہ حضرت انس (رض) فرماتے ہیں "ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں اپنے اونٹ کو باندھ کر توکل کروں یا اسے کھلا چھوڑ کر توکل کروں؟ ارشاد فرمایا "تم اسے باندھو پھر توکل کرو۔

اور توکل کی فضیلت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب جنت میں جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو منتر جنتر نہیں کرتے، فال کے لیے چڑیاں نہیں اڑاتے اور اپنے رب عَزَّوَجَلَّ پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(تفسیر صراط الجنان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " وہی لوگ مومن کامل ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل خوفزدہ ہو جائیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے رہیں "

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو بشرطیکہ تم کامل مومن ہو۔ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ کمال ایمان کمال طاعت مستلزم ہے اور کمال ایمان اس وقت حاصل ہوگا جب اللہ کے ذکر سے مسلمان کا دل خوف زدہ ہو اور اللہ کی آیات سن کر اس کا ایمان قوی ہو اور وہ صرف اپنے رب پر توکل کرے، نماز قائم کرے اور صدقہ و خیرات ادا کرے، سو ایسے لوگوں کا ہی ایمان کامل ہے اور وہ برحق مومن ہیں۔

وجل کا معنی

اس آیت میں فرمایا ہے " وجلت قلوبہم " علامہ راغب اصفہانی وجل کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وجل کا معنی ہے خوف محسوس کرنا، قرآن مجید میں ہے: انا منکم وجلون۔ قالوا لا توجل: (ابراہیم نے کہا) ہم تم سے ڈر محسوس کر رہے ہیں (فرشتوں نے) کہا آپ مت ڈریے۔ (المفردات، ج 2، ص 655، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کے متعلق قرآن مجید کی آیات

قرآن مجید کی اور آیتوں میں بھی یہ فرمایا کہ مسلمان اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔

اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم وقلوبھم الی ذکر اللہ:

اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا، ایسی کتاب جس کی تمام باتیں ایک جیسی ہیں، بار بار دہرائی ہوئی، جو مسلمان اپنے رب سے ڈرتے ہیں اس سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں (الزمر : 23)

قد افلح المومنون۔ الذین ھم فی صلاتھم خاشعون : بیشک ایمان والے کامیاب ہو گئے، وہ جو اپنی نماز میں اللہ سے ڈرتے ہیں۔ (المومنون : 1۔2)

ان الذین ھم من خشیۃ ربھم مشفقون : بیشک جو لوگ اللہ کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں (المومنون : 57)

انما ذالکم الشیطن یخوف اولیاءہ فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین : یہ محض شیطان ہے جو (تمہیں) اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، سو تم ان سے نہ ڈرو اور (صرف) مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو (آل عمران : 175)

فلا تخشوا الناس واخشون : سو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو (المائدہ : 44)

ان لاذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ واجر کبیر : بیشک جو لوگ بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے اور بہت بڑا اجر ہے (الملک : 12)

واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھوی۔ فان الجنۃ ھی الماوی : اور رہا وہ شخص جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس (امارہ) کو اس کی خواہش سے روکا تو بیشک اس کا ٹھکانا جنت ہے (النازعات : 40۔41)

ولمن خاف مقام ربہ جنتان : اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اس کے لیے دو جنتیں ہیں (الرحمٰن : 46)

اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کے متعلق احادیث اور آثار

اللہ تعالیٰ کے خوف کی دو قسمیں ہیں ایک ہے عذاب کے خوف سے گناہوں کو ترک کرنا، یہ خوف عام مسلمانوں کو ہوتا ہے بلکہ عام مسلمانوں میں سے بھی پرہیزگاروں کو ہوتا ہے، اور دوسری قسم ہے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت سے اور اس کی بے نیازی سے ڈرنا، یہ خوف انبیاء اور مرسلین، اولیاء کاملین اور ملائکہ مقربین کو ہوتا ہے اور جس کا اللہ تعالیٰ سے جتنا زیادہ قرب ہوتا ہے اس کو اتنا زیادہ خوف ہوتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 20)

حضرت ام سلمہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی قسم مجھے امید ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ تقویٰ کو جاننے والا ہوں۔ (صحیح مسلم صوم : 79، (110) 2552۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 2389۔ سنن کبری للنسائی، ج 5، رقم الحدیث : 3025)

حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے عرض کیا : یارسول اللہ ! آپ بوڑھے ہوگئے ! (یا آپ کے بال سفید ہوگئے) آپ نے فرمایا مجھے سورۃ ھود، سورۃ الواقعہ اور سورۃ المرسلات نے بوڑھا کردیا۔ (ان سورتوں میں قیامت کا ذکر ہے، یعنی قیامت کی ہولناکیوں کے خوف سے آپ کے بال سفید ہوگئے۔) (شمائل ترمذی رقم الحدیث 41۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 3297۔ حلیۃ الاولیاء ج 4، ص 35۔ المستدرک ج 2، ص 343۔ المعجم الکبیر ج 17، ص 286، رقم الحدیث : 790۔ کامل ابن عدی ج 2، ص 664)

حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جس کو تم نہیں دیکھتے، اور میں وہ آوازیں سنتا ہوں جن کو تم نہیں سنتے، بیشک آسمان چرچرا رہا ہے (خوف خدا سے ڈری ہوئی آوازیں نکال رہا ہے) اور اس پر حق ہے کہ وہ چرچرائے، اور اللہ کی قسم اگر تم ان چیزوں کو جان لو جن کو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ، اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دو اور تم گھر سے باہر صحن میں نکل جاؤ اور بہ آواز بلند اللہ سے فریاد کرو۔ حضرت ابوذر نے کہا اللہ کی قسم ! میری خواہش ہے کہ میں

ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا۔ (سنن اتلرمذی رقم الحدیث: 2318۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4190)

حضرت عبداللہ ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے قرآن سناؤ۔ تو میں نے سورۃ النساء پڑھی۔ حتی کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: **فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید و جئنا بك علی ھؤلاء شھیدا**: اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ہم آپ کو ان پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ (النساء: 41)۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے حضور کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 4582۔ صحیح مسلم رقم الحدیث: 800۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 3268۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 3036۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4194۔ مسند احمد ج 1، رقم الحدیث: 3550، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 7065۔ المعجم الکبیر ج 8، رقم الحدیث: 8460۔ مسند اوب یعلی رقم الحدیث: 5228۔ سنن کبری للبیہقی ج 10 ص 231)

حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک جنازہ میں تھے، آپ ایک قبر کے کنارے بیٹھ گئے اور آپ رونے لگے حتی کہ قبر کی مٹی بھگی گئی۔ پھر آپ نے فرمایا میرے بھائیو! اس کی مثل کے لیے تیاری کرو۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4195)

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا روؤ، اگر تم رو نہ سکو تو رونے جیسی شکل بنالو۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4196)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، جس بندہ مومن کی آنکھ سے اللہ کے خوف سے آنسو نکلے خواہ وہ مچھر کے سر جتنا ہو، پھر وہ آنسو رخسار کے سامنے کے حصہ کو مس کرے اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو حرام کر دیتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4197)

حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے درخت پر ایک پرندے کو بیٹھا دیکھ کر کہا تیرے لیے کتنی خیر ہے اے پرندے تو پھل کھاتا اور درخت پر بیٹھتا ہے، کاش میں ایک پھل ہوتا جس کو پرندے کھا لیتے!

(کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: 240، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

عبداللہ بن عامر بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا حضرت عمر بن خطاب نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا کاش میں ایک تنکا ہوتا ! کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا ! کاش میں پیدا نہ ہوتا، کاش میں بھولا بسرا ہوتا۔
(کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث : 234)

حمید بن ہلال بیان کرتے ہیں کہ حرم بن حیان اور عبداللہ بن عامر اپنی سواریوں پر جارہے تھے، راستہ میں خشک گھاس ملی تو ان کی اونٹنیاں اس گھاس کی طرف دوڑیں اور ان میں سے ایک نے وہ گھاس کھالی۔ حرم نے عبداللہ سے کہا کیا تم یہ پسند کروگے کہ تم یہ گھاس ہوتے اور تم کو یہ اونٹنی کھا کر چلی جاتی، عبداللہ نے کہا اللہ کی قسم میں اس کو پسند نہیں کروں گا، بیشک میں یہ امید رکھتا ہوں کہ اللہ مجھے جنت میں داخل کردے گا، بیشک میں یہ امید رکھتا ہوں، بیشک میں یہ امید رکھتا ہوں۔ حرم نے کہا اللہ کی قسم اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے دل کی بات مانی جائے گی تو میں یہ پسند کرتا کہ میں خشک گھاس ہوتا اور مجھے یہ اونٹنی کھا کر چلی جاتی۔
(کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث : 237)

زیاد بن محراق بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء (رض) نے کہا میری خواہش ہے کہ میں اپنے گھر کا ایک مینڈھا ہوتا، گھر میں کوئی مہمان آتا اور مجھے ذبح کردیا جاتا اور گھر والے مجھے کھالیتے۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث : 238)

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح (رض) نے کہا کاش میں ایک مینڈھا ہوتا، مجھے گھر والے ذبح کردیتے اور میرا گوشت کھالیتے۔ حضرت عمران بن حصین (رض) نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں گھاس ہوتا اور مجھے تیز ہوا کے دن آندھی اڑا کرلے جاتی۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث : 241)

اسحاق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کاش میں ایک درخت ہوتی جس کو کاٹ دیا جاتا ! کاش میں پیدا نہ کی جاتی۔ (کتاب الزہد للوکیع رقم الحدیث : 161۔ الطبقات الکبری، ج 7، ص 75، مصنف ابن ابی شیبہ، ج 2، ص 251۔252)

ضحاک بن مزاحم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ نے کہا کاش میں پرندہ ہوتا۔ (کتاب الزہد للوکیع رقم الحدیث : 162)

قاسم بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ کے پاس ایک شخص نے کہا کاش میں اصحاب الیمین سے ہوتا، حضرت عبداللہ نے کہا کاش مجھے مرنے کے بعد اٹھایا نہ جاتا۔ (کتاب الزہد للوکیع، رقم الحدیث : 163)

یعقوب بن زید بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے درخت پر ایک پرندے کو دیکھ کر کہا کاش میں اس پرندہ کی جگہ ہوتا۔ (کتاب الزہد للوکیع، رقم الحدیث: 165)

حضرت عمرو بن میمون الاودی (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) کی زندگی کے آخری ایام میں ایک انصاری نوجوان ان کی خدمت میں آئے اور کہا اے امیر المومنین! آپ اللہ کی بشارتوں سے خوش ہو جائیں، آپ قدیم الاسلام صحابی ہیں جس کا آپ کو علم ہے، اور پھر آپ خلیفہ بنے تو آپ نے عدل کیا، پھر ان تمام فضائل کے بعد آپ کو شہادت نصیب ہوئی، حضرت عمر نے کہا اے میرے بھتیجے! کاش یہ سب برابر سرابر ہو جائے، مجھ کو عذاب ہو نہ ثواب ملے۔ (الحدیث) (صحیح البخاری رقم الحدیث: 1392)

حضرت عثمان (رض) کے آزاد کردہ غلام ھانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان (رض) جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ جاتی، ان سے پوچھا گیا کہ آپ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں توے اور قبر کو دیکھ کر رونے لگتے ہیں! حضرت عثمان (رض) نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے، اگر انسان کو اس سے نجات مل جائے تو بعد کی منزلیں زیادہ آسان ہوتی ہیں اور اگر اس سے نجات نہ ملے تو بعد کی منزلیں اور مشکل ہوں گی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے جو بھی ہول ناک منظر دیکھا قبر کا منظر اس سے زیادہ ہول ناک تھا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2315۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1823۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4258۔ حلیۃ الاولیاء ج 9 ص 252، صحیح ابن حبان ج 9، رقم الحدیث: 292۔ مسند احمد ج 9، رقم الحدیث: 7930)

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان (رض) ان صحابہ میں سے ہیں جن کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زندگی میں جنگ کی بشارت دے دی تھی، اس کے باوجود یہ صحابہ اللہ کی بے نیازی اور جلال ذات سے اس قدر خوف زدہ رہتے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے کہا کاش میں ایک پھل ہوتا جس کو پرندے کھالیتے یا میں ایک پرندہ ہوتا۔ حضرت عمر (رض) نے کہا کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا اور حضرت عثمان (رض) قبر کو دیکھ کر بے اختیار روتے تھے اور دیگر کبار صحابہ بھی اللہ تعالیٰ کے جلال ذات اور حساب و کتاب کی شدت سے گھبرا کر اور خوف کی زیادتی سے یہ کہتے تھے کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا، یا میں خشک گھاس ہوتا جس کو جانور کھالیتے، یا کوئی حلال جانور ہوتا جس کو مسلمان ذبح کر کے کھالیتے اور مجھے حساب و کتاب کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے بچ جاتا۔

ایمان میں کمی اور زیادتی کی تحقیق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں۔ اس آیت سے ائمہ ثلاثہ اور محدثین یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایمان میں کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے۔ محققین اور امام ابو حنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ ایمان بسیط ہے اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوتی، اس کی تحقیق یہ ہے کہ امام اعظم اور محققین کے نزدیک نفس ایمان میں اعمال داخل نہیں ہیں، اس لیے اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی اور نفس ایمان میں اعمال کے داخل ہونے کے ائمہ ثلاثہ اور محدثین بھی قائل نہیں ہیں اور ائمہ ثلاثہ اور محدثین ایمان کامل میں اعمال کے داخل ہونے کے قائل ہیں، اور ایمان کامل میں اعمال کے دخول کے امام اعظم اور محققین بھی قائل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفس ایمان میں ان سب کے نزدیک اعمال داخل نہیں ہیں اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوتی اور ایمان کامل میں ان سب کے نزدیک اعمال داخل ہیں اور اس میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے، اور اس آیت میں جو فرمایا ہے اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں۔ اس سے ایمان کامل ہی مراد ہے۔

اصل میں یہ اختلاف ایک اور اختلاف پر مبنی ہے، امام شافعی وغیرہ کے نزدیک جب ایمان کا لفظ مطلّقاً بولا جائے تو اس سے ایمان کامل مراد ہوتا ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں اور ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔ اور امام اعظم کے نزدیک جب ایمان کا لفظ مطلّقاً بولا جائے تو اس سے نفس ایمان مراد ہوتا ہے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں اور اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی، اور دونوں جانب دلائل ہیں۔

اس کی پوری تفصیل اور تحقیق ہم نے البقرہ : 3 میں کر دی ہے، اس لیے جو قائین، ایمان کے تمام مذاہب، دلائل اور ان میں محاکمہ جاننا چاہیں وہ اس کا مطالعہ کر لیں۔

اس کے بعد فرمایا ہے : اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں، توکل کی تفصیل اور تحقیق ہم نے آل عمران : 159 میں بیان کر دی ہے، اس کے لیے تبیان القرآن، ج 2، ص 139 کا مطالعہ فرمائیں، اس آیت میں حصر فرمایا ہے یعنی یہ صرف اللہ سے ڈرنے والوں کی صفت ہے کہ وہ صرف اللہ کے فضل اور اس کی نصرت اور اعانت پر اعتماد کرتے ہیں اور اللہ کے ماسوا سے بالکلیہ مستغنی رہتے ہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

ربط آیات

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے جماعتی نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لیے باہمی اختلافات ختم کر کے آپس میں صلح جوئی کی پالیسی اختیار کرنے کی تلقین کی تھی، اللہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مال غنیمت پر کسی مجاہد یا غازی کا براہ راست کوئی حق نہیں۔ یہ اللہ کی ملکیت ہے جس اس کا رسول ہدایت الٰہی کے مطابق تصرف میں لاتا ہے اور اس کو تقسیم کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے مرکزی بات یہ فرمائی کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ فرمایا، اگر ان میں سے کسی معاملہ میں بھی مسلمانوں کی طرف سے کمزوری واقع ہو گی تو دشمن راہ پا کر غلبہ حاصل کر لے گا، لہٰذا مذکورہ ہدایات پر سختی سے کاربند ہو جاؤ۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں جن کی وجہ سے انھیں دینا اور آخرت میں فلاح نصیب ہو گی۔

مومنین کی صفات

ا۔ خوف خدا

ارشاد ہوتا ہے (آیت) "انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم " بیشک ایمان والے حقیقت میں وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔ اہل ایمان کی یہ پہلی صفت ہے کہ خدا کے ذکر سے ان کے دلوں میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ومالک ہے، وہ بڑی عظمت اور بزرگی والا ہے۔ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو وہ پکڑ لے گا یہی ایمان کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے متعلق بھی فرمایا ہے (آیت) "یدعوننا رغبا ورھبا وکانوا لنا خشعین "(الانبیاً) وہ ہمیں پکارتے ہیں اس رغبت اور امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انعام واکرام حاصل ہو۔ اور ہم سے ڈرتے بھی ہیں کہ کہیں گرفت نہ ہو جائے۔ دراصل ایمان خوف اور امید کے درمیان ہی ہے۔ اگر کسی آدمی پر اس قدر خوف طاری ہو جائے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہی ہو جائے تو یہ کفر کی نشانی ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اتنا پر امید ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کا خوف ہی دل سے جاتا رہے یہ بھی نافرمانی اور کفر کی علامت ہے۔ لہٰذا انسان کے دل

میں اس کی رحمت امید اور اس کے عذاب کا خوف دونوں چیزیں موجود ہونی چاہیں۔ بہر حال مومنوں کی پہلی صفت یہ فرمائی کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری کسی کوتاہی سے ناراض نہ ہو جائے۔ اہل ایمان کو یہ فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔

ایمان میں اضافہ

فرمایا اہل ایمان کی دوسری صفت یہ ہے (آیت) "واذا تلیت علیھم ایتہ "جب ان پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (آیت) "زادتھم ایمانا "تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کے ایمان میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایمان میں زیادتی کے متعلق محدثین اور فقہائے کرام کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حالات کے مطابق ایمان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے مگر امام ابو حنیفہ اور بعض دوسرے فقہا و محدثین فرماتے ہیں کہ ایمان تو تصدیق قلبی کا نام ہے جو شخص پورے یقین کے ساتھ اللہ کی وحدانیت، اس کے انبیاء کی رسالت اور قیامت پر ایمان لاتا ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی، البتہ حالات کے لحاظ سے ایمان کی کیفیت میں فرق ہو سکتا ہے بعض آدمیوں کا ایمان قوی ہوتا ہے اور بعض کا ضعیف ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص تصدیق قلبی کے بعد پورے طریقے سے خدا تعالیٰ کی اطاعت بھی کرتا ہے تو اس کے ایمان کی کیفیت انبیاء کے ایمان کی سی اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ برخلاف اس کے جو شخص تصدیق تو کرتا ہے مگر معاصی میں بھی آلودہ ہوتا ہے، اس کے ایمان کی حالت کامل الایمان لوگوں جیسی تو نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ کہ ایمان میں تصدیق کے اعتبار سے تو کمی بیشی نہیں ہوتی کیونکہ نبی اور کامل الایمان آدمی بھی انہی چیزوں کی تصدیق کرتا ہے جن کی تصدیق ایک عام آدمی کرتا ہے۔ البتہ کیفیت کے اعتبار سے ایک نبی کا ایمان ایک عام امتی کے ایمان سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے بلکہ ان میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ انبیاء اور عام آدمیوں کا ایمان برابر ہوتا ہے بہر حال یہ مومنین کی دوسری صفت بیان فرمائی گئی ہے کہ جب وہ آیات الٰہی سنتے ہیں تو ان کے ایمان میں تازگی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے جسے ایمان میں زیادتی پر محمول کیا گیا ہے۔

توکل علی اللہ

فرمایا اہل ایمان کی تیسری صفت یہ ہے (آیت) "وعلی ربھم یتوکلون" وہ اپنے رب پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان کا اعتماد اسباب کی بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ آیت "لا الہ الا ھو فاتخذہ وکیلا (المزمل) اس کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا کارساز بھی اسی کو پکڑو کہ اس کے سوا کارساز بھی کوئی نہیں۔ ایمان والے یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی سبب موثر بالذات نہیں ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہو۔ اللہ چاہے تو کوئی کام بنادے اور چاہے تو کوئی کام بگاڑ دے۔ اسی لیے اہل ایمان صرف خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ سرمایہ دار کو اپنے سرمایہ پر بھروسہ ہوتا ہے، ایک تنومند شخص کو قوت بازو پر بھروسہ ہوتا ہے ہر مادہ پرست اپنے مادہ پر توکل کرتا ہے مگر ایمان والے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ قرآن پاک میں انبیاء کا یہ بیان موجود ہے (آیت) "ومالنا الا نتوکل علی اللہ وقد ھدنا سبلنا" (ابراہیم) ہم خدا تعالیٰ کی ذات پر کیوں نہ بھروسہ کریں حالانکہ اسی نے ہمیں سیدھا راستہ بھی دکھایا ہے۔ اور اس پر چلنے کی توفیق بھی وہی دیتا ہے۔ تمام اسباب کا مہیا کرنے والا اور تمام چیزوں پر کنٹرول کرنے والا وہی ہے، لہٰذا بھروسہ بھی اسی کی ذات پر ہونا چاہیے نہ کہ ان عارضی اور فانی اسباب پر کامل الایمان لوگوں کی یہ تیسری صفت ہوگئی۔

آیۃ مبارکہ:

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

لغۃ القرآن: [اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يُقِيْمُوْنَ : قائم رکھتے ہیں] [اَلصَّلٰوةَ : نماز کو] [وَمِمَّا : اور اس میں سے جو] [رَزَقْنٰهُمْ : ان کو رزق دیا ہم نے] [يُنْفِقُوْنَ : وہ خرچ کرتے ہیں]

ترجمہ: (یہ) وہ لوگ ہیں جو نماز قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں عطا کیا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والوں کے جو تین اوصاف بیان کئے یعنی اللہ عَزَّوَجَلَّ کے ذکر کے وقت ڈر جانا، تلاوت قرآن کے وقت ایمان زیادہ ہونا اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا، ان تینوں کا تعلق قلبی اعمال سے تھا جبکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دو اوصاف ایسے بیان فرمائے ہیں کہ جن کا تعلق ظاہری اعضاء کے اعمال سے ہے، پہلا وصف یہ ارشاد فرمایا کہ "وہ جو نماز قائم رکھتے ہیں "نماز قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ فرض نمازوں کو ان کی تمام شرائط و ارکان کے ساتھ ان کے اوقات میں ادا کرنا۔ دوسرا وصف یہ ارشاد فرمایا کہ "اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال اس جگہ خرچ کرتے ہیں جہاں خرچ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا، اس میں زکوۃ، حج، جہاد میں خرچ کرنا اور نیک کاموں میں خرچ کرنا سب داخل ہے۔ (صراط الجنان)
بدنی عبادات میں سب سے افضل نماز ہے، اس لیے اس کا ذکر فرمایا، اور اللہ کے دیے ہوئے میں سے خرچ کرنا مالی عبادت ہے اس میں زکوۃ، صدقات، نماز، اور جہاد کے لیے خرچ کرنا، مساجد پر خرچ کرنا، کنویں کھدوانا، لائبریریاں قائم کرنا، دینی مدارس کی امداد کرنا اور سماجی اور رفاہی امور پر خرچ کرنا داخل ہے۔ اور ان تمام نیک کاموں میں حلال مال سے خرچ کرنا چاہیے حرام مال سے نیک کام کرنا اور سماجی اور رفاہی امور پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ جس مال حرام کی حرمت قطعی ہو، اس کو صدقہ کرنا کفر ہے اور اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال حرام ہے اور پھر بھی وہ دینے والے کو دعا دے تو وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ حرام مال سے چھٹکارے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مال جس کا ہے اس کو واپس کر دے۔ اگر وہ شخص مر چکا ہو تو اس کے ورثاء کو واپس کر دے۔ اور اگر ان کا پتا نہ چل سکے تو اس مال کے مالک کی طرف سے اس کو صدقہ کر کے اس کا ثواب اس کو پہنچا دے اور اگر اس نے حرام ذرائع سے روپیہ کمایا ہو تو اس مال کو اپنے پاس نہ رکھے اور اپنے ذمہ سے بری ہونے کی نیت سے کسی فقیر یا حاجت مند کو دے دے۔ (تبیان القرآن)

اقامت صلوٰۃ

فرمایا چوتھی صفت یہ ہے (آیت) "الذین یقیمون الصلوۃ "کہ وہ لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں، یہ بھی ایک اہم ترین کام ہے۔ موطا امام مالک (رح) (ا۔ موطا امام مالک ص ۵ (فیاض) میں حضرت عمر (رض) کا وہ سر کلر موجود ہے جو آپ نے تمام صوبوں کے حکام کو بھیجا تھا اور جس میں لکھا تھا ان من اھم امورکم عندی الصلوۃ یعنی میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے اہم کام نماز ہے۔ اس پر خود بھی کاربند رہو اور دوسروں سے بھی پابندی کراؤ۔ مطلب یہ کہ نماز کوئی پرائیوٹ چیز نہیں ہے کہ جس نے چاہا اس کو ادا کر لیا اور جس نے چاہا چھوڑ دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جس نے نماز کی حفاظت کی وہ دین کی باقی باتوں کا بھی محافظ ہو گا اور جس نے نماز کو ضائع کر دیا وہ باقی امور کو بہت زیادہ ضائع کرنے والا ثابت ہو گا۔
دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق درست رکھنے کے لیے نماز بہترین ذریعہ ہے جب کسی شخص کا تعلق باللہ درست ہو گا تو وہ مخلوق کے ساتھ تعلق کو بھی درست کرے گا اور وہ حقوق العباد کا بھی پابند ہو گا۔ برخلاف اس کے جس کا تعلق باللہ ٹھیک نہیں ہے اس کا معاملہ مخلوق کے ساتھ بھی درست نہیں ہو گا، لہٰذا اہل ایمان کے لیے نماز کی پابندی بڑی ضروری ہے۔ یہ ان کی چوتھی صفت ہے کہ وہ نماز کو ضائع نہیں کرتے۔

نماز باجماعت کے متعلق امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں

کہ جنگ میں اگر تین آدمی بھی موجود ہو تو وہ نماز باجماعت ادا کریں ورنہ ان پر شیطان چھا جائے گا۔البتہ امام شافعی (رح) فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے چالیس آدمیوں کا اکٹھا ہونا ضروری ہے، لیکن امام ابو حنیفہ (رح) فرماتے ہیں کہ تین آدمی بھی کافی ہیں نماز اجتماعیت کا ذریعہ ہے۔اس میں وقت کی پابندی، طہارت، مساوات اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کا درس ملتاہے اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق استوار ہوتا ہے۔نماز میں خدا تعالیٰ کے حضور مناجات ہوتی ہے۔اس میں تلاوت قرآن بھی ضروری ہے جس کے ذریعے فلاں کا پروگرام میسر آتا ہے۔لہٰذا کامل الایمان لوگوں کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ نماز کو قائم کرتے ہیں اور اسے ضائع نہیں ہونے دیتے۔

انفاق فی سبیل اللہ

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی ہے (آیت) "وممارزقنھم ینفقون" جو روزی ہم نے انھیں دی ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں اگر صاحب نصاب ہیں تو سب سے پہلے زکوۃ ادا کرتے ہیں جو کہ فرض ہے۔البتہ زکوۃ کے علاوہ بھی مال کے حقوق ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے ان فی المال حقا سوی الزکوۃ یعنی زکوۃ کے علاوہ مالی عبادات میں حج اور عمرہ بھی ہے اس کے علاوہ قربانی اور صدقہ فطر واجبات میں سے ہیں۔اگر کسی صاحب مال آدمی کا کوئی عزیز رشتہ دار نادار ہو تو اس کی اعانت بھی واجب ہو جاتی ہے امام خصاف نے کتاب النفقات میں لکھا ہے کہ حنفی قانون کے مطابق صاحب ثروت کے لیے اپنے نادار رشتہ دار کا خرچہ واجب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بعض کو بعض پر مالی لحاظ سے فضیلت عطا کرتا ہے تو یہ مال ان کے لیے آزمائش ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے عطا کردہ مال میں سے غرباء مساکین اور دیگر مستحقین کا حق ادا کیا گیا ہے یا نہیں اللہ نے فرمایا (آیت) "وات ذاالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل" اگر اللہ نے مال دیا ہے تو قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو (آیت) "ولا تبذر تبذیرا" (بنی اسرائیل) اور فضول خرچی نہ کرو۔اس کو کھیل تماشے میں صرف نہ کرو۔رسوماتِ باطلہ اور حرام کاموں میں دولت خرچ کرنے کا حکم نہیں ہے نھی عن اضاعۃ المال حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مال کے ضیاع سے منع فرمایا ہے سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں یہی قباحت ہے۔کہ مال کمانے والا سمجھتا ہے کہ خرچ کرنا بھی بلاشرکت غیر اسی کا حق ہے لہٰذا وہ جس طرح خرچ کرے حالانکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کمائی کے لیے حلال ذرائع کی شرط عائد کی ہے اسی طرح خرچ کرنے کے لیے بھی جائز امور کا حکم دیا ہے حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قوم نے آپ کو یہی کہا تھا (آیت) "اصلوتک تامرک ان نترک مایعبد اباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشؤا" (ہود) کیا تمہاری نماز تمہیں یہی حکم دیتی ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤاجداد کرتے آئے ہیں یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی سے تصرف نہ کریں مگر اللہ نے فرمایا کہ کامل الایمان وہ لوگ ہیں جو ہمارے عطا کردہ مالوں میں سے ہماری مرضی کے مطابق خرچ کرتے ہیں ان اخراجات کی مدات عرض کر دی گئی ہیں یہ پانچویں صفت ہو گئی۔(تفسیر منازل العرفان)

آیۃ مبارکہ:

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

لغۃ القرآن: [أُولٰئِكَ : وہ لوگ] [هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ : ہی ایمان لانے والے ہیں] [حَقًّا: حقیقتا] [لَهُمْ : ان کے لیے ہی] [دَرَجٰتٌ: درجے ہیں] [عِنْدَ رَبِّهِمْ : ان کے رب کے پاس] [وَمَغْفِرَةٌ: اور مغفرت ہے] [وَّرِزْقٌ: اور رزق ہے] [كَرِيْمٌ: بہترین]

ترجمہ: (حقیقت میں) یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے رب کی بارگاہ میں (بڑے) درجات ہیں اور مغفرت اور بلند درجہ رزق ہے

تشریح:

حقیقی مومن

فرمایا جن لوگوں میں یہ پانچ صفات پائی جائیں گی (آیت) "**اولئك هم المومنون حقا** "یہ سچے مومن ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں کہ اور جب آیات الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان تازہ ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر توکل رکھتے ہیں معاملہ تجارت ہو یا زراعت صلح ہو یا جنگ معیشت ہو یا معاشرت، وہ لوگ کام انجام دے کر نتیجہ ہمشہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں وہ لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یہی کامل الایمان لوگ ہیں اور ان صفات کی حامل جماعت سے ہی اسلامی نظام قائم کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہی دنیا میں امن وامان قائم کرسکتے ہیں اور انھیں کی سرکردگی میں انصاف کا بول بالا ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (آیت) "انتم الاعلون ان کنتم مومنین " (آل عمران) اگر تم پکے سچے مومن ہو گے تو دنیا میں بالادستی تمہیں حاصل ہو گی اور جب تمہارے ایمان میں خرابی آجائے گی، تعلق باللہ خراب ہو جائے گا تو دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤ گے۔ عیش پرست اور آرام طلب ہو جاؤ گے یا حریص اور غلام بن جاؤ گے نیکی رخصت ہو جائے گی اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی تمہارے شامل حال ہو جائے گی۔

مومنوں کے لیے انعامات

ا

درجات

آخر میں اللہ تعالیٰ نے کامل الایمان لوگوں کے لیے انعامات کا ذکر فرمایا ہے (آیت) "لھم درجت عند ربھم "ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں درجات ہیں۔ سورۃ احقاف میں (آیت) "ولکل درجت مما عملوا "ہر آدمی کے لیے اس کے اعمال کے مطابق درجے ہوں گے درجات میں تفاوت اعمال کا نتیجہ ہوگا ایمان جنت کے دروازے کی چابی ہے ایمان ہوگا تو جنت کا دروازہ کھل جائے گا مگر وہاں پر درجات عمل کے اعتبار سے حاصل ہوں گے، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد مبارک ہے جنت کے سو درجے ہیں اور ہر درجہ ایک دوسرے سے اتنا بلند ہے جتنا آسمان زمین سے غرضیکہ اہل ایمان کے لیے اپنی اپنی حیثیت، خلوص اور کارگزاری کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات ہوں گے مغفرت:

فرمایا مومنین کے لیے دوسرا انعام ومغفرۃ اللہ تعالیٰ کی بخشش ہوگی دنیا میں جو کوتاہی، لغزش یا خطا ہوگئی تھی اس کی معافی مل جائے گی یہ بھی بہت بڑا انعام ہے، اسی لیے اللہ نے حضرت آدم اور حوا (علیہما السلام) کی زبان سے کہلوایا کہ مولا کریم ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا (آیت) "وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخسرین "(اعراف) اگر تو ہماری غلطیوں کو معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے دنیا میں انسانوں سے بہت سی کوتاہیاں سرزد ہوں گی۔ مگر کامل الایمان لوگوں کو معافی مل جائے گی۔

باعزت روزی

فرمایا تیسرا انعام یہ ہے (آیت) "ورزق کریم "اہل ایمان کو باعزت روزی نصیب ہوگی۔ رزق کریم آخرت میں تو یقیناً میسر ہوگا اور اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کتنا بڑا انعام ہوگا مگر اس دنیا میں بھی اطاعت کے ساتھ رزق حلال نصیب ہو جائے تو اس سے بلند کوئی روزی نہیں جو کچھ معصیت کے ساتھ ملتا ہے وہ باعزت رزق نہیں بلکہ ذلت کی روزی ہے ظاہر ہے کہ جو شخص ایمان کو اختیار کرے گا حلال ذرائع معاش اختیار کرے گا اسے حلال روزی نصیب ہوگی اور وہ صحیح معنوں میں اس کا حقدار ہوگا

یہاں پر عزت کا لفظ بتلا رہا ہے کہ گداگری چونکہ عزت کی روزی نہیں ہے لہٰذا یہ انسانیت کی تذلیل ہے الخبز بالکرامۃ یعنی عزت کی روزی ہر آدمی کو ملنی چاہیے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ بیشتر لوگ خود ذلیل روزی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ فلم انڈسٹری اور گانا بجانا وغیر عزت کی روزی نہیں بلکہ تعیش ہے عزت کی روزی وہ ہے جس میں انسان کے لیے تسکین اور بہتری ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اس دنیا میں حلال ذرائع سے روزی اختیار کرے تاکہ اسے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی رزق کریم میسر آسکے۔ لفظ کریم میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ وہ کونسا راستہ ہے جسے اختیار کر کے مسلمانوں کو باعزت روزی نصیب ہو سکتی ہے اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو سکتی ہے ہم تو انگریز، امریکہ روس اور دہریوں کے نظام معیشت پر چل رہے ہیں اللہ کا عطا کردہ وہ پروگرام ہماری سمجھ میں نہیں آتا جو رزق کریم کا ذریعہ بن سکے اس ایک لفظ سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ

اسلامی نظام معیشت کے علاوہ تمام نظام باطل ہیں، کسی میں حلال روزی نہیں ہے ہر صاحب ایمان اپنے ایمان کی وجہ سے صاحب عزت ہے مال و دولت عزت نہیں بلکہ نفاق ہے لوگ برے آدمی کے شر سے بچنے کے لیے اسے سلال کرتے ہیں، حالانکہ حقیقی عزت کے قابل وہ شخص ہے جسے ایمان کی دولت حاصل ہے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ اس کے کامل الایمان بندوں کا تیسرا انعام یہ ہے کہ انھیں باعزت روزی نصیب ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں بھی رزق حلال سے مستفید ہوتے ہیں اور آخرت میں تو بہت بڑے انعامات کے حقدار ہوں گے

گداگری حرام ہے

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (رح) فرماتے ہیں (۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۴۲۔ ج ۱ (فیاض) کہ گداگری چونکہ عزت کی روزی نہیں ہے، اس لیے ہمارے دین میں یہ حرام ہے۔ یہ بھی چوری اور ڈاکے کی طرح مضر پیشہ ہے مگر ہماری حکومت اس پر قابو پانے سے قاصر ہے انسداد گداگری کے آرڈیننس تجویز ہوتے ہیں مگر نافذ العمل نہیں ہو پاتے نظام زکوۃ کے نفاذ سے گداگری کے انسداد کی امید پیدا ہوئی تھی مگر اس مذموم پیشے پر قابو نہیں پایا جاسکا یورپ کے اکثر ممالک میں بیکاری الاونس ملتا ہے جس کی وجہ سے وہاں گداگری نہیں ہے یہ کام تو مسلمانوں کا ورثہ تھا جسے دوسروں نے اپنالیا ہے مگر ہم اس لعنت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اس کا خاتمہ قرآنی پروگرام سے ہی ممکن ہے ورنہ ذلت سے جان نہیں چھوٹ سکتی۔

(تفسیر معالم العرفان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : " یہی لوگ برحق مومن ہیں ان کے رب کے پاس ان کے لیے (بلند) درجات ہیں اور بخشش اور معزز روزی ہے "

میں یقیناً مومن ہوں یا میں انشاء اللہ مومن ہوں کہنے میں فقہاء اور متکلمین کا اختلاف

آیات سابقہ میں تین باطنی اور دو ظاہری صفات ذکر کی گئی ہیں یعنی اللہ کا ذکر سن کر دل کا خوفزدہ ہونا، آیات سن کر ایمان زیادہ ہونا اور صرف اللہ کے فضل اور اس کی نصرت پر اعتماد اور توکل کرنا اور نماز قائم کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اور جو مسلمان ان پانچوں صفات کے ساتھ متصف ہوں ان کے متعلق فرمایا اولئک ہم المومنون حقا، " وہی برحق مومن ہیں " اور ظاہر ہے کوئی مسلمان جزم اور یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان صفات کے ساتھ متصف ہوں اور برحق مومن ہوں۔ کیونکہ جو مسلمان ان صفات کے ساتھ متصف ہوں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : یہ برحق مومن ہیں اور ان کے لیے ان کے رب کے پاس (جنت میں) بلند درجات ہیں اور بخشش اور عزت والی روزی ہے، سو یہ کہنا کہ میں برحق مومن ہوں، اس کہنے کو مستلزم ہے کہ میں جنتی ہوں اور کوئی شخص یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں جنتی ہوں تو وہ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں برحق مومن ہوں، ورنہ اس کا اس آیت کے نصف اول پر ایمان ہوگا اور باقی نصف پر ایمان نہیں ہوگا۔ اس بناء پر ائمہ ثلاثہ کا یہ مذہب ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ " انا مومن حقا " (میں برحق مومن ہوں) بلکہ اس کو یہ کہنا چاہئی " انا مومن انشاء اللہ " (انشاء اللہ میں مومن ہوں)

ائمہ ثلاثہ نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے

حضرت انس بن مالک انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ان کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گزر ہوا، آپ نے ان سے پوچھا: اے حارث! تم نے کس حال میں صبح کی۔ انھوں نے کہا میں نے اس حال میں صبح کی درآنحالیکہ میں برحق مومن تھا، آپ نے فرمایا غور کرو تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، سو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انھوں نے کہا میں دنیا سے بے رغبت ہوں میں رات بھر بیدار رہا اور دن بھر پیاسا رہا (یعنی روزہ سے رہا) اور گویا کہ میں اہل جنت کو دیکھ رہا تھا وہ ایک دوسرے کی زیارت کر رہے تھے اور گویا کہ میں اہل دوزخ کو دیکھ رہا تھا وہ بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اے حارث! تم نے معرفت حاسل کر لی ہے۔ تم ان (مذکورہ) تین اوصاف کو لازم رکھنا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج 11، ص 43، المعجم الکبیر ج 3، رقم الحدیث: 3367۔ مسند البزار رقم الحدیث: 22 کتاب الزہد للبیہقی رقم الحدیث: 971۔ مجمع الزوائد ج 1، ص 57، کنزل العمال رقم الحدیث: 36988۔ الدر المنثور ج 4، ص 13)

امام رازی شافعی متوفی 606ھ اور امام قرطبیؒ مالکی متوفی 668ھ نے درج ذیل اثر سے بھی ائمہ ثلاثہ کے موقف پر استدلال کیا ہے۔

حسن بصری سے کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ مومن ہیں؟ انھوں نے کہا ایمان کی دو قسمیں ہیں: اگر تم مجھ سے اللہ، فرشتوں، کتابوں رسولوں اور یوم آخرت کے ایمان کے متعلق سوال کرتے ہو تو میں مومن ہوں، اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ مومن صرف وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ (الانفال: 2) تو اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں مومن ہوں یا نہیں۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 454، الجامع لاحکام القرآن ج 7، ص 329، بیروت)

مبحث مذکور میں فریقین کے درمیان محاکمہ

اس مبحث میں تحقیق یہ ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں

1۔ نفس ایمان یعنی دل سے ان تمام چیزوں کی تصدیق کرنا جس کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے پاس سے لے کر آئے۔

2۔ ایمان کامل یعنی دل سے تصدیق کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور تمام احکام شرعیہ پر عمل کرنا۔

نفس ایمان کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ میں برحق مومن ہوں، اور ایمان کامل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ ایمان کامل میں اعمال بھی داخل ہیں اور انسان کو تصدیق بالقلب پر ہر چند کہ یقین ہوتا ہے لیکن مستقبل میں احکام شرعیہ پر عمل کرنے کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتا آیا مستقبل میں وہ نیک عمل کرے گا یا نہیں۔ اس لیے ایمان کامل کے اعتبار سے اس کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ میں برحق مومن ہوں بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ انشاء اللہ میں مومن ہوں۔ امام ابو حنیفہ جب مطلّقاً لفظ ایمان بولا جائے تو اس سے نفس ایمان مراد لیتے ہیں اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ میں برحق مومن ہوں یا میں یقیناً مومن ہوں۔ ائمہ ثلاثہ جب لفظ ایمان مطلّقاً بولا جائے تو اس سے مومن کامل مراد لیتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں کہ میں یقیناً مومن ہوں کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں۔

"میں یقیناً مومن ہوں" کہنے کے دلائل

علامہ مسعود بن عمر سعد الدین تفتازانی متوفی 793ھ لکھتے ہیں:

بہ شمول امام شافعی متوفی 204ھ کثیر سلف صالحین کا یہ موقف ہے کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں اور امام ابو حنیفہ ان کے اصحاب اور اکثرین نے اس سے منع کیا ہے، کیونکہ انسان کو یہ معلوم ہے کہ اس کے دل میں اللہ اور فرشتوں، کتابوں، رسولوں، تقدیر اور یوم آخرت کی تصدیق ہے اور اس تصدیق کے تحقق اور ثبوت میں کوئی شک اور تردد نہیں ہے، اور جس شخص کو است صدیق کے تحقق میں شک اور تردد ہو گا، وہ قطعی طور پر مومن نہیں ہو گا اور جب اس کو شک اور تردد نہیں ہے تو پھر انشاء اللہ میں مومن ہوں، کہنے کو ترک کرنا اولیٰ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں حقاً اور یقیناً مومن ہوں، اور تصدیق میں شک اور تردد کے وہم کو دور کیا جائے۔ اور جو ائمہ " میں انشاء اللہ مومن ہوں " کہنے کے قائلین ہیں، ان کے دلائل اور ان دلائل کے جوابات حسب ذیل ہیں :

"میں انشاء اللہ مومن ہوں" کہنے کے دلائل کا تجزیہ

1۔ میں مومن ہوں کے ساتھ انشاء اللہ، اللہ کے ذکر کے ساتھ تبرک حاصل کرنے کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اور ادب کے لیے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف مفوض ہیں، اور اپنے نفس سے تکبر کو دور کرنے کے لیے، اور تردد مستقبل کے اعتبار سے ہے۔ اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس دلیل سے صرف اس قول کی صحت معلوم ہوتی ہے نہ کہ " میں انشاء اللہ مومن ہوں " کی ترجیح " میں یقینا مومن ہوں " کہنے پر۔ اور تردد کا وہم بہر حال باقی رہتا ہے اور تبرک اور ادب کی ایمان کے ساتھ کیا تخصیص ہے، یہ تو باقی نیک اعمال اور عبادات میں بھی ہو سکتا ہے۔
2۔ تصدیق ایمانی، جس پر نجات کی مدار ہے وہ ایک مخفی امر قلبی ہے اور شیطان اور خواہش اس کے معارض ہوتے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ انسان کو اس کے حصول کا یقین ہوتا ہے لیکن وہ اس خطرہ سے مامون نہیں ہے کہ اس کو کوئی ایسی چیز لاحق ہو جائے جو نجات کے منافی ہو، خاص طور پر جب وہ احکام شرعیہ اور ممنوعات شرعیہ کی تفصیلوں کو دیکھتا ہے تو اس کو بعض احکام اور ممنوعات اپنی خواہشات کے خلاف دکھائی دیتے ہیں اور بہت سی چیزیں جو اس کے نزدیک لذیذ اور پسندیدہ ہیں اور شرعاً ممنوع ہیں اور کتنی مرتبہ وہ احکام شرعیہ کے مقابلہ میں اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کر لیتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے ایمان کو اللہ کی مشیت کے سپرد کر دے اور کہے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تقریر ایمان کامل میں جاری ہوتی ہے نہ کہ نفس ایمان میں۔
3۔ امام الحرمین نے یہ کہا ہے کہ ایمان فی الحال قطعاً ثابت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن جس ایمان پر کامیابی اور نجات کا مدار ہے یہ وہ ایمان ہے جو پوری زندگی میں موت تک قائم رہے اور کوئی شخص جزم اور یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تاحیات مومن رہے گا اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا، اس وجہ سے سلف صالحین نے یہ کہا " کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں " کہنا چاہیے، اس لیے اب اشاعرہ پر یہ اعتراض نہیں ہو گا کہ جب انسان ایمان کے ساتھ متصف ہے تو وہ یقیناً مومن ہے اور انشاء اللہ میں مومن ہوں کہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ میں انشاء اللہ زندہ ہوں کہنا صحیح نہیں کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے، کئی لوگ زندگی میں نیک اور صالح ہوتے ہیں اور ان کا خاتمہ بدکاری پر ہوتا ہے اور کئی لوگ پوری زندگی مومن ہوتے ہیں اور ان کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے، اور انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا یا کفر پر اور وہ اللہ کے علم میں مومن ہے یا نہیں، وہ ہر چند کہ اس وقت قطعاً اور یقیناً مومن ہے اور اس میں کوئی شک اور تردد نہیں لیکن وہ کفر پر خاتمہ سے ڈرتا ہے اور ایمان اور اعمال صالحہ پر خامتہ کی امید رکھتا ہے۔ اس لیے انجام بخیر کی امید سے وہ کہتا ہے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں، یعنی جس طرح اب میں قطعاً اور یقیناً مومن ہوں تو اگر اللہ نے چاہا تو میں تادم مرگ مومن ہی رہوں گا اور ایمان پر آئندہ بھی برقرار رہوں گا اور یہ قول برحق ہے اور اس آیت کے موافق ہے : " ولا تقولن لشای انی

فاعل ذلک غدا۔ الاان یشاء اللہ واذ کرربک اذانسیت : اور آپ کسی چیز کے متعلق ہر گز یہ نہ کہیں کہ میں اس کام کو کل کرنے والا ہوں، مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب آپ بھول جائیں تو آپ اللہ کو یاد کریں " (الکہف: 23۔24)

یہ تقریر بالکل درست ہے لیکن اس تقدیر پر مطلّقاً یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میں یقیناً مومن ہوں، نہیں کہنا چاہیے بلکہ میں انشاء اللہ مومن ہوں کہنا چاہیے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ حال کے اعتبار سے میں یقیناً مومن ہوں کہنا چاہیے اور مآل اور خاتمہ کے اعتبار سے میں انشاء اللہ مومن ہوں کہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ صحت اور عافیت کے ساتھ ایمان پر ہماری زندگی برقرار رکھے اور عزت اور کرامت کے ساتھ ایمان پر ہمارا خاتمہ کرے اور ہمیں دنیا اور آخرت کی ہر آفت اور بلا اور ہر فکر اور پریشانی سے محفوظ رکھے اور ہمیں دارین کی فوز وفلاح عطافرمائے اور آخرت میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی آل اور اصحاب کی رفاقت عطافرمائے۔ (آمین)۔ (شرح المقاصد ج 5، ص 215۔217، ملخصاً وموضحاً، مطبوعہ منشورات الرضی ایران، 1409ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں تصوروں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے، اب یہاں پر ان آیات کا خلاصہ دیکھیں تو یہاں پر پانچ صفات گنوائی گئیں ہیں، حقیقی مومنوں کی، جو پہلی تین ہیں، آیت۔ وجلت قلو بھم زاد تھم ایمانا۔ علی ربھم یتوکلون۔ ان کا تعلق دل سے ہے۔ یہ کسی کو نظر آنے والی صفات نہیں ہیں جیسے جڑ بنیاد ہیں اور باقی دو۔ یقیمو الصلوۃ۔ اور ینفقون۔ یہ نظر آنے والی صفات ہیں جیسے درخت کے پھول پتے۔ جڑ جتنی گہری جتنی مضبوط ہوگی، درخت اتنا مضبوط اتنا stagle ہوگا اگر ایمان مضبوط ہے تو اسلام مضبوط ہوگا۔ ایمان ہے تو اطاعت ٹھکی ہوئی ہوگی، فرمان برداری ہوگی اور اگر ان کیفیات کے اندر کمی ہے کمزوری ہے کھو کھلا پن ہے دل کے اندر ایک hollow feeling دل کے اندر آتی ہے اگر دل ٹٹول کر دیکھیں تو۔ vacum جیسا ہے کوئی محبت وغیرہ محسوس نہیں ہوتی اللہ کی تو قرآن پڑھ کر کوئی فرق نہیں پڑتا تو اب پتہ چلا کہ جڑ کمزور ہے عمل بھی کمزور ہوگا جیسے۔ جڑ سے درخت غذا پاتا ہے اسی طرح عمل جو ہے وہ ایمان سے غذا پاتا ہے اگر جڑ بیمار ہو جائے تو پھل اور پھول پتے سب بیمار ہو جاتے ہیں درخت بیکار ہو جاتا ہے۔ صحیح Growth کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑ اور شاخ۔ جڑوں اور شاخوں دونوں کی دیکھ بھال کی جائے، تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ایمان اور عمل دونوں کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ دونوں کی طرف سے محتاط رہے۔ سورۃ ابراہیم میں ہم یہ مثال انشاء اللہ تعالیٰ پڑھیں گے۔ ایمان کی مثال اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ کیا ہوتا ہے ایمان۔ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ اس کی جڑیں اندر گہری گہری ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، تو ہم کہتے ہیں نا کہ sky is the limit تو اعمال کے لیے تو sky is the limit اچھے اعمال کے درجات کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ ایک شخص نے حسن بصری (رح) سے پوچھا کہ کیا آپ مومن ہیں۔ انھوں نے جواب دیا بھائی ایمان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہوں تو بیشک میں مومن ہوں اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مومن ہوں کہ جس کا ذکر سورۃ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے معلوم نہیں کہ ان میں داخل ہوں یا نہیں۔ تو واقعی ایمان اور ایمان میں بھی تو فرق ہے نا۔ تو اللہ سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہمیں ایسا مومن بنادے جس کے بارے میں فرمایا کہ یہی تو سچے مومن ہیں، اور کتنے خوبصورت وعدے ہیں جو کہ ان کے لیے کئے گئے ہیں۔

آیۃ مبارکہ:

كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَـكٰرِهُوۡنَ ۙ○

لغۃ القرآن: [كَمَاۤ : جیسے کہ] [اَخْرَجَكَ : آپ کو نکالا] [رَبُّكَ : آپ کے رب نے] [مِنْۢ بَيْتِكَ : آپ کے گھر سے] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [وَاِنَّ : اور بیشک] [فَرِيْقًا : ایک فریق] [مِّنَ : سے] [الْمُؤْمِنِيْنَ : مومنوں] [لَكٰرِهُوْنَ : البتہ ناپسند کرنے والے تھے]

ترجمہ: (اے حبیب!) جس طرح آپ کا رب آپ کو آپ کے گھر سے حق کے (عظیم مقصد) کے ساتھ (جہاد کے لئے) باہر نکال لایا حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ (اس پر) ناخوش تھا

تشریح:

مال غنیمت کے متعلق یہ طریق کار کیونکہ اہل عرب کے سابقہ رسوم ورواج سے یکسر مختلف تھا اس لیے بعض طبیعتوں پر اس کی تعمیل بہت شاق گزری۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے حبیب! ان کی پسند و ناپسند کا خیال مت کرو بلکہ جو ہمارا حکم ہے اس پر کاربند ہو جاؤ۔ ان کی یہ ناپسندیدگی ایسی ہی ہے جیسے لشکر کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ بعض لوگوں کو ناگوار گزرا تھا لیکن آپ نے ان کے انقباض طبع کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرمان الٰہی کی تعلیم کر دی تو اس کا کتنا خوشگوار نتیجہ نکلا۔ اسی طرح اموال غنیمت کے بارے میں بھی وہی بات تم سب کے لیے موجب خیر و برکت ہے جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ (ضیاء القرآن)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، مالِ غنیمت کا مسلمانوں کے اختیار سے نکال کر آپ کے اختیار میں دے دینا ایسے ہی حق ہے جیسے آپ کا غزوہ بدر کے لیے اپنے گھر سے نکلنا برحق تھا اگرچہ دونوں چیزیں طبعی طور پر بعض مسلمانوں کی طبیعت پر گراں گزر رہی ہیں۔

وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَـكٰرِهُوۡنَ: حالانکہ یقیناً مسلمانوں کا ایک گروہ اس پر ناخوش تھا۔} اس گروہ کے ناخوش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد کم ہے، ہتھیار تھوڑے ہیں جبکہ دشمن کی تعداد بھی زیادہ ہے اور وہ اسلحہ وغیرہ کا بڑا سامان رکھتا ہے۔ ان آیات میں مذکور واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک شام سے ابوسفیان کے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ آنے کی خبر پا کر سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہ کرام کے ساتھ ان سے مقابلے کیلئے روانہ ہوئے تو مکہ مکرمہ سے ابوجہل قریش کا ایک لشکر گراں لے کر اس تجارتی قافلے کی امداد کے لیے روانہ ہوا۔ ابوسفیان تو رستے سے کترا کر اپنے قافلے کے ہمراہ ساحل سمندر کے راستے پر چل پڑے اور ابوجہل سے اس کے رفیقوں نے کہا کہ قافلہ تو بچ گیا اس لیے اب مکہ مکرمہ واپس چل۔ ابوجہل نے انکار کر دیا اور وہ تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کرنے کے ارادے سے بدر کی طرف چل پڑا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے دونوں گروہوں یعنی تجارتی قافلے یا قریش کے لشکر میں سے ایک پر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا۔ صحابہ کرام (رض) نے اس بات میں موافقت کی لیکن بعض صحابہ کرام (رض) نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم اس تیاری سے نہیں چلے تھے اور نہ ہماری تعداد اتنی ہے اور نہ ہی ہمارے پاس کافی اسلحے کا سامان ہے۔ یہ عذر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گراں گزرا اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قافلہ تو ساحل کی طرف نکل گیا جبکہ ابو جہل سامنے آرہا ہے۔ اس پر ان لوگوں نے پھر عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، قافلے ہی کا تعاقب کیجئے اور دشمن کے لشکر کو چھوڑ دیجئے۔ یہ بات خاطر اقدس پہ ناگوار ہوئی تو حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق (رض) نے کھڑے ہو کر اپنے اخلاص و فرماں برداری اور رضا جوئی و جاں نثاری کا اظہار کیا اور بڑی قوت و استحکام کے ساتھ عرض کی کہ وہ کسی طرح مرضئ مبارک کے خلاف سستی کرنے والے نہیں ہیں۔ پھر اور صحابہ کرام (رض) نے بھی عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو حکم فرمایا اس کے مطابق تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں کبھی پیچھے نہ ہٹیں گے، ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپ کی تصدیق کی اور ہم نے آپ کی پیروی کے عہد کئے ہیں۔ ہمیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع میں سمندر کے اندر کود جانے سے بھی کوئی عذر نہیں ہے۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: چلو، اللہ تعالیٰ کی برکت پر بھروسا کرو، اس نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے اور میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ مجھے دشمنوں کے گرنے کی جگہ نظر آرہی ہے۔ اس کے بعد حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کفار کے مرنے اور گرنے کی جگہ ہر ایک کے نام کے ساتھ بتادی اور ایک ایک کی جگہ پر نشانات لگادیئے اور یہ معجزہ دیکھا گیا کہ ان میں سے جو مر کر گرا اسی نشان پر گرا اور اس سے خطا نہ کی۔ مزید تفصیل کے لئے کتب سیرۃ مطالعہ کریں۔ (تفسیر صراط الجنان)

امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ قریش کا قافلہ شام سے مکہ آرہا تھا

، اور اس میں بہت زیادہ غلہ اور ساز وسامان تھا، اس قافلہ کے ساتھ چالیس سوار تھے۔ ان میں ابوسفیان، عمرو بن العاص، اور دوسرے کفار قریش تھے، حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس قافلہ کی خبر دی، آپ نے مسلمانوں کو بتایا وہ اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے سوچا کہ وہ قافلہ پر حملہ کر کے اس کا مال و متاع چھین لیں گے، کیونکہ اس قافلہ میں مال بہت زیادہ تھا اور اس کے محافظ کم تھے، جب وہ قافلہ پر حملہ کے ارادہ سے نکلے تو اہل مکہ کو اس کی خبر ہوگئی، ابو جہل نے کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر ندا کی، اے اہل مکہ ہر مشکل اور رسوائی سے اپنے آپ کو بچاؤ اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قافلہ لوٹ لیا، تو تم ہرگز فلاح نہ پاسکو گے، ان ہی دنوں عباس بن عبدالمطلب کی بہن نے ایک خواب دیکھا اور اپنے بھائی سے کہا میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ ایک شتر سوار آیا اور اس نے پکار کر کہا اے عہد شکن قوم تین دن کے اندر اپنی قتل گاہوں کی طرف دوڑو، اور اس نے پہاڑ سے ایک چٹان الگ کرلی اور مکہ کے ہر گھر میں اس چٹان سے ایک پتھر ٹوٹ کر پہنچ گیا، عباس نے یہ خواب ابو جہل کو سنایا تو ابو جہل نے کہا کہ تم مردوں کی نبوت پر راضی نہ ہوئے تھے کہ تمہاری عورتوں نے دعوی نبوت کرنا شروع کردیا، پھر ابو جہل تمام اہل مکہ کو لے کر نکلا اور یہ بہت بڑا لشکر تھا، ابو جہل کو بتایا گیا کہ ابوسفیان کے قافلہ نے ساحل کا راستہ اختیار کرلیا ہے اور وہ محفوظ ہو چکا ہے، تم اب لوگوں کو واپس مکہ لے جاؤ۔ اس نے کہا نہیں! خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوسکتا، حتی کہ ہم اونٹوں کو ذبح کریں گے، شراب پئیں گے اور ہماری باندیاں آلات موسیقی

کے ساتھ گانا سنائیں گی اور تمام قبائل عرب ہمارے خروج کی خبر سن لیں گے، اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر چند کہ قافلہ کو نہیں لوٹا لیکن وہ اپنی قوم کو لے کر میدان بدر میں آ چکے ہیں، اور میدان بدر میں تمام قبائل عرب سال میں ایک بار بازار لگاتے تھے، ادھر حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نازل ہوئے اور کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے آپ سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے، تجارتی قافلہ یا لشکر قریش! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا اور فرمایا قریش مکہ، ہر مشکل اور ہر مصیبت کا چیلنج قبول کر کے مکہ سے نکل کر یہاں آن پہنچے ہیں، تمہارے نزدیک تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا پسندیدہ ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا، آپ نے فرمایا تجارتی قافلہ تو ساحل سمندر کے راستے مکہ کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور اب تو وہ تمہاری دست برد سے محفوظ ہے، اور ادھر ابو جہل اپنے لشکر کے ساتھ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ اصحاب نے پھر کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! قافلہ کا پیچھا کیجئے اور دشمن کو چھوڑیے، جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غضب ناک ہوئے تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رض) نے اچھی باتیں کہیں، پھر حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے، اور کہا آپ وہی کام کیجئے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور آپ جو بھی ارادہ کریں گے ہم آپ کے ساتھ ہیں، اللہ کی قسم اگر آپ عدن کی طرف بھی روانہ ہوئے تو انصار میں سے کوئی شخص آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا، پھر حضرت مقداد بن عمرو نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے، اور آپ جو بھی ارادہ کریں گے، ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا آپ اور آپ کا رب جا کر جنگ کریں ہم یہیں بیٹھنے والے ہیں۔ (المائدہ: 24) بلکہ ہم آپ سے یہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا رب جنگ کریں ہم آپ کے ساتھ اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے جب تک ہماری آنکھوں کی پلکیں جھپکتی رہیں گی، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسکرائے اور آپ نے فرمایا اللہ کی برکت سے روانہ ہو، بیشک میں قوم کفار کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں۔ (الحدیث)۔ (دلائل النبوۃ، ج 3، ص 28۔ 34، ملخصاً، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1410ھ)

اس قصہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ لشکر قریش سے مقابلہ کرنا صرف بعض اصحاب کو ناگوار تھا تمام صحابہ کو ناگوار نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بیشک مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو ناپسند کرنے والا تھا، اور یہ فرمایا ہے کہ "وہ حق ظاہر ہونے کے باوجود آپ سے اس میں بحث کر رہے تھے" اس کا معنی یہ ہے کہ وہ لشکر کفار سے مقابلہ کرنے کی بجائے قافلہ کے مال و متاع کی وجہ سے اس پر حملہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے، حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو یہ بتا چکے تھے کہ اس مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گی اور ان کی بحث یہ تھی کہ ہم تو قافلہ پر حملہ کرنے کی نیت سے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ اور آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا تا کہ ہم اس لشکر سے مقابلہ کرنے کی اچھی طرح تیاری کر لیتے، پھر ان پر لشکر کفار کا جو رعب اور ہیبت طاری تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حال سے تشبیہ دی ہے جو آنکھوں دیکھے موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہوں، ان کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ لشکر کفار کے مقابلہ میں ان کی تعداد ایک تہائی تھی، اور ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے اور باقی پیادہ تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی بہت کم تھے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیۃ مبارکہ:

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝

لغۃ القرآن: [يُجَادِلُوْنَكَ : وہ لوگ بحث کرتے تھے آپ سے] [فِي الْحَقِّ : حق (بات) میں] [بَعْدَمَا : اس کے بعد کہ جو] [تَبَيَّنَ : واضح ہوا] [كَاَنَّمَا : گویا کہ] [يُسَاقُوْنَ : وہ لوگ ہانکے جاتے ہیں] [اِلَى الْمَوْتِ : موت کی طرف] [وَ : اس حال میں کہ] [هُمْ : اور وہ] [يَنْظُرُوْنَ : دیکھ رہے تھے]

ترجمہ: وہ آپ سے امر حق میں (اس بشارت کے) ظاہر ہو جانے کے بعد بھی جھگڑنے لگے (کہ اللہ کی نصرت آئے گی اور لشکر محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فتح نصیب ہو گی) گویا وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ (موت کو آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں

تشریح:

جیسے اس سورۃ کے تعارف میں تفصیلا بیان ہو چکا ہے کہ مدینہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری کی ظاہری غرض اہل مکہ کا تجارتی قافلہ تھا۔ اب باہر نکلے تو ابو جہل کی سرکردگی میں لشکر کفار کے آنے کی اطلاع ملی تو صورت حال بالکل بدل گئی۔ مسلمان نہ جنگ کی نیت سے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے اور نہ جنگی ساز و سامان سے مسلح تھے۔ اتنے بڑے منظم اور مسلح لشکر سے ٹکرانا بعض لوگوں کو خلاف مصلحت دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے منہ میں پھینک رہے ہیں۔ لیکن حضور کریم نے جو مجلس مشاورت وادی ذفران میں منعقد کی اس میں شمع مصطفوی کے پروانوں نے جس جرات اور جانفروشی کا اظہار کیا اس سے تمام لشکر اسلام کے حوصلے بلند ہو گئے اور کسی کو موت کا اندیشہ نہ رہا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آگے ارشاد ہے۔ کہ وہ آپ کی سچی بات میں جھگڑ رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں لشکر قریش کا حال معلوم نہ تھا ورنہ ہم بھی مقابلہ کی تیاری کر کے نکلتے بعد اس کے کہ حقیقت ظاہر ہو چکی کہ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ کرتے ہیں وہ بحکم الٰہی کرتے ہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اعلان بھی فرما دیا کہ مسلمانوں کو غیبی امداد پہنچے گی۔ لیکن اسباب ظاہری کے مہیا نہ ہونے کی صورت میں پھر بھی وہ ایسے جا رہے تھے گویا کہ وہ آنکھوں دیکھی موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں گویا انھیں بظاہر یہ نظر آ رہا تھا کہ قریش کا مقابلہ موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے اور یاد کرو جب اللہ نے وعدہ دیا تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک پر تمہیں فتح ہے یعنی قافلہ شامی اور لشکر ابو جہل میں سے ایک پر تم فتح یاب ہو گے۔ اور تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں وہ ملے جس میں کانٹے کا بھی کھٹکا نہ ہو۔ بعدہ قافلہ شامی پر جس میں چالیس آدمی تھے فتح یاب بہ آسانی ہو جائیں اور اللہ کی مشیت یہ تھی کہ وہ اپنی کلام سے سچ کو سچ کر دکھائے اور دین حق کو غالب اور بلند و بالا فرما

دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اور انھیں ایسے ہلاک کرے کہ ان میں سے کوئی سر کش نہ بچے تاکہ سچ سچ ہو اور جھوٹ جھوٹ یعنی اسلام غالب ہو اور کفر مٹ جائے اگرچہ مجرموں پر گراں گزرے اور وہ برامانیں۔ (تفسیر الحسنات)
اے محبوب ﷺ! تیرے بیان سے جو ہونے والا تھا (وہ روشن ہو چکا) اور انھوں نے یہ بات جان لی کہ دشمن پر فتح پائینگے۔ پیغمبر نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ یہ جہاد ان پر واجب ہے جو تجارتی قافلوں کو لوٹنے سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے۔
ان تمام باتوں کے باوجود جب ان کی نظر اس بات پر پڑتی تھی کہ تمام لشکر میں تقریبا تین سو پچاس۔۔ یا۔۔ تین سو تیرہ ۳۱۳ آدمی تھے اور ستر ۷۰ اونٹ اور صرف دو ۲ گھوڑے اور محض آٹھ ۸ تلواریں تھیں۔ اور ان کے مقابل میں کم و پیش ایک ۱۰۰۰ ہزار فراد تمام آلات حرب و ضرب سے لیس ہو کر اور جنگی ساز وسامان سے آراستہ ہو کر موجود تھے تو ان میں سے بعض افراد اپنی بے سر و سامانی کے سبب شکستہ دل ہو گئے گو انھوں نے حکم رسول کی جان و دل کے ساتھ پوری تعمیل کیلئے اپنے کو تیار کر لیا لیکن بشری تقاضے سے ان کو ایسا لگا (گویا وہ ہانکے جارہے ہیں موت کی طرف اور وہ) موت کی علامتوں کو اپنی کھلی آنکھوں سے (دیکھ رہے ہیں)۔ اے محبوب! یاد کرو۔۔ (تفسیر اشرفی)
آگے جو ارشاد باری تعالیٰ ہے اس کا

شان نزول

یہ ہے کہ بدر والے دن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشرکین کو ملاحظہ فرمایا تو وہ ہزار کی تعداد میں تھے اور حضور کے اصحاب تین سو دس سے کچھ زیادہ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبلہ رو قیام فرما کر اپنے نوری ہاتھ پھیلا کر اپنے رب کے حضور عرض پیرا ہوئے۔
الہٰی جو تو نے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر الہٰی جو تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ عنایت فرما اے رب العالمین اگر تو نے ان مسلمانوں کو ہلاک کر دیا تو تمام روئے زمین پر تیری پوجا نہ ہو گی۔ کمارواہ مسلم۔ اس قسم کے الفاظ سے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کر رہے تھے حتی کہ دوش اقدس سے رداء مبارک اتر گئی۔ صدیق اکبر (رض) آگے بڑھے اور رداء مبارک دوش اقدس پر ڈالی اور عرض کرنے لگے یا نبی اللہ اب آپ کی مناجات آپ کے رب کے ساتھ کافی ہو گئی وہ یقیناً اپنا وعدہ پورا فرمائے گا اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری سن لی (اور بشارت دی) کہ میں تمہیں مدد دینے والا ہوں ہزار فرشتوں کی قطار سے۔ چنانچہ اول ہزار فرشتے آئے۔ پھر تین ہزار پھر پانچ ہزار۔
حضرت عباس (رض) فرماتے ہیں کہ جب مسلمان کافروں کا تعاقب کرتے تھے تو کافر مسلمانوں کے آگے بھاگتے جاتے تھے ایک کافر بھاگتا جارہا تھا کہ اچانک ایک اوپر سے چابک کی آواز آئی اور ساتھ ہی نعرے کی آواز آئی جس میں یہ جملے تھے اقدم یا حیزوم یعنی آگے بڑھ اے حیزوم۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حیزوم حضرت جبرائیل امین کے گھوڑے کا نام ہے۔ پھر نظر آیا کہ وہ کافر مر گیا اور اس کی ناک تلوار سے اڑی ہوئی تھی اور تمام چہرہ زخمی تھا۔ صحابہ علیہم رضان نے یہ مشاہدہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے عرض کیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ آسمان سوم کی مدد ہے۔ ابو جہل نے حضرت ابن مسعود (رض) سے کہا کہ ضرب نہ معلوم کہاں سے آتی تھی۔ مارنے والا ہمیں کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آپ نے فرمایا خبیث وہ غیبی امداد ملائکہ سماویہ کی تھی جس کا وعدہ قرآن پاک میں ہو چکا تھا۔ (انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین۔ تو جہالت کا پتلا ابو جہل کہنے لگا تو پھر ملائکہ ہی غالب ہوئے تم تو غالب نہ ہو سکے یہ اس کی ابو جہلی کا اثر تھا آگے

ارشاد ہے۔ اور نہیں کیا یہ اللہ نے تمہاری خوشی کو اور اس لیے کہ تمہارے دل اطمینان پائیں اور مدد نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے لہٰذا بندے کو چاہیے کہ اسی پر بھروسہ رکھے اور زور آور اور قوت اور علل واسباب ظاہری پر ناز نہ کرے۔ (تفسیر الحسنات)

شیعہ لوگ صحابہ کی اس خوفزدگی پر اعتراض کرتے ہیں مگر یاد رہے بعض چند صحابہ کی یہ گھبراہٹ اس وقت تک تھی جب تک وہ میدان جنگ میں نہ اترے تھے اور یہ طبعی خوف تھا جو باعث سے اعتراض نہیں۔ یہ خوف راہ حق میں نکلنے کے ابتدائی مرحلہ میں انبیاء کو بھی لاحق ہو سکتا ہے اسی لئے موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کو جب فرعون کی طرف بھیجا گیا تو انھوں نے فرمایا: اننا نخاف ان یفرط علینا اوان یطغی۔ ہمیں خوف ہے کہ فرعون ہم پر زیادتی کرے یا سرکشی اپنائے۔ (طہ : 45)

مگر جب صحابہ کرام (رض) میدان بدر میں اتر گئے تو تمام خوف جاتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے نزول سے ان کے دل مضبوط کر دیے۔ قرآن مجید میں ہے:

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ۔ تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا اور اسے اللہ نے تمہارے لیے محض بشارت بنایا ہے اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔ (آل عمران : 125)

اور یہ چند ایک صحابہ کرام (رض) جن کی جنگ سے قبل گھبراہٹ بیان کی جارہی ہے اجلہ صحابہ میں سے نہ تھے کیونکہ کتب سیرت میں مرقوم ہے کے غزوہ بدر سے قبل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفار مکہ کا تجارتی قافلہ پکڑنے نکلے تھے قافلہ کسی طرح بھاگ گیا اور ان کی مدد کے لیے مکہ سے ابو جہل کی کمان میں ایک بڑا لشکر بدر تک آ پہنچا۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ اب بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے قافلہ نکل گیا ہے اور لشکر جرار آ گیا ہے اور اتنا وقت نہیں ہے کہ مدینہ پہنچ کر تیاری کر کے واپس آیا جائے بس زندگی اور موت کا فیصلہ ہے۔ ایسے میں واقعات چند صحابہ کے دل میں کچھ خوف آیا جو اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان کیا۔ مگر اجلہ صحابہ کا جذبہ قابل دید تھا چنانچہ "المواھب" میں ہے:

فقام ابو بکر فقال فاحسن ثم قام عمر فقال فاحسن، ثم قام المقداد بن عمرو فقال یا رسول اللہ امض لما امرک اللہ فنحن معک۔ یعنی ابو بکر صدیق (رض) کھڑے ہوئے انھوں نے اٹھ کر بہت عمدہ باتیں کہیں (یعنی مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا) پھر عمر فاروق (رض) کھڑے ہوئے انھوں نے بھی عمدہ باتیں کہیں، پھر حضرت مقداد بن عمرو کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو اللہ نے جو حکم فرمایا ہے آپ اس پر چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم قوم موسیٰ کی طرح نہیں ہیں کہ کہہ دیں تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ ہمیں اگر سمندر پار جا کر لڑنے کا حکم دیں گے تو ہم اس پر بھی تیار ہیں۔ (مواھب اللدنیہ جلد اول صفحہ 351 مطبوعہ المکتب الاسلامی) (تفسیر برہان القرآن)

آیۃ مبارکہ:

وَاِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحۡدَی الطَّآئِفَتَیۡنِ اَنَّہَا لَکُمۡ وَ تَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَیۡرَ ذَاتِ الشَّوۡکَۃِ تَکُوۡنُ لَکُمۡ وَ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۙ﴿۷﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [یَعِدُکُمُ : وعدہ کیا تم سے] [اللّٰہُ : اللہ نے] [اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ : دو جماعتوں کی ایک کا] [اَنَّھَا : کہ وہ] [لَکُمْ : تمہارے لیے ہے] [وَتَوَدُّوْنَ : اور تم لوگ چاہتے تھے] [اَنَّ : کہ] [غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ : ہتھیار والی کے علاوہ] [تَکُوْنُ : ہو] [لَکُمْ : تمہارے لیے] [وَیُرِیْدُ : اور چاہتا تھا] [اللّٰہُ : اللہ] [اَنْ : کہ] [یُّحِقَّ : وہ حق کرے] [الْحَقَّ : حق کو] [بِکَلِمٰتِہٖ : اپنے فرمانوں سے] [وَیَقْطَعَ : اور کاٹ دے] [دَابِرَ : جڑ] [الْکٰفِرِیْنَ : کافروں کی]

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے تم سے (کفار مکہ کے) دو گروہوں میں سے ایک پر غلبہ و فتح کا وعدہ فرمایا تھا کہ وہ یقیناً تمہارے لیے ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح (کمزور گروہ) تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلام سے حق کو حق ثابت فرمادے اور (دشمنوں کے بڑے مسلح لشکر پر مسلمانوں کی فتح یابی کی صورت میں) کافروں کی (قوت اور شان و شوکت کے) جڑ کاٹ دے

تشریح:

مکہ کا کافر امیہ بن خلف اور مدینہ کا مسلمان سعد بن معاذ (رض) آپس میں پرانے دوست تھے۔

امیہ جب سفر تجارت پر جاتا اور اس کا گزر مدینہ سے ہوتا تو وہ حضرت سعد (رض) کیا پاس ٹھہرا کرتا اور حضرت سعد (رض) جب مکہ آئے تو امیہ کے ہاں قیام کرتے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہجرت کے بعد حضرت سعد (رض) عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ آئے اور حسب سابق امیہ کے مہمان بنے۔ ایک دن حضرت سعد (رض) امیہ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کرنے لگے تو ابو جہل نے کہا: ''میں دیکھ رہا

ہوں کہ تم مکہ میں امن کے ساتھ طواف کر رہے ہو حالانکہ تم نے بے دینوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور تم یہ خیال کرتے ہو کہ بوقت ضرورت تم ان کی مدد کرو گے، خدا کی قسم! اگر تم امیہ کے مہمان نہ ہوتے تو تم زندہ اپنے گھر واپس نہ جا سکتے۔
حضرت سعد (رض) نے بلند آواز سے ابو جہل کو جواب دیا کہ اگر تم مجھے کعبہ کا طواف کرنے سے روکو گے تو بخدا! میں تمہیں اس چیز سے روکوں گا جو تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گی یعنی مدینہ کے قریب سے تمہارا تجارت کا راستہ بند کر دوں گا۔ (ضیاء النبی: جلد ۳، ص ۲۵۳)
اہل مکہ کی معیشت اور طاقت کا زیادہ تر دارومدار شام کی تجارت پر تھا اور ان کے تجارتی قافلوں کا شام جانے کا راستہ مدینہ کے قریب سے گزرتا تھا۔ کفار مکہ نے اس کامیاب تجارت کے نشہ میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑے، انھیں مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا، ان کی جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کر لیا اور مدینہ میں بھی ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں، چنانچہ ان کی سازشوں سے بچنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ تجارتی شاہراہوں سے مسلمان ہمیشہ محتاط رہیں تاکہ تجارت کے بہانے کہیں وہ اچانک مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں یا تجارت کے ذریعہ وہ اتنے مضبوط اور مستحکم ہو جائیں کہ مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ختم کر دیں، لہٰذا ان کے اچانک حملوں سے بچنے اور ان کی مادی طاقت کو کم کرنے کے لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے تجارتی قافلوں کو ہراساں کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ انھیں احساس ہو کہ مسلمان ان کی نقل و حرکت سے آگاہ ہیں اور ان پر اچانک حملہ کرنا آسان نہیں ہے، مگر ان مہمات میں نہ تو کوئی انسان قتل ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا کیونکہ آپ کا مقصد لوٹ مار یا قتل و غارت نہیں تھا بلکہ کفار کو مرعوب کرنا مقصود تھا تاکہ اسلام دشمنی سے باز آ جائیں۔ اس کے برعکس اہل مکہ کو جہاں کہیں موقع ملتا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے مال مویشی لوٹنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے اور جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا اثر و رسوخ دیگر عرب قبائل میں پھیل رہا ہے تو انھوں نے مدینہ پر باقاعدہ حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں تاکہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے، اور ابوسفیان کی قیادت میں ایک عظیم الشان تجارتی قافلہ شام بھیجا تاکہ اس کی آمدنی سے وہ مدینہ پر حملہ کے اخراجات پورے کر سکیں۔ (ضیاء النبی: جلد ۳: ص ۲۷۲)
اس قافلہ کی حفاظت کے لیے چالیس آدمیوں کا ایک دستہ بھی ساتھ تھا۔ جب یہ قافلہ شام سے واپس آ رہا تھا تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ اس قافلہ کے تعاقب کے لیے نکلیں، چنانچہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تین سو تیرہ صحابہ کرام (رض) کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔
جب ابوسفیان کو اطلاع ملی کہ مسلمان اس کے قافلہ کے تعاقب کے لیے مدینہ سے چل پڑے ہیں تو اس نے مکہ پیغام بھیجا کہ ہماری مدد کو جلد پہنچو۔ اس خبر نے مکہ کے کفار کو بے چین کر دیا اور ہر شخص مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو گیا، چنانچہ ایک ہزار پر مشتمل کفار مکہ کا لشکر ابو جہل کی قیادت میں روانہ ہوا۔ ان کے ساتھ سو گھوڑے، چھ سو اونٹ، رقص کرنے والی کنیزیں اور سامان جنگ وافر مقدار میں تھا۔
ادھر ابوسفیان کا قافلہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے گزر گیا تھا۔ اس نے پیغام بھیجا کہ میرا قافلہ بحفاظت گزر آیا ہے اب لشکر کشی کی ضرورت نہیں لیکن ابو جہل نے کہا: ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے بلکہ بدر پہنچ کر مسلمانوں کو سبق سکھائیں گے۔
ادھر راستہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان کا قافلہ تو بچ کر نکل گیا ہے مگر قریش مکہ ایک لشکر جرار کے ساتھ بڑھتے چلے آ رہے ہیں، چنانچہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نئی صورت حال کے پیش نظر صحابہ کرام (رض) سے مشورہ طلب کیا۔ صحابہ کرام (رض) نے عرض کیا:

یارسول اللہ! آپ تشریف لے جائیں جدھر آپ کا ارادہ ہے ہم حضور کے ساتھ ہیں۔ اگر آپ سمندر میں چھلانگ لگانے یا دشمن سے ٹکرانے کا اشارہ فرمائیں تو ہماری جانیں قربان ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالٰی آپ کو ہم سے وہ کارنامے دکھائے گا جس سے آپ کی چشم مبارک ٹھنڈی ہو جائے گی، سو اللہ تعالٰی کی برکت پر آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو جواب بنی اسرائیل نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دیا تھا، یعنی "جایئے آپ کا رب ان سے جنگ کیجیے ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں"۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ تشریف لے چلئے آپ اور آپ کا رب ہم آپ کے ساتھ جنگ کریں گے۔

(ضیاء النبی: جلد ۳: ص ۳۱۱)

میدان جنگ

میدان بدر میں جب دونوں لشکر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے

تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھوڑی دیر کے لیے اپنے خیمے میں تشریف لے گئے اور بڑے عجز و نیاز سے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ پھیلا دیئے: یا اللہ! اپنا سچا وعدہ پورا فرما، اگر یہ کافر آج مسلمانوں پر غالب آگئے تو شرک غالب آجائے گا اور پھر تیرا دین قائم نہیں ہو سکے گا۔ اپنے رب تعالٰی کے حضور دعائیں مانگنے کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میدان جنگ میں تشریف لائے۔ آپ نے مٹھی بھر کنکریاں کفار کی طرف پھینکیں اور تلوار لے کر جنگ میں شریک ہوگئے۔ اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کی مدد کے لیے ہزاروں فرشتے نازل فرمائے۔ مشرکین نے شکست کھا کر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس جنگ میں ابو جہل سمیت ستر کافر مارے گئے اور ستر جنگی قیدی بنا لیے گئے اور جنگ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد صرف چودہ تھی۔

(طبقات ابن سعد: جلد ۲: ص ۱۶)

جنگ سے ایک روز پہلے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میدان جنگ کا معائنہ فرمایا اور مختلف جگہوں کی نشاندہی فرمائی کہ کل فلاں فلاں کافروں کی لاشیں فلاں فلاں جگہوں پر پڑی ہوں گی ان شاء اللہ تعالٰی۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم جس نے ہمارے نبی کو حق کے ساتھ بھیجا! کفار کی لاشیں ان جگہوں سے ذرہ آگے پیچھے نہ تھیں جہاں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے بارے میں نشاندہی فرمائی تھی۔

(مسلم: کتاب الجنتہ: باب ۱۷)

اسیران جنگ بدر

جنگ کے بعد حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان ستر قیدیوں کے بارے میں مجلس مشاورت قائم کی۔ کئی تجاویز پیش ہوئیں کہ ان ظالموں کو قتل کر دیا جائے وغیرہ، مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو تجویز پسند فرمائی وہ یہ تھی کہ حسب استعداد فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جائے اور جو فدیہ ادا نہیں کر سکتے وہ مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو وہ آزاد ہیں۔

(مسند احمد: جلد اول: ص ۲۴۷)

زید بن ثابت (رض) انہی میں سے ہیں جن کو کافر قیدیوں نے علم سکھایا۔ (طبقات ابن سعد: جلد ۲: ص ۲۰) حضرت زید (رض) انصاری جوان تھے، کاتب وحی اور قرآن کے حافظ تھے۔ خلافت صدیقی میں حضرت زید (رض) کی سر براہی میں قرآن مجید کو ایک نسخہ کی صورت میں تحریر کیا گیا تھا۔

حضرت عباس (رض) کے گھر مال کی اطلاع

حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسیران بدر کا فدیہ چار سو درہم مقرر فرمایا اور حضرت عباس (رض) نے کہا کہ اس کے پاس مال نہیں ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: وہ مال کہاں ہے جو آپ نے اور آپ کی بیوی ام فضل نے زمین میں دفن کیا تھا اور آپ نے اس سے کہا: اگر میں اس سفر جنگ میں مر گیا تو یہ مال میرے بیٹوں کو دے دینا۔ اس پر حضرت عباس (رض) نے کہا بخدا! میں جان گیا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں کیونکہ اس مال کا میرے اور میری بیوی کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔

(سبل الھدی والرشاد: جلد ۴: ص ۱۰۵، مسند احمد: جلد اول: ص ۳۴۳)

ا۔ بدر کی جنگ کفر اور اسلام کے درمیان سب سے پہلی باقاعدہ جنگ تھی جو سترہ رمضان المبارک بروز جمعہ سن دو ہجری میں لڑی گئی۔ اس میں کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار اور مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی ۷۰ کافر مارے گئے، ۷۰ قیدی بنا لیے گئے اور باقی اپنا مال و متاع چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اس طرح جنگ میں دشمن کا جو مال مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے اس کو اسلامی اصطلاح میں انفال یا غنائم یعنی مال غنیمت کہا جاتا ہے اور یہ آیت جنگ بدر کے مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ حضرت عبادہ (رض) بیان کرتے ہیں: ''میں بدر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ حاضر تھا، مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی، مسلمانوں کے ایک گروہ نے بھاگنے والے کفار کا تعاقب کیا، بعض کو قید اور بعض کو قتل کرنے لگے اور دوسرا گروہ ان کا چھوڑا ہوا مال جمع کرنے لگا اور تیسرا گروہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد آپ کی حفاظت کر رہا تھا تاکہ دشمن آپ کو ضرر نہ پہنچا سکے۔ رات کو جب مسلمان آپس میں اکٹھے ہوئے تو جن مسلمانوں نے مال غنیمت اکٹھا کیا تھا تو انھوں نے کہا: یہ مال غنیمت ہم نے جمع کیا ہے، لہٰذا اس میں اور کسی کا حصہ نہیں ہے اور جن مسلمانوں نے دشمن کا تعاقب کیا تھا انھوں نے کہا: تم ہم سے زیادہ اس مال غنیمت کے حق دار نہیں ہو ہم نے دشمن کو بھگایا اور شکست دی ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے محافظ گروہ نے کہا: تم ہم سے زیادہ اس مال غنیمت کے حق دار نہیں ہو، ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت میں مشغول رہے تاکہ دشمن آپ کو ضرر نہ پہنچا سکے۔ (جب اس اختلاف نے شدت اختیار کی اور بات تلخ کلامی اور رنجش قلبی تک پہنچ گئی) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (مسند احمد: جلد ۵: ص ۳۲۴) یعنی مال غنیمت تمہاری ملکیت نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری لڑائی کا مقصد مال غنیمت کا حصول ہے۔ مال غنیمت کے اصل مالک تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور ان کے حکم کے مطابق ہی اس کو تقسیم کیا جائے گا۔ اس کی تفصیل آگے آیت نمبر ۴۱ میں ملاحظہ کریں۔

۲۔ ان آیات میں کامل اور سچے مومن کے ظاہر و باطن کی چند نشانیاں بتائی گئی ہیں اور وہ یہ ہیں۔ ا۔ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل اللہ تعالیٰ کے جلال سے کانپ اٹھتے ہیں۔ ۲۔ جب ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو ان کا ایمان اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ ۳۔ وہ صرف اپنے رب تعالیٰ پر ہی توکل کرتے ہیں۔

ان تینوں صفات کا تعلق دل اور باطن سے ہے اور ظاہر میں ان کی تصدیق اس وقت ہوتی ہے جب وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

علامہ فخر الدین رازی لکھتے ہیں: کسی نے حضرت حسن بصری (رض) سے پوچھا:

کیا آپ مومن ہیں؟

آپ نے جواب دیا: مومن دو طرح کے ہیں: ایک تو ہے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت پر ایمان لانے والا تو اس اعتبار سے میں یقیناً مومن ہوں اور دوسرا مومن وہ ہے جو اس آیت میں مذکورہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اس کا دل کانپ اٹھے تو مجھے پتہ نہیں کہ میں اس معیار کا مومن ہوں یا نہیں؟ (تفسیر کبیر) اس سلسلہ میں سورۃ فاتحہ (۱) کی آیت نمبر تین کا حاشیہ نمبر ۶ بھی ملاحظہ کر لیں۔

جب ۳۱۳ مسلمان تقریباً ایک ہزار کفار کے ساتھ جنگ کے لیے روانہ ہوئے تو بعض مسلمانوں کو یہ اقدام ناگوار گزرا حالانکہ اس وقت حق واضح ہو چکا تھا۔ اگر مسلمان لشکر کا مقابلہ نہ کرتے تو وہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے نیز حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو یہ خبر بھی دے دی تھی کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس جنگ میں فتح مسلمانوں کی ہو گی، پھر بھی بعض مسلمان جھگڑا کر رہے تھے کہ اتنے بڑے لشکر کے مقابلہ میں جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں پھینکنے کے مترادف ہے لیکن ان کے اختلاف رائے کے باوجود آپ نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا اور حق کی سربلندی کے لیے کفار کے مقابلہ میں پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و نرت سے نوازا۔ اسی طرح اب مال غنیمت کی تقسیم میں بھی اگر بعض صحابہ کو اختلاف ہے تو آپ فکر مند نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل پیرا رہیں، اس کا نتیجہ بھی مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو گا۔

مدینہ سے روانہ ہونے کے بعد ۳۱۳ مسلمانوں کے سامنے ایک طرف غیر مسلح تجارتی قافلہ تھا جس کا محافظ دستہ تیس چالیس افراد پر مشتمل تھا اور دوسری طرف ایک ہزار افراد پر مشتمل مسلح لشکر تھا جو مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے مدینہ کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا کہ ان دونوں میں سے ایک پر تمہیں غلبہ دیا جائے گا۔ اب فطری امر ہے بعض صحابہ کرام نے چاہا ہو گا کہ غیر مسلح تجارتی قافلہ ہاتھ لگے تاکہ بغیر کسی مزاحمت کے بہت سا مال و متاع حاصل ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ جو فتح و نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کو پورا کیا جائے تاکہ حق ثابت ہو جائے اور کفار کا زور بھی ٹوٹ جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب مسلمان اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنے سے تین گنا بڑے لشکر پر حملہ کرتے اور ان پر غلبہ حاصل کر کے دنیا پر اسلام کی صداقت کو ثابت کر دیتے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صرف ۱۳ مجاہدین نے ایک ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی جس سے کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کا غرور خاک میں مل گیا۔

اس آیت میں جن دو گروہوں میں سے ایک پر غلبہ کا وعدہ کیا گیا تھا وہ سن دو ہجری غزوہ بدر سے متعلق دو مخصوص کافر گروہ ہیں یعنی ابو سفیان کا تجارتی قافلہ اور ابو جہل کا جنگی لشکر اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور ابو جہل کے جنگی لشکر پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس وعدہ سے یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ آج بھی اگر مسلمانوں کو دو کافر گروہوں سے واسطہ پڑے تو ایک پر غلبہ حاصل ہوگا آج اس کے الٹ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ وعدہ ان مخصوص گروہوں کے لیے تھا۔ (تفسیر امداد الکرم)

شام کے لیے ایک تجارتی قافلہ تیار کیا کہ جس کی رقم کا بیشتر حصہ مدینہ فتح کرنے پر لگانا تھا ادھر نبی محترم بھی مکہ والوں کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھے جناب عباس اور کچھ دوسرے لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مکہ کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ آپ کو تجارتی قافلہ کی غرض وغایت کا علم ہوا تو آپ نے اس قافلہ پر شبخون مارنے کا فیصلہ کیا۔ حالات کی تیز رفتاری کی وجہ سے آپ نے اعلان فرمایا کہ جو لوگ بھی اس ایمرجنسی میں تیار ہو سکتے ہیں وہ ہمارے ہم رکاب ہو جائیں۔ آپ کے اس فیصلے کو اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ آپ کے رب نے ہی آپ کو آپ کے گھر سے نکالا تھا۔ یہاں گھر سے مراد مدینہ طیبہ کا گھر اور شہر ہے۔

بدر

بدر مدینہ طیبہ سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر دور تھا جب آپ بدر کے مقام کے قریب پہنچے تو آپ کے مخبروں نے آپ کو اطلاع دی کہ قافلہ جرنیلی راستہ چھوڑ کر ساحلی راستہ اختیار کر کے یہاں سے نکل چکا ہے۔ راستہ تبدیل کرنے سے پہلے مکی قافلہ کے سربراہ ابو سفیان نے مکہ والوں کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے پیغام بھیجا کہ فوری طور پر قافلے کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ مکہ والے پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے اس لیے ابو جہل نے حفاظتی دستہ بھیجنے کے بجائے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابو سفیان کا نمائندہ مکہ پہنچا تو اس نے قدیم روایت کے مطابق شدید ترین ہنگامی صورت حال کا تاثر دینے کے لیے اپنی سواری کا ناک چیر ڈالا اپنا گریبان چاک کیا اور مکہ کے شاہراہوں میں کھڑے ہو کر دہائی دی کہ قافلہ لٹنے ہی والا ہے۔ اس پر مکہ کے ایک ہزار سورما مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔

رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بدر کے قریب جا کر اپنے ساتھیوں کو تجارتی قافلے اور مکہ کے لشکر کے بارے میں بتلایا۔ اور مشورہ طلب کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس پر تین سو تیرہ مجاہدین فکری طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

ایک حصہ کا خیال تھا جس قافلہ کے لیے ہم آئے تھے وہ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہم تھوڑے اور بے سروسامان ہیں۔ اس لیے ہمیں واپس پلٹ جانا چاہیے۔

دوسرے فریق کا نکتہ نگاہ اس کے برعکس تھا۔ اس صورت حال میں آپ نے وقفہ، وقفہ کے بعد تین چار مرتبہ صحابہ سے فرمایا: اَشِیْرُوْا عَلٰی ھٰذَا اَیُّھَا النَّاس لوگو مجھے مشورہ دو۔ جس پر حضرت ابو بکر (رض)، حضرت عمر (رض) نے عرض کی کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم آخر دم تک آپ کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔ لیکن آپ کا مطمع نظر یہ تھا کہ انصار کے نمائندے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ جس کی مورخین نے یہ توجیہ بیان کی ہے کہ بیعت عقبہ کے موقع پر یہ بات طے پائی تھی کہ آپ ہجرت کر کے مدینہ آئیں اگر کوئی آپ پر حملہ آور ہوا تو انصار اس کا دفاع کریں گے۔ اس لیے آپ نے مناسب جانا کہ انصار بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ جونہی انصار نے آپ کا نقطہ نظر جانا تو وہ تڑپ گئے۔ ان کے نمائندے سعد بن معاذ (رض) نے اٹھ کر عرض کی یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اگر آپ ہمیں سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیں تو ہمیں اس کے لیے بھی تیار پائیں گے۔ کل جب دشمن سے مقابلہ ہوگا تو ہم اس طرح اپنی جان پر

کھل جائیں گے۔ جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی پھر حضرت مقداد (رض) اٹھے اور انھوں نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کی طرح نہیں پائیں گے جنھوں نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! آپ اور آپ کا خدا لڑیں ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! آپ حبشہ کے دور دراز علاقہ "برق الغماد" تک جانا چاہیں تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ ان جذبات اور بھرپور تائید کے ساتھ آپ نے بدر کی طرف پیش قدمی فرمائی۔ جس کی تائید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور بدر کی طرف روانہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ ہی کا آپ کو حق کے ساتھ نکالنا تھا۔ حق سے مراد دین کی سربلندی کے لیے بروقت نکلنا اور صحیح فیصلہ کرنا ہے۔

حضرت مقدار (رض) کا دلیرانہ جواب

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ قَالَ الْمِقْدَادُ (رض) یَوْمَ بَدْرٍ یَا رَسُولَ اللّٰہِ إِنَّا لَا نَقُولُ لَكَ كَمَا قَالَتْ بَنُو إِسْرَاءِیلَ لِمُوسٰی فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَا هُنَا قَاعِدُونَ وَلَكِنِ امْضِ وَنَحْنُ مَعَكَ فَكَأَنَّهُ سُرِّیَ عَنْ رَسُولِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) [رواہ البخاری : کتاب المغازی، باب قول اللہ اذ تستغیثون ربکم]

"حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں حضرت مقداد (رض) نے بدر کے دن رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا ہم اس طرح نہیں کہیں گے جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے ان سے کہا تھا تم اور تمہارا پروردگار دونوں جاؤ اور لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں آپ نکلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس بات سے خوش ہوگئے۔"

یہاں جھگڑا کرنے سے مراد بحث و تکرار ہے۔ صحابہ (رض) کی دوسری جماعت کا خیال تھا کہ ہم سراسر موت کے منہ میں جارہے ہیں اسی پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن کہہ رہا ہے کہ گویا کہ وہ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے وعدہ کیا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی ایک جماعت تمہارے ہاتھ لگے گی۔ یعنی تجارتی قافلہ یا مکہ کے لشکر سے مڈ بھیڑ ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ آج حق کو اپنے حکم کے ساتھ بالا کر دے اور کفار کی جڑ کاٹ دے حق و باطل کے درمیان ہمیشہ کے لیے فیصلہ اور امتیاز ہو جائے خواہ یہ بات مجرموں کے لیے کتنی ہی ناپسند کیوں نہ ہو۔ (تفسیر فہم القرآن)

اسی طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دس سالہ مدنی زندگی میں اکثر کفار سے جنگ کا سلسلہ جاری رہا تو اس دوران جو احکام نازل ہوئے ان میں سے اکثر تعلق ان حملہ آور کفار اور حالت جنگ سے ہے۔ ان احکام کو انہی حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ آج کی دنیا میں چودہ سو سال پہلے کی حالت جنگ کے احکام کا حوالہ دے کر اسلام کو بدنام کرنا درست نہیں ہے۔

مثال کے طور پر پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں فرانسیسی حکمرانوں نے اپنی فوجوں کو جرمن حملہ آوروں کے خلاف جو احکام دیئے ان کو اسی حالت جنگ کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ آج جرمنی اور فرانس کے پرامن حالات میں ان احکام کا حوالہ دینا درست نہیں ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ جرمنی کے خلاف اہل فرانس کے نظریات و احکام آج بھی وہی ہیں جو عالمی جنگوں کے وقت تھے اور آج بھی اہل فرانس اہل جرمنی کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ جرمنی اور فرانس کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ الزام لگائے گا کہ غیر مسلموں کے خلاف اسلام کے احکام آج بھی وہی ہیں جو جنگ بدر اور جنگ احد میں تھے یعنی وہ غیر مسلموں کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی

سازش کر رہا ہے۔ دنیا ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اسلامی تعلیمات اور احکامات کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اسلام کو بد نام کرنے کی کوشش نہ کرے۔ (تفسیر امداد الکرم)

آیۃ مبارکہ:

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٨

لغۃ القرآن: [لِيُحِقَّ : تاکہ وہ حق کرے] [الْحَقَّ : حق کو] [وَيُبْطِلَ : اور باطل کرے] [الْبَاطِلَ : باطل کو] [وَلَوْ : اور اگرچہ] [كَرِهَ : ناپسند کریں] [الْمُجْرِمُوْنَ : مجرم]

ترجمہ: تاکہ (معرکہ بدر اس عظیم کامیابی کے ذریعے) حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل کر دے اگرچہ مجرم لوگ (معرکہ حق و باطل کی اس نتیجہ خیزی کو) ناپسند ہی کرتے رہیں

تشریح:

(تاکہ حق کو حق اور ناحق کو واضح فرمادے)

یعنی دین اسلام کو غالب فرمادے اور اپنے محبوب کو کامیاب فرمائے اور کفر کو نمایاں کر دے اور مشرکین کو کمزور و ناتواں کر دے تاکہ وہ اہل حق کے مقابلے میں سر اٹھانے کے لائق نہ رہ جائیں (گو برا مانیں) اور ناپسند کریں (مجرم لوگ)۔ ظاہر ہے کہ کافر کب چاہیں گے کہ وہ ذلیل و خوار ہوں اور اسلام کو غلبہ و استیلاء حاصل ہو۔ مگر ایمان والو! تمہاری تو پہلی خواہش یہی ہونی چاہیے کہ دین و اسلام کا بول بالا ہو اور مسلمان قوم ساری قوموں پر غاب و قاہر رہے۔

سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ وہ حق کو ثابت کرے گا اور ناحق کو باطل فرمائیگا۔

اب آگے ارشاد فرما رہا ہے جو لوگ دین حق پر قائم ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ سے کسی مصیبت۔۔ یا۔۔ امتحان کے موقع پر فریاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتا ہے۔۔ چنانچہ۔۔ اے محبوب! یاد کرو اپنے صحابہ کو یاد کرا دو اس واقعہ کو۔۔ (تفسیر اشرفی)

جیسا کہ پہلے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ سورۃ انفال کے زیادہ تر مضامین کا موضوع غزوہ بدر اور اس سے متعلقہ واقعات و مسائل وغیرہ ہیں، ان آیات میں بھی واقعہ غزوہ بدر کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ بدر اور اس کا پس منظر اختصار کے ساتھ یہاں پیش کر دیا جائے، تاکہ متعلقہ آیات کا مفہوم سمجھنا آسان ہو۔

غزوہ بدر اور اس کا پس منظر

کفار مکہ کی طرف سے تیرہ سالہ مکی دور میں جس ظلم و ستم کو روا رکھا گیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، بالآخر ۱۲ نبوی میں مدینہ منورہ کے ستر نفوس پر مشتمل ایک وفد نے حج کے موقع پر جمرات کے قریب ایک گھاٹی کے دامن میں نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام پیروکاروں کو اپنے شہر چلنے اور وہیں قیام کی دعوت دی، اہل مدینہ کی طرف سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ دعوت محض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے امام و پیشوا، فرماں روا اور اللہ تعالیٰ کے ایک معزز نبی و رسول ہونے کی حیثیت سے تھی، اور ان لوگوں نے اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو کر یہ دعوت دی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے ہاں لے جانا، پورے عرب سے اعلان جنگ کے مترادف ہے، جیسا کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار کی باہمی مشاورت اور ان کے مکالمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے، چنانچہ دعوت ہجرت قبول کر لیئے جانے کے بعد صحابہ کرام یا چھوٹی بڑی جماعتوں کی شکل میں مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے لگے، جب قریش کو یہ یقین ہونے لگا کہ اب محمد ((صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) بھی مکہ سے مدینہ منتقل ہو جائیں گے تو انہوں نے باہمی مشاورت سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو معاذ اللہ قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حسن تدبیر سے خاک میں ملا دیا اور آپ نے اپنے رفیق سفر حضرت ابو بکر صدیق (رض) کی معیت میں بحفاظت مدینہ منورہ پہنچ گئے قریش آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہجرت سے روکنے اور اپنے منصوبہ قتل کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے تو انہوں نے مدینہ کے سردار عبداللہ بن ابی، جسے اہل مدینہ اپنا حاکم بنانے پر رضامند ہو چکے تھے، لیکن ہجرت نبوت سے اسے اپنے اقتدار کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی غروب ہوتا نظر آنے لگا تھا، کو خط لکھا کہ تم لوگوں نے محمد ((صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) اور ان کے ساتھیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، یا تم خود ان سے لڑو یا انہیں نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے، تمہارے مردوں کو قتل کریں گے اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔ اس کے بعد قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عمرے کے لیے مکہ مکرمہ گئے تو ابو جہل نے ان سے کہا: کہ تم نے ہمارے دین سے پھر جانے والوں کو پناہ دی ہے اور تم ان کی نصرت و اعانت کا بھرپور عزم بھی رکھتے ہو، اس کے باوجود تم یہاں مکہ میں بڑے اطمینان سے طواف بھی کر رہے ہو؟ اگر آج تم ابو صفوان امیہ بن خلف کی پناہ میں نہ ہوتے تو زندہ بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے، حضرت سعد (رض) نے جواب دیا: اللہ کی قسم اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمہیں اس سے شدید تر چیز یعنی مدینہ جو تمہاری گذر گاہ ہے اس سے گذرنے سے روک دوں گا، گویا یہ اہل مکہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان عمرہ وغیرہ کے لیے مکہ نہیں آ سکتے، ان کے لیے مکہ آنے پر پابندی ہے، اہل مدینہ کی طرف سے اس کا جواب یہ تھا کہ شام کا تجارتی راستہ اہل مکہ کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوگا، چنانچہ اس قرار داد کے بعد ہجرت کے پہلے سال ہی سریہ حمزہ (رض) سریہ عبیدہ بن حارث (رض) اور سریہ سعد بن ابی وقاص (رض) قافلۂ قریش کے تعاقب میں روانہ کیے گئے، پھر ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ ابواء، غزوۂ بواط، غزوۂ عشیرہ پیش آئے، ان غزوات میں قافلۂ قریش کا تعاقب مقصود تھا، اس دوران کفار مکہ کی طرف سے بھی مسلمانوں کے تعاقب اور ان کے جانور لوٹنے کے واقعات پیش آئے، چنانچہ جمادی الاولی ۲ ہجری میں غزوہ بدر اولی اپنی شب خون مارنے والوں اور جانور لوٹنے والوں کے تعاقب میں پیش آیا۔ حالات کے اس پس منظر میں رمضان المبارک ۲ھ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ ابو سفیان ایک بڑا تجارتی قافلہ لے کر شام سے مکہ واپس جا رہے ہیں۔ یہ قافلہ پچاس ہزار دینار کا نفع بخش کاروبار کر کے واپس لوٹ رہا تھا اور تقریباً مکہ کا ہر فرد اس تجارتی

قافلہ کے کاروبار میں شریک تھا، حسب حالات نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس قافلے کے تعاقب کا ارادہ فرمایا، ۱۲ رمضان المبارک ۲ھ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تین سو تیرہ صحابہ کرام خان کی معیت میں اس کاروان تجارت کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ چونکہ ابو جہل کی دھمکی کے بعد جانبین سے اس قسم کے واقعات پیش آرہے تھے، اور اس تجارتی قافلہ کا نفع مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونا تھا، جیسا کہ ہوالہٰذا یہ تعاقب کسی بھی اعتبار سے قابل اشکال نہیں ہے، اور اس تعاقب کو ایک پرامن تجارتی قافلے کا تعاقب اور اس پر حملہ قرار دینا بھی قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ دشمن کی طاقت کو توڑنا اور اپنے خلاف استعمال ہونے سے پہلے ہی اسے کمزور کرنا ہر اس شخص کی سمجھ میں آنے والی بات ہے جو معمولی سی بھی سمجھ بوجھ رکھتا ہے، چونکہ مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت باقاعدہ کسی جنگی محاذ کے لیے نہیں بلکہ قافلہ قریش کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی اور تیاری کا زیادہ وقت بھی نہیں تھا، لہٰذا جو حضرات بخوشی اور بآسانی تیار ہو کر ساتھ جاسکے، بس وہی روانہ ہوئے، سردست جو اسباب مہیا تھے، انہیں پہ اکتفا کیا گیا، چنانچہ اس لشکر میں صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے، مدینہ منورہ سے ایک میل کے فاصلے پر واقع بئر ابی عنبہ پہنچ کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لشکر کا جائزہ لیا، کم عمر بچوں کو واپس کیا، ادھر تجارتی قافلہ کے سردار ابوسفیان کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان ہمارے تعاقب میں روانہ ہو چکے ہیں تو انہوں نے فوراً اپنا راستہ تبدیل کر کے بحر احمر کا ساحلی راستہ اختیار کیا اور ضمضم غفاری کو اجرت دے کر قریش کو اطلاع دینے کے لیے روانہ کیا، مکہ میں اطلاع پہنچتے ہی ایک کہرام مچ گیا، چنانچہ ابو جہل کی سرکردگی میں مانے ہوئے شہسواروں، جنگجو نوجوانوں اور اشراف قریش پر مشتمل ایک ہزار افراد پر مشتمل جنگی لشکر تیار ہو گیا، جو ایک سو گھوڑوں، سات سو اونٹوں اور ناچنے گانے والی عورتوں کے ساتھ روانہ ہوا، مقام صفراپر پہنچ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو معلوم ہوا کہ تجارتی قافلہ بحفاظت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اس قافلہ کی حفاظت کے لیے مکہ سے قریش کا لشکر روانہ ہو کر بدر کے قریب پہنچ گیا ہے، ابوسفیان نے لشکر قریش کو پیغام بھیجا کہ تجارتی قافلہ بحفاظت نکل آیا ہے، لہٰذا تم واپس ہو جاؤ، لیکن ابو جہل نہ مانا، اس کا اصرار تھا کہ بدر میں تین دن جشن منا کر واپس ہوں گے، ان حالات میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام خان سے مشورہ فرمایا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ مدینہ واپس چلے جائیں یا ابو جہل کے لشکر سے مقابلہ کریں؟ ابتداء صحابہ کرام (رض) بیان میں رائے کا کچھ اختلاف ہوا، حضرت ابو بکر صدیق (رض)، حضرت عمر (رض)، حضرت مقداد (رض) اور انصار میں حضرت سعد بن معاذ (رض) نے اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا، چنانچہ ابو جہل کے لشکر سے لڑنے کا فیصلہ ہوا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ان دو جماعتوں میں سے ایک جماعت پر غلبہ کا وعدہ فرمایا ہے، صحابہ کرام نام کی منشاء یہ تھی کہ ابوسفیان کے قافلہ سے مقابلہ ہو، کیونکہ اس میں خطرات کم اور فوائد زیادہ تھے، آیت میں اسی کو "غیر ذات الشوکۃ" "غیر مسلح جماعت کہا گیا ہے، شوکت کا معنی ہتھیار اور اسلحہ بھی ہے، جبکہ ابو جہل کے لشکر سے مقابلہ میں معاملہ برعکس تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو حق و باطل کا فیصلہ کرنا منظور تھا، چنانچہ

۱۷۔رمضان المبارک ۲ہجری جمعہ کی صبح میدان بدر میں کفر واسلام کی فوجیں آمنے سامنے تھیں

، مبارزۃ کے نعرے لگے اور انفرادی مقابلہ سے معرکہ کا آغاز ہوا، لشکر قریش سے عتبہ، شیبہ اور ولید نکلے، لشکر اسلام سے حضرت حمزہ (رض) ، حضرت علی (رض) اور حضرت عبیدہ بن الحارث مقابلے کے لیے آئے، انہوں نے تینوں کافروں کا کام تمام کیا، عقبہ کے وار سے حضرت عبیدہ (رض) کی ٹانگ کٹ گئی تھی، کچھ دیر بعد انہوں نے شہادت پائی، پھر عام حملہ شروع ہوا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرمائی، قریش کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے، ستر قید ہوئے، چودہ مسلمان شہید ہوئے، قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا، اس طرح کفر کا زور ٹوٹا اور مسلمان فتح عظیم سے سرفراز ہوئے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ مفتی طاہر مسعود)

جناب غامدی صاحب اس سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں:

اِن آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اس کی روشنی میں غزوہ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت و مغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملے کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اس کے لیے قافلہ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہ راہ ان کے لیے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہجرت کے بعد ہی وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلہ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملے کی خبر بھیج دی یا اس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو، بہر حال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھر کم لشکر مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رویا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہونا ہے۔

آں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے صورت حال مبہم انداز میں ان کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہوگا اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین وانصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آ رہی ہے اور اس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ ایک مختصر سی ٹولی ان میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلہ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرۂ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آئے۔ اسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضور نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے، وہ اپنی کمزوری ظاہر کر دیں اور مخلص و منافق میں مرحلہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہو جائے۔“ (تدبر قرآن ۴۳۹/۳) (تفسیر البیان)

آیۃ مبارکہ:

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝۹

لغۃ القرآن: [اِذْ : جب] [تَسْتَغِیْثُوْنَ : تم لوگ مدد کے لیے پکارتے تھے] [رَبَّكُمْ : اپنے رب کو] [فَاسْتَجَابَ : تو اس نے جواب دیا] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [اَنِّیْ : کہ میں] [مُمِدُّ : مدد کرنے والا ہوں] [كُمْ : تمہاری] [بِاَلْفٍ : ایک ہزار سے] [مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ : فرشتوں میں سے] [مُرْدِفِیْنَ : پے در پے]

ترجمہ: (وہ وقت یاد کرو) جب تم اپنے رب سے (مدد کے لئے) فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد قبول فرمالی (اور فرمایا) کہ میں ایک ہزار پے در پے آنے والے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرنے والا ہوں

تشریح: {اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ : یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے۔} شانِ نزول : حضرت عمر بن خطاب (رض) فرماتے ہیں "غزوہ بدر کے دن رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشرکین کو ملاحظہ فرمایا تو وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے ساتھ تین سو انیس مرد تھے۔ سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور اپنے بابرکت ہاتھ پھیلا کر اپنے رب عَزَّوَجَلَّ سے یہ دعا کرنے لگے "یارب! عَزَّوَجَلَّ، تو نے جو مجھ سے وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما۔ یارب! عَزَّوَجَلَّ، تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ عنایت فرما۔ یارب! عَزَّوَجَلَّ، اگر تو اہل اسلام کی اس جماعت کو ہلاک کر دے گا تو زمین میں تیری پرستش نہ ہو گی۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسی طرح دعا کرتے رہے یہاں تک کہ مبارک کندھوں سے چادر شریف اتر گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق (رض) حاضر ہوئے اور چادر مبارک شانہ اقدس پر ڈال کر عرض کی : یا نَبِیَّ اللہ! اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے ساتھ آپ کی مناجات کافی ہو گئی وہ بہت جلد اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔

{اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ : میں ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں۔} چنانچہ پہلے ایک ہزار فرشتے آئے پھر تین ہزار پھر پانچ ہزار۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ مسلمان اس دن کافروں کا تعاقب کرتے تھے اور کافر مسلمانوں کے آگے آگے بھاگتا جاتا تھا کہ اچانک اوپر سے کوڑے کی آواز آتی اور سوار کا یہ کلمہ سنا جاتا تھا "اَقْدِمْ حَیْزُوْمُ" یعنی آگے بڑھ اے حیزوم (حیزوم حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کے گھوڑے کا نام ہے) اور نظر آتا تھا کہ کافر گر کر مر گیا اور اس کی ناک تلوار سے اڑا دی گئی اور چہرہ زخمی ہو گیا۔ صحابہ کرام

(رض) نے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے یہ معائنے بیان کئے تو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ تیسرے آسمان کی مدد ہے۔ (2) (تفسیر صراط الجنان)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ بدر میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں کی قلّت تعداد اور بے سروسامانی دیکھ کر قبلہ رخ کھڑے ہوگئے اور دونوں ہاتھ بلند کر کے اپنے رب کو زور زور سے پکارنے لگے اور عرض کرنے لگے اے میرے اللہ ! تونے جو وعدہ مجھ سے فرمایا تھا آج اسے پورا فرما۔ اے اللہ ! اگر آج مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت ختم ہوگئی تو پھر زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلسل روتے اور یہی فریاد کرتے جاتے تھے حتیٰ کہ آپ کی چادر مبارک نیچے گر گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق (رض) عنہٗ نے آپ کی چادر آپ کے کندھوں پر رکھی اور دامن پکڑ کر عرض کیا اے اللہ کے سچے نبی اپنے اپنے رب کو بہت پکار لیا۔ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ تب یہ آیت مبارکہ اتری : اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ (مسلم کتاب الجہاد حدیث 85۔ ترمذی کتاب التفسیر سورۃ انفال باب 3)

یاد رہے کہ اس آیت میں ایک ہزار فرشتوں کے اترنے کی نوید سنائی گئی ہے، جبکہ سورۃ نساء آیت 124 اور 125 میں فرمایا گیا کہ کیا تمہارے لیے تین ہزار فرشتوں کا اترنا کافی نہیں ؟ ہاں اگر تم صبر عورت کو اپناؤ تو اللہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں اتارا پھر تین ہزار کر دیا پھر اسے پانچ ہزار تک پہنچا دیا تو بدر میں کل 5 ہزار فرشتے نازل ہوئے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمانا کہ اے اللہ اگر یہ مٹھی بھر جماعت ختم ہوگئی تو قیامت تک تیری عبادت نہ ہوگی۔ اہل تشیع کے مشہور محقق ملا باقر مجلسی نے بھی یہ حدیث اپنی کتاب بحار الانوار جلد 19 صفحہ 226 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت میں نقل کیا ہے اور شیو کے مشہور مفسر علی بن ابراہیم قمی نے بھی اسے یوں نقل کیا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : یارب ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد۔ اے میرے رب ! اگر یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ (تفسیر قمی سورۃ انفال صفحہ 244 مطبوعہ تہران)

اس سے معلوم ہوا کہ آج جو دنیا میں اللہ کی عبادت ہو رہی ہے یہ بدر والے صحابہ کرام (رض) کی قربانیوں کا صدقہ ہے جن میں ابو بکر صدیق عمر فاروق اور عثمان غنی (رض) بھی شامل ہیں بلکہ وہ سر فہرست ہیں۔ اس کے باوجود اہل تشیع کا ان کی شان میں گستاخی کرنا کس قدر افسوس ناک ہے۔ (تفسیر برہان القران)

احادیث میں یہی مذکور ہے کہ اس وقت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا فرمارہے تھے، لیکن قرآن مجید میں جمع کا صیغہ ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کرام دعا کر رہے تھے اور بظاہر یہی اقرب ہے کیونکہ صحابہ کرام کو دشمن کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی سے بہت خوف تھا۔ تاہم ان میں یوں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ بنبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا فرمارہے تھے اور صحابہ اس پر آمین کہہ رہے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : اس نے تمہاری دعا قبول فرمالی کہ میں ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمانے والا ہوں۔ اور اللہ نے اس کو صرف تمہارے لیے خوش خبری بنایا تھا تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوں اور نصرت صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔ جنگ بدر میں فرشتوں نے قتال بھی کیا تھا یا نہیں۔ اس میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے، ہم اس سلسلہ میں فرشتوں کے قتال کے متعلق پہلے احادیث اور آثار بیان کریں گے ھر اس مسلہ میں علماء اسلام کے نظریات بیان کریں گے اور آخر میں اپنا موقف پیش کریں گے۔

فنقول و باللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

جنگ بدر میں قتال ملائکہ کے متعلق احادیث اور آثار

قرآن مجید کی مذکور الصدر آیات یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے ہوا تھا اور ان کو فتح اور نصرت کی بشارت دینے کے لیے، قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں نے قتال بھی کیا تھا، البتہ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں نے جنگ بدر میں قتال بھی کیا تھا، ہم پہلے وہ احادیث پیش کریں گے، پھر اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ بدر کے دن فرمایا یہ جبرائیل ہیں جنہوں نے گھوڑے کے سر کو پکڑا ہوا ہے اور ان پر جنگی ہتھیار ہیں۔ (صحیح بخاری ج 3، ص 570، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، 1381ھ)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن ایک مسلمان ایک مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا، جو اس سے آگے تھا، اتنے میں اس نے اپنے اوپر سے ایک کوڑے کی آواز سنی اور ایک گھوڑ سوار کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا "اے حیزوم آگے بڑھ" (حیزوم اس فرشتے کے گھوڑے کا نام تھا) پھر اچانک اس نے دیکھا کہ وہ مشرک اس کے سامنے چت گر پڑا۔ اس مسلمان نے اس مشرک کی طرف دیکھا تو اس کی ناک پر چوٹ تھی اور اس کا چہرہ پھٹ گیا تھا، جیسے کوڑا لگا ہو، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا، اس انصاری نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی۔ (صحیح مسلم ج 2، ص 93، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت، کراچی 1375ھ)

امام محمد بن عمر بن واقد اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

معاذ بن رفاعہ بن رافع اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ فرشتوں کیع لامت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے عماموں کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا، ان کے عماموں کا رنگ سبز، زرد اور سرخ تھا، اور ان کے گھوڑوں کی پیشانیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

ابورہم غفاری اپنے ابن عم سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرا عم زاد بدر کے کنوئیں پر کھڑے ہوئے تھے، جب ہم نے دیکھا کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ لوگوں کی تعداد کم ہے اور قریش کی تعداد زیادہ ہے تو ہم نے کہا جب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوگا تو ہم (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب کے لشکر پر حملہ کریں گے، پھر ہم (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب کی بائیں جانب چلے گئے، اور ہم کہہ رہے تھے کہ یہ تو قریش کے لشکر کا چوتھائی ہیں، ج وقت ہم مسلمانوں کے لشکر کی بائیں جانب جا رہے تھے تو ایک بادل نے آکر ہم کو ڈھانپ لیا، ہم نے اس بادل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ہمیں مردوں اور ہتھیاروں کی آوازیں سنائی دیں، اور ہم نے سنا ایک شخص اپنے گھوڑے سے کہہ رہا تھا "حیزوم آگے بڑھو" اور ہم نے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے ٹھہرو، پیچھے سے آؤ، پھر وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دائیں جانب اترے، پھر ان کی طرح ایک اور جماعت آئی اور وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھی، پھر جب ہم نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کی طرف دیکھا تو وہ قریش سے دگنے نظر آئے، میرا عم زاد فوت ہو گیا، اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔

سائب بن ابی حبیش اسدی، حضرت عمر بن خطاب کے زمانہ میں بیان کر رہے تھے کہ بہ خدا مجھے کسی انسان نے گرفتار نہیں کیا تھا، ان سے پوچھا پھر کس نے گرفتار کیا تھا؟ انھوں نے کہا جب قریش نے شکست کھائی تو میں نے بھی ان کے ساتھ شکست کھائی، مجھے سفید رنگ کے ایک طویل القامت شخص نے گرفتار کیا جو آسمان اور زمین کے درمیان ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار ہو کر آ رہا تھا، اس نے مجھے رسیوں سے باندھ دیا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آئے تو انھوں نے مجھے بندھا ہوا پایا، حضرت عبدالرحمٰن لشکر میں اعلان کر رہے تھے کہ اس شخص کو کس نے گرفتار کیا ہے؟ تو کسی نے بھی یہ دعوی نہیں کیا کہ اس نے مجھے گرفتار کیا ہے، حتی کہ مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے جایا گیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے پوچھا اے ابن ابی حبیش! تم کو کس نے گرفتار کیا ہے؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا اور میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو بتلانا ناپسند کیا، سول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کو فرشتوں میں سے ایک کریم فرشتے نے گرفتار کیا ہے، اے ابن عوف! اپنے قیدی کو لے جاؤ! تو حضرت عبدالرحمٰن مجھے لے گئے۔ سائب نے کہا میں نے ایک عرصہ تک اس بات کو مخفی رکھا اور اپنے اسلام قبول کرنے کو موخر کرتا رہا بالآخر میں مسلمان ہو گیا۔

حضرت حکیم بن حزام (رض) بیان کرتے ہیں (یہ اس وقت اسلام نہیں لائے تھے) میں نے اس دن دیکھا آسمان ایک سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا ہے، اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آسمان سے کوئی چیز آ رہی ہے۔ جس سے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تائید کی گئی ہے، اور اسی وجہ سے شکست ہوئی اور یہ فرشتے تھے۔

امام واقدی بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ ہو رہی تھی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہاتھ اٹھائے ہوئے اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعائیں کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے: "اے اللہ! اپنا وعدہ پورا فرما" اور کہہ رہے تھے: اے اللہ! اگر آج یہ جماعت مغلوب ہو گئی تو پھر شرک غالب ہو جائے گا اور تیرا دین قائم نہیں ہو سکے گا" اور حضرت ابو بکر آپ سے کہہ رہے تھے کہ بہ خدا! اللہ آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ کو سرخرو کرے گا، پھر اللہ عزوجل نے دشمن کی جانب ایک ہزار لگاتار فرشتے نازل کیے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! اے ابو بکر! خوشخبری ہو! یہ جبرائیل ہیں جو زرد عمامہ باندھے ہوئے ہیں، ان کے دانتوں پر غبار ہے وہ آسمان اور زمین کے درمیان اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے آ رہے ہیں، جب وہ زمین پر اترے تو ایک ساعت کے لیے مجھ سے غائب ہوئے، پھر ظاہر ہوئے اور کہہ رہے تھے کہ جب آپ نے مدد طلب کی تو اللہ کی مدد آ گئی۔

امام واقدی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی مٹھی میں کنکریاں لیں اور یہ کہہ کر کفار کی طرف پھینکیں کہ ان کے چہرے بگڑ جائیں، اے اللہ! ان کے دلوں پر رعب طاری کر! اور ان کے قدم اکھاڑ دے، پھر اللہ کے دشمن شکست کھا گئے اور مسلمان، کافروں کو قتل کر رہے تھے اور کفار کو قید کر رہے تھے۔ اور مشرکوں کے چہرے اور ان کی آنکھیں خاک میں اٹی ہوئی تھیں اور ان کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ خاک کہاں سے آئی اور مومنین اور فرشتے ان کو قتل کر رہے تھے۔ (کتاب المغازی، ج 1، ص 75۔ 81، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، الطبعہ الثلاثہ)

امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت مالک بن ربیعہ (رض) جنگ بدر کے دن حاضر تھے۔ انھوں نے اپنی بینائی چلے جانے کے بعد کہا اگر میں تمہارے ساتھ اس وقت بدر میں ہوتا اور میں بینا بھی ہوتا تو میں تمہیں وہ گھاٹی دکھاتا جہاں سے فرشتے نکلے تھے۔ (دلائل النبوۃ ج 3، ص 81، جامع البیان ج 4، ص 50، سیرت ابن ہشام ج 2، ص 274)

امام ابن جوزی لکھتے ہیں :
حضرت ابوداود مازنی نے کہا میں جنگ بدر کے دن مشرکین میں سے ایک شخص کا پیچھا کر رہا تھا تا کہ میں اس کو قتل کروں۔ سو میرے تلوار مارنے سے پہلے ہی اس کا سر کٹ کر گر گیا تو میں نے جان لیا کہ میرے علاوہ کسی اور نے اس کو قتل کیا ہے۔ (زاد المسیر ج 1، ص 452۔ 453۔ سیرت ابن ہشام ج 1، ص 633۔ جامع البیان ج 4، ص 50)
امام ابن جریر طبری روایت کرتے ہیں :
عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا کہ جنگ بدر کے بعد ابوسفیان مکہ کے لوگوں میں جنگ کے احوال بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا ہم نے زمین اور آسمان کے درمیان سفید رنگ کے سوار دیکھے جو چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے، وہ ہم کو قتل کر رہے تھے اور ہم کو قید کر رہے تھے، ابو رافع نے کہا وہ فرشتے تھے۔
مقسم بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا جس شخص نے عباس کو گرفتار کیا وہ حضرت ابوالیسر تھے۔ حضرت ابوالیسر دبلے پتلے آدمی تھے اور عباس بہت جسیم تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوالیسر سے پوچھا تم نے عباس پر کیسے قابو پایا؟ انھوں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شخص نے میری مدد کی تھی میں نے اس کو اس سے پہلے نہ دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک معزز فرشتے نے تمہاری مدد کی تھی۔
مقسم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا یوم بدر کے سوا ملائکہ نے کسی دن بھی قتال نہیں کیا، باقی ایام میں وہ عددی قوت اور مدد کے لیے آتے تھے، قتال نہیں کرتے تھے۔
حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم جب تک اللہ نے چاہا قریظہ اور نضیر کا محاصرہ کرتے رہے، اور ہم کو فتح حاصل نہیں ہوئی، پھر ہم واپس آگئے، سو جس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے گھر میں اپنا سر دھو رہے تھے، اچانک آپ کے پاس جبرائیل ائے اور کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے اپنا اسلحہ اتار دیا اور فرشتوں نے ابھی اپنے ہتھیار نہیں اتارے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک کپڑا منگایا اور اس کو سر پر لپیٹا اور سر نہیں دھویا، پھر آپ نے ہمیں بلایا ہم سب آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حتی کہ ہم قریظہ اور نضیر کے پاس پہنچے، اس دن اللہ تعالیٰ نے ہماری تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد فرمائی، اور اللہ تعالیٰ نے ہمٰں فتح عطا فرمائی اور ہم اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے۔ (جامع البیان، جز 4، ص 50۔ 52)
امام محمد بن اسماعیل (رض) بیان کرتی ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ خندق سے واپس آئے تو آپ نے ہتھیار اتار دیے اور غسل فرمایا، آپ کے پاس جبرائیل آئے اور کہا آپ نے ہتھیار اتار دیے بخدا ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے آپ ان کی طرف نکلیے آپ نے پوچھا کس طرح؟ جبرائیل نے کہا ادھر اور بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا سو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی طرف روانہ ہوئے۔
حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں، جبرائیل کے چلنے سے بنو غنم کی گلیوں میں غبار بلند ہو رہا تھا، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ (صحیح بخاری ج 2، ص 590، 591، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)
فرشتوں کے قتال کے متعلق جس قدر اہم روایات ہم کو دستیاب ہوئیں ہم نے ان سب کو یہاں ذکر کر دیا ہے فرشتوں کی آمد کا معاملہ تو کئی غزوات میں فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لیے نازل ہوئے، لیکن فرشتوں کا نزول ان کے جنگ کرنے کو مستلزم نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی عددی قوت کو بڑھانے کے لیے، ان کی دلجمعی کے لیے، ان کو مطمئن کرنے کے لیے، جنگ میں ان کو ثابت قدم رکھنے کے لیے، دشمنوں پر

رعب طاری کرنے کے لیے اور ان کو فتح اور نصر کی بشارت دینے کے لیے فرشتوں کا نزول ہوا تھا، انھوں نے کفار کے خلاف جنگ میں عملًا حصہ نہیں لیا کیونکہ انسانوں کا فرشتوں سے مقابلہ کرانا اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کی حکمت کے خلاف ہے، مقابلہ ایک جنس کے افراد میں ہوا کرتا ہے، جن روایات میں یہ ذکر ہے کہ فرشتوں نے کفار سے قتال کیا تھا ان میں بعض سنداً ضعیف ہیں اور بعض میں تاویل اور توجیہ ہے۔

جنگ بدر میں قتال ملائکہ کے متعلق مفسرین اسلام کی آراء

امام ابو جعفر محمد ابن جریر طبری متوفی 310ھ لکھتے ہیں:

جنگ بدر میں فرشتوں کے نازل کرنے کی آیات ہیں۔ ان کی تفسیر میں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے یہ خبر دی کہ آپ نے مسلمانوں سے یہ فرمایا کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کرے، سو اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ فرمالیا، پھر ان سے پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ فرمالیا، بشرطیکہ وہ دشمن کے مقابلہ میں صبر کریں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں اور ان آیتوں میں اس پر دلیل نہیں کہ ان کی تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی اور نہ اس پر دلیل ہے کہ ان کی پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی اور نہ اس پر دلیل ہے کہ ان کی مدد نہیں کی گئی تھی، اس لیے فرشتوں کا مدد کرنا اور نہ کرنا دونوں امر جائز ہیں، اور ہمارے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی یا پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی، اور بغیر کسی صحیح حدیث کے ان میں سے کسی چیز کا قول کرنا جائز نہیں ہے، البتہ قرآن مجید میں یہ دلیل ضروری ہے جنگ بدر میں مسلمانوں کی ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی اور وہ یہ آیت ہے: "اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ: جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں تمہاری ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے مدد کرنے والا ہوں" (جامع البیان ج 4، ص 53، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، 1409ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

اہل تفسیر اور اہل سیرت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کے دن فرشتوں کو نازل کیا اور انھوں نے کفار سے قتال کیا، حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا فرشتوں نے جنگ بدر کے سوا اور کسی دن قتال نہیں کیا اور باقی غزوات میں فرشتے عددی قوت کے اظہار اور مدد کے لیے نازل کیے گئے تھے، لیکن انھوں نے عملی طور پر قتال میں کوئی حصہ نہیں لیا، اور یہی جمہور کا قول ہے۔ لیکن ابو بکر اصم نے اس کا بڑی شدت کے ساتھ انکار کیا ہے اور ان کے حسب ذیل دلائل ہیں:

1۔ تمام روئے زمین کو تباہ کرنے کے لیے ایک فرشتہ کافی ہے، حضرت جبرائیل نے اپنے ایک پر سے قوم لوط کے چار شہروں کی زمین تحت الثری سے لے کر آسمان تک اٹھایا پھر اس کو زمین پر پلٹ کر پھینک دیا اور قوم لوط تباہ ہو گئی تو پھر جنگ بدر کے دن ان کو کافروں سے لڑنے کی کیا حاجت تھی؟ پھر ان کے ہوتے ہوئے باقی فرشتوں کی کیا ضرورت تھی۔

2۔ قتل کیے جانے والے تمام بڑے بڑے کافر مشہور تھے اور یہ معلوم تھا کہ فلاں کافر کو فلاں صحابی نے قتل کیا ہے تو پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا تھا۔

3۔ اگر فرشتے کفار کو انسانی شکل میں نظر آ رہے تھے تو پھر مسلمانوں کے لشکر کی تعداد تیرہ سو یا تین ہزار یا اس سے زائد ہو جائے گا حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کافروں سے کم تھی، اور اگر وہ غیر انسانی شکل میں تھے تو کفار پر سخت رعب طاری ہونا چاہیے تھا حالانکہ یہ منقول نہیں ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس قسم کے شبہات وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو قرآن مجید اور نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو لیکن جو قرآن مجید اور احادیث پر ایمان رکھتا ہو اس سے اس قسم کے شبہات بہت بعید ہیں، سو ابو بکر اصم کے لائق نہیں ہے کہ وہ فرشتوں کے قتال کا انکار کرے جب کہ قرآن مجید میں فرشتوں کی مدد کرنے کا ذکر ہے اور فرشتوں کے قتال کرنے کے متعلق جو احادیث ہیں وہ تواتر کے قریب ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب قریش جنگ احد سے واپس ہوئے تو وہ آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ اس مرتبہ ہم نے وہ چتکبرے گھوڑے اور سفید پوش انسان نہیں دیکھے جن کو ہم نے جنگ بدر میں دیکھا تھا، ابو بکر اصم کے شبہات کا جب ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں جائزہ لیتے ہیں تو وہ زائل ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ اپنے کسی کام پر کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ (تفسیر کبیر ج 3 ص 45، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1398 ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668 ھ لکھتے ہیں :

حضرت سہل بن حنیف (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نے جنگ بدر کے دن دیکھا کہ ہم کسی مشرک پر تلوار مارتے اور ہماری تلوار پہنچنے سے پہلے اس کا سر دھڑ سے الگ ہو جاتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭسَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ : جب آپ کے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، عنقریب میں کافروں کے دلوں پر رعب طاری کروں گا، تم کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑ کے اوپر ضرب لگاؤ" (الانفال : 12)۔

حضرت ربیع بن انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر کے دن فرشتوں کے ہاتھوں قتل کیے ہوئے کافر الگ پہچانے جاتے تھے، ان کی گردنوں کے اوپر تلوار کے وار تھے اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب تھی، اور ہر ضرب ایسی تھی جیسے آگ سے جلی ہوئی ہو، امام بیہقی نے ان تمام کافروں کا ذکر کیا ہے، اور بعض علماء نے کہا ہے کہ فرشتے قتل کرتے تھے اور کافروں میں ان کی ضرب کی علامت صاف ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ وہ ضرب لگاتے تھے وہ جگہ آگ سے جل جاتی تھی۔ حتی کہ ابو جہل نے حضرت ابن مسعود (رض) سے پوچھا کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ مجھے اس شخص نے قتل کیا کہ باوجود میری پوری کوشش کے میرا نیزہ اس کے گھوڑے تک نہیں پہنچ سکا، اور اس قدر زیادہ فرشتے نازل کرنے کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل پر سکون رہیں، اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ان فرشتوں کو مجاہد بنا دیا، سو ہر وہ لشکر جو صبر وضبط سے کام لے اور محض ثواب کی نیت سے لڑے فرشتے آ کر اس کے ساتھ قتال کرتے ہیں، حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا کہ جنگ بدر کے سوا اور کسی جنگ میں فرشتوں نے قتال نہیں کیا اور باقی غزوات میں وہ صرف عددی قوت کے اظہار اور مدد کے لیے آتے تھے، اور بعض علماء نے کہا کہ یہ کثرت فرشتوں کو نازل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دعا کریں، تسبیح پڑھیں اور لڑنے والوں کی عددی قوت میں اضافہ کریں، اس قول کی بناء پر فرشتوں نے جنگ بدر میں بھی قتال نہیں کیا وہ صرف دعا کرنے کے لیے اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ لیکن پہلی رائے کے قائلین زیادہ ہیں۔

قتادہ نے کہا پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جنگ بدر میں مدد کی گئی تھی۔ حسن نے کہا یہ پانچ ہزار فرشتے قیامت تک مسلمانوں کے مدد گار ہیں۔ شعبی نے کہا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کرنا چاہتا ہے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں پر یہ خبر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: کیا تمہاری لیے یہ کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے۔ ہاں کیوں نہیں! اگر تم ثابت قدم رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو جس آن دشمن تم پر چڑھائی کریں گے اسی آن اللہ (تین ہزار کی بجائے) پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ (آل عمران: 124۔125) کرز کو جب مشرکوں کی شکست کی خبر پہنچی تو وہ ان کی مدد کے لیے نہیں آیا اور لوٹ گیا، اور اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کی مدد کے لیے پانچ ہزار فرشتے نہیں بھیجے اور ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی مدد کی گئی تھی، ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنگ بدر کے دن یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت پر ثابت قدم رہیں اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈریں اور بچیں تو اللہ تعالیٰ ان کی تمام جنگوں میں مدد فرمائے گا اور مسلمان جنگ خندق کے سوا اور کسی جنگ میں ثابت قدم نہیں رہے اور صرف اسی جنگ میں نافرمانی سے ڈرے تو جب انھوں نے قریظہ کا محاصرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی (انزال) ملائکہ سے مدد فرائی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے متعلق ہے اگر وہ اس میں ثابت قدم رہتے اور نافرمانی نہ کرتے تو پانچ ہزار فرشتوں سے ان کی مدد کی جاتی۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) سے یہ حدیث ثابت ہے کہ میں جنگ بدر کے دن دو سفید پوش آدمیوں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دائیں اور بائیں بہت شدت سے قتال کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے پہلے اور اس کے بعد ان آدمیوں کو نہیں دیکھا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ وعدہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص ہو اور عام صحابہ کی فرشتوں کے قتال سے مدد نہ کی گئی ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج 4، ص 194۔195، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

مفتی محمد عبدہ لکھتے ہیں:

فرشتوں کی مدد معنوی تھی جس سے مسلمان ثابت قدم رہے اور ان کے ارادے پختہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اللہ نے ان (فرشتوں کے نازل کرنے) کو محض تمہیں خوشخبری دینے کے لیے کیا ہے اور تاکہ اس سے تمہارے دل مطمئن رہیں اور (درحقیقت) مدد تو صرف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ (آل عمران: 126) یعنی تاکہ کفار کے لشکر کی کثرت کو دیکھ کر تمہارے دلوں میں گھبراہٹ پیدا نہ ہو، سو تمہاری تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل کیے، اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو تم سے فرشتوں کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ محض تمہیں خوشخبری دینے اور تمہاری تسکین کے لیے ہے، کیونکہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے اس کو نقل فرمایا ہے، اور فرشتوں کی مدد کا محمل یہ ہے کہ اس سے دشمن کے دل میں رعب واقع ہوگا اور خوف پیدا ہوگا اور مسلمان جنگ میں ثابت قدم رہیں گے اور فرشتے ان کو جنگ کے متعلق عمدہ تدبیریں القاء کریں گے۔ چنانچہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وادی کے قریب ترین راستے میں اتر گئے تھے اور آپ نے اس راستہ کو دشمن سے مخفی رکھا اور آپ نے بہت مناسب جگہ لشکر کو ٹھہرایا اور لشکر کی پشت پہاڑ کی طرف رکھی اور تیر اندازوں کو پیچھے کھڑا کیا، اگر ان تدبیروں میں سے کوئی تدبیر بھی بروئے کار نہ لائی جاتی تو مشکل پیش آتی۔

بعض سیرت کی کتابوں میں مذکورہ ہے کہ فرشتوں نے جنگ احد میں لڑائی میں حصہ لیا، امام ابن حجر نے اس کی نفی کی ہے اور حضرت ابن عباس نے یہ روایت نقل کی ہے کہ فرشتوں نے صرف جنگ بدر میں قتال کیا ہے اور کسی جنگ میں قتال نہیں کیا، ابو بکر اصم نے اس کا بہت

شدت سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک فرشتہ ہی تمام روئے زمین کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے، اتنے فرشتے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، نیز ہر کافر کے متعلق معلوم ہے کہ اس کو فلاں صحابی نے قتل کیا ہے پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا تھا، نیز اگر فرشتے انسانی شکلوں میں دکھائی دے رہے تھے تو مسلمانوں کی تعداد کافروں سے بہت زیادہ ہو گئی تھی، حالانکہ قرآن مجید میں ہے: " ویقللکم فی اعینھم: اور اللہ تم کو ان کی نگاہوں میں کم دکھا رہا تھا" (الانفال: 44)

اور اگر فرشتے انسانی شکلوں میں نظر آ رہے تھے تو لازم آئے گا کہ بغیر کسی فاعل کے سر کٹ کٹ کر گر رہے ہوں، پیٹ چاک ہو رہے ہوں اور اعضاء کٹ کٹ کر گر رہے ہوں اور یہ بہت عظیم معجزہ تھا اور اس کو تواتر سے نقل ہونا چاہیے تھا۔

امام رازی نے جو ابو بکر اصم کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابو بکر اصم کا یہ قول قرآن مجید کے خلاف ہے تو قرآن مجید میں کہیں یہ نص صریح نہیں ہے کہ فرشوں نے بالفعل قتال کیا ہے، البتہ سورۃ انفال میں غزوہ بدر کے سیاق میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کرے گا، اور اس مدد کا یہ معنی ہے کہ فرشتے مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رکھیں گے اور ان کی نیت درست رکھیں گے کیونکہ فرشتوں انسانوں میں الہام وغیرہ کے ساتھ تاثیر کرتے ہیں، اور اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے کہ اور اللہ نے اس (نزول ملائکہ) کو محض تمہیں خوشخبری دینے کے لیے کیا ہے اور تاکہ اس سے تمہارے دل مطمئن رہیں۔ (آل عمران: 126۔ الانفال: 10)

باقی رہا یہ کہ اس میں کیا حکمت تھی کہ جنگ بدر کے دن فرشتوں کی مدد آئی اور جنگ احد کے دن نہیں آئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے احوال ان دنوں میں مختلف تھے، جنگ بدر کے دن مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی اور کسی پر نظر نہیں تھی اور انھوں نے اس جنگ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مکمل اطاعت کی، اور جنگ احد میں سب مسلمانوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مکمل اطاعت نہیں کی بلکہ بعض مسلمان آپ کی مقرر کی ہوئی جگہ سے ہٹ گئے تھے۔ (المنار ج 4، ص 112۔115، ملخصاً مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی 685ھ لکھتے ہیں۔

فرشتوں کے قتال کرنے میں اختلاف ہے اور بعض احادیث فرشتوں کے قتال کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ (انوار التنزیل ص 235، مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع، مصر)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی 1069ھ لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ فرشتوں نے کفار کے خلاف قتال کیا تھا یا قتال نہیں کیا تھا، بلکہ فرشتوں کا نازل ہونا صرف مسلمانوں کی تقویت کے لیے تھا اور ان کے دشمنوں کو کمزور کرنے کے لیے تھا، اس کی تفصیل "کشاف" میں ہے۔ (عنایہ القاضی، ج 4، ص 256، مطبوعہ دار صادر، بیروت، 383)

علامہ جار اللہ محمود بن عمر وزمخشری متوفی 528ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا غزوہ بدر میں فرشتوں کو بھیجنا صرف تمہیں مدد کی بشارت دینے کے لیے تھا، جیسے بنی اسرائیل کے لیے سکینہ کو نازل کیا گیا تھا۔ یعنی تم نے اپنے قلّت تعداد اور ضعف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا اور فریاد کی تو تمہیں مدد کی بشارت دینے کے لیے فرشتوں کو نازل فرمایا تاکہ تمہیں سکون حاصل ہو اور تمہارے دل مطمئن ہوں اور (حقیقت میں) امداد صرف اللہ کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ

تم یہ نہ گمان کرو کہ فرشتوں نے مدد کی ہے، کیونکہ تمہاری اور فرشتوں کی مدد کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور فرشتوں کی مدد کرنا اللہ کی طرف سے بطور اسباب ہے اور جس کی اللہ مدد فرمائے وہی منصور ہے۔ (الکشاف ج 2، ص 202، مطبوعہ ایران، 1413ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل نے اس امداد کو محض بشارت اور مسلمانوں کے دلوں کے اطمینان کے لیے نازل کیا ہے، اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ فرشتوں نے قتال نہیں کیا اور یہ بعض علماء کا مذہب ہے، اور بعض احادیث میں اس کی دلیل ہے حضرت ابواسید نے نابینا ہونے کے بعد کہا اگر میں اس وقت بدر میں ہوتا اور بینا ہوتا تو تم کو وہ گھاٹی دکھاتا جس سے فرشتے نکل رہے تھے۔ (روح المعانی ج 9، ص 174، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

قرآن مجید میں صراحتًہ یہ مذکور نہیں ہے کہ فرشتوں نے جنگ بدر میں قتال کیا، البتہ سورۃ انفال کی اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے: " اِذۡ يُوۡحِىۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ اَنِّىۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ‌ؕ سَاُلۡقِىۡ فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ وَاضۡرِبُوۡا مِنۡهُمۡ كُلَّ بَنَانٍ: جب آپ کے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تو تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، عنقریب میں کافروں کے دلوں میں رعب طاری کروں گا، تم کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑ کے اوپر ضرب لگاؤ" (الانفال: 12)

علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں: اس آیت سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرشتوں نے بالفعل لڑائی میں حصہ لیا، لیکن جن حضرات نے اس مستبعد جانا ہے ان کا خیال ہے کہ فاضربوا میں خطاب مومنین سے ہے اور انھیں مارنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ لیکن اس آیت کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے۔ (ضیاء القرآن، ج 2، ص 134، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

علامہ ابو محمد ابن عطیہ اندلسی متوفی 546ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں یا تو فرشتوں سے خطاب ہے کہ تم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور یا مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم کافروں کو قتل کرو۔ (المحرر الوجیز ج 8، ص 27، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ، مکہ مکرمہ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں ان علماء کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ فرشتوں نے قتال کیا تھا، اور جو علماء یہ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے قتل نہیں کیا تھا وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرشتوں کے قول کی حکایت کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رکھتے تھے، ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور فرشتے مومنوں سے یہ کہتے تھے کہ تم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔ (روح المعانی، ج 9، ص 187، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیرت)

علامہ ابو الحیان اندلسی متوفی 754ھ لکھتے ہیں: جو معنی واضح ہے وہ یہی ہے کہ اس آیت میں فرشتوں کے ثابت قدم رکھنے کی تفسیر ہے اور فرشتے مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔ البحر المحیط، ج 5، ص 285، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1412ھ)

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی 1369ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

روایات میں ہے بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کیے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ (تفسیر بر حاشیہ قرآن، مطبوعہ سعودی عربیہ)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ اس آیت کی تفسیر لکھتے ہیں :

ابو داؤد مازنی جو بدر میں حاضر ہوئے تھے فرماتے ہیں کہ میں ایک مشرک کی گردن مارنے کے لیے اس کے درپے ہوا۔ اس کر سر میری تلوار کے پہنچنے سے پہلے ہی کٹ کر گر گیا تو میں نے جان لیا کہ اس کو کسی اور نے قتل کیا۔ (تفسیر بر حاشیہ قرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

سید ابو الاعلی مودودی متوفی 1399ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

جو اصولی باتیں ہم کو قرآن کے ذریعہ سے معلوم ہیں ان کی بناء پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام نہیں لیا ہو گا کہ وہ خود حرب و ضرب کا کام کریں، بلکہ شاید اس کی صورت یہ ہو گی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں کی مدد سے ٹھیک بیٹھے اور کاری لگے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (تفہیم القرآن، ج 2، ص 134، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)

مفتی محمد شفیع کا کلام اس مسئلہ میں واضح نہیں ہے، انھوں نے دو ٹوک طریقے سے نہ تو فرشتوں کے قتال کا قول کیا ہے اور نہ صراحۃً اس کی نفی کی ہے۔ سورۃ آل عمران کی تفسیر میں قتال ملائکہ کی بعض روایات نقل کر کے لکھتے ہیں :

یہ سب مشاہدات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کہ اللہ نے مسلمانوں کو اپنی نصرت کا یقین دلانے کے لیے کچھ کچھ کام ایسے بھی کیا ہے کہ گویا وہ بھی قتال میں شریک ہیں اور دراصل ان کا کام مسلمانوں کی تسلی اور تقویت قلب تھا۔ فرشتوں کے ذریعہ میدان جنگ فتح کرانا مقصود نہیں تھا، اس کی واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں جنگ و جہاد کے فرائض انسانوں پر عائد کیے گئے ہیں اور اسی وجہ سے ان کو فضائل و درجات حاصل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ فرشتوں کے لشکر سے ملک فتح کرائے جائیں تو دنیا میں کفر و کافر کا نام ہی نہ رہتا، حکومت و سلطنت کی تو کیا گنجائش تھی، مگر اس کارخانہ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہی نہیں۔ (معارف القرآن، ج 4، ص 174، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، 1397ھ)

اور سورۃ انفال کی زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کیے گئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں۔ یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آ کر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں، اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور ان میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی ان کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیے۔ مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت و قوت بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا، اور اس کی تائید چند روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر در منثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتال ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرام سے نقل کی ہیں۔ (معارف القرآن، ج 4، ص 197، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی، 1397ھ)

شیخ امین احسن اصلاح متوفی 1417ھ لکھتے ہیں :

اس زمانہ کے بعض کم سوادوں نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کی فوج اتارنے کا وعدہ محض مسلمانوں کو ذرا بڑھاوا دینے کے لیے تھا تاکہ وہ ہمت کر کے کفار سے بھڑ جائیں۔ ان کے خیال میں قرآن نے جنگ کے بعد خود یہ راز کھول دیا کہ یہ بات محض تمہاری تسلی کے لیے کہہ دی گئی تھی اس کی حقیقت کچھ نہیں تھی، گویا نعوذ باللہ پہلے تو اللہ میاں نے مسلمانوں کو چکمہ دیا اور خود ہی اپنا بھانڈا پھوڑ دیا کہ اب کے تو

میں نے تمہیں چکمہ دے کر لڑادیا آئندہ میرے بھرے میں نہ آنا، فرشتوں ورشتوں کی بات محض ایک بھڑ ہی تھی، شاید یہ حضرات اللہ میاں کو اپنے برابر بھی عقلمند نہیں سمجھتے۔ (تدبر قرآن، ج 3، ص 444 ۔ 445، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن، 1419ھ)

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کو اللہ میاں کہنا جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی انھوں نے جس غیر سنجیدہ انداز سے تعبیر کی ہے وہ قابل صد افسوس اور مذمت ہے۔

شیعہ مفسر شیخ فتح اللہ کاشانی لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ جنگ بدر کے دن جبرائیل پانچ سو فرشتوں کے ساتھ اور میکائیل پانچ سو فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے، جبرائیل دائیں جانب تھے اور میکائیل بائیں جانب تھے، انھوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور عمامہ کا شملہ کندھوں کے درمیان ڈالا ہوا تھا، انھوں مشرکوں کے ساتھ جنگ کی اور ان کو مغلوب کیا، اور ماضی اور مستقبل میں سے جنگ بدر کے سوا اور کسی دن میں فرشتوں کو جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ حضرت رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بلند مرتبہ کی وجہ سے ان کو صرف جنگ بدر کے دن جہاد کا حکم دیا گیا تھا، حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مشرک کے ساتھ جنگ کرتا تو اس مشرک کے سر کے اوپر سے تازیانہ کی آواز آتی اور جب مسلمان شخص نظر اوپر اٹھاتا تو وہ مشرک زمین پر پڑا ہوتا اور اس کے سر کے اوپر تازیانہ کا نشان ظاہر ہوتا اور وہ شخص کسی اور کو نہ دیکھتا، اور جب اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس واقعہ کی خبر سنائی تو آپ نے فرمایا یہ فرشتے تھے جن کو حق تعالیٰ نے تمہاری مدد کے لیے بھیجا تھا، اور حضرت امیر المومنین صلوات اللہ علیہ نے فرمایا ہمارے شہید اور قریش کے مقتولین میں یہ فرق تھا کہ ہمارے شہداء پر زخموں کے نشانات تھے اور قریش کے مقتولین پر زخموں کے نشانات نہیں تھے۔ (منہج الصاقین، ج 4، ص 168، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران)

آیۃ اللہ مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے، بعض اس کے معتقد ہیں کہ فرشتے اپنے مخصوص اسلحہ کے ساتھ نازل ہوئے تھے اور انھوں نے دشمنوں پر حملہ کیا اور ان کی ایک جماعت کو خاک پر گرادیا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے کچھ روایات کو بھی نقل کیا ہے، اور مفسرین کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ فرشتے صرف مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے، ان کے دلوں کو تقویت دینے اور ان کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے نازل ہوئے تھے۔ اور یہی قول حقیقت سے قریب تر ہے اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

1۔ آل عمران: 126 اور الانفال: 10 میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ فرشتوں کا نزول صرف مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے اور ان کو فتح کی بشارت دینے کے لیے ہوا تھا۔

2۔ اگر کفار کو فرشتوں نے قتل کیا تھا تو مجاہدین بدر کی کیا فضیلت رہ جاتی ہے؟

3۔ جنگ بدر میں ستر کافر قتل ہوئے تھے، جن میں سے کچھ کو حضرت علی (علیہ السلام) نے قتل کیا تھا اور باقی کو دوسرے مجاہدین نے، اور تاریخ میں یہ محفوظ ہے کہ کس کافر کو کس مسلمان نے قتل کیا تھا تو پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا تھا۔ (تفسیر نمونہ، ج 7، ص 104۔ 105، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ، ایران، 1369ھ)

غزوہ بدر میں فرشوں کے قتال کے متعلق امام رازی کا تبدیل شدہ نظریہ

آل عمران : 125 ۔ 127 کی جو امام فخر الدین رازی نے تفسیر کی ہے اس کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ الانفال : 10 کی تفسیر میں امام رازی نے اس سے مختلف تقریر کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول صرف مسلمانوں کی تقویت اور ان کو فتح اور نصرت کی بشارت دینے کے لیے تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا جنگ بدر میں فرشتوں نے قتال کیا تھا یا نہیں ؟ علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) پانچ سو فرشتوں کے ساتھ لشکر اسلام کی دائیں جانب تھے۔ اور حضرت میکائیل پانچ سو فرشتوں کے ساتھ لشکر اسلام کی بائیں جانب تھے اور اس لشکر میں حضرت علی بن ابی طالب (رض) بھی تھے۔ اور فرشتے مردوں کی صورت میں سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور انھوں نے کفار سے قتال کیا تھا، ایک قول یہ ہے کہ ان فرشتوں نے غزوہ بدر میں قتال کیا تھا اور غزوہ احزاب اور غزوہ حنین میں قتال نہیں کیا تھا۔ اور روایت ہے کہ ابوجہل نے حضرت ابن مسعود (رض) سے کہا تھا وہ آواز کہاں سے آتی تھی جس کو ہم سنتے تھے اور بولنے والا نظر نہیں آتا تھا، حضرت ابن مسعود نے کہا وہ فرشتے تھے، تب ابوجہل نے کہا تو پھر انھوں نے ہم کو شکست دی ہے تم نے نہیں دی، اور روایت ہے کہ ایک مسلمان ایک مشرک کا پیچھا کر رہا تھا اچانک اس نے اپنے اوپر سے ایک کوڑا مارنے والے کی آواز سنی، اس نے اس مشرک کی طرف دیکھا تو وہ نیچے گرا پڑا تھا اور اس کا چہرہ شق ہو گیا تھا، اس انصاری نے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا یہ آسمان سے مدد آئی تھی۔ علماء کی دوسری جماعت نے یہ کہا کہ فرشتوں نے قتال بالکل نہیں کیا، وہ صرف مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بڑھانے کے لیے آئے تھے اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے، ورنہ پوری دنیا کو ہلاک کرنے کے لیے صرف ایک فرشتہ ہی کافی ہے، حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے اپنے بازو کے ایک پر سے قوم لوط کے تمام شہروں کو تباہ اور برباد کر دیا تھا اور قوم ثمود کے شہروں کو اور حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم کو صرف ایک چیخ سے ہلاک کر دیا تھا۔ غزوہ بدر میں فرشتوں کی امداد کی کیفیت سورۃ آل عمران میں بہت تفصیل سے ذکر کی گئی ہے۔ غزوہ بدر میں فرشتے قتال کے لیے نازل نہیں ہوئے تھے اس قول کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : " وماجعلہ اللہ الابشری ولتطمئن بہ قلوبکم : اور فرشتوں کو نازل فرمانا صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے تھے اور اس لیے کہ تمہارے دل مطمئن رہیں " (الانفال : 10)۔

فراء نے یہ کہا کہ " وماجعلہ " کی ضمیر لگاتار فرشتوں کی طرف لوٹتی ہے، یعنی لگاتار فرشتوں کو بھیجنا صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے تھا اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے کہ لگاتار فرشتوں کو بھیجنا صرف بشارت دینے کے لیے تھا۔ اور یہ تفسیر اولیٰ ہے کیونکہ فرشتوں کی امداد بشارت سے حاصل ہو گئی تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہ غزوہ بدر کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چھپّر کے نیچے بیٹھے ہوئے دعا کر رہے تھے اور آپ کی دائیں جانب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اونگھ آ گئی، پھر آپ نے حضرت ابوبکر کے زانو پر ہاتھ مارا اور فرمایا اللہ کی مدد کی بشارت لو، میں نے خواب میں دیکھا کہ جبرائیل گھوڑے پر سوار آ رہے ہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ فرشتوں کو نازل کرنے سے صرف خوشخبری دینا مقصود تھا۔ اور یہ اس بات کی نفی کرتی ہے کہ فرشتوں نے قتال کیا تھا، اس کے بعد اللہ نے فرمایا کہ " مدد صرف اللہ کی طرف سے ہے " (الانفال : 10) اور اس سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ہرچند کہ فرشتے مومنین کی موافقت میں نازل ہوئے تھے، لیکن مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ اس پر اعتماد نہ کریں، بلکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اللہ کی اعانت اور امداد، اس کی ہدایت اور اس کے کافی ہونے پر اعتماد کریں۔ کیونکہ اللہ ہی عزیز اور

غالب ہے جس پر کوئی غلبہ نہیں پاسکتا اور وہی ایسا قاہر ہے جس پر کوئی قہر نہیں کر سکتا، اور وہی حکیم ہے اور وہ اپنی حکمت سے جانتا ہے کہ کس جگہ نصرت کرنی چاہیے سو وہ اس جگہ نصرت فرماتا ہے۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 460، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

غزوہ بدر میں فرشتوں کے قتال کے متعلق مصنف کی تحقیق

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کی صریح آیات اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتے صرف مسلمانوں کو بشارت دینے اور ان کو تقویت دینے کے لیے نازل ہوتے تھے، اور انھوں نے خود جنگ نہیں کی۔ اس کے برخلاف بعض دیگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے خود جنگ کی تھی، لیکن یہ احادیث چونکہ قرآن مجید کی ان صریح آیات سے معارض ہیں اس لیے ان کو ترک کر دیا جائے گا، نیز اگر فرشتوں نے یہ لڑائی لڑی ہوتی تو پھر کوئی صحابی بھی اس جنگ میں زخمی یا شہید نہ ہوتا، حالانکہ چودہ صحابی شہید ہوئے، اور متعدد زخمی ہوئے، نیز اگر یہ فرشتوں کا کارنامہ تھا تو اصحاب بدر کا کوئی کمال نہ ہوا اور ان کی اس قدر فضیلت نہ ہوئی اور پھر ہزاروں فرشتوں کی کیا ضرورت تھی؟ تمام کافروں کو قتل کرنے کے لیے تو ایک فرشتہ ہی کافی تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہ مجاہدین صحابہ میں سے ہر ایک کے متعلق معلوم اور ثابت ہے کہ فلاں صحابی نے فلاں کافر کو قتل کیا اور فلاں صحابی نے فلاں کار کو قتل کیا، پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا؟ نیز قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی: تو (اے مسلمانو) تم نے ان کافروں کو (حقیقۃً) قتل نہیں کیا، لیکن ان کو اللہ نے (حقیقتاً) قتل کیا ہے، اور (اے محبوب) آپ نے (حقیقتاً خاک) نہیں پھینکی، جس وقت (بظاہر) آپ نے (خاک) پھینکی تو تھی، وہ (خاک) اللہ نے پھینکی)" (الانفال: 17)

بظاہر اصحاب بدر نے کافروں کو قتل کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم نے ان کو حقیقتاً قتل نہیں کیا اللہ نے ان کو قتل کیا ہے، اگر فرشتوں نے بظاہر قتل کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم نے ان کو حقیقتاً قتل نہیں کی یا اللہ نے ان کو قتل کیا ہے، اگر فرشتوں نے بظاہر قتل کیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: اے مسلمانو! تم نے کافروں کو حقیقۃً قتل نہیں کیا، ان کو تو درحقیقت فرشتوں نے قتل کیا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف قتل کی نسبت ظاہراً کی نہ حقیقۃً تو معلوم ہوا کہ بدر کے کافروں کو قتل کرنے میں فرشتوں کا کوئی دخل نہیں ہے نہ ظاہراً نہ حقیقتاً اور بدر میں فرشتوں کا نزول صرف مسلمانوں کے اطمینان اور ان کو بشارت دینے کے لیے تھا، جو فرشتے بدر میں اترے انھیں دوسرے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہوئی، اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض فرشتوں کو عزت اور فضیلت دینے کے لیے بدر میں فرشتوں کو اتارا ہوا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت معاذ بن رفاعہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں (ان کے والد اہل بدر میں سے تھے) کہ حضرت جبرائیل نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ اہل بدر کو کونسا درجہ دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مسلمانوں میں سب سے افضل ہیں یا اس طرح کوئی اور بات فرمائی۔ حضرت جبرائیل نے کہا ہم بھی اسی طرح فرشتوں میں بدری فرشتوں کو سب سے افضل قرار دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری، ج 2، ص 529، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، 1381ھ)

اس حدیث میں یہ معلوم ہوا کہ فرشتوں کو نازل کرنے کی حکمت یہ تھی کہ اس جنگ میں ان کو مسلمانوں کی معیت کا شرف اور مرتبہ دیا جائے۔

میں نے اس مسئلہ میں بہت چھان بین کی ہے اور امہات کتب حدیث میں مجھ کو فرشتوں کے قتال کے متعلق حس قدر احادیث ملیں میں نے ان سب کا ذکر کیا، لیکن میں نے دیکھا یہ احادیث باہم متعارض اور مضطرب ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے صرف جنگ بدر میں قتال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے جنگ احزاب میں بھی قتال کیا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بلکہ کافر بھی فرشتوں کو دیکھ رہے تھے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو قتال کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، البتہ بغیر کسی فاعل کے کافروں کے سر کٹ کٹ کر گر رہے تھے، اس کے بر خلاف قرآن مید میں یہ ذکر نہیں ہے کہ فرشتوں نے قتال کیا تھا بلکہ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے قتال کیا تھا اور فرشتے صرف مسلمانوں کی دل جمعی کے لیے نازل ہوئے تھے، میرے نزدیک احادیث صحیحہ اور آثار صحیحہ حجت ہیں لیکن قرآن مجید بہ ہر نوح احادیث پر مقدم ہے۔ نیز قواعد اسلام اور اصول اور درایات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ یہ جنگ صرف مسلمانوں نے لڑی تھی۔ میں نے اس مسئلہ میں دیگر فقہاء اسلام کی آراء کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہر حال میرے قلب و ضمیر کے مطابق حق یہی ہے اور اگر حق دوسری جانب ہے تو یہ میری فکر کی غلطی ہے اور میں اس سے تائب ہوں۔

آل عمران: 124۔127 کی تفسیر میں بھی میں نے یہی تقریر کی ہے للیکن اس کی اہمیت اور افادہ کے پیش نظر میں نے چند مزید حوالہ جات کا اضافہ کر کے اس تقریر کو دوبارہ ذکر کر دیا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰

لغۃ القرآن: [وَمَا جَعَلَهُ : اور نہیں بنایا اس کو] [اللّٰهُ : اللہ نے] [اِلَّا : مگر] [بُشْرٰي : خوشخبری] [وَلِتَطْمَىِٕنَّ : اور تاکہ مطمئن ہوں] [بِهٖ : اس سے] [قُلُوْبُكُمْ: تمہارے دل] [وَمَا النَّصْرُ : اور نصرت نہیں ہے] [اِلَّا : مگر] [مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ: اللہ کے پاس سے] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ] [عَزِيْزٌ: بالا دست ہے] [حَكِيْمٌ: حکمت والا ہے]

ترجمہ: اور اس (مدد کی صورت) کو اللہ نے محض بشارت بنایا (تھا) اور (یہ) اس لیے کہ اس سے تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اور (حقیقت میں تو) اللہ کی بارگاہ سے مدد کے سوا کوئی (اور) مدد نہیں، بیشک اللہ (ہی) غالب حکمت والا ہے

تشریح:

اے مسلمانو بدر میں اسقدر فرشتوں کا اترنا تمہارے لئے ایک بشارت تھی

تاکہ تم خوش ہو کر کہہ سکو کہ ہم مسلمان وہ ہیں جن کی مدد کے لیے اس قدر فرشتے اترے تھے اور تمہارے دل مطمئن ہوں ورنہ مدد کرنے والا تو اللہ ہے وہ فرشتوں کا محتاج نہیں، وہ چاہے تو ابابیل پرندوں کے ذریعے ہاتھیوں کے لشکر تباہ کر سکتا اور ایک مچھر سے نمرود جیسے جابر حاکم کو مروا سکتا ہے وہ بہت غالب حکمت والا ہے۔

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے۔

1۔ صرف گھر بیٹھ کر دعا کرنے سے فتح نہیں ملتی

آیت 9 میں مذکور دعا اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میدان بدر میں اتر کر کی، تب فرشتے نازل ہوئے۔ آج ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں تنکا نہ ہلانا پڑے اور گھر بیٹھے محض ہماری دعاؤں سے اسلام غالب ہو جائے۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا بلکہ پہلے دشمنان اسلام کے خلاف متحد ہو کر میدان میں اترنا پڑے گا پھر دعائیں بھی اثر لائیں گی۔ یہی سنت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے، اگر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاہتے تو مدینہ طیبہ ہی میں رہ کر دعاء فتح کرتے اور اللہ رب العزت وہیں آپ کی دعاء سے کفار کو ہلاک کر دیتا، مگر آپ نے امت کو یہ سنت عطا فرمائی کہ پہلے جذبۂ شہادت اور ولولۂ جہاد کے ساتھ میدان جنگ میں اترا جائے گا پھر فتح کے لیے دعا مانگی جائے، تب اللہ فتح عطا فرمائے گا اور مومنوں کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتے اتارے گا۔

2۔ آج بھی اگر فضائے بدر پیدا ہو تو فرشتے ہماری مدد کو اتر سکتے ہیں

اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دعا مانگنے کو تمام صحابہ کا دعا مانگنا قرار دیا گیا کیونکہ وہ سب بھی آپ کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے۔ اگر یہ کیفیت آج بھی مسلمانوں میں پیدا ہو تو ہو جائے تو ان کی مدد کے لیے اسی طرح فرشتے اتر سکتے ہیں جیسے صحابہ کی مدد کے لیے بدر میں اترے تھے ۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

(تفسیر برہان القرآن)

مسلمان اللہ کے دربار میں زاری کر رہے تھے تو اللہ نے ان کو جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں کی امداد تمہارے لیے بھیج رہا ہوں جو لگاتار نازل ہوتے رہیں گے۔ اس اعلان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بہت عظیم تھا، اور اللہ کے نزدیک اقامت دین کی بہت اہمیت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ یہاں اس بات کی وضاحت بار بار فرماتے ہیں کہ دنیا میں اسباب کی اس قدر اہمیت نہیں کہ ان سے تخلف ممکن نہ ہو۔ اصل اختیار اللہ

کی مشیت کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسباب کے معاملے میں مومن کو اپنا ذہن صاف رکھنا چاہیے۔ اللہ کی جانب سے مدد کی قبولیت اور پھر اس کی اطلاع محض ایک خوشخبری تھی جس کے ذریعے مومنین کو اطمینان دلانا مقصود تھا۔ رہی نصرت تو وہ اللہ کی جانب سے تھی۔

یہ ہے وہ حقیقت جو یہاں قرآن مومنین کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تاکہ وہ کلی تکیہ اسباب پر نہ کریں۔

مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی پوری قوت کو اس معرکے میں جھونک دیں اور کچھ بھی باقی نہ رکھیں۔ ابتدائی طور پر بعض لوگوں کے اندر جو تنزلزل پیدا ہو گیا تھا اس پر قابو پالیں۔ کیونکہ اس وقت وہ واقعی اور حقیقی خطرے سے دوچار تھے۔ وہ اللہ کا حکم بجالاتے ہوئے اگے بڑھیں اور اللہ کی نصرت پر یقین رکھیں۔ بس یہی ان کے لیے کافی تھا تاکہ وہ اپنے حصے کا کردار اچھی طرح ادا کرلی۔ آگے پھر قدرت الٰہیہ کا کام آتا ہے اور قدرت الٰہی اپنے معاملات کی تدبیر خود کرتی ہے۔ اس کے علاوہ جو اقدامات ہوئے اور اطلاعات دی گئیں وہ محض مسلمانوں کے اطمینان کے لیے ہیں۔ ان کے قدموں کو ثابت کرنے کے لیے تھیں کیونکہ وہ ایک حقیقی خطرے سے دوچار تھے۔ جماعت مسلمہ کے لیے یہ بات کافی تھی کہ اسے یہ اطمینان ہو کہ اللہ کے لشکر اس کے ساتھ ہیں اور یہ کہ نصرت ان کے لیے مقدر ہے۔ کیونک نصر اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اور اللہ ان کے ساتھ ہے، وہ عزیز ہے اور وہی غالب ہے، وہی حکیم ہے اور وہ ہر بات کو اپنے حقیقی مقام پر رکھتا ہے۔ (تفسیرات احمدیہ۔ ملا جیونؒ)

اللہ تعالیٰ کی نصرت اسباب کے پردے میں

اس آیت کریمہ میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ایک تو یہ بات کہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کے لیے فرشتوں یا اسباب کا محتاج ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق اپنی قوتوں اور اپنے خواص کے لیے اللہ کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کا محتاج نہیں۔ فرشتے اگر کسی کی مدد کرتے ہیں تو اللہ کے حکم اس کے اذن اور اس کی دی ہوئی طاقت سے کرتے ہیں۔ اپنے طور سے وہ کسی کی مدد کرنے پر قادر نہیں۔ البتہ ! اللہ کی ایک سنت ہے جس کے مطابق دنیا کا نظام چل رہا ہے کہ وہ جب بھی کسی کی مدد کرتا ہے تو اسباب کے پردے میں کرتا ہے۔ انسانی نظر چونکہ اسباب کو دیکھتی ہے اور اسباب ہی سے متأثر ہوتی ہے اس لیے جب وہ اسباب کو حرکت میں دیکھتی ہے تو اسے ایک گونہ سکون اور حوصلہ ملتا ہے۔ اس لیے پروردگار نے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا لیکن ساتھ یہ بتانا ضروری سمجھا کہ تم کہیں اپنے آپ کو فرشتوں کا محتاج نہ سمجھ لینا اور نہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کا محتاج ہے۔ جب بھی کسی کی مدد ہوتی ہے تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ البتہ ! نگاہیں اسباب کے پردے میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ روشنی پاور ہاؤس سے آتی ہے لیکن نگاہیں ٹیوب اور بلب کو دیکھتی ہیں۔ لیکن بجلی کے نظام کو جاننے والا جانتا ہے کہ بجلی کہاں سے آرہی ہے۔ ایک مسلمان کو بھی اس بات سے آگاہ ہونا چاہیے کہ اس کا سر رشتہ کس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا ہاتھ کس کے سامنے پھیلنا چاہیے۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ جنگ بدر میں پروردگار نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرشتوں کی فوج بھیجی لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ کی نصرت کا یہ وعدہ صرف جنگ بدر کے ساتھ مخصوص تھا یا اس وقت کے مسلمانوں کے ساتھ خاص تھا کیونکہ ان میں اللہ کے آخری رسول موجود تھے بلکہ مسلمانوں کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جب بھی تقویٰ اور صبر کی تصویر بن کر صرف اللہ کی رضا کے حصول اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے مسلمان دشمن سے نبرد آزما ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد

ضرور اترے گی۔ ضروری نہیں کہ فرشتوں کی شکل میں مدد اترے کسی بھی صورت میں مدد آسکتی ہے۔ وہ چاہے تو پرندوں کو فرشتوں کی طاقت دے دے، چاہے تو سمندر کی موجوں کو بے لگام کر دے، وہ چاہے تو آسمان کے دروازے بارشوں کے لیے کھول دے، لیکن عموماً وہ اپنے بندوں کی مدد کے لیے فرشتے اتارتا ہے۔ اس لیے ہر کٹھن وقت اور خطرناک حق و باطل کے معرکے میں مسلمانوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ اگر انھوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی اور تقویٰ اور صبر کو ملحوظ رکھا اور وہی فضا پیدا کر دی جو جنگ بدر میں تھی اور اللہ کے سامنے گڑگڑا کر اس سے مدد مانگی تو کوئی وجہ نہیں کہ مدد کے لیے فرشتے نازل نہ ہوں۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

(مدد جب بھی آتی ہے اللہ کی طرف سے آتی ہے بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔)

مسلمانوں کے عقیدے کی بنیاد ہی یہ ہے کہ مدد جب بھی آتی ہے اللہ کی طرف سے آتی ہے۔ اس لیے بھروسہ اللہ پر ہونا چاہیے دست سوال اسی کے سامنے دراز ہونا چاہیے، امیدیں اسی سے باندھنی چاہئیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہی ایک ذات ہے جو سب سے زور آور اور سب پر غالب ہے۔ جب وہ کسی کی مدد کرنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، کوئی راستے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتا۔ البتہ! یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مسلمان اللہ سے مدد طلب کرے لیکن ادھر سے مدد نہ آئے اور بظاہر یہ سمجھا جائے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی مدد سے محروم کر دیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو تو مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ جس طرح "عزیز" ہے اسی طرح "حکیم" بھی ہے۔ اگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اہل ایمان کو تربیت کے لیے مصائب سے گزارا جائے تو وہ مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے محروم کر دیا ہے بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس میں بھی اہل ایمان کے لیے کوئی مصلحت ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اللہ نے فتح کا وعدہ فرمالیا تھا، پھر بھی آپ کو اضطراب پیدا ہوا اور آپ نے اللہ سے وعدہ کا واسطہ دے کر دعا کی۔ بات یہ تھی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حالت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرح تھی، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کیا تھا: رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۔ اللہ نے فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۔ دونوں پیغمبروں کی حالت نزول اَتم کے مرتبہ کی تھی۔

پیغمبروں کی دو حالتیں ہوتی ہیں

صعودی اور نزولی، یعنی قرب الٰہی اور قرب مخلوق۔ اوّل حالت کا تعلق نبوت سے ہے اور دوسری حالت رسالت سے متعلق ہے۔ جس کی صعودی حالت اکمل ہوتی ہے، اس کی نزولی حالت بھی بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو نزول اتم کا مرتبہ حاصل تھا، اسی لیے باوجود کمال ایمانی کے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے احیاء موتی کو آنکھوں سے دیکھنے کی درخواست کی تاکہ شہودی طور پر اطمینان قلب پیدا ہو جائے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شہودی اطمینان کیلئے امداد ظاہری کیلئے دعاء کی۔] نزول اتم کی تشریح سورۃ البقرۃ کی آیت رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کی تفسیر کے ذیل میں ہم کر چکے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ نزول اتم کے مرتبہ پر فائز نہ تھے، اسی لیے انھوں نے کہا تھا کہ اللہ کو وعدہ یاد دلایا جائے، اس سے اللہ بہت بالا و برتر ہے (اس کو اس کی ضرورت نہیں) اور حضرت ابو بکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس مرتبہ سے واقف تھے اور آپ کو

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قرب حاصل تھا ' اس لیے حضرت ابن رواحہ کی طرح تو الفاظ زبان سے نہیں نکالے ' ہاں یہ فرمایا کہ اب اللہ کو واسطہ دے کر دعا کرنے کی حد ہوگئی (اس سے زیادہ ضرورت نہیں) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بے قرار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ اشاعت اسلام اور استیصال کفر کی انتہائی رغبت رکھتے تھے اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ سارے جہان کی عبادت سے بے نیاز ہے (اس کو ضرورت نہیں کہ کوئی اس کی عبادت کرے اور دنیا میں اسلام پھیلے اور کفر مٹے) واللہ اعلم۔

وما النصر الا من عند اللہ ان اللہ عزیز حکیم اور فتح تو حاصل نہیں ہوتی مگر اللہ کی جانب سے۔ بیشک اللہ غالب ہے اور اس کے کام مبنی بر حکمت ہیں۔

ملائکہ کی امداد تعداد کی کثرت اور سامان جنگ کی زیادتی ' یہ تو درمیانی ذرائع ہیں ' واقع میں ان کی کوئی تاثیر نہیں۔ ضابطہ خداوندی یونہی ہے۔

فائدہ: دعا سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوگئے اور خوب لڑے۔ حضرت ابو بکر بھی شریک جنگ ہو کر لڑے۔ اوّل دونوں حضرات جھونپڑی کے اندر انتہائی کوشش کے ساتھ دعا اور زاری میں منہمک رہے ' پھر باہر نکل کر لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی اور برانگیختہ کیا اور خود بھی اجتماعی حالت میں مختلف مقامات پر لڑے۔ محمد بن یوسف صالحہ نے سبیل الرشاد میں یہی صراحت کی ہے۔

حضرت ابن سعد اور فریابی کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: بدر کا دن ہوا اور جنگ سامنے آئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے آگے ہوگئے اور ہم نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آڑ میں اپنا بچاؤ کیا۔ اس روز آپ سب سے زیادہ جنگ جو تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی مشرکوں سے اتنا قریب نہ تھا جتنا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریب تھے۔ امام احمد کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا: بدر کے دن کا وہ منظر میرے سامنے ہے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پناہ لے رہے تھے۔ نسائی کے یہ الفاظ ہیں: جب لڑائی گرم ہوگئی اور قوم سے مقابلہ ہوا تو ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آڑ پکڑ کر اپنا بچاؤ کرنے لگے۔ (تفسیر مظہری)

کیا فرشتے براہ راست لڑے؟

بدر کے دن فرشتوں کے براہ راست لڑنے کے متعلق اختلاف ہے۔ نمبر ۱۔ جبرائیل (علیہ السلام) پانچ سو فرشتوں کے ساتھ اسلامی لشکر کے میمنہ پر اترے جس میں ابو بکر (رض) تھے۔ اور میکائیل (علیہ السلام) پانچ سو کے ساتھ میسرہ پر اترے۔ جس میں علی (رض) تھے۔ فرشتے انسانی صورت میں سفید لباس اور سفید عمامے زیب تن کرنے والے تھے۔ اور پگڑیوں کے شملے کندھوں کے درمیان ڈالنے والے تھے۔ اور انھوں نے باقاعدہ لڑائی کی یہاں تک کہ ابو جہل نے عبداللہ بن مسعود کو کہا ہمیں تلوار کی ضرب کہاں سے آتی تھی جبکہ ہم کسی ذات کو نہ دیکھتے تھے۔ تو عبداللہ نے جواب دیا وہ ضرب ملائکہ کی طرف سے تھی۔ اس نے کہا وہ ہم پر غالب آئے نہ کہ تم۔ نمبر ۲۔ فرشتے اترے تعداد بڑھانے اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کیلئے انھوں نے قتال نہیں کیا۔ ورنہ ایک فرشتہ پوری دنیا کو ہلاک کرنے کیلے کافی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ (بیشک اللہ زبردست) اپنے دوستوں کی مدد کیلئے حَکِیْمٌ (حکمت والے ہیں) اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتے ہیں۔ (تفسیر مدارک التنزیل)

آیت مبارکہ:

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝11

لغۃ القرآن: [اِذْ : جب] [يُغَشِّيْكُمُ : اس نے ڈھانپ دیا تم لوگوں کو] [النُّعَاسَ : اونگھ سے] [اَمَنَةً : امن ہوتے ہوئے] [مِّنْهُ : اپنی طرف سے] [وَيُنَزِّلُ : اور اس نے اتارا] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے] [مَآءً : کچھ پانی] [لِّيُطَهِّرَكُمْ : تاکہ وہ پاک کرے تم لوگوں کو] [بِهٖ : اس سے] [وَيُذْهِبَ : اور وہ لے جائے] [عَنْكُمْ : تم سے] [رِجْزَ الشَّيْطٰنِ : شیطان کی نجاست کو] [وَلِيَرْبِطَ : اور تاکہ وہ مضبوط کرے] [عَلٰي قُلُوْبِكُمْ : تمہارے دلوں کو] [وَيُثَبِّتَ : اور وہ جمادے] [بِهِ : اس سے] [الْاَقْدَامَ : قدم (جمع)]

ترجمہ: جب اس نے اپنی طرف سے (تمھیں) راحت و سکون (فراہم کرنے) کے لیے تم پر غنودگی طاری فرما دی اور تم پر آسمان سے پانی اتارا تاکہ اس کے ذریعے تمھیں (ظاہری و باطنی) طہارت عطا فرما دے اور تم سے شیطان (کے باطل وسوسوں) کی نجاست کو دور کر دے اور تمہارے دلوں کو (قوت یقین) سے مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے قدم (خوب) جما دے

تشریح:

کفار میدان بدر میں پہلے پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے موزوں جگہ پر اپنے خیمے نصب کر لیے اور پانی پر بھی قبضہ کر لیا۔ مسلمان پہنچے تو بجز ریت کے ٹیلوں کے اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں پڑاؤ ڈالیں۔ چار و ناچار وہیں خیمے گاڑ دیئے۔ پانی کی بھی سخت قلّت تھی چلتے ہیں تو پاؤں ریت میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ نماز کا وقت آتا ہے تو وضو و غسل کے لیے پانی ندارد۔ پیاس لگتی ہے تو پینے کے لیے پانی نایاب۔ اس عجیب و غریب صورت حال سے مسلمانوں کو سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ادھر شیطان رہ رہ کر دل میں وسوسہ ڈالنے لگا کہ تم اپنے آپ کو خدا کا مقرب سمجھے ہوئے تھے۔ اب آنکھوں سے دیکھ لو کیا مقربین خدا کا یہی حشر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان دونوں تکلیفوں کا ازالہ فرما دیا۔ جس صبح کو جنگ ہونے والی تھی اس رات کو بادل گھر کر آگئے اور اتنا موسلا دھار مینہ برسا کہ وادیاں لبریز ہو کر بہنے لگیں۔ مسلمانوں نے حوض بنا کر پانی جمع کر لیا اس طرح پانی کی قلّت دور ہو گئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ بارش کے پانی سے ریت جم گئی اور مسلمانوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو گئی اور کفار کی

قیامگاہ میں کیچڑ ہی کیچڑ ہو گیا اور ان کے لیے نقل و حرکت دو بھر ہو گئی۔ دوسری نوازش جو مولائے کریم نے لشکر اسلام پر فرمائی وہ یہ تھی کہ ان پر نیند مسلط کر دی گئی۔ رات بھر خوب سوئے، صبح اٹھے تو بالکل ہشاش بشاش اور تازہ دم تھے۔ تھکن اور افسردگی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کفار کا رعب اور ہیبت دلوں سے دور ہو چکی تھی۔ آیت کریمہ میں وَلِيَرْبِطَ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ یعنی یہ نیند اتفاقیہ نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت اور رحمت سے اسے مسلمانوں پر مسلط کیا تھا۔ رجز الشیطن سے مراد اس کی وہ وسوسہ اندازی ہے جو پانی کی نایابی اور حالات کی ناسازگاری کی بدولت وہ مسلمانوں کے قلوب میں ڈالنا چاہتا تھا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں کہ غنودگی اگر جنگ میں ہو تو امن ہے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے ہے اور نماز میں ہو تو شیطان کی طرف سے ہے۔ جنگ میں غنودگی کا امن ہونا اس سے ظاہر ہے کہ جسے جان کا اندیشہ ہو اسے نیند اور اونگھ نہیں آتی، وہ خطرے اور اضطراب میں رہتا ہے۔ شدید خوف کے وقت غنودگی آنا حصول امن اور زوال خوف کی دلیل ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ "جب مسلمانوں کو دشمنوں کی کثرت اور مسلمانوں کی قلّت سے جانوں کا خوف ہوا اور بہت زیادہ پیاس لگی تو ان پر غنودگی ڈال دی گئی جس سے انھیں راحت حاصل ہوئی، تھکان اور پیاس دور ہوئی اور وہ دشمن سے جنگ کرنے پر قادر ہوئے۔ یہ اونگھ ان کے حق میں نعمت تھی۔ بعض علماء نے فرمایا کہ "یہ اونگھ معجزہ کے حکم میں ہے کیونکہ یکبارگی سب کو اونگھ آئی اور کثیر جماعت کا شدید خوف کی حالت میں اس طرح یکبارگی اونگھ جانا خلاف عادت ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

بدر میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام (رض) کو دشمن کی کثرت اور قوت کی طرف سے بے خوف کرنے کے لیے ان پر اونگھ طاری کر دی اور حدیث میں ہے کہ جنگ میں اونگھ کا آنا اللہ کی رحمت ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا (رض) سے مروی ہے کہ بدر میں مقداد کے سوا کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا اور میں نے دیکھا بدر میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا ہم میں سے ہر کوئی سو رہا تھا صرف حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درخت کے نیچے نماز پڑھ رہے اور رو رہے تھے۔ (ابن کثیر جلد 2 صفحہ 203 بروایت ابی یعلی) (تفسیر برہان القرآن)

غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی امداد کی چھ انواع

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر فرمایا تھا کہ غزوہ بدر میں صرف اللہ کی طرف سے مدد تھی۔ اب اللہ تعالیٰ تفسیل سے اس امداد کو بیان فرما رہا ہے۔ الانفال کی آیت 11، 12 میں اللہ تعالیٰ نے اس امداد کی چھ انواع بیان فرمائی ہیں۔

1۔ مسلمانوں پر غنودگی طاری کرنا۔

2۔ آسمان سے بارش نازل فرمانا۔

3۔ مسلمانوں کے دلوں کو ڈھارس بندھانا اور ان کے دلوں کو مضبوط کرنا۔

4۔ مسلمانوں کے قدم جمانا۔

5۔ فرشتوں کی طرح یہ وحی نازل فرمانا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

6۔ کافروں کے دلوں پر رعب طاری کرنا اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت ڈالنا۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ ہر امداد کی نعمتوں کو بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق

جس دن کی صبح جنگ ہونی تھی اس رات مسلمانوں پر نیند کا طاری ہونا

نعاس، غنودگی کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان بالکل مطمئن ہوتا ہے اور اس کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا، مسلمانوں پر یہ غنودگی اس رات طاری ہوئی تھی جس کی صبح کو انھوں نے کفار کے خلاف جہاد کرنا تھا اور اس رات ان کو نیند آجانا نہایت عجیب تھا کیونکہ ان کی تعداد کم تھی اور صبح ان کو اپنے سے تین گنا لشکر کا سامنا کرنا تھا۔ بظاہر اس فکر اور پریشانی کی وجہ سے ان کو نیند نہیں آنی چاہیے تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مطمئن اور مضبوط کر دیا، مسلمانوں میں سے حضرت مقداد بن اسود کے پاس ایک چتکبرے رنگ کا گھوڑا تھا جس کا نام سبحہ تھا۔ ایک گھوڑا حضرت زبیر بن العوام کے پاس تھا جس کا نام یعسوب تھا، اور ایک گھوڑا مرثد بن ابی مرثد کے پاس تھا جس کا نام سیل تھا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک تلوار اور ایک زرہ تھی، اور مسلمانوں کے پاس کل ستر اونٹ تھے اور ایک اونٹ پر باری باری تین مسلمان سوار ہوتے تھے۔ حضرت ابولبابہ اور حضرت علی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حصہ میں بھی ایک اونٹ تھا، ان صاحبوں نے چاہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مستقل اونٹ پر سوار رہیں اور وہ پیدل چلتے رہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ پیدل چلنے پر قادر نہیں ہو اور میں تمہاری بہ نسبت اجر سے مستغنی نہیں ہوں۔ اس کے برخلاف کفار قریش کے پاس ایک سو گھوڑے تھے اور ہر گھوڑے پر ایک زرہ پوش سوار تھا اور جو پیدل تھے ان کے پاس بھی زرہیں تھیں۔ وہ ہر روز نو، دس اونٹ ذبح کرتے تھے اور ان کے ساتھ باندیاں تھیں جو گا بجا کر اور مسلمانوں کی ہجو میں اشعار پڑھ کر ان کو جوش دلا رہی تھیں، اور ان کی آتش غضب کو اور بھڑکا رہی تھیں، اندریں حالات مسلمانوں کو زیادہ فکر مند اور پریشان ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ اسی طرح بے چینی سے جاگ کر رات گزارتے تو صبح کو وہ لڑنے کے لیے تازہ دم نہ ہوتے، سو اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا اور ان کی یہ امداد کی کہ ان پر نیند طاری کر دی اور جمعہ کی صبح کو جس دن جنگ ہونی تھی وہ بالکل تازہ دم اور جنگ کے لیے تیار تھے۔ (الطبقات الکبری، دلائل النوۃ، سبل الہدی والرشاد ملتقطاً)

مسلمانوں پر اس رات غنودگی طاری کرنے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں

ہر نیند اور غنودگی اللہ کی طرف سے طاری ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس غنودگی کو طاری کرنے کی نسبت جو اپنی طرف کی ہے اور اس کو اہمیت سے بیان فرمایا تو ضرور اس میں اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی نعمتیں ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

1۔ جب کوئی شخص اپنے دشمن سے خوفزدہ ہو اور اس کو اپنے اہل و عیال کی جان کا خطرہ ہو تو عادتاً اس کو نیند نہیں آتی اور جب اس کیفیت میں نیند آجائے تو یہ ضرور ایک غیر معمولی بات ہے۔

وہ ایسی گہری نیند نہیں سوئے تھے کہ گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو جاتے ورنہ دشمن ان پر اچانک ٹوٹ پڑتا اور ان سب کو ہلاک کر دیتا۔ بلکہ ان پر صرف غنودگی طاری کی جس سے ان کی تھکاوٹ دور ہو جائے اور صبح کو وہ تازہ دم اٹھیں، اور اگر رات کو دشمن ان کی طرف آتا تو وہ فوراً بیدار ہو جاتے اور دشمن ان کو بے خبری میں ہلاک کرنے پر قادر نہ ہوتا۔

3۔ ایک بڑی جماعت کے ہر شخص کو بیک وقت نیند کا آجانا یہ بھی غیر معمولی بات ہے۔

4۔ نیند بے فکر اور سکون کے وقت آتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے دل و دماغ سے دشمن کے خوف اور اس کی فکری کو دور کر دیا تھا، اور تین سو تیرہ نفوس کے دل و دماغ میں بیک وقت ایک ہی قسم کی کیفیات کا طاری ہونا یہ بھی ایک غیر معمولی بات ہے۔
ان مذکورہ وجوہ سے معلوم ہوا کہ اس رات مسلمانوں پر غنودگی طاری کرنے میں کوئی وجوہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا اظہار تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ تھا۔

بدر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قیام گاہ اور بارش کا نزول

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمان بدر کی طرف روانہ ہوئے، ادھر مشرکین پہلے پہنچ چکے تھے اور انھوں نے پانی پر قبضہ کر لیا تھا، ان کا پڑاؤ وادی کے اوپر کی جانب تھا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وادی کی نچلی جانب تھے۔ کئی مسلمان جنبی ہو چکے تھے اور ان کے غسل کے لیے پانی نہیں تھا، اور کئی پیاسے تھے اور مسلمان جنبی تھے وہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے جنابت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تم کفار قریش پر غالب آنے کی کیسے توقع کر سکتے ہو حالانکہ تم میں کئی مسلمان بغیر وضو کے حالت جنابت میں نماز پڑھ رہے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے ان پر بارش نازل کی۔ انھوں نے غسل کیا، وضو کیا اور پانی پیا۔ وہ جگہ ریتلی تھی اور ریت کی وجہ سے ان کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے اب ان کے قدم ریت پر جم گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو زائل کر دیا۔ (جامع البیان، جز9، ص261، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)
امام ابن ہشام متوفی 218ھ لکھتے ہیں:
امام ابن اسحاق نے کہا کہ کفار قریش نے وادی بدر کے آخری کونے پر پڑاؤ ڈالا تھا اور ان کے پیچھے ریت کا ٹیلہ تھا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمان اس تیلہ کے پیچھے تھے اور ریت کی زیادتی کی وجہ سے ان کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے، اور پانی پر قریش کا قبضہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی، جس سے ریت بیٹھ گئی اور جہاں قریش تھے وہاں بارش کی وجہ سے کیچڑ ہو گئی۔ (سیرت ابن ہشام ج2، ص232، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)
امام بیہقی نے زہری، محمد بن یحیٰی بن حبان، عاصم بن عمر بن قتادہ، اور عبداللہ بن ابی بکر وغیر ہم سے غزوہ بدر کے متعلق ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس میں بدر کے میدان میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قیام گاہ کے متعلق بیان کیا ہے:
قریش نے وادی بدر کے آخری کنارے میں پڑاؤ ڈالا اور بدر کے سارے کنویں مدینہ کی طرف سے ابتدائی کنارے کے ریتلے میدان کے وسط میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی جس سے ریت بیٹھ گئی اور اس جگہ چلنا آسان ہو گیا۔ اور جس جانب کفار قریش تھے وہاں سخت کیچڑ ہو گئی اور وہاں چلنا دوبھر ہو گیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سرعت سے روانہ ہوئے اور کفار قریش پر سبقت کر کے نزدیک ترین پانی کے کنویں پر پہنچ گئے۔ حضرت حباب بن منذر نے کہا یا رسول اللہ! کیا اللہ نے وحی کے ذریعہ آپ کو اس جگہ قیام کرنے کا حکم دیا ہے کہ ہم اس جگہ سے سر مو تجاوز نہ کر سکیں یا آپ نے جنگ کی حکمت عملی کی وجہ سے اس جگہ کو منتخب فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ صرف جنگ کی حکمت عملی ہے۔ حضرت حباب نے کہا یا رسول اللہ! تب یہاں سے اٹھیے اور ایسی جگہ قیام کیجئے کہ بدر کے تمام کنویں ہماری پشت پر ہوں، پھر ایک

کنویں کے سوا باقی تمام کنویں بند کرادیجئے۔ اور زمین کھود کر ایک حوض بنوادیجئے اور اس میں سارا پانی جمع کرلیں تاکہ اس حوض پر ہمارا قبضہ ہو، ہم جب چاہیں وہاں سے پانی حاصل کرلیں اور قریش کو ایک گھونٹ بھی پانی نہ مل سکے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس جنگ کا فیصلہ فرمادے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس رائے کو پسند فرمالیا۔ (دلائل النبوۃ ج 3، ص 31۔35، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)

بدر کے دن بارش کے نزول میں اللہ کی نعمتیں

کفار قریش نے پہلے پہنچ کر پانی پر قبضہ کرلیا تھا، مسلمان خوف زدہ اور پیاسے تھے اور بعض جنبی تھے، انھیں پینے کے لیے پانی میسر تھا نہ غسل کے لیے، علاوہ ازیں ریت میں ان کے پاؤں دھنس رہے تھے اور ہوا سے ریت اڑ رہی تھی، اور شیطان ان کے دلوں میں وسوسے ڈال رہا تھا کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو تم اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے، پھر اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت نعمتیں ہیں۔ ان میں سے بعض کی تفصیل یہ ہے:

1۔ ان کی پیاس بجھ گئی اور انھوں نے غسل کرلیا کیونکہ روایت ہے کہ انھوں نے زمین کو کھود کر ایک حوض بنالیا تھا جس میں انھوں نے بارش کا پانی اکٹھا کرلیا۔

2۔ اللہ تعالیٰ تم سے شیطان کی نجاست دور کرے، اس سے یہ مراد ہے کہ اس بارش کے ذریعہ انھوں نے غسل کرلیا اور ان سے نجاست دور ہوگئی۔ نیز اس سے شیطان کا ڈالا ہوا یہ وسوسہ باطل ہوگیا کہ اگر تم دین حق پر ہوتے تو اس طرح پیاسے اور جنبی نہ رہتے۔

بقیہ چار نعمتوں کی تفصیل

اس کے بعد فرمایا تاکہ تمہارے دلوں کو ڈھارس بندھائے۔ یہ تیسری نعمت اور امداد کا بیان ہے، کیونکہ بارش نازل ہونے کی وجہ سے ان کے دل مضبوط ہوگئے اور گھبراہٹ اور خوف ان سے دور ہوگیا۔ لغت میں ربط کا معنی باندھنا ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں کو باندھ دیا تاکہ اس میں خوف و گھبراہٹ نہ داخل ہوسکے۔

پھر فرمایا اور تمہارے قدموں کو جمادے، یہ چوتھی نعمت اور امداد کا بیان ہے، کیونکہ ریت میں مسلمانوں کے پاؤں دھنس رہے تھے اور ان کو چلنے میں مشکل اور دشواری تھی، اور بارش ہونے کے بعد ریت بیٹھ گئی اور وہ قدم جما کر چلنے لگے، اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دل مضبوط کردیے تو وہ جنگ میں ثابت قدم ہوگئے۔ کیونکہ اگر ان کے دل کمزور ہوتے تو یہ خدشہ رہتا ہے کہ وہ جنگ کی شدت سے گھبرا کر بھاگ جائیں گے، اور اس نعمت اور امداد کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ مسلمان وادی بدر کی جس جانب تھے وہاں ریتلی زمین تھی اور کفار قریش جس جانب تھے وہاں دھول اور مٹی تھی، اور بارش ہونے سے ریت بیٹھ گئی اور مسلمانوں کے لیے آسانی ہوگئی اور جہاں دھول اور مٹی تھی وہاں بارش کی وجہ سے کیچڑ ہوگئی اور ان کا چلنا دوبھر ہوگیا تو اس بارش نے جہاں مسلمانوں کے لیے آسانی کی، وہاں کفار کے لیے مشکل اور دشواری کی اور دشمن کی مصیبت بھی انسان کے لیے نعمت ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی فرما رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، یہ نعمت اور امداد کی پانچویں قسم ہے۔ اس نعمت کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ جب فرشتے مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ ان کے یعنی فرشتوں کے

ساتھ ہے، اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ مسلمانوں کی مدد کرو اور ان کو ثابت قدم رکھو۔ اور فرشتوں کے ثابت قدم رکھنے کا یہ معنی ہے کہ فرشتوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دل یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد فرمائے گا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو یہ خبر دے دی اور اس سے مسلمانوں کے دل مطمئن ہو گئے اور وہ اس جنگ میں ثابت قدم رہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۭ 12○

لغۃ القرآن: [اِذْ : جب] [يُوْحِيْ : وحی کیا] [رَبُّكَ : آپ کے رب نے] [اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ : فرشتوں کی طرف] [اَنِّيْ : کہ میں] [مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہوں] [فَثَبِّتُوا : پس تم لوگ جمادو] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں کو جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [سَاُلْقِيْ : میں ڈالوں گا] [فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ : ان کے دلوں میں جنہوں نے] [كَفَرُوا : کفر کیا] [الرُّعْبَ : رعب] [فَاضْرِبُوْا : پس تم لوگ مارو] [فَوْقَ الْاَعْنَاقِ : گردنوں کے اوپر] [وَاضْرِبُوْا : اور مارو] [مِنْهُمْ : ان میں سے] [كُلَّ : ہر] [بَنَانٍ : جوڑ پر]

ترجمہ: (اے حبیب مکرم! اپنے اعزاز کا وہ منظر بھی یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں کو پیغام بھیجا کہ (اَصحاب رسول کی مدد کے لئے) میں (بھی) تمہارے ساتھ ہوں، سو تم (بشارت و نصرت کے ذریعے) ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، میں ابھی کافروں کے دلوں میں (لشکر محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا) رعب و ہیبت ڈالے دیتا ہوں سو تم (کافروں کی) گردنوں کے اوپر سے ضرب لگانا اور ان کے ایک ایک جوڑ کو توڑ دینا

تشریح:

آیت کے اس حصے کی ایک تفسیر یہ ہے کہ جب فرشتے مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی فرمائی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی فرمائی کہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہوں تم ان کی مدد کرو اور

انھیں ثابت قدم رکھو۔ فرشتوں کے ثابت قدم رکھنے کا معنی یہ ہے کہ فرشتوں نے سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد فرمائے گا اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو یہ خبر دے دی (جس سے مسلمانوں کے دل مطمئن ہو گئے اور وہ اس جنگ میں ثابت قدم رہے۔) دوسری تفسیر زیادہ قوی ہے کیونکہ اس کلام سے مقصود خوف زائل کرنا ہے کیونکہ فرشتے کفار سے نہیں ڈرتے محض مسلمان خوفزدہ تھے۔

{فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ: تو تم کافروں کی گردنوں کے اوپر مارو۔} ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور ایک قول یہ ہے کہ خطاب فرشتوں سے ہے۔

جنگِ بدر میں فرشتوں نے لڑائی میں باقاعدہ حصہ لیا تھا

مفسرین کی ایک تعداد کے مطابق جنگِ بدر میں فرشتوں نے باقاعدہ لڑائی میں حصہ لیا تھا، یہاں ہم دو صحابہ کرام (رض) کے بیانات تحریر کرتے ہیں جن سے مفسرین کے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ

حضرت ابو داؤد مازنی (رض) جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے تھے، فرماتے ہیں کہ "میں مشرک کی گردن مارنے کے لیے اس کے درپے ہوا لیکن اس کا سر میری تلوار پہنچنے سے پہلے ہی کٹ کر گر گیا تو میں نے جان لیا کہ اسے کسی اور نے قتل کیا ہے۔

حضرت سہل بن حُنَیف (رض) فرماتے ہیں کہ "غزوہ بدر کے دن ہم میں سے کوئی تلوار سے مشرک کی طرف اشارہ کرتا تھا تو اس کی تلوار پہنچنے سے پہلے ہی مشرک کا سر جسم سے جدا ہو کر گر جاتا تھا۔

نوٹ: یاد رہے کہ غزوۂ بدر کا واقعہ 2ھ 17 رمضانُ المبارک، بروز جمعہ صبح کے وقت پیش آیا تھا۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں عنقریب ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، اور یہ نعمت اور امداد کی چھٹی قسم ہے، کیونکہ انسان کے جسم کا امیر اس کا دل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو قوی کر دیا اور ان کے دلوں سے کفار کے خوف کو زائل کر دیا اور پھر کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

اس کے بعد فرمایا سو تم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ اس آیت کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ حکم فرشتوں کو ہے اور اس جملہ سے متصل ہے کہ تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو، اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ حکم مومنوں کو ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ یہی تفسیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرشتوں کو قتال اور جہاد کے لیے نہیں نازل کیا گیا تھا۔ ان کے ہر جوڑ پر وار کرو یعنی ان کے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹ ڈالو۔ اس کی بھی دو تفسیریں ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ جس طرح بھی چاہو ان کو مار ڈالو، کیونکہ گردن کے اوپر سر ہے اور سر اشرف الاعضاء ہے اور جوڑ اضعف الاعضاء ہیں پس یہاں اشرف اور اضعف کا ذکر کر کے متنبہ کیا ہے کہ ان کو جس طرح چاہو قتل کر دو۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یا تو ان کو قتل کر دو یا پھر ان کی انگلیوں اور ان کے ہاتھوں کو کاٹ ڈالو تاکہ یہ تم پر حملہ کرنے کے قابل نہ رہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

بدر میں فرشتوں کے قتال کی کیفیت

یعنی بدر میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ تم مومنوں کے دل مضبوط کرو، میں ضرور ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دوں گا تو تم کفار کی گردنوں پر اور ان کے ہر جوڑ پر ضربیں لگاؤ۔ چنانچہ حضرت ابوامامہ (رض) سے مروی ہے کہ فرمایا ہم نے بدر میں اپنی یہ حالت دیکھی کہ ہم میں سے کوئی شخص کسی مشرک پر تلوار لہراتا مگر اس سے قبل کے وہ اس پر تلوار چلاتا اس کا سر پہلے ہی کٹ کر زمین پر گر جاتا (یعنی فرشتے اس کا سر کاٹ دیتے) (درمنثور بروایت ابن مردویہ)

حضرت انس (رض) سے مروی ہے کہ بدر میں لوگ فرشتوں کے ہاتھ سے اور مومنوں کے ہاتھ سے قتل ہونے والوں میں اس طرح امتیاز کرتے تھے کہ فرشتوں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی گردنوں اور دیگر جوڑوں پر آگ سے جلنے کے نشانات پائے جاتے تھے (یعنی جہاں فرشتے وار کرتے وہ جگہ جل جاتی تھی) (ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 8661 حدیث 6788 مطبوعہ مکہ مکرمہ)

حضرت سیدنا علی المرتضٰی (رض) سے مروی ہے کہ بدر میں ایک صحابی حضرت ابو یاسر (رض) نے حضرت عباس (رض) کو قیدی بنایا حالانکہ حضرت عباس اپنی صحت اور قد و قامت میں ابو یاسر سے کہیں زیادہ تھے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے پوچھا اے ابو یاسر! تم نے عباس کو کیسے گرفتار کر لیا؟ انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شخص نے اس میں میری مدد کی تھی جیسے میں نے پہلے کبھی دیکھا نہ بعد میں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک معزز فرشتے نے اس میں تمہاری مدد کی تھی۔ (مسند احمد جلد 1 صفحہ 353) گویا فرشتے بدر میں مسلمانوں کی ہر صورت میں مدد کر رہے تھے، کبھی وہ نظر نہیں آتے تھے اور کبھی انسانی شکل میں نظر بھی آجاتے تھے۔ (تفسیر برہان القرآن)

معرکہ بدر کی اہمیت

جنگ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک مدلجی کی صورت میں ممثل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری لشکر شیاطین کا تھا۔ یہ واقعہ آگے آئے گا۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبرائیل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر بھیجے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر شیاطین آدمیوں کی صورت میں (ہم شکّل) ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی طرف سے لڑنے کو تیار ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسے ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم و ضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو۔ ادھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے ادھر میں کفار کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈال دوں گا۔ تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردنیں مارو اور پور پور کاٹ ڈالو۔ کیونکہ آج ان سب جنی و انسی کافروں نے مل کر خدا اور رسول سے مقابلہ کی ٹھہرائی ہے۔ سو انھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کیسی سخت سزا ملتی ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔ روایات میں ہے کہ بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھا دیا کہ اگر

کبھی شیاطین الجن والانس ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقہ سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے۔ باقی ویسے تو فتح و غلبہ بلکہ ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت و قدرت سے انجام پاتا ہے۔ اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی، اور اگر فرشتوں ہی سے کوئی کام لے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر پٹک سکتا ہے۔ یہاں تو عالم تکلیف و اسباب میں ذرا سی تنبیہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔

مسلمان اور کافر کے دل کا فرق

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ کافروں کے دل فرشتوں کے الہام کے قابل نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رعب ڈالنے کو اپنی طرف منسوب کیا اور فرشتوں کو مسلمانوں کے دل ثابت کرنے کا حکم دیا اور اس جنگ میں فرشتے ہاتھوں سے بھی لڑے ہیں (موضح القرآن)

نکتہ: چونکہ معرکہ بدر میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقۃ بن مالک مدلجی کی شکل میں متمثل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا اور مشرکین کے حوصلے بڑھائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا کہ میرا تمام قبیلہ تمہارے ساتھ ہے اور بعد ازاں ابلیس لعین شیاطین کا ایک بھاری لشکر لیکر مشرکین کی مدد کے لیے معرکہ بدر میں حاضر ہوا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنے کے لیے فرشتوں کا لشکر نازل کیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے الہامات سے مسلمانوں کے دلوں کو قوت پہنچائیں اور ان کی مدد کریں اور ان کے ہمراہ ہو کر کافروں سے لڑیں ورنہ فی الحقیقت اللہ کو نہ فرشتوں کو احتیاج ہے اور نہ آدمیوں کی وہ ایک فرشتہ سے بھی بڑی سے بڑی بستی تباہ کر سکتا ہے۔ یہ سب من جانب اللہ اپنے رسول کا اور اپنے صحابہ کا اعزاز و اکرام تھا۔

فرشتوں کے کام

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کئے گئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آکر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور ان میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی ان کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت و قوت بھی بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کی تائید چند روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر در منثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتال ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرام سے نقل کی ہیں۔

ابو نعیم نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا ابا، آپ کو ابوالیسر نے کیسے گرفتار کر لیا، اگر آپ چاہتے تو اس کو مٹھی میں پکڑ لیتے (آپ قد آور جسیم آدمی ہیں اور ابوالیسر ناٹا ٹھگنا مٹھی بھر آدمی ہے) فرمایا بیٹے ایسا نہ کہو۔ وہ مجھے کوہ خندقہ سے بھی بڑا دکھائی دیتا تھا۔ ابن انباری نے کہا فرشتے واقف نہ تھے کہ آدمیوں کو کیسے قتل کیا جاتا ہے اللہ نے فاضربوا فرما کر ان کو بتا دیا۔
حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعاء قبول ہوئی:

بخاری نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن جب کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ڈیرہ کے اندر تھے ' آپ نے دعا کی: اے اللہ! میں تجھے تیری ذمہ داری اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں ' اے اللہ! اگر مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی آج تیری مشیت ہوئی تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جاسکے گی۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہاتھ پکڑ لیا اور عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! بس ' آپ اپنے رب کے سامنے خوب زاری کر چکے (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعاء ختم کردی) اور زرہ پہنے ' یہ فرماتے ہوئے ڈیرہ سے باہر آگئے: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔

فقط اشارہ سے سر کٹ جاتا

حاکم اور بیہقی اور ابو نعیم نے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت سہل بن حنیف نے فرمایا بدر کے دن ہم میں سے بعض لوگ اپنی تلوار سے مشرک کے سر کی طرف اشارہ ہی کرتے تھے اور تلوار پہنچنے نہ پاتی تھی کہ سر نیچے گر پڑتا تھا بیہقی نے حضرت ربیع بن انس کا بیان نقل کیا کہ گردنوں اور پوروں پر آگ سے جلے ہوئے کی طرح نشان دیکھ کر لوگ پہچان لیتے تھے کہ اس کا کس نے قتل کیا ہے۔
(تفسیر مظہری)

ابن اسحاق اور بیہقی نے حضرت ابو واقد لیثی کا بیان نقل کیا ہے: میں بدر کے دن ایک مشرک کا تعاقب کر رہا تھا لیکن میری تلوار پہنچنے سے پہلے اس کا سر گر پڑا ' اس سے میں پہچان لیتا تھا کہ کسی اور نے اس کو قتل کر دیا۔ بیہقی نے حضرت خارجہ بن ابراہیم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت جبرائیل سے دریافت کیا: بدر کے دن اقدم حیزوم کہنے والا کون فرشتہ تھا؟ حضرت جبرائیل نے فرمایا: تمام آسمان والوں کو میں نہیں پہچانتا۔

مسلم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے ' حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس روز ایک مسلمان ' ایک مشرک کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا۔ مشرک آگے آگے بھاگا جا رہا تھا کہ مسلمان نے اوپر سے کوڑا مارنے کی آواز سنی اور کسی سوار کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا: اقدم حیزوم (حیزوم! آگے بڑھ) نظر اٹھا کر دیکھا تو مشرک سامنے چت پڑا ہوا دکھائی دیا جس کی ناک ٹوٹ گئی تھی اور چہرہ پھٹ گیا تھا۔ اس مسلمان نے سب کو وہاں جمع کر کے دکھایا۔ ایک انصاری نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا ' حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو ' وہ (قتل) تیسرے آسمان کے فرشتوں کی کمک نے کیا تھا۔ حاکم اور بیہقی اور ابو نعیم نے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے (تفسیر مظہری)

ابو لہب

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافع نے فرمایا: میں عباس بن عبدالمطلب کا غلام تھا۔ اسلام ہمارے گھر والوں کے اندر داخل ہو چکا تھا ' اُمّ الفضل مسلمان ہو چکی تھیں اور میں بھی اسلام لے آیا تھا۔ عباس قوم والوں سے ڈرتے تھے اور ان کی مخالفت پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ آدمی بڑے مالدار تھے اور ان کا مال قوم میں (بطور قرض) بٹا ہوا تھا ' اس لیے آپ ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ دشمن خدا ابو لہب خود بدر میں شریک نہ ہوا تھا ' اپنی جگہ اس نے عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا۔ جب اس

کو بدر کی شکست کی اطلاع ملی تو اللہ نے اس کو ذلیل اور رسوا کر دیا اور ہم کو اپنے اندر قوت اور عزت محسوس ہونے لگی۔ میں کمزور آدمی تھا ' تیر بنایا کرتا تھا اور زمزم کے حجرہ کے اندر بیٹھا تیر چھیلا کرتا تھا۔ ایک روز حجرہ کے اندر بیٹھا تیر تراش رہا تھا 'اُمّ الفضل میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ ابو لہب کافر پاؤں کو گھسیٹتا ہوا سامنے سے آ گیا اور حجرہ کے بیرونی حصہ میں بیٹھ گیا 'اس کی پشت میری پشت کی طرف تھی۔ وہ بیٹھا ہی ہوا تھا کہ لوگوں نے کہا: لو 'ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب آ گیا۔ ابو لہب بولا: بھتیجے! میرے پاس آؤ 'تمہارے پاس ضرور اطلاع ہو گی۔ ابو سفیان اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا 'لوگ کھڑے رہے۔ ابو لہب نے کہا: بھتیجے! بتاؤ کیا ہوا؟ ابو سفیان نے کہا: کچھ نہیں 'خدا کی قسم! مقابلہ ہوا تو ہم نے اپنے شانے ان کے ہاتھوں میں دے دیئے کہ وہ جیسا چاہیں کریں 'ہم کو قتل کریں یا قید کریں اس کے باوجود 'خدا کی قسم! لوگ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے مگر ہمارا مقابلہ ایسے گورے رنگ کے لوگوں سے ہوا جو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور آسمان و زمین کے درمیان (فضا میں) معلق تھے۔ خدا کی قسم! ان کا اندازہ کسی چیز سے نہیں ہوتا تھا 'نہ ان کے سامنے کوئی چیز ٹھہر سکتی تھی۔ حضرت ابو رافع کا بیان ہے: میں نے یہ سن کر خیمہ کا ایک حصہ (غالباً راوی نے جس کو حجرہ کہا ہے 'وہ حجرہ نما ڈیرہ ہو گا جو طنابوں سے بندھا ہوا ہو گا) اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کہا: خدا کی قسم! وہ ملائکہ تھے۔ ابو لہب نے ہاتھ اٹھا کر فوراً میرے منہ پر زور سے ضرب لگائی۔ میں اس سے لپٹ گیا 'اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر دے مارا اور اوپر چڑھ کر مجھے مارنے لگا۔ میں کمزور آدمی تھا 'اُمّ الفضل نے جو یہ دیکھا تو ڈیرے کی ایک ٹیکی لے کر ابو لہب کے زور سے ماری جس سے اس کا سر برے طور پر پھٹ گیا اور بولیں: چونکہ اس کا آقا موجود نہیں ہے 'اس لیے تو نے اس کو کمزور سمجھ لیا۔

ابو لہب ذلیل ہو کر 'منہ پھیر کر چل دیا اور سات راتیں گذرنے نہ پائی تھیں کہ اللہ نے اس کو عدسہ کے مرض میں مبتلا کر دیا اور ختم کر دیا۔ ابن جریر نے کہا: عدسہ ایک قسم کا پھوڑا ہوتا تھا۔ عرب اس کو منحوس جانتے تھے 'ان کا خیال تھا کہ یہ بڑا متعدی مرض ہے۔ ابو لہب کو چونکہ عدسہ کا مرض ہوا تھا 'اس لیے مرنے کے بعد بھی تین دن تک اس کی اولاد اس سے دور دور ہی رہی۔ کوئی اس کی لاش کے قریب نہ آتا تھا ' نہ اس کو دفن کرنے کا قصد کرتا تھا۔ آخر جب بدنامی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو ایک گڑھا کھود کر لاٹھیوں کے سہارے لاش کو اٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا اور دور ہی دور سے پتھروں سے گڑھے کو پاٹ کر لاش کو چھپا دیا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یونس بن بکیر کی روایت میں آیا ہے: ابو لہب کی لاش کیلئے گڑھا نہیں کھودا گیا تھا بلکہ کسی باغ کی دیوار کے سہارے اس کو ٹکا کر دیوار کی پشت کی جانب سے پتھر پھینک کر لاش کو پتھروں سے چھپا دیا تھا۔

(تفسیر مظہری) (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝١٣

لغۃ القرآن: [ذٰلِكَ : یہ] [بِاَنَّهُمْ : اس سبب سے کہ انہوں نے] [شَآقُّوا : مخالفت کی] [اللّٰهَ : اللہ کی] [وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کے رسول کی] [وَمَنْ : اور جو] [يُّشَاقِقِ : مخالفت کرے گا] [اللّٰهَ : اللہ کی] [وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کے رسول کی] [فَاِنَّ : تو بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [شَدِيْدُ الْعِقَابِ : سخت عذاب دینے والا ہے]

ترجمہ: یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کی، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کرے تو بیشک اللہ (اسے) سخت عذاب دینے والا ہے

تشریح:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے مراد اہل ایمان کی مخالفت ہے۔ (تفسیر قرطبیؔ) یعنی جنگ بدر میں کفار مکہ کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کی انتہاء کر دی۔ مکہ میں جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے کفار مکہ نے ان کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ انھیں اس قدر اذیتیں پہنچائیں کہ وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے مگر یہ ظالم یہاں بھی حملہ کرنے آ گئے اس لیے یہ ایسی ہی سزا کے مستحق ہیں، چنانچہ اس جنگ میں کفار مکہ کے ستر اہم آدمی قتل ہو گئے، ستر قیدی بنا لیے گئے، باقی شکست کھا کر بھاگ گئے، انھیں اپنے مظالم کی سزا تو اس دنیا میں ملی اور آخرت میں انھیں آگ کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جو اس دنیا کی سزا سے بہت زیادہ سخت عذاب ہو گا۔ (تفسیر امداد الکرم)

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو براہ راست اور بلا واسطہ نعمتیں ہیں اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کی ہوئی ان نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو بالواسطہ نعمتیں ہیں، کیونکہ کسی جماعت کے مخالفین پر عذاب بھی اس جماعت کے حق میں نعمت ہوتا ہے۔

شقاق کا معنی

اس آیت میں فرمایا ہے: انھوں نے اللہ سے شقاق کیا۔ شقاق کا معنی ہے ایک شخص ایک شق (جانب) پر ہو اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ متصور نہیں ہے کہ وہ کسی ایک شق پر ہو یا کسی ایک جانب ہو، اس لیے اس آتی کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اولیاء سے شقاق کیا کہ وہ ایک جانب دین اسلام پر تھے اور وہ دوسری جانب کفر پر تھے۔

پہلی آیت میں فرمایا تھا جو اللہ اور اس کے رسول سے شقاق (تنازع) کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے اور اس دوسری آیت میں اس عذاب کی صفت بیان کی ہے کہ وہ عذاب معجّل (فوری) بھی ہے اور موجل (اخروی) بھی ہے۔ معجّل عذاب کو ذالکم سے بیان فرمایا یعنی: یہ ہے (تمہاری سزا) یہ اشارہ دنیاوی سزا کی طرف ہے، اس میں ستر کافر مارے گائے تھے اور ستر کافروں کو قید کرلیا گیا تھا۔

اور فرمایا ہے چکھو، اس میں اس عذاب کو کھانے پینے کی اشیاء تشبیہ دی گئی ہے، یعنی جس طرح کھانے پینے کی چیزیں لذیذ اور نفس کو مرغوب ہوتی ہیں تو یہ عذاب بھی حکماً تمہارے لیے مرغوب ہے، کیونکہ تمہیں بارہا بتایا گیا کہ تم جو کفر اور شرک کر رہے ہو یہ عذاب کا باعث ہے اس کے باوجود تم کفر اور شرک سے چمٹے رہے سو تمہیں کفر اور شرک مرغوب تھا اور وہ عذاب کو مستلزم ہے تو عذاب بھی تمہیں حکماً مرغوب ہوگا، سو اب تم اپنی مرغوب چیز کو چکھو۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقتولین بدر سے خطاب فرمانا اور سماع موتی کی بحث

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقتولین بدر کو تین دن تک پڑے رہنے دیا، پھر آپ ان کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور ان کو پکار کر فرمایا اے ابوجہل بن ہشام! اے امیہ بن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! کیا تم نے اپنے رب کے کیے ہوئے وعدہ کو سچا پالیا، بیشک میرے رب نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا میں نے اس کو سچا پایا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس ارشاد کو سن کر عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کیسے سنیں گے اور کس طرح جواب دیں گے حالانکہ یہ مردہ اجسام ہیں، آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! میں جو کچھ ان سے کہہ رہا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، لیکن یہ جواب دینے پر قادر نہیں ہیں، پھر آپ کے حکم سے ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ (صحیح مسلم صفۃ الجنۃ 77 (2874) 7090)

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر القرطبی المالکی الموفی 656ھ لکھتے ہیں:

چونکہ عادتاً مردوں سے کلام نہیں کیا جاتا تھا اس لیے حضرت عمر (رض) نے مردوں سے کلام کرنے کو مستبعد جانا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ زندوں کی طرح آپ کے کلام کو سن رہے ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے سننے کی یہ صفت دائمی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی یہ صفت بعض اوقات میں ہو (المفہم ج 7، ص 151، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، 1417ھ)

علامہ ابی مالکی متوفی 828ھ نے قاضی عیاض مالکی سے اس حدیث کی یہ شرح نقل کی ہے :

جس طرح عذاب قبر اور قبر کے سوال وجواب کی احادیث سے مردوں کا سننا ثابت ہے اس طرح ان کا سننا بھی ثابت ہے، اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے ان کے جسم یا جسم کے کسی جز کی طرف روح کو لوٹا دیا جائے، علامہ ابی مالکی فرماتے ہیں جو شخص یہ دعوی کرے کہ بغیر روح کے لوٹائے ہوئے جسم سن لیتا ہے، اس کا یہ دعوی بداہت کے خلاف ہے۔ اور شاید جو لوگ سماع موتی کے منکر ہیں ان کی یہی مراد ہو کہ روح کو لوٹائے بغیر جسم نہیں سن سکتا اور جو اس کے قائل ہیں وہ اعادہ روح کے ساتھ سماع کے قائل ہیں اور اس صورت میں یہ اختلاف اٹھ جاتا ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج 7، ص 322، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)

علامہ محمد بن محمد بن یوسف السنوسی الحسینی المتوفی 895ھ لکھتے ہیں :

اگر علامہ ابی کی روح سے مراد حیات ہے تو پھر تو واضح ہے کہ بغیر حیات کے جسم کے سننے کا دعوی کرنا بداہت کے خلاف ہے اور اگر روح سے وہ متعارف معنی مراد ہے جس کا جسم میں حلول ہوتا ہے اور جس کے نکلنے سے جسم مردہ ہو جاتا ہے اور جسم میں اس کے حلول کی وجہ سے جسم عادتاً زندہ ہوتا ہے تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ اگر روح کو جسم میں نہ لوٹایا جائے، تو جسم نہ سن سکے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم میں روح کو لوٹائے بغیر اس میں حیات پیدا کر دے اور سماعت کا ادراک پیدا کر دے۔ (اکمال اکمال المعلم ج 7، ص 322، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی 676ھ لکھتے ہیں :

علامہ مازری نے کہا اس حدیث سے بعض لوگوں نے سماع موتی (مردوں کے سننے پر) استدلال کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس حدیث سے عام حکم ثابت نہیں ہوتا یہ صرف مقتولین بدر کے ساتھ خاص ہے، قاضی عیاض مالکی نے ان کا رد کرتے ہوئے لکھا جن احادیث سے عذاب قبر اور قبر میں سوالات اور جوابات ثابت ہیں اور ان سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے اور ان کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس حدیث سے بھی سماع موتی ثابت ہے دونوں کا ایک محمل ہے، اور یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا ہو یا ان کے جسم کے کسی ایک عضو میں حیات پیدا کر دی ہو اور جس وقت اللہ ان میں سماعت پیدا کرنا چاہے وہ سن لیتے ہوں، یہ قاضی عیاض کا کلام ہے اور یہی مختار ہے اور جن احادیث میں اصحاب قبور کو سلام کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان کا بھی یہی تقاضا ہے۔ (صحیح مسلم بشر النووی ج 11، ص 7091، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1417ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی 668ھ لکھتے ہیں :

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ موت عدم محض اور فناء صرف نہیں ہے بلکہ موت روح کے بدن سے منقطع ہونے اور اس کی بدن سے مفارقت کا نام ہے اور وہ ایک حال سے دوسرے حال میں اور ایک دار سے دوسرے دار میں منتقل ہونا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 338، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ ابو عبداللہ قرطبیؒ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے :

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اصحاب پیٹھ موڑ کر چلے جاتے ہیں تو مردہ ان کی جوتیوں کے چلنے کی آواز سنتا ہے، پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اس کے بعد قبر میں

سوال وجواب کاذکر ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 1338، 1374۔ صحیح مسلم کتاب الجنتہ : 71 (2870)۔ سنن النسائی، رقم الحدیث : 2048)

سماع موتی سے حضرت عائشہؓ کے انکار کی توجیہ

عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ (رض) کے سامنے ذکر کیا گیا کہ حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے : مردہ کے گھر والوں کے رونے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے، حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طرح فرمایا تھا کہ مردہ کو اس کے گناہوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے اور اس کے گھر والے اس پر رو رہے ہیں، اور یہ ایسا ہی کہ جب جنگ بدر کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدر کے کنویں پر کھڑے ہوئے اور اس میں مشرکین میں سے مقتولین بدر پڑے ہوئے تھے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا جو فرمانا تھا، حضرت عمر نے روایت کیا یہ میرا کلام سن رہے ہیں اور وہ بھول گئے۔ آپ نے فرمایا تھا ان کو علم ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ برحق ہے۔ پھر حضرت عائشہ نے یہ آیت پڑھی : " انک لاتسمع الموتی : بیشک آپ مردوں کو نہیں سناتے " (النمل : 80)۔ " وماانت بمسمع من فی القبور : اور آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں " (فاطر : 22)۔ (صحیح مسلم الجنائز 26 (932) 2121۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 3129۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 2076)

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر القرطبیّ المالکی المتوفی 656ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

حضرت عائشہ (رض) نے جن آیتوں سے استدلال کیا ہے ان سے مراد کفار ہیں گویا کہ وہ اپنی قبروں میں مردہ ہیں اور ان آیتوں میں سنانے سے مراد ان کا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کو سمجھنا اور آپ کے پیغام کو قبول کرنا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : " ولو علم اللہ فیھم خیرا لااسمعھم ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون : اور اگر (بالفرض) اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں (آپ کا پیغام) ضرور سنا دیتا اور اگر بالفرض) اللہ انھیں سنا بھی دیتا تب بھی وہ اعراض کرتے ہوئے ضرور پیٹھ پھیرتے " (الانفال : 23)

اور یہ اس طرح ہے جیسے ان کے حواس خمسہ سلامت ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرا، گونگا اور اندھا فرمایا، کیونکہ سننے، بولنے اور دیکھنے کی جو غرض وغایت اور اس کے تقاضے ہیں وہ ان کو پورا نہیں کرتے تھے، اور ان آیتوں کا معنی یہ ہے کہ آپ ان کو اپنا پیغام نہیں سناتے جو اس پیغام کو فہم وتدبر سے نہیں سنتے اور نہ اس پیغام کو قبول کرتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ ان آیتوں میں حقیقتاً مردے مراد ہیں تب بھی ان آیات کا ان احادیث سے کوئی تعارض نہیں ہے جن سے مردوں کا سننا ثابت ہے، کیونکہ اگر ان آیتوں سے بالعموم مردوں کے سننے کی نفی مراد ہو تب بھی عام میں تخصیص جائز ہے اور مخصص وہ احادیث ہیں جن سے مردوں کا سننا ثابت ہے اور ان سے یہ ثابت ہوگیا کہ کسی وقت اور کسی حال میں مردے سن لیتے ہیں۔ حضرت ابوطلحہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے میں نے جو کچھ ان (مقتولین بدر) سے کہا اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 1374۔ صحیح مسلم رقم الحدیث : 932۔ المفہم ج 2، ص 586، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، 1417ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر بن عسقلانی شافعی متوفی 852ھ لکھتے ہیں :

حضرت عائشہ (رض) مردوں کے سننے کا انکار کرتی ہیں اور ان کے علم اور جاننے کا اعتراف اور اقرار کرتی ہیں، امام بیہقی نے فرمایا علم سماعت کے منافی نہیں ہے اور آیت کریمہ آپ مردوں کو نہیں سناتے (النمل: 40) کا جواب یہ ہے کہ آپ مردوں کو بہ حیثیت مردہ نہیں سناتے لیکن اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ سن لیتے ہیں، جیسا کہ قتادہ نے بیان کیا ہے، اور مقتولین بدر کے سننے کی حدیث صرف حضرت عمر نے روایت نہیں کی اور نہ اس روایت میں حضرت ابن عمر منفرد ہیں بلکہ اس حدیث کو حضرت ابو طلحہ نے بھی روایت کیا ہے (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3976۔ صحیح مسلم رقم الحدیث: 2875) اور اس کی مثل حدیث کو امام طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ ! کیا یہ سنتے ہیں ؟آپ نے فرمایا وہ اسی طرح سنتے ہیں جس طرح تم سنتے ہو لیکن وہ جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔ حافظ عسقلانی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدر کے کنویں پر کھڑے ہوئے اور فرمایا اے کنویں والو ! کیا تم نے اس وعدہ کو سچا پا لیا جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا، کیونکہ میں نے اس وعدہ کو سچا پا لیا جو مجھ سے میرے رب نے کیا تھا۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ ! کیا یہ سن رہے ہیں ؟آپ نے فرمایا یہ اسی طرح سن رہے ہیں جس طرح تم سن رہے ہو لیکن یہ آج جواب نہیں دے سکتے ! (المعجم الکبیر ج 10، رقم الحدیث: 10320۔ کتاب السنہ، رقم الحدیث: 884۔ نیز امام ابن اسحاق نے اس حدیث کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ السیرۃ النبویہ، ج 2، ص 250)

اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ امام ابن اسحاق نے مغازی میں یونس بن بکیر کی سند جید کے ساتھ حضرت عائشہ (رض) سے بھی حضرت ابو طلحہ کی حدیث کی مثل کو روایت کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ (السیرۃ النبویہ ج 2، ص 250)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: امام احمد عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ (رض) نے بیان فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا کہ مقتولین بدر کو کنویں میں پھینک دیا جائے۔ امیہ بن خلف کے علاوہ سب کو پھینک دیا گیا کیونکہ وہ اپنی زرہ میں پھول چکا تھا۔ جب ان کو کنویں میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا اے کنویں والو ! کیا تم نے اپنے رب کے اس وعدہ کو سچا پا لیا جو اس نے تم سے کیا تھا ؟ کیونکہ میں نے اس وعدہ کو سچا پا لیا جو مجھ سے میرے رب ن کیا تھا، آپ کے اصحاب نے کہا یارسول اللہ ! کیا آپ مردوں سے باتیں کر رہے ہیں ؟آپ نے ان سے فرمایا انھوں نے جان لیا ہے کہ میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ برحق ہے، اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے سن لیا۔ میں نے ان سے جو کہا تھا وہ برحق تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمایا تھا انھوں نے جان لیا۔ (مسند احمد ج 18 رقم الحدیث: 4639، طبع قاہرہ۔ مسند احمد ج 6، ص 276، طبع قدیم، دارالفکر) حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ نے یہ روایت کیا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، ہم کو مسند احمد میں یہ الفاظ نہیں ملے۔ البتہ امام ابن اسحاق کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، بہر حال حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اگر امام احمد کی یہ روایت (یا امام ابن اسحاق کی یہ روایت) محفوظ ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنے سابق انکار سے رجوع فرما لیا، کیونکہ ان کے نزدیک دیگر صحابہ کی روایت سے یہ امر ثابت ہو گیا تھا جو اس موقع پر حاضر تھے اور حضرت عائشہ اس موقع پر حاضر نہیں تھیں۔ امام اسماعیلی نے یہ کہا ہے کہ ہر چند کہ حضرت عائشہ (رض) فہم اور ذکاوت اور کثرت روایت اور بحر علم میں غواص ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہ پر فائق ہیں لیکن ثقہ اور معتمد صحابہ کی روایت کو اسی وقت مسترد کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کا مثل ثقہ روایت میں اس کے منسوخ یا مخصوص یا محال ہونے کی تصریح ہو۔ اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ جس چیز کا حضرت عائشہ نے

انکار کیا ہے اور جس چیز کو دوسرے صحابہ نے ثابت کیا ہے ان کو جمع کرنا ممکن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے "انک لا تسمع الموتی: آپ مردوں کو نہیں سناتے" (انک لا تسمع الموتی)۔ یہ اس کے منافی نہیں کہ وہ اس وقت سن رہے تھے۔ کیونکہ اسماع کا معنی ہے سنانے والے کی آواز کو سامع تک پہنچانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو سنایا تھا بایں طور کہ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز ان تک پہنچائی۔ رہا حضرت عائشہ کا یہ فرمانا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا وہ اب جان رہے ہیں یا ان کو اب علم ہو رہا ہے، تو اگر حضرت عائشہ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خود یہ الفاظ سنے تھے تو یہ دیگر صحابہ کی اس روایت کے منافی نہیں ہے کہ وہ اب سن رہے ہیں بلکہ اس کی موید ہے،

علامہ سہیلی نے جو اس مقام پر بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث خرق عادت (معجزہ) پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ صحابہ نے کہا کیا آپ مردوں سے کلام کر رہے ہیں تو آپ نے جواب دیا جو صحابہ کی روایت کے مطابق وہ اب سن رہے ہیں اور حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق ان کو اب علم ہو رہا ہے، اور جب مردہ ہونے کی حالت میں ان کا عالم ہونا جائز ہے تو اس حال میں ان کا سامع ہونا بھی جائز ہے۔ اور یہ سماعت یا ان کے سر کے کانوں سے تھی یا ان کے دل کے کانوں سے تھی۔ اور دیگر صحابہ کی روایت کو حضرت عائشہ کی روایت پر اس لیے ترجیح ہے کہ وہ اس موقع پر حاضر تھے اور حضرت عائشہ اس موقع پر موجود نہ تھیں، حضرت عائشہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے "ما انت بمسمع من فی القبور: آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں" (فاطر: 22)۔ اور یہ آیت اس آیت کی مثل ہے افانت تسمع الصم او تھدی العمی: تو کیا آپ بہروں کو سنائیں گے اور اندھوں کو ہدایت دیں گے (الزخرف: 4)۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے اور وہی توفیق دیتا ہے اور وہی دلوں کے کانوں تک نصیحت پہنچاتا ہے نہ کہ آپ، اور مردوں اور بہروں کے ساتھ تشبیہ دینے کے لیے کفار کو مردہ اور بہرہ فرمایا، پس حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سناتا ہے جب وہ چاہتا ہے اور حقیقت میں نہ اس کا نبی سنا سکتا ہے نہ کوئی اور، پس اس آیت سے حضرت عائشہ کے استدلال کا دو وجوہ سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اول یہ کہ یہ آیت کفار کو اہل ایمان کی دعوت دینے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے اور ثانی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے اس چیز کی نفی کی ہے کہ حقیقت میں وہ سنانے والے نہیں ہیں بلکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سنانے والا ہے۔ اور اللہ نے صحیح فرمایا ہے وہی جب چاہتا ہے ان کو سناتا ہے وہ جو چاہے کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (الروضۃ الانفس، ج 2، ص 74، مطبوعہ ملتان، فتح الباری، ج 7، ص 303، 304، مطبوعہ لاہور، 1401ھ)

حافظ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی 855ھ اس سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عائشہ نے یہ آیات اپنے موقف میں تلاوت کیں، ان آیات کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ان آیات میں سماع کے پیدا کرنے کی نفی کی گئی اور سماع کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا نہیں کرتے، بدر کے کنویں میں اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام سنا دیا، یہ تفسیر قتادہ نے بیان کی ہے اور علامہ سہیلی نے یہ کہا ہے کہ حضرت عائشہ (رض) اس موقع پر حاضر نہیں تھیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمایا تھا کہ "تم میری بات کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو"۔ تو اس موقع پر انہی کی روایت معتبر ہے جنہوں نے یہ الفاظ سنے تھے، اور جب اس حالت میں ان کا جاننا ممکن ہے تو ان کا سننا بھی ممکن ہے، یا تو ان کفار نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کو اپنے سر کے کانوں سے سنا تھا اور یہ اس وقت ہے جب فرشتوں کے سوال کے وقت ان کی روحیں ان کے جسموں میں لوٹا دی گئی تھیں جیسا کہ اکثر اہل سنت کا قول ہے۔ یا انھوں نے دل اور روح کے کانوں سے سنا جیسا کہ ان لوگوں

کا مذہب ہے کہ سوال صرف روح کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور روح کو جسم میں لوٹایا نہیں جاتا۔ (عمدۃالقاری ج 17، ص 93، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃالمنیریہ، مصر 1348ھ)

ملا علی سلطان بن القاری متوفی 1041ھ میں اس بحث میں لکھتے ہیں:

علامہ ابن ہمام نے شرح الہدایہ میں یہ تصریح کی ہے کہ اکثر مشائخ حنفیہّ کا یہ موقف ہے کہ مردہ سنتا نہیں ہے کیونکہ انھوں نے کتاب الایمان میں یہ تصریح کی ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ قسم کھائی کہ وہ کسی سے کلام نہیں کرے گا، پھر اس نے کسی مردہ سے کلام کیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ اس کی قسم اس شخص کے متعلق تھی جو سوچ سمجھ کر اس کی بات کا جواب دے اور مردہ اس طرح نہیں ہے۔ (ملا علی قاری فرماتے ہیں) یہ جزیہ اس قاعدہ پر متفرع ہے کہ قسم کی بنا عرف پر ہوتی ہے اور مردہ سے بات کرنے کو عرف میں کلام نہیں کہتے اور اس سے حقیقت میں مردہ کے سننے کی نفی نہیں ہوتی، جس طرح فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا تو مچھلی کھانے سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو گوشت فرمایا ہے: "وھوالذی سخر البحر لتاکلوامنہ لحما طریا: وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کردیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ" (النحل: 14)

حضرت عمر کی اس حدیث کو حضرت عائشہ (رض) نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کس طرح فرماسکتے ہیں کہ تم میرے کلام کو ان (مقتولین بدر) سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، جبکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: آپ مردوں کو نہیں سناتے (النمل: 80) اور فرمایا ہے آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں (فاطر: 22)۔ حضرت عمر (رض) کی یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، اس کو مسترد کرنا صحیح نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ اس حدیث اور قرآن مجید کی آیتوں میں کوئی تعارض بھی نہیں کیونکہ مردوں سے مراد قرآن مجید میں کفار ہیں، اور نفی کا حاصل یہ ہے کہ آپ ان کفار کو میرا پیغام سنا کر کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے، اور اس آیت میں مطلقاً سنانے کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ اس کی نظری یہ آیت ہے: "صم بکم عمی فہم لایعقلون: وہ بہرے گونگے اندھے ہیں پس وہ عقل سے کام نہیں لیں گے" (البقرہ: 171)

ان کو بہرا، گونگا اور اندھا اس لیے فرمایا کہ وہ کان، زبان اور آنکھوں سے نفع نہیں اٹھاتے تھے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ ان کافروں کو ایسا پیغام نہیں سنا سکتے جس سے وہ آپ کے پیغام کو تسلیم اور قبول کرلیں، علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ آیت اور اس کی مثل دوسری آیتوں کا محمل یہ ہے کہ انھوں نے اپنے حواس کو حق بات سننے اور حق کو دیکھنے سے روک لیا تھا، بیشک اللہ جس کو چاہے سناتا ہے اور اس میں ہدایت پیدا کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کی آیات میں فہم سے کام لے اور نصیحت حاصل کرے۔ رہی دوسری آیت آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں (فاطر: 22) سو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ کفر پر اصرار کرتے تھے۔ ان کو اس آیت میں مردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان کے ایمان لانے سے مایوس کرنے میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ اور اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے: "انک لاتھدی من احبب ولکن اللہ یھدی من یشاء: بیشک آپ اس کو ہدایت الیفتہ نہیں بناتے جس کا ہدایت یافتہ ہونا آپ کو پسند ہو لیکن اللہ جو کو چاہتا ہے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے" (القصص: 56)۔ پھر انھوں نے یہ جواب دیا کہ مقتولین بدر کو اپنا کلام سنان، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیت اور آپ کا معجزہ تھی۔ اور کفار کو زیادہ حسرت زدہ کرنا تھا، میں کہتا ہوں کہ یہ قتادہ کا قول ہے اور یہ جواب اور یہ قول مردود ہے کیونکہ خصوصیت بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتی اور وہ یہاں موجود نہیں ہے بلکہ صحابہ کا سوال کرنا اور آپ کا جواب دینا خصوصیت کے منافی ہے اور منکرین سماع

موتی پر اس حدیث سے اشکال ہو گا کہ جب لوگ مردہ کو دفن کر کے واپس چلے جاتے ہیں تو وہ کی جوتیوں سے چلنے کی آواز سنتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 1374۔ صحیح مسلم رقم الحدیث: 932)

اور اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ یہ حدیث دفن کے بعد اول وقت تک کے ساتھ مخصوص ہے تا کہ مردہ منکر نکیر کے سوال کا جواب دے سکے تو یہ جواب اس حدیث سے مردود ہے، حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ قبرستان میں گئے اور فرمایا السلام علیکم دار قوم مومنین۔ (صحیح مسلم رقم الھدیث: 249۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4304، مرقاۃ المفاتیح، ج8، ص11، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، 1390)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں جو یہ حدیث ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو ہر چند کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے لیکن یہ معنی کے اعتبار سے معلول ہے اور اس میں ایک ایسی علت ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت نہ ہو اور وہ علت یہ ہے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے مخالف ہے (ردالمحتار، ج3، ص131، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1407 ھ)

علامہ شامی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے مخالف ہے۔ ہم علامہ قرطبیؒ، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ سہیلی، علامہ محمود بن احمد عینی اور ملا قاری کی وہ توجیہات نقل کر چکے ہیں جن میں انھوں نے اس حدیث اور قرآن مجید کی آیات میں تطبیق دی ہے، اور ہم قبر والے پر سلام پڑھنے کی حدیث بھی باحوالہ بیان کر چکے ہیں اور انشاء اللہ اس حدیث کو مزید حوالہ جات اور دیگر احادیث کو بھی بحث کے آخر میں بیان کریں گے۔

اعلی حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی 3140ھ اس بحث میں فرماتے ہیں:

عرض؛ ام المومنین صدیق (رض) کا انکار سماع موتی سے رجوع ثابت ہے یا نہیں؟

ارشاد: نہیں، وہ جو فرمار ہی ہیں حق فرمار ہی ہیں۔ وہ مردوں کے سننے کا انکار فرماتی ہیں، مردے کون ہیں، جسم، روح مردہ نہیں، اور بیشک جسم نہیں سنتا، سنتی روح ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ام المومنین کے حضور میں سیدنا عمر فاروق (رض) کی حدیث بیان کی گئی کہ حضور اقدس (رض) نے ارشاد فرمایا "ماانتم باسمع منھم" تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں۔ ام المومنین نے فرمایا اللہ رحم فرمائے امیر المومنین پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ نہیں ارشاد فرمایا بلکہ فرمایا "انھم لیعلمون" بیشک وہ جانتے ہیں امیر المومنین کو سہو ہوا، انھوں نے فرمایا ماانتم باسمع منھم، تو خود ام المومنین (رض) مردوں کے علم کا اقرار فرماتی ہیں: سماع سے بیشک انکار فرماتی ہیں، اور وہ بھی اس کے ان معنوں سے جو عرف میں شائع ہیں، سماع کے عرفی معنی ان آلات کے ذریعہ سے سننا، یہ یقینا بعد مرنے کے روح کے لیے نہیں، روح کو جسم مثالی دیا جاتا ہے اس جسم کے کانوں سے سنتی ہے۔ پھر ام المومنین کا ان آیتوں سے استدلال اور بھی اس کو ظاہر کر رہا ہے۔ انک لا تسمع الموتی اور وما انت بمسمع من فی القبور۔ موتی کون ہیں؟ اجسام، قبور میں کون ہیں؟ وہی اجسام، تو پھر اجسام ہی کے سننے سے انکار ہوا۔ اور وہ یقینا حق ہے (پھر فرمایا) خود ام المومنین (رض) کا طرز عمل سماع موتی کو ثابت کر رہا ہے۔ فرماتی ہیں کہ جب حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے حجرہ میں دفن ہوئے میں بغیر چادر اوڑھے بے حجابانہ حاضر ہوتی اور کہتی "انماھوزوجی" میرے وہر ہی تو ہیں، پھر میرے باپ حضرت ابو بکر صدیق (رض) دفن ہوئے، جب بھی میں بغیر احتیاط کے چلی جاتی اور کہتی "انماھمازوجی وابی۔ میرے شوہر اور میرے باپ ہی تو ہیں،

پھر جب حضرت عمر (رض) دفن ہوئے تو میں نہایت احتیاط کے ساتھ چادر سے لپٹی ہوئی حاضر ہوتی، اس طرح کہ کوئی عضو کھلا نہ رہے، حیاء من عمر، عمر (رض) کی شرم سے۔ تو اگر ارواح کا سمع وبصر نہ مانتیں تو پھر حیاء من عمر کے کیا معنی؟ (پھر فرمایا) تین باتوں میں ام المومنین کا خلاف مشہور ہے اور ان تینوں میں غلط فہمی، ایک تو یہی سماع موتی کہ وسماع عرفی کا جسموں کے واسطے انکار فرماتی ہیں، اور اس کو غلط فہمی سے ارواح کے سماع حقیقی پر محمول کیا جاتا ہے۔ دوسرے معراج کے جسدے کے بارے میں انکار مشہور ہے کہ ام المومنین فرماتی ہیں "مافقدت جسد رسول اللہ" جسد اقدس میرے پاس سے کہیں نہ گیا۔ حالانکہ آپ معراج منامی کے بارے میں فرمارہی ہیں جو مدینہ منورہ میں ہوئی اور وہ معراج تو مکہ معظّمہ میں ہوئی۔ اس وقت ام المومنین خدمت اقدس میں حاضر بھی نہ ہوئی تھیں بلکہ نکاح سے بھی مشرف نہ ہوئی تھی اسے اس پر محمول کرنا سراسر غلطی ہے۔ تیسرے علم مافی الغد کے بارے میں ام المومنین کا قول ہے کہ جو یہ کہے کہ حضور کو علم مافی الغد (یعنی آنے والی کل کا علم) تھا وہ جھوٹا ہے۔ اس سے مطلق علم کا انکار نکالنا محض جہالت ہے، علم جبکہ مطلق بولا جائے خصوصاً جبکہ غیب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے۔ اس کی تشریح حاشیہ کشاف پر میر سید شریف (رح) نے کردی ہے اور یہ یقیناً حق ہے۔ کوئی شخص کسی مخلوق کے لیے ایک ذرہ کا بھی علم ذاتی مانے یقیناً کافر ہے۔ (الملفوظ ج 3 ص 281۔283۔ حامد اینڈ کمپنی لاہور)

دیوبند کے مشہور محدث انور شاہ کشمیری متوفی 1352ھ لکھتے ہیں:

سماع موتی کا مسئلہ گزر چکا ہے اور رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: آپ ان کو سنانے والے نہیں جو قبروں میں ہیں (فاطر: 22) سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ قبر والوں کو ایسا پیغام نہیں سناتے جس پر ان کا قبول کرنا مترتب ہو یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ قبر والوں کو ایسا پیغام نہیں سناتے جس پر ان کا قبول کرنا مترتب ہو یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ان قبر والوں کو ہمارے اس جہان میں نہیں سناتے اور ان قبر والوں کا سننا عالم برزخ میں ہے۔ اور وہ ہمارے جہان کے اعتبار سے معدوم ہے اور یا یہ آیت اس طرح ہے جس طرح فرمایا ہے وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں (البقرہ: 171) یعنی ان کو سننے کے باوجود بہرہ فرمایا۔ اسی طرح یہاں فرمایا کہ آپ ان بہروں کو نہیں سناتے۔ علامہ سیوطی نے کہا وہ آپ کے پیغام کو کان لگا کر نہیں سنتے، اس کو قبول نہیں کرتے اور اس سے ہدایت حاصل نہیں کرتے اس لیے فرمایا آپ ان کو نہیں سناتے گویا اس آیت میں کفار کو قبر والوں سے تشبیہ دی ہے۔ (فیض الباری ج 4، ص 90، مطبوعہ مجلس علمی ہند، 1357ھ)

شیخ انور شاہ کشمیری نے جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

میں یہ کہتا ہوں کہ مردوں کے سننے کے متعلق احادیث حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ امام ابو عمر (ابن عبد البر) نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے، کہ جب کوئی شخص مردہ کو سلام کرے تو وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اگر دنیا میں اس کو پہچانتا تھا تو اس کو پہچان لیتا ہے، (یہ روایت بالمعنی ہے) حافظ ابن کثیر نے بھی اس حدیث کو سند کے ساتھ روایت کیا ہے، پس اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ ہمارے ائمہ رحمہم اللہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، البتہ علامہ ابن الہمام نے یہ کہا ہے کہ سماع موتی میں اصل نفی ہے اور جن مواضع میں سماع ثابت ہے ان کا استثناء کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ پھر اصل میں نفی کا عنوان قائم کرنے کا کیا فائدہ اور جب فی الجملہ سماع ثابت ہے تو پھر تخصیص کے ادعا کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں قرآن مجید میں فرمایا ہے انک لا تسمع الموتی اور ما انت بمسمع من فی القبور اور ان آیتوں سے بظاہر مردوں کے مطلّقاً سننے کی نفی ہوتی ہے، اس کا ایک جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے سنانے کی نفی کی ہے، سننے کی نفی نہیں کی اور ہماری بحث مردوں کے سننے میں ہے، اور علامہ سیوطی نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ آپ کے پیغام کو کان لگا کر نہیں سنتے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کا

نفع نہیں حاصل کرتے، کیونکہ مردوں کا سماع سے فائدہ حاصل کرنا دنیاوی زندگی میں متصور ہے اور اب اس کا وقت گزر چکا ہے، اسی طرح یہ کفار ہر چند کہ زندہ ہیں لیکن آپ کا ان کو ہدایت دینا غیر مفید ہے کیونکہ یہ نفع نہ اٹھانے میں مردوں میں مثل ہیں۔ پس ان آیتوں سے مردوں کے سننے کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ سننے سے ان کے فائدہ اٹھانے کی نفی مقصود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نفی سماع سے ماننے اور عمل کرنے کی نفی بھی مراد ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کو کتنی مرتبہ نماز پڑھنے کے لیے کہا مگر وہ سنتا ہی نہیں۔ یعنی مانتا نہیں اور عمل نہیں کرتا، سو قبر میں مردے بھی سنتے نہیں اور عمل نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے زندہ کافروں کو مردوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ آپ کی بات مانیں گے نہیں اور اس پر عمل نہیں کریں گے، اگر تم یہ اعتراض کرو کہ جب مردوں کے لیے سننا ثابت ہے تو کیا وہ نفع بھی اٹھا سکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جو لوگ نیکی پر فوت ہوئے وہ سننے سے نفع بھی حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ العیاذ باللہ کفر پر فوت ہوئے تو ان کے لیے نفع کہاں؟ وہ لوگ صرف آواز سنتے ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم قبر میں جس سماع کے ثبوت کے درپے ہیں وہ عالم برزخ میں سماع ہے۔ اور قرآن مجید نے مردوں کے جس سننے کی نفی کی ہے وہ ہمارے اس عالم کے اعتبار سے ہے۔ (فیض الباری، ج 2، ص 267۔ 268، ملخصاً، مطبوعہ ہند، 1357ھ)

سماع موتی کے ثبوت میں بعض دیگر احادیث اور آثار

اس سے پہلے ہم صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالوں سے یہ حدیث بیان کر چکے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقتولین بدر کے متعلق صحابہ سے فرمایا (1) تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، اور اس پر مفصل بحث و نظر کا بھی ذکر کی اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن نسائی کے حوالہ سے یہ حدیث یان کی (2) کہ دفن کے بعد قبر میں مردہ جوتیوں سے چلنے کی آواز سنتا ہے اور اس پر وارد ہونے والے اعتراض کا جواب دیا اور اس کی تائید میں صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ کے حوالوں سے یہ حدیث بیان کی (3) کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قبرستان میں گئے اور فرمایا السلام علیکم دار قوم مومنین اور ظاہر ہے کہ یہ سلام کرنا اسی وجہ سے تھا کہ قبر میں مردے سنتے ہیں۔ اب اس کی تائید میں ہم مزید احادیث پیش کر رہے ہیں:

(4) امام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر مالکی اندلسی متوفی 463ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص بھی اپنے کسی ایسے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے، اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ (الاستذکار، ج 2، ص 165، رقم الحدیث: 1858، مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ، بیروت)

علامہ قرطبی اور علامہ مناوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ امام ابن عبدالبر نے اس حدیث کو التمہید میں بھی روایت کیا ہے لیکن ہم نے التمہید کے دو نسخوں اور فتح المالک میں اس حدیث کو تلاش کیا اس میں یہ حدیث نہیں ہے، امام عبدالبر نے اس حدیث کو صرف الاستذکار میں روایت کیا ہے۔

امام غزالی متوفی 505ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے (الحیاء العلوم، ج 6، ص 127) اور اس کے حاشیہ پر حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ عبدالحق الاشبیلی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، علامہ سید مرضی زبیدی متوفی 1205ھ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے امام ابن ابی

الدنیانے اس حدیث کو کتاب القبور میں روایت کیا ہے، اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس کو حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا (اتحاف السادۃ المتقین، ج 10، ص 366) علامہ زین الدین رجب حنبلی متوفی 795ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (احوال القبور، ص 142، مطبوعہ دار الکتاب العربی 1414ھ) محمد ناصر المجیولی نے اس کا دار البرزخ میں ذکر کیا ہے۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی 668ھ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ابن عبدالبر نے اس حدیث کو الاستذکار اور التمہید میں حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔

حافظ شمس الدین ابو عبداللہ بن قیم جوزیہ حنبلی متوفی 751ھ لکھتے ہیں:

حافظ ابو محمد عبدالحق الاشبیلی نے یہ عنوان قائم کیا کہ مردے زندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں اور ان کے اقوال اور اعمال کو پہچانتے ہیں پھر کہا کہ امام ابن عبدالبر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص بھی اپنے ایسے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ پہچانتا ہو پس اس کو سلام کرے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے، اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر وہ اس کو نہ پہچانتا ہو اور سلام کرے، تب بھی وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ عنقریب ہم اس حدیث کو باحوالہ ذکر کریں گے۔ (الروح ص 10 - 11، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ 1410ھ)

علامہ عبدالرؤف مناوی شافعی متوفی 1003ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن القیم نے کہا ہے کہ اس قسم کی احادیث اور آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص قبر والے کی زیارت کرتا ہے اور اس کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کے سلام کو سنتا ہے اور اس سے مانوس ہوتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے، اور یہ حکم شہداء اور غیر شہداء دونوں کے لیے عام ہے اور اس میں وقت کی کوئی قید نہیں ہے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کے لیے یہ مشروع کیا ہے کہ وہ اہل قبور کو سلام کریں جس طرح سننے والے اور عقل والے شخص کو سلام کیا جاتا ہے۔ حافظ عراقی نے کہا ہے کہ امام عبدالبر نے اس حدیث کو التمہید اور الاستذکرار میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو حافظ عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ (فیض القدیر ج 10، ص 5438، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

حافظ ابو بکر احمد بن علی الخطیب المتوفی 463ھ نے اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(5) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو بندہ بھی کسی ایسے شخص کی قبر کے پاس سے گزرے، جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا، پس اس کو سلام کرے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے اور وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ (تاریخ بغداد ج 6، ص 137، مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ، الجامع الصغیر، ج 2، رقم الحدیث: 8062۔ شرح الصدور ص 204، دار الکتب العلمیہ بیروت، 1403ھ۔ کنزالعمال ج 15، رقم الھدیث: 42556، مطبوعہ بیروت)

امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی 211ھ روایت کرتے ہیں:

(6) سالم بن عبداللہ بینا کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر (رض) جس قبر کے پاس سے گزرتے اس کو سلام کرتے تھے (المصنف ج 3، رقم الحدیث: 6721)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: ہم قبروں پر سلام کرنے کے لیے کیا کہیں؟آپ نے فرمایا کہو السلام علی اھل الدیار من المومنین والمسلمین یرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین، انا انشاء اللہ بکم لاحقون۔ (المصنف، ج 3، رقم الحدیث: 6722)

(8) زید بن اسلم بیان کرتے کہ حضرت ابوہریرہ اور ان کے ایک شاگرد ایک قبر کے پاس سے گزرے، حضرت ابوہریرہ اور ان کے شاگرد ایک قبر کے پاس سے گزرے، حضرت ابوہریرہ نے کہا سلام کرو، اس شخص نے پوچھا کیا قبر کو سلام کروں، حضرت ابوہریرہ نے کہا، اگر اس نے کس دن دنیا میں تمہیں دیکھ لیا تھا تو وہ اب تمہیں پہچان لے گا۔ (المصنف، ج 3، رقم الحدیث: 6723)

امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی 235ھ روایت کرتے ہیں:

(9) زازان بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی (رض) جب قبرستان میں داخل ہوتے تو فرماتے اس دیار میں رہنے والے مومنین اور مسلموں پر میرا سلام ہو، تم ہم پر مقدم ہو اور ہم تمہارے تابع ہیں اور ہم تمہارے ساتھ ضرور ملیں گے، اور ہم اللہ کے لیے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوتنے والے ہیں۔

(10)۔ جندب ازدی بیان کرتے ہیں کہ ہم سلمان کے ساتھ حرہ کی طرف گئے۔ حتیٰ کہ جب ہم قبروں کے پاس پہنچے تو انھوں نے دائیں طرف متوجہ ہو کر کہا، السلام علیکم یا اھل الدیار من المومنین والمومنات۔ الحدیث۔

(11) مجاہد سے روایت ہے کہ وہ قبروں پر سلام عرض کرتے تھے

(12) موسیٰ بن عقبہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے دیکھا سالم بن عبداللہ رات ہو یا دن، جس وقت بھی قبر کے پاس سے گزرتے تو اسکو سلام کرتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے السلام علیکم! میں نے ان سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا ان کے والد حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بھی اسی طرح کرتے تھے۔

(13) حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو ان میں سے کوئی شخص یہ کہے السلام علیکم یا اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانا انشاء اللہ بکم للاحقون انتم لنا فرط ونحن لکم تبع ونسال اللہ لنا ولکم العافیۃ۔

(14) عامر بن سعد اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ اپنی زمین سے لوٹتے اور شہداء کی قبروں کے پاس سے گزرتے تو کہتے السلام علیکم وانا بکم للاحقون، پھر اپنے اصحاب سے کہتے کہ تم شہداء کو سلام نہیں کرتے تاکہ وہ تمہارے سلام کا جواب دیں۔

(15) عبداللہ بن سعد الجاری بیان کرتے ہیں کہ مجھے سے حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا جب تم ان قبروں کے پاس سے گزرو جن کو تم پہچانتے تھے تو کہو، السلام علیکم اصحاب القبور اور جب تم ان قبروں کے پاس سے گزرو جن کو تم نہیں پہچانتے تھے تو کہو السلام علی المسلمین۔

(16) ابو مویبہ بیان کرتے ہیں کہ ان کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا کہ وہ البقیع کی طرف جائیں ان کے لیے دعا کریں اور ان کو سلام کریں۔ (المصنف ج 3، ص 339۔ 341، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، 1406ھ)

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی متوفی 360ھ روایت کرتے ہیں:

(17) حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احد سے لوٹتے ہوئے حضرت مصعب بن عمری (رض) کے پاس سے گزرے آپ نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ کے نزدیک زندہ ہو۔ (پھر صحابہ سے فرمایا) تم ان کی زیارت کرو اور ان کو سلام کرو۔ (المعجم الاوسط ج 4، ص 426، رقم الحدیث: 3712، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، 1415ھ)

(18) عبداللہ الاودی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اس وقت وہ حالت نزع میں تھے۔ انھوں نے کہا جب میں مر جاؤں تو میرے ساتھ اسی طرح کرنا جس طرح حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں مردوں کے ساتھ کرنے کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا جب تمہارے بھائیوں میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو تم اس کی قبر پر مٹی ہموار کر دینا، پھر تم میں سے کوئی شخص اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو جائے، پھر اس کو چاہیے کہ یہ کہے یا فلاں بن فلانہ، وہ اس کلام کو سنے گا اور جواب م نہیں دے گا، پھر کہے کہ یا فلاں بن فلانہ، تو وہ اٹھ کر سیدھا بیٹھ جائے گا پھر کہے یا فلاں بن فلانہ، تب وہ مردہ کہے گا اللہ تم پر رحم کرے ہماری رہنمائی کرو۔ لیکن تم کو (ان کے کلام کا) شعور نہیں ہوتا، پس اس شخص کو کہنا چاہیے: یاد کرو جب تم دنیا سے گئے تھے تو یہ شہادت دیتے تھے کہ ان لاالہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ اور تم اللہ کو رب مان کر راضی تھے اور اسلام کو دین مان کر اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی مان کر اور قرآن کو امام مان کر، پھر منکر اور نکیر میں سے ایک اپنے صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا اب یہاں سے چلو ہم اس شخص کے پاس نہیں بیٹھتے جس کو حجت کی تلقین کر دی گئی ہے، پھر ان کے سامنے اللہ حجت کرنے والا ہو گا، ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر ہمیں اس کی ماں کا نام معلوم نہ ہو تو! آپ نے فرمایا تو پھر اس کو حواء کی طرف منسوب کرے اور کہے یا فلاں بن حواء (المعجم الکبیر ج 8، رقم الحدیث: 7979۔ مجمع الزوائد، ج 2، ص 202۔ التزکرہ، ج 1، ص 119۔ تہذیب تاریخ دمشق، ج 6، ص 424۔ کنز العمال، رقم الحدیث: 42406، 42934)

علامہ ابو عبداللہ قرطبیؒ متوفی 668ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابو محمد عبدالحق اور شیبہ بن ابی شیبہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ یہ حدیث احیاء العلوم میں بھی ہے اور بہت علماء نے اس سے استدلال کیا ہے، اور شیخ فقیہ امام مفتی الامام ابوالحسن علی بن ھبۃ اللہ شافعی نے اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ہمارے شیخ علامہ ابوالعباس احمد بن عمر قرطبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث پر عمل کر کے میت کو تلقین کرنی چاہیے۔ (التذکرہ ج 1، ص 119، 120، ملخصاً، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

واضح رہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کے آباء کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا۔ اور اس حدیث میں جو امہات کی طرف نسبت کا ذکر ہے یہ قیامت کا واقعہ نہیں ہے بلکہ دفن کے بعد قبر کا واقعہ ہے۔ اس حدیث میں مردہ کے سننے کی صفات تصریح ہے۔ اور چونکہ اس حدیث پر اہل علم کا عمل ہے اور یہ اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

ملا علی قاری نے علامہ نووی سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک ضعیف حدیث اہل علم کے عمل سے قوی ہو جاتی ہے۔ (مرقات، ج 2، ص 98، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، 1390ھ)

امام ابو بکر حسین بن احمد بیہقی متوفی 458ھ روایت کرتے ہیں۔

(19)۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ایسی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا ہو اور اس کو سلام کرتے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور جب وہ ایسی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ نہ پہچانتا ہو اور اس کو سلام کرے تو وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ (شعب الایمان ج 7، رقم الحدیث: 9296۔ شرح الصدور ص 202)

(20) نیشاپور کے قاضی ابو ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا، قاضی کے پوچھنے پر بتایا کہ میں کفن چور تھا اور قبروں سے کفن چراتا تھا۔ ایک عورت فوت ہو گئی میں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تاکہ میں اس کی قبر دیکھ لوں۔ رات کو میں نے قبر کھودی اور اس کا کفن اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس عورت نے کہا سبحان اللہ! ایک جنتی مرد جنتی عورت کا

کفن اتار رہاہے، پھر اس عورت نے کہا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تم نے میری نماز جنازہ پڑھی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام لوگوں کو بخش دیا، جنھوں نے میری نماز جنازہ پڑھی تھی۔ (شعب الایمان ج 7، رقم: 9261، شرح الصدور، ص 208)

امام ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی 571ھ روایت کرتے ہیں:

(21) یحییٰ بن ایوب الخزاعی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا جس نے مسجد کو لازم کر لیا تھا، حضرت عمر اس سے بہت خوش تھے، اس کا باپ بوڑھا آدمی تھا، وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے باپ کی طرف لوٹ آتا تھا، اس کے راستہ میں ایک عورت کا دروازہ تھا وہ اس پر فریفتہ ہو گئی تھی، وہ اس کے راستہ میں کھڑی ہو جاتی تھی، ایک رات وہ اس کے پاس سے گزرا تو وہ اس کو مسلسل بہکاتی رہی حتی کہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا، جب وہ اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا تو وہ بھی اندر آ گئی۔ اس نوجوان نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا اور اس کی زبان پر یہ آیت جاری ہو گئی: "ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون: بیشک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، انھیں اگر شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں، اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں" (الاعراف: 201)

پھر وہ نوجوان بے ہوش ہو کر گر گیا، اس عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اس نوجوان کو اٹھایا اور اسے اس کے گھر کے دروازہ پر چھوڑ آئیں۔ اس کے گھر والے اسے اٹھا کر گھر میں لے گئے، کافی رات گزرنے کے بعد وہ نوجوان ہوش میں آیا اس کے باپ نے پوچھا اے بیٹے! تمہیں کیا ہوا تھا؟ اس نے کہا خیر ہے، باپ نے پھر پوچھا تو اس نے پورا واقعہ سنایا، باپ نے پوچھا! اے بیٹے! تم نے کونسی آیت پڑھی تھی؟ تو اس نے آیت کو دہرایا جو اس نے پڑھی تھی اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ گھر والوں نے اسے ہلایا جلایا، لیکن وہ مر چکا تھا، انھوں نے اس کو غسل دیا اور اسے جا کر دفن کر دیا۔ صبح ہوئی تو اس بات کی خبر حضرت عمر (رض) تک پہنچی، صبح کو حضرت عمر اس کے والد کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور فرمایا تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی۔ اس کے باپ نے کہا رات کا وقت تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا ہمیں اس کی قبر کی طرف لے چلو، پھر حضرت عمر اور ان کے اصحاب اس کی قبر پر گئے، حضرت عمر نے کہا اے نوجوان! جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں؟ تو اس نوجوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر! مجھے میرے رب عزوجل نے جنت میں دو بار دو جنتیں عطا فرمائی ہیں۔ (مختصر تاریخ دمشق ترجمہ عمرو بن جامع رقم: 114، ج 1، ص 190۔ 191، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حافظ ابن عساکر کے حوالہ سے اس حدیث کو حافظ ابن کثیر متوفی 774ھ، حافظ جلال الدین سیوطی متوفی 911ھ اور امام علی متقی ہندی متوفی 975ھ نے بھی ذکر کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر الاعراف 201، ج 3، ص 269، طبع دار الاندلس بیروت۔ شرح الصدور ص 213، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، 1404ھ۔ کنز العمال ج 2، ص 516۔ 517، رقم الحدیث: 4634)

امام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبد البر مالکی قرطبی متوفی 463ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

(22) عطاء بن یسار حضرت عائشہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات کو قبرستان میں جاتے اور فرماتے "السلام علیکم دار قوم مومنین" ہمارے پاس اور تمہارے اپس وہ چیز آ چکی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں، اے اللہ! بقیع الغرقد والوں کی مغفرت فرما۔

جن علماء کا یہ مذہب ہے کہ مردوں کی روحیں قبروں کے صحنوں پر ہوتی ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں : اور بیشک نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بدر کے کنویں میں پڑے ہوئے مردوں کو خطاب فرمایا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، مگر یہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے (الی قولہ) قتادہ نے حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے کہ مردہ کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو وہ لوگوں کی جوتیوں سے چلنے کی آواز سنتا ہے، اور ان امور کی کیفیت نہیں بیان کی جاسکتی ان کو صرف تسلیم کیا جائے گا اور ان کی اتباع کی جائے گی۔ امام عبدالبر فرماتے ہیں جو شخص قبرستان میں جائے وہ ان کو سلام کرے اور وہ الفاظ کہے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول ہیں۔ (التمہید ج 20، ص 240، مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ، مکہ المکرمہ 1412ھ)

(23) عامر بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ (رض) فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو موجود نہ پایا میں آپ کے پیچھے گئی، آپ بقیع کے قبرستان میں گئے تو آپ نے فرمایا السلام علیکم دار قوم مومنین ! تم ہمارے پیش رو ہو، اور بیشک ہم تم سے ملنے والے ہیں، اے اللہ ! ہم کو ان کے اجر سے محروم نہ کر اور ہم کو ان کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔ (التمہید، ج 20، ص 241 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ، مکہ المکرمہ، 1412ھ)

(24) روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب (رض) قبرستان میں گئے اور قبروں کی طرف متوجہ ہو کر بلند آواز سے ندا کی اے اہل قبور ! آیا تم ہمیں اپنی خبریں دو گے یا ہم تمہیں خبریں سنائیں ؟ ہمارے پاس یہ خبر ہے کہ تمہارے مال تقسیم کردیے گئے اور عورتوں نے دوسری شادیاں کرلیں، اور تمہارے گھروں میں اب تمہارے سوا اور لوگ رہتے ہیں، یہ ہماری خبریں ہیں، اب تم ہمیں اپنی خبریں سناؤ، پھر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر کہا سنو، اللہ کی قسم اگر یہ جواب دینے کی طاقت رکھتے تو یہ کہتے کہ ہم نے تقوی سے بہتر کوئی زاد راہ نہیں پایا۔

(25) ابوعثمان النہدی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص سخت گرم دمن میں نکلا اور قبرستان میں گیا، وہاں دو رکعت نماز پڑھی، پھر ایک قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک آواز سنی " میرے پاس سے ہٹ جا، اور مجھے ایذا نہ پہنچا " تم جو کہتے ہو تمہیں اس کا علم نہیں ہے اور ہمیں علم ہے اور ہم کہتے نہیں ہیں، تمہاری یہ دو رکعت نماز مجھے فلاں فلاں چیز سے زیادہ محبوب ہے۔

(26) ثابت بنانی بیان کرتے ہیں کہ میں قبرستان میں جارہا تھا، اچانک میں نے غیب سے ایک آواز سنی : اے ثابت ہماری خاموشی سے دھوکا نہ کھانا، یہاں پر کتنے ہی لوگ مغموم ہیں۔

(27) امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الکطاب (رض) بقیع الغرقد کے پاس سے گزرے تو فرمایا السلام علیکم اھل القبور ! ہمارے پاس یہ خبریں ہیں کہ تمہاری بیویوں نے شادیاں کرلیں، اور تمہارے گھروں میں اب اور لوگ رہتے ہیں، اور تمہارے مال تقسیم کردیے گئے، تو غیب سے آواز آئی : اے عمر بن خطاب ! ہماری خبریں یہ ہیں کہ ہم نے جو نیک اعمال بھیجے تھے وہ مل گئے، اور ہم نے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا تھا اس کا نفع پالیا، اور ہم نے جو اپنے پیچھے مال چھوڑا وہ گھاٹا تھا۔ (التمہید ج 20، ص 242، مطبوعہ المکتبہ التجاریہ مکہ المکرمہ 1412ھ)

ہمارے زمانہ میں بعض لوگ سماع موتی کا شدت سے انکار کرتے ہیں، اس لیے میں نے احادیث صحیحہ و مقبولہ کی روشنی میں اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور مذاہب اربعہ کے مستند علماء کی تصریحات بھی پیش کی ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ علامہ قرطبی مالکی، علامہ نووی شافعی، علامہ ابن قیم حنبلی اور علامہ بدرالدین عینی حنفی قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں امام احمد رضا بریلوی اور مکتب فکر دیوبند کے محدث شیخ انور شاہ کشمیری کی تصریحات بھی پیش کردی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو اثر آفریں بنادے (آمین) انشاء اللہ النمل : 80 اور فاطر : 22 میں اس پر مزید بحث کی

جائے گی۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین و علی آلہ واصحابہ الراشدین و علماء ملتہ اجمعین۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝۱۴

لغۃ القرآن: [ذٰلِكُمْ : یہ ہے] [فَذُوْقُوْهُ : پس تم لوگ چکھو اس کو] [وَاَنَّ : اور یہ کہ] [لِلْكٰفِرِیْنَ : کافروں کے لیے] [عَذَابَ : عذاب ہے] [النَّارِ : آگ کا]

ترجمہ: یہ (عذاب دنیا) ہے سو تم اسے (تو) چکھ لو اور بیشک کافروں کے لیے (آخرت میں) دوزخ کا (دوسرا) عذاب (بھی) ہے

تشریح:

جنگ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک مدلجی کی صورت میں متمثل ہو کر ابو جہل کے پاس آیا اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری لشکر شیاطین کا تھا۔ یہ واقعہ آگے آئے گا۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبرائیل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر بھیجے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر شیاطین آدمیوں کی صورت میں (ہم شکّل) ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی طرف سے لڑنے کو تیار ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسے ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم و ضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو۔ ادھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے ادھر میں کفار کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈال دوں گا۔ تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردنیں مارو اور پور پور کاٹ ڈالو۔ کیونکہ آج ان سب جنی و انسی کافروں نے مل کر خدا اور رسول سے مقابلہ کی ٹھہرائی ہے۔ سو انھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کیسی سخت سزا ملتی ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔ روایات میں ہے کہ بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھا دیا کہ اگر کبھی شیاطین الجن والانس ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقہ سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے۔ باقی ویسے تو فتح و غلبہ بلکہ ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت و قدرت سے انجام پاتا ہے۔ اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی، اور اگر فرشتوں ہی سے کوئی کام لے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر پٹک سکتا ہے۔ یہاں تو عالم تکلیف و اسباب میں ذرا سی تنبیہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔ (تفسیر عثمانی)

(یہ شکست) دی جارہی ہے فی الحال اس (کا مزہ تو چکھو) مگر اس خیال میں نہ رہو کہ سزا اسی پر ختم ہو جائیگی تو سنو (اور) یاد رکھو کہ (بیشک کافروں کیلئے) اسی پر بس نہیں بلکہ (جہنم کا عذاب ہے) جس میں وہ ہمیشہ ہمیش کیلئے رہنے والے ہیں۔۔۔

چونکہ کفرواسلام کی جنگ اور حق و باطل کا تصادم ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور صبح قیامت تک ہمیشہ ہوتا رہیگا لہٰذا ضرورت تھی کہ اہل ایمان کیلئے ایک ضابطہ بنادیا جائے تاکہ جنگ کی حالت پیش آنے کی صورت میں وہ اسپر عمل کریں اور اس میں رب تعالیٰ کی خوشنودی بھی ہو۔۔ چنانچہ۔۔ ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ۔۔ (تفسیر اشرفی)

کافروں کیلئے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔

اس کا عطف ذٰلکم پر ہے یا وَاَنَّ میں واؤ معیت کیلئے ہے ' یعنی یہ سزا جو فوری طور پر تم کو دی گئی ہے ' اس کو مع اس سزا کے چکھو جو آخرت میں تمہارے لیے تیار کی گئی ہے۔ لَھُمْ کی جگہ صراحت کے ساتھ لِلْکَافِرِیْنَ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت میں عذاب اور دنیوی سزا کے ساتھ آخرت کے عذاب میں بھی مبتلا ہونا محض کفر کی وجہ سے ہے۔ مومن پر بداعمالی کی وجہ سے اگر دنیا میں کوئی مصیبت آ بھی جاتی ہے تو وہ کفارہ ہو جاتی ہے ' انشاء اللہ آخرت میں اس پر عذاب نہیں ہو گا۔
بغوی نے آیت مَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا: کیا میں تم کو اللہ کی کتاب کی ایک بزرگ ترین آیت بتاؤں جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے بیان فرمائی تھی ' وہ آیت ہے: مَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا: اے علی! میں اس کی تم سے تفسیر بیان کرتا ہوں: مراد یہ ہے کہ جو بیماری ' یا سزا ' یا مصیبت تم پر دنیا میں آتی ہے ' وہ تمہارے اعمال سے آتی ہے اور اللہ آخرت میں اس کی دوبارہ سزا دینے سے بہت بزرگ ہے (یعنی دوبارہ آخرت میں سزا نہیں دے گا) اور جس عمل کی سزا سے اس نے دنیا میں درگذر فرما دی تو معافی کے بعد پھر آخرت میں اس کی سزا دینے سے اللہ لاپرواہ ہے۔ ترمذی اور حاکم نے بوساطت عکرمہ ' حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس روایت کو حسن بھی کہا ہے کہ خدمت گرامی میں عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! قافلہ کا پیچھا کرنا آپ کیلئے ضروری ہے ' قافلہ سے کوئی مانع نہیں ہے۔ حضرت عباس اس وقت قیدی کی حیثیت میں تھے اور بندھے ہوئے تھے ' اسی حالت میں آپ نے پکار کر کہا: یہ بات نہیں ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیوں؟ حضرت عباس نے عرض کیا: اللہ نے آپ سے دونوں گروہوں میں سے ایک پر فتحیابی کا وعدہ کیا تھا اور جو وعدہ کیا تھا ' وہ دے دیا (یعنی قریش پر آپ کو فتح حاصل ہو گئی ' دوسرے گروہ پر فتحیاب کرنے کا وعدہ نہیں فرمایا) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم نے سچ کہا۔ (تفسیر مظہری)

آیت مبارکہ:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝۱۵

لغۃ القرآن: [يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو ! جو] [اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے][اِذَا : جب کبھی] [لَقِيْتُمُ : تم لوگ ملو] [الَّذِيْنَ : ان سے جنہوں نے] [كَفَرُوْا : کفر کیا] [زَحْفًا : لشکر کے چلتے ہوئے] [فَلَا : تو نہ] [تُوَلُّوْهُمُ : پھیرو تم ان سے] [الْاَدْبَارَ : اپنی پیٹھیں]

ترجمہ: اے ایمان والو ! جب تم (میدان جنگ میں) کافروں سے مقابلہ کرو (خواہ وہ) لشکر گراں ہو پھر بھی انھیں پیٹھ مت دکھانا

تشریح: یہاں مجاہدین اسلام کو حکم دیا جارہا ہے کہ جب تم دین حق کے دشمنوں سے نبرد آزما ہو تو داد شجاعت دو اور پامردی اور بہادری سے ان کے سامنے ڈٹے رہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت تمہارے ہمرکاب ہو گی۔ تمہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ حق کے علمبردار ہو کر باطل کے پرستاروں کے سامنے نامردی اور بزدلی کا مظاہرہ کرو اور میدان جہاد سے بھاگ کھڑے ہو۔ چنانچہ میدان جنگ سے فرار کو حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اکبر الکبائر، بڑے گناہوں سے بھی بڑا گناہ فرمایا ہے۔ والفرار کبیرۃ صوبقۃ بظاہر القرآن واجماع الاکثر من الائمۃ (قرطبیؒ) الفواد من الزحف کبیرۃ من الکبائر وعلی حذا اکثر اہل العلم وبہ قال الائمۃ الاربعۃ من الفقہاء (مظہری)۔ لیکن یہ گناہ کبیرہ اس وقت تک ہے جبکہ دشمنوں کی تعداد دوگنا سے زائد نہ ہو۔ اگر اس سے زیادہ ہو تو پھر بھی ثابت قدم رہنا اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا ہی افضل ہے۔ جیسے جنگ موتہ میں اہل اسلام کی تعداد صرف تین ہزار تھی اور ان کے مقابل قیصر کی فوج دو لاکھ تھی۔ لیکن غلامان مصطفیٰ نے پرچم اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ فاتح اندلس طارق (رح) صرف سترہ سو جانبازوں کے ساتھ لڈریک شاہ اندلس کے ستر ہزار شہسواروں سے ٹکرایا اور ان کو کچل کر رکھ دیا۔ طارق کے یہ شعر ان کی اور ان کے سپاہیوں کی اسلامی ذہنیت کے کتنے روشن آئینے ہیں ف

رکبنا سفینا بالمجاز معبرا عسی ان یکون اللہ منا قد اشتری

ہم سمندر عبور کرنے کے لیے کشتیوں میں سوار ہوئے۔ یہ تمنا لیے ہوئے کہ شاید اللہ تعالیٰ از راہ احسان ہم سے خرید لے

نفوسا واموالا واھلا بجنۃ اذا ما اشتھینا الشیء فیھا تیسرا

ہماری جانوں۔ ہمارے اموال اور اہل و عیال کو جنت کے بدلے جہاں ہم جو چاہیں ہمیں بآسانی میسر آجائے

ولسنا نبالی کیف سالت نفوسنا اذا نحن ادرکنا الذی کان اجدرا

اگر ہم اپنی منزل مقصود کو حاصل کرلیں تو پھر ہمیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں کہ ہمارے خون کے دریا کیسے بہے

آیت میں زحفا کا لفظ تحقیق طلب ہے۔ اس کا معنی کیا ہے ؟ اور ترکیب میں کیا واقع ہوا ہے ؟ زحف کا لغوی معنی ہے بچے کا زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چلنا۔ اسی وجہ سے آہستہ چلنے کو بھی زحف کہتے ہیں۔ الزحف الدنو قلیلا قلیلا واصلہ الزند فاع علی الالیۃ (قرطبیؒ)۔ اس لفظ کا اطلاق لشکر عظیم پر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی کثرت تعداد کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہی چل سکتا ہے۔ وفی القاموس الزحف الجیش یزحفون الی العدو۔ اپنے دونوں معنوں

(مصدری اور اسمی) کے اعتبار سے یہ الذین کفروا جو لقیتم کا مفعول ہے، کا حال ہے یا لقیتم کے فاعل (لقیتم کی ضمیر) اور مفعول (الذین کفروا) دونوں کا حال ہے (مظہری)۔ میں نے ترجمہ میں زحف کا معنی اسمی ملحوظ رکھتے ہوئے الذین کا حال بنایا ہے کیونکہ یہی مفہوم حقیقت سے قریب تر ہے۔ کیونکہ کافر لشکر عظیم لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے مسلمانوں کی تو کمزور اور قلیل جمعیت محض اپنے بچاؤ کے لیے میدان میں آ کھڑی ہوتی تھی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ جب کفار کے لشکر جرار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور انھیں پیٹھ دکھا کر نہ بھاگو ، اور جو بزدلی دکھاتے ہوئے بھاگے گا وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہو گا اور آخرت میں اس کا ٹھکانا ختم ہو گا۔ ہاں دو صورتیں ہیں جن میں وہ دشمن کی طرف پیٹھ پھیر سکتا ہے : ایک تو یہ ہے کہ وہ کسی جنگی چال کے سبب وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف سے دشمن پر اچانک حملہ کرنا چاہتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ لڑتے لڑتے تنہا دشمن کے لشکر میں اتنا آگے چلا گیا جہاں اسے گھبرا جانے کا خطرہ ہے اور اس لیے واپس لوٹا ہے کہ اپنی فوج کے ساتھ رہتے ہوئے دشمن پر حملہ جاری رکھ سکے ، تو اس قسم کی کوئی بھی حکمت عملی جس کا مقصد میدان جنگ سے بھاگنا نہیں بلکہ بہتر انداز میں دشمن پر حملہ کرنا ہو تو ایسا کرنا جائز بلکہ بہتر ہے۔

میدان جنگ میں فوجیوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے ان آیات میں جو ہدایات چودہ سو سال پہلے دی گئی تھیں آج پوری دنیا ان پر عمل پیرا ہے یعنی دنیا کے ہر ملک کا سربراہ میدان جنگ میں اپنے فوجیوں کو یہی حکم دیتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور بزدلی نہ دکھاؤ۔ جو فوجی بلاوجہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرتا ہے ہر ملک اس کو مجرم قرار دے کر اس کے خلاف قانونی کارروائی کرتا ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

میدان جنگ سے پیٹھ موڑ کر بھاگنا بہت سخت گناہ اور اکبر الکبائر میں سے ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اجتناب کرو، پوچھا گیا یا رسول اللہ ! وہ کون کون سی چیزیں ہیں، آپ نے فرمایا :

1۔ اللہ کا شریک بنانا

2۔ جادو کرنا۔

3۔ جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا۔

4۔ یتیم کا مال کھانا۔

5۔ سود کھانا۔

6۔ جنگ کے دن دشمن سے پیٹھ پھیرنا۔

7۔ بھولی بھالی پاک دامن مسلمان عورتوں کو بدکاری کی تہمت لگانا۔

(صحیح مسلم الایمان : 145 (189) 256۔ صحیح البخاری رقم الحدیث : 2766۔ سنن ابوداود رقم الحدیث : 2874۔ سن النسائی رقم الحدیث : 3671۔السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث : 11361)

اگر دشمن کی تعداد مسلمانوں سے دگنی یا اس سے کم ہو تو پھر مسلمانوں کا میدان سے بھاگنا جائز نہیں (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يُّوَلِّهِمْ : پھیرے گا ان سے] [يَوْمَىِٕذٍ : اس دن] [دُبُرَهٗٓ: اپنی پیٹھ کو] [اِلَّا : سوائے اس کے کہ] [مُتَحَرِّفًا : جھکائی دینے والا ہوتے ہوئے] [لِّقِتَالٍ : قتال کے لیے] [اَوْ : یا] [مُتَحَيِّزًا : ملنے والا ہوتے ہوئے] [اِلٰي فِئَةٍ : کسی جماعت کی طرف] [فَقَدْ بَآءَ : تو وہ لوٹا ہے] [بِغَضَبٍ : ایک غضب کے ساتھ] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ (کی طرف) سے] [وَمَاْوٰىهُ : اور اس کا ٹھکانا] [جَهَنَّمُ: جہنم ہے] [وَبِئْسَ : اور بری ہے] [الْمَصِيْرُ : وہ پھرنے کی جگہ]

ترجمہ: اور جو شخص اس دن ان سے پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس کے جو جنگ (ہی) کے لیے کوئی داؤ چل رہا ہو یا اپنے (ہی) کسی لشکر سے (تعاون کے لئے) ملنا چاہتا ہو، تو واقعتاً وہ اللہ کے غضب کے ساتھ پلٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ (بہت ہی) برا ٹھکانا ہے

تشریح: غزوہ بدر کے احوال بتاتے ہوئے درمیان میں بعض احکام جہاد بھی بتائے جارہے ہیں جن میں سے یہ بھی ہے کہ میدان جہاد سے بھاگنا مجاہدین کے لیے بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کا نتیجہ مسلمانوں کی شکست، کفار کا غلبہ اور پوری امت کو مظلومیت کا شکار بنادینا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں پر جو مصائب آتے ہیں جتنا خون بہتا ہے، جتنی عزتیں لٹتی ہیں اور جتنے اموال ہلاک ہوتے ہیں ان سب کا ذمہ دار وہ گروہ ہوتا ہے جس کے بھاگنے سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا: کہ جو شخص کفار کے مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بھاگے اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ البتہ اگر جنگی چال چلنے کے لیے مجاہدین میدان جنگ سے پیچھے ہٹیں تاکہ لشکر کفار آگے آجائے اور اسے گھیرے میں لیا جاسکے یا مجاہدین اس لیے پسپا ہوں تاکہ اپنی جماعت کی پناہ لے سکیں اور مزید کمک لے کر دوبارہ پلٹ کر حملہ کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں بزدلی اور بھگدڑ مچانے کا مفہوم نہیں ہے۔

یاد رہے میدان جنگ سے فرار سات بڑے مہلک گناہوں میں سے ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
اجتنبوا السبع الموبقات سات تباہ کن گناہوں سے بچو، پوچھا گیا وہ کیا ہیں؟ فرمایا:
الشرک باللہ والسحر وقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق واکل الربا واکل مال الیتیم والتولی یوم الزحف وقذف المحصنات المومنات الغافلات۔ "
شرک، جادو گری، قتل، سود خوری، مال یتیم کا کھانا، جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوں تو اس وقت بھاگنا اور گناہ سے بیخبر پاک دامن عورتوں پر تہمت گناہ رکھنا۔ " (بخاری کتاب الوصایا باب 23۔ مسلم کتاب الایمان حدیث 441)
حضرت ثوبان (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
ثلاثة لا ينفع معهن عمل الشرك بالله وعقوق الوالدين والفرار من الزحف۔ "تین گناہ وہ ہیں جن کی موجودگی میں کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ شرک، والدین سے نافرمانی اور میدان جنگ سے بھاگنا۔ " (طبرانی کبیر جلد 2 حدیث 1420 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)
ام المومنین عائشہ صدیقہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
الفار من الطاعون كالفار من الزحف۔ طاعون سے بھاگنے والا ایسا گناہگار ہے جیسے میدان جنگ سے بھاگنے والا۔ (مسند احمد بن حنبل جلد 6 صفحہ 82 مطبوعہ دار الفکر بیروت)
حضرت معاذ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو دس وصیات فرمائیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ نے فرمایا:
اياك والفرار من الزحف وان هلك الناس۔ یعنی "خبردار میدان جنگ سے مت بھاگو خواہ سب لوگ ہلاک ہو جائیں (یعنی سارا لشکر قربان ہو جائے) (مسند احمد بن حنبل جلد 5 صفحہ 238)
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ سے معلوم ہوا جنگ میں چال چلنا جائز ہے اور حدیث مبارکہ ہے: الحرب خدعۃ۔ جنگ دھوکے کا نام ہے۔ یعنی دشمن کو دھوکا دے کر ہی مارا جاسکتا ہے۔ (مسلم، ترمذی)
اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ جب میت دین کی مدد ہے تو کفار سے جنگ میں دھوکا کرنا جائز ہوا۔ مگر یہ دھوکا جنگ ہی میں جائز ہے حالت امن میں نہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

مومن کا دل و دماغ نہایت ہی پختہ ہونا چاہیے۔

اس طرح کہ وہ زمین کی کسی بھی قوت کے سامنے متزلزل نہ ہو اور اس کا رابطہ ایسی قوت کے ساتھ ہونا چاہیے جسے اپنے امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہو اور وہ بندوں کے اوپر مکمل غلبہ رکھتی ہو اور جب کسی مومن کا دل و دماغ خطرات کو دیکھ کر متزلزل ہو گیا تو یہ تزلزل فرار پر منتج نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس لیے کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ موت کے ڈر سے پیٹھ پھیرے۔ یہ حکم ایسا نہیں ہے کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم دیا جا رہا ہے، کیونکہ مومن بھی انسان ہے اور اس کا دشمن بھی انسان ہے۔ اس لحاظ سے وہ

گویا ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔ پھر مومن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ربط ایسی قوت کے ساتھ ہے جس پر کوئی غالب نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو پھر وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسی طرف متوجہ ہے اور اگر مر گیا تو بھی اللہ کی طرف لوٹنے والا ہے۔ اگر اس کے لیے شہادت رکھ دی گئی ہے تو بھی وہ اس پوزیشن سے بہت اچھی ہے، جو اس کے دشمن کی ہے کیونکہ دشمن تو اللہ اور رسول اللہ کے مقابلے میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قطعی حکم دیا جاتا ہے۔ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَاۗءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری۔ الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے۔ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔

-- یہاں قرآن کریم نے جو اسلوب گفتگو اپنایا ہے اس میں بہت سے اشارات ہیں۔ فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔ اور وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗ۔ یہ دراصل ہزیمت اور شکست کی حسی تعبیر ہے اور نہایت ہی حقارت آمیز نقشہ دیا گیا ہے بھاگنے والوں کا۔ اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ دشمن کو منہ دکھانا چاہیے مقعد نہیں۔ پھر فَقَدْ بَاۗءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ گویا شکست کھانے والا دراصل پیٹھ پھیرتا ہے اور اس کے ساتھ غضب الہی ہوتا ہے اور یہ غضب الہی اسے جہنم تک لے جاتا ہے جو برا ٹھکانا ہے۔ وماواہ جھنم وبئس المصیر۔ یوں انداز کلام میں بھی جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کی منظر کشی اس طرح کی گئی ہے جس سے اس فعل کی قباحت اور کراہت بالکل واضح معلوم ہوتی ہے اور کوئی غیرت مند شخص اسے پسند نہیں کرتا۔

جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کی ممانعت کے بعد اب سیاق کلام میں یہ حقیقت بتائی جاتی ہے کہ اس معرکے کے پیچھے دراصل دست قدرت کام کر رہا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دشمنوں کو قتل کیا۔ وہی ہے جو تمہارے تیر کو درست نشانے پر پہنچاتا ہے۔ اور تمہیں جو اجر دیا جاتا ہے وہ تو محض اس لیے ہے کہ اہل ایمان اس آزمائش میں کامیاب رہے اور انھوں نے جد و جہد کی اور اللہ نے ان کو اس ثواب کا مستحق بنایا اور اجر عطا کیا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○۱۷

لغۃ القرآن: [فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ : تو تم لوگوں نے قتل نہیں کیا ان کو] [وَلٰکِنَّ : اور لیکن] [اللّٰہَ : اللہ نے] [قَتَلَھُمْ : قتل کیا ان کو] [۪وَمَا رَمَیْتَ : اور آپ نے نہیں پھینکا] [اِذْ : جب] [رَمَیْتَ : آپ نے پھینکا] [وَلٰکِنَّ : اور لیکن] [اللّٰہَ : اللہ نے] [رَمٰی : پھینکا] [وَلِیُبْلِیَ : اور تاکہ وہ آزمائے] [الْمُؤْمِنِیْنَ : مومنوں کو] [مِنْہُ : اس سے] [بَلَآءً حَسَنًا: جیسا کہ خوبصورت آزمانے کا حق ہے] [اِنَّ اللّٰہَ : بیشک اللہ] [سَمِیْعٌ: سننے والا ہے] [عَلِیْمٌ: جاننے والا ہے]

ترجمہ: (اے سپاہیان لشکر اسلام !) ان کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کر دیا، اور (اے حبیب محتشم !) جب آپ نے (ان پر سنگ ریزے) مارے تھے (وہ) آپ نے نہیں مارے تھے بلکہ (وہ تو) اللہ نے مارے تھے، اور یہ (اس لئے) کہ وہ اہل ایمان کو اپنی طرف سے اچھے انعامات سے نوازے، بیشک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے

تشریح: نہتے مسلمانوں کا اپنے سے تین گنا مسلح اور طاقتور لشکر کو یوں تہس نہس کر دینا اور اس کے بڑے بہادر رئیسوں کو کاٹ کر رکھ دینا محض نصرت خداوندی کا کرشمہ تھا۔ اس لیے صاف صاف بتادیا کہ تم اپنی قوت و شجاعت پر نازاں نہ ہو بلکہ اپنے رب قدیر کا احسان سمجھو اور اس کے شکر گزار بنے رہو۔

ان کلمات میں حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک خاص معجزہ کی طرف اشارہ ہے جس کا مشاہدہ دوست و دشمن نے بدر کے میدان میں کیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کنکریوں کی ایک مٹھی بھری اور کفار کے لشکر کی طرف پھینک دی۔ وہ لشکر جو ایک وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ کوئی کھڑا تھا تو کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ کسی کا منہ ادھر تھا تو کسی کی پشت ادھر تھی۔ لیکن ایک کافر بھی تو ایسا نہ رہا تھا جس کی آنکھوں کو ریت کے ذرات نے بھر نہ دیا ہو۔ سب کی آنکھیں دیکھنے سے معذور ہو گئیں۔ اور وہ کچھ ایسے دہشت زدہ اور حواس باختہ ہوئے کہ اپنے مقتولوں کے لاشے بھی پیچھے چھوڑ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے محبوب ! جب تم کنکریاں پھینک رہے تھے تو پھینکنے والا ہاتھ گو تمہارا تھا لیکن قوت وقدرت ہماری تھی جو اس میں کارفرما تھی۔ کتنا ہی پیارا انداز بیان ہے۔

علامہ زمخشری نے یبلی کا معنی یعطی اور بلاء کا معنی عطاء کیا ہے۔ اور صاحب تفسیر مظہری نے یبلی کا معنی ینعم اور بلاء کا معنی نعمت فرمایا ہے۔ اگرچہ ابتلاء کا لغوی معنی اختبار یعنی آزمانا ہے لیکن آزمائش جس طرح تکلیف و مصیبت سے کی جاتی ہے اسی طرح عطاء واحسان سے بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے مفہوم کے پیش نظر یہاں لفظ ابلاء کی یہ توضیح بالکل صحیح ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو مسلمانوں کے لڑے بغیر ہی کفار کو نیست و نابود کر دیتا۔ ہزاروں فرشتوں کے اتارنے کے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ایک ہی فرشتہ سب کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن مسلمانوں کے ذریعہ اپنے دین کی حفاظت اس لیے کرائی گئی تاکہ انھیں دین کے پاسبان ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔ شہادت اور جہاد کی فضیلت سے انھیں سرفراز کیا جائے۔ کیا شان بندہ پروری ہے ! کیا رحمت ذرہ نواز ہے۔ یہاں اسی شرف پاسبانی اور فضیلت شہادت کو لیبلی کے کلمات طیبات سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

کفار قریش کی شکست کا اصل سبب خاک کی وہ مٹھی تھی جو تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھینکی تھی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

"وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ"

ترجمہ کنزالعرفان : اے حبیب ! جب آپ نے خاک پھینکی تو وہ آپ نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ (1)

اعلیٰ حضرت (رح) اس واقعے کی منظر کشی کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں

میں ترے ہاتھوں کے صدقے کیسی کنکریاں تھیں وہ

جن سے اتنے کافروں کا دفعتاً منھ پھر گیا (تفسیر صراط الجنان)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر اچھے اور نیک کام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنی چاہیے اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کوئی اچھا یا نیک کام کرے تو اس پر فخر نہ کرے بلکہ شکر ادا کرے۔

۱۱۔ جنگ بدر میں جب مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مٹی کی ایک مٹھی کافروں کے چہروں پر ماری اور فرمایا : کفار کے چہرے سیاہ ہو جائیں تو وہ مٹی سب کافروں کی آنکھوں میں پڑ گئی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب بڑھ کر ان کو قتل کرنے لگے اور قید کرنے لگے اور ان کی شکست کا سبب مٹی کی وہ مٹھی تھی جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھینکی تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابن جریر طبری) اور مشرکین میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کی آنکھ، ناک اور منہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پھینکی ہوئی مٹی نہ پہنچی ہو۔ (تفسیر ابن ابی حاتم) یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ تھا (تفسیر صاوی) ایک ہزار کفار کا لشکر ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا، بعض سوار تھے اور بعض پیدل، کوئی جنگ میں تھا تو کوئی جانوروں اور خیموں کی حفاظت پر مقرر تھا، کسی کا رخ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف تھا تو کسی کی پشت۔ اس کے باوجود صرف مٹھی بھر مٹی کا ہر مشرک کی آنکھ، ناک اور منہ میں پہنچ جانا ایک عظیم معجزہ تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : پیارے نبی ! پھینکنے والا ہاتھ اگرچہ تمہارا تھا مگر اس میں میری قوت اور قدرت جلوہ گر تھی جس نے کفار کے حواس باختہ کر دیئے اور وہ گھبرا کر بھاگنا شروع ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی دعاؤں کو قبول کیا اور ان پر عظیم احسان فرمایا۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ اہل ایمان پر خوب احسان کیا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ کفار کے مکر و فریب کو ناکارہ کر دیا جائے۔ (تفسیر امداد الکرم)

یہاں سے مقام مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معلوم ہوا:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے کنکریاں پھینکنے کو اپنا پھینکنا قرار دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ سے بیعت کرنے کو اللہ سے بیعت کرنا قرار دیا: ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ۔ (فتح۔ 10)

آپ کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا۔ ید اللہ فوق ایدیھم۔ (فتح۔ 10)

آپ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (نساء: 80)

اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دربار میں حاضر ہونے والوں کو بشارت دی گئی کہ گویا انھوں نے اللہ کو پالیا، تو ارشاد فرمایا گیا: ولوا انھم اذ ظلموا انفسھم جاء وک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ (نساء: 64)

[16]۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بدر میں کفار کو اس لیے فرشتوں کے ہاتھوں قتل کیا تاکہ وہ مومنوں کو ان کی آزمائشوں کے صلہ میں بہترین جزا عطا فرمائے۔ معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے انھیں بدر میں آزمایا انھوں نے صبر سے کام لیا تو اللہ نے انھیں بہترین جزا عطا فرمائی۔

بدری صحابہ کے لیے جنت کا اعلان:

اس لیے بدری صحابہ کا مقام تمام صحابہ میں بلند تر ہے۔ چنانچہ ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ (رض) سے خطاء ہوئی کہ انھوں نے فتح مکہ سے قبل کفار مکہ کو خط بھیجا کہ ان پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حملہ کرنے والے ہیں وہ اپنا بچاؤ کرلیں، مقصد ان کا یہ تھا کہ اس طرح کفار مکہ ان کے اہل خانہ کو جو مکہ میں محبوس تھے کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ وہ خط پکڑا گیا۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے اجازت دیں میں اس منافق کا سر اتار دوں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ حاطب اہل بدر میں سے ہے؟ پھر فرمایا: اللہ نے اہل بدر کی طرف نظر رحمت فرمائی اور فرمایا: اعملوا ما شئتم فقد وجبت لکم الجنتہ۔ تم جو چاہو عمل کرو تمہارے لیے جنت واجب ہوگئی۔ (بخاری کتاب المغازی باب 9) یہ حدیث شیعہ تفسیر مجمع البیان جلد 5 صفحہ 629 میں بھی مذکور ہے۔

اہل بدر کی عظمت اور درس غزوۂ بدر پہ قاری محمد طیب صاحب کی رقم کردہ ایمان افروز نظم:

یہ غزوہ بدر پیارے مصطفیٰ کی ایک عظمت ہے\
یہاں صحابیِ رسول اللہ کی روشن کرامت ہے\
یہ عظمت و جرات کی تابندہ کہانی ہے\
یہ اصحاب نبی کی داستان استقامت ہے\
وہ روزے دار بے ہتھیار میداں میں نکل آئے\
مسلماں کا اصل ہتھیار جذبۂ شہادت ہے\
فرشتے اترتے ہیں بہر امداد مسلماناں

یہ غزوہ شوکت اسلام کی زندہ علامت ہے
ہیں ان کے پاس دو گھوڑے فقط اور آٹھ تلواریں
مگر عشق خدا و مصطفیٰ کی دل میں طاقت ہے
دو چھوٹے بچوں نے بو جہل سا دشمن گرا ڈالا
مسلمانو تمہارے واسطے سامان عبرت ہے
مسلمانو ! رسول اللہ سے عہد وفا کر لو
تو پھر سمجھو کہ دنیا پر تمہاری ہی حکومت ہے
اگر تم ہو غلام ان کے تو دنیا سب تمہاری ہے
کہ جنگ بدر میں طیبؔ یہی درس نصیحت ہے (تفسیر برہان القرآن)

مسلمانوں سے کفار بدر کے قتل کی نفی کے محامل

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس بن ابی حاتم رازی متوفی 327ھ اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے روایت کرتے ہیں : (جنگ بدر کے دن صحابہ آپس میں بحث کرنے لگے، ایک نے کہا میں نے فلاں کو قتل کیا ہے۔ دوسرے نے کہا میں نے فلاں کو قتل کیا ہے، تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی : سوائے مسلمانو ! تم نے ان کو قتل نہیں کیا، لیکنا للہ نے ان کو قتل کیا ہے۔ (تفسیر امام ابن حاتم ج 5، ص 1672۔ جامع البیان ج 9، ص 270، الدر المنثور، ج 4، ص 39)
اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ان کو قتل کرنے پر فخر نہ کرو، اگر اللہ تمہاری مدد نہ فرماتا اور تمہیں حوصلہ اور قوت نہ عطا فرماتا تو تم ان کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے بظاہر تم نے ان کو قتل کیا ہے لیکن حقیقت میں ان کو اللہ نے قتل کیا ہے، یا تم نے ان کو کسباً قتل کیا ہے اور اللہ نے ان کو خلقاً قتل کیا ہے۔ یا تم نے اس کو صورۃً قتل کیا ہے اور اللہ نے ان کو معناً قتل کیا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ہر اچھے اور نیک کام کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہیے اور جب انسان اللہ کی توفیق سے کوئی اچھا اور نیک کام کرے تو اس پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔

ومارمیت اذ رمیت کے شان نزول میں مختلف آراء ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے :
امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کرتے ہیں :
ابی بن خلف نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب یہ ہڈی بوسیدہ ہو جائے گی تو اس کو کون زندہ کرے گا ؟ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ٹھہرو ! ٹھہرو ! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دست مبارک میں نیزہ پکڑا اور ابی بن خلف کی طرف تاک کر مارا اور اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی توڑ دی، ابی بن خلف زخمی ہو کر اپنے اصحاب کی طرف پلٹا اس کے اصحاب اس کو اٹھا کر لے گئے اور کہا خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ سن کر ابی بن خلف نے کہا خدا کی قسم ! اگر میں لوگوں کے

درمیان ہوتا تو وہ پھر بھی مجھے قتل کردیتے، کیا انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ انشاء اللہ میں تجھ کو قتل کردوں گا۔اس کے اصحاب اس کو بے ہوشی کی کیفیت میں لے گئے وہ راستہ ہی میں مر گیا اور انھوں نے اس کو وہیں دفن کردیا، ابن المسیب نے کہا اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی "ومارمیت اذرمیت" یعنی آپ نے وہ نیزہ نہیں مارا، جب آپ نے نیزہ مارا تھا، لیکن اللہ نے وہ نیزہ مارا تھا۔ (تفسیر امام ابن ابی حتم ج 5، ص 1673۔ الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 344، الدرالمنثور ج 4، ص 41۔ المستدرک ج 2، ص 327۔ اسباب النزول رقم الحدیث: 471)

اس سلسلہ میں دوسرا قول یہ ہے:

امام ابن ابی حاتم رازی متوفی 327ھ اور امام علی بن احمد واحدی متوفی 468ھ روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمٰن بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ غزوہ خیرب کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک کمان منگوائی تو ایک بہت لمبی کمان لائی گئی۔آپ نے فرمایا کوئی اور کمان لاؤ تو ایک درمیانی کمان لائی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کمان سے یہودیوں کے قلعہ کا نشانہ لگاکر تیر مارا جو کنانہ بن ابی الحقیق کو جاکر لگا جو اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی" یعنی آپ نے تیر نہیں مارا، جس وقت آپ نے تیر مارا تھا لیکن اللہ نے وہ تیر مارا تھا۔ (تفسیر امام ابن حاتم ج 5، ص 1674،1673۔ اسباب نزول القرآن، رقم الحدیث: 472، الدرالمنثور ج 4، ص 41)

اس سلسلہ میں تیسرا قول یہ ہے اور یہی جمہور مفسرین کا مختار ہے:

جب مسلمانوں اور کافروں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خاک کی ایک مٹھی کافروں کے چہرے پر ماری اور فرمایا یہ لوگ روسیاہ ہوجائیں تو وہ خاک سب کافروں کی آنکھوں میں پڑ گئی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب بڑھ کر ان کو قتل کرنے لگے اور گرفتار کرنے لگے اور ان کی شکست کا اصل سبب خاک کی وہ مٹھی تھی جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھینکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ومارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمی اور (اے رسول معظم آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جس وقت آپ نے پھینکی تھی لیکن وہ خاک اللہ نے پھینکی تھی۔ (اجمع البیان جز 9، ص 270۔272، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج 5، س 1673۔ اسباب نزول القرآن، رقم الحدیث: 473، المعجم الکبیر ج 3، رقم الحدیث: 3128، حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند حسن ہے۔ مجمع الزوائد ج 6، ص 84، الدرالمنثور، ج 4، ص 40)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خاک کی مٹھی پھینکنے کی نفی اور ثابت کے محامل

اس آیت سے پہلے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خاک کی مٹھی پھینکنے کی نفی کی ہے اور پھر اس کو ثابت کیا ہے اور بظاہر یہ تعارض ہے۔اس کا بھی یہی جواب ہے کہ نفی اور اثبات کے محمل الگ الگ ہیں اور معنی اس طرح ہے: آپ نے خاک کی مٹھی حقیقتاً نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی بظاہر پھینکی تھی یا آپ نے خاک کی مٹھی خلقا نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی کسباً پھینکی تھی، یا آپ نے خاک کی مٹھی بظاہر پھینکی تھی یا آپ نے خاک کی مٹھی معناً نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی صورۃ پھینکی تھی، یا آپ نے خاک کی مٹھی عادۃ نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی خالف عادت پھینکی تھی۔

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی 685ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے خاک کی مٹھی اس طرح نہیں پھینکی کہ آپ تمام کافروں کی آنکھوں میں وہ خاک پہنچادیں، جب کہ آپ نے صورۃ خاک کی مٹھی پھینکی تھی، لیکن یہ مقصود اللہ نے پورا کیا اور وہ خاک تمام کافروں کی آنکھوں میں پہنچادی حتی کہ وہ سب شکست کھا گئے اور آپ کافروں کی جڑ کاٹنے پر قادر ہوگئے۔ اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ آپ نے خاک کی مٹھی پھینک کر ان کو مرعوب نہیں کیا جب آپ نے خاک پھینکی تھی لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں رعب پیدا کر دیا۔ (انوار التنزیل مع الکزرونی ج3، ص96، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1416ھ)

علامہ منصور بن الحسن القرشی التوفی 860ھ اس کے حاشیہ پر لکھتے ہیں: علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں: اکثر علماء نے اس آیت کا یہ معی کیا ہے کہ آپ نے خلقا اور حقیقتاً خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جب کہ آپ نے کسبا اور صورۃً خاک کی مٹھی پھینکی تھی، لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ تمام بندوں کے افعال اسی طرح ہیں، ظاہراً اور کسباً بندے فعل کرتے ہیں اور حقیقتاً اور خلقاً اللہ تعالیٰ فعل کرتا ہے۔ یعنی فعل کا کسب بندہ کرتا ہے اور فعل کا خلق اور اس کو پیدا اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ تو پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاک کی مٹھی پھینکنے کی کیا خصوصیت تھی جو یہ فرمایا کہ آپ نے حقیقتاً خاک نہیں پھینکی جب آپ نے بظاہر خاک پھینکی تھی، جب کہ تمام بندوں کے افعال اسی طرح ہیں۔ اس کے جواب میں، میں یہ کہتا ہوں کہ بندہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک قدرت پیدا کی ہے جو اللہ کے اذن سے موثر ہوتی ہے پس جب اللہ سبحانہ چاہتا ہے تو وہ قدرت موثر ہوتی ہے اور جب وہ نہیں چاہتا تو وہ قدرت موثر نہیں ہوتی، یہ بات نہیں ہے کہ بندہ میں بالکل قدرت نہ ہو جیسا کہ جبریہ کہتے ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ بندہ کی ایسی قدرت موثرہ ہے کہ اللہ جس فعل کو کرنا نہ چاہے بندہ اس فعل کو بھی کرے، اور جب یہ معاملہ اس طرح ہے تو میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ضو خاک پھینکی تھی یہ وہی ھینکنا ہو، جس پر وہ عظیم اثر مرتب ہوا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حقیقتاً یہ فعل کیا اور یہ فعل اس قدرت سے کیا جو آپ کو عطا کی گئی تھی اور جو اللہ کے اذن سے موثر تھی۔ لیکن چونکہ یہ فعل خلاف عادت اور خلاف معمول تھا کیونکہ معروف اور معمول یہ ہے کہ بندہ کو جو قدرت دی جاتی ہے اس سے اس قسم کے عظیم آثار پیدا نہیں ہوتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نفی کی اور اس فعل کو انا فعل قرار دیا۔ گویا کہ یوں کہا گیا کہ خاک کی اس مٹھی کا پھینکنا ہر چند کہ حقیقتاً آپ سے صادر ہوا ہے، اس قدرت کے ساتھ جو اللہ سبحانہ کے اذن سے موثر ہوئی ہے لیکن چونکہ یہ بہت عظیم الشان کام ہے اور عادۃ افعال بشر کے خلاف ہے تو گویا کہ یہ فعل آپ سے صادر نہیں ہوا، بلکہ اللہ جل شانہ سے بلاواسطہ صادر ہوا ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ آپ نے خاک پھینک کر ان کو مرعوب نہیں کیا جب آپ نے خاک کی مٹھی پھینکی تھی لیکن اللہ نے خاک پھینک کر ان کو مرعوب کیا اور اس طرح دونوں آیتوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں سے اللہ نے قتل کی نفی کی اور اپنی طرف قتل کرنے کی نسبت کی اور فرمایا سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن ان کو اللہ نے قتل کیا ہے اور مسلمانوں کے لیے اس فعل کو ثابت نہیں کیا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق فرمایا آپ نے خاک نہیں پھینکی جب آپ نے خاک پھینکی تھی، پہلے آپ سے اس فعل کی نفی کی پھر آپ کے لیے اس فعل کو ثابت کیا، اور وجہ فرق یہ ہے کہ قتل کرنا کوئی اس قدر مستبعد اور محیر العقول کام نہیں تھا اس لیے عام اصول کے مطابق فرمایا کہ تم نے حقیقتاً ان کو قتل نہیں کیا جب تم نے ان کو ظاہراً قتل کیا تھا، اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو خاک پھینکی وہ تمام کافروں کی آنکھوں میں پڑ گئی اور وہ مرعوب ہو کر شکست کھا گئے اور چونکہ یہ فعل عام افعال بشر کے منافی تھا اس لیے پہلے اس کی آپ سے مبالغۃً نفی کی اور پھر اس کو حقیقتاً آپ کے لیے ثابت کیا اور چونکہ آپ نے حقیقتاً یہ فعل اللہ سبحانہ کی دی ہوئی قدرت سے کیا تھا اس لیے فرمایا اللہ نے یہ خاک پھینکی تھی۔ (روح المعانی، جز9، ص186۔ 187، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

معجزات کا مقدور ہونا

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خاک کی اس مٹھی کو پھینکنا معجزہ تھا اور علامہ آلوسی کی تحقیق اور تقریر کے مطابق آپ نے یہ خاک اللہ سبحانہ کی دی ہوئی قدرت سے پھینکی تھی جو اس کے اذن سے موثر تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء (علیہم السلام) کے معجزات ان کی قدرت اور ان کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ البتہ یہ قدرت اللہ تعالیٰ کے اذن کے تابع ہے۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جزئی فعل کے صدور کے وقت تازہ اذن لیا جائے بلکہ اس کے لیے اذن کلی کافی ہے۔ جیسے شفاعت بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے لیے بھی اذن مطلق کافی ہے اور ہر جزوی شفاعت کے لیے تازہ اذن لینا ضروری نہیں۔ چنانچہ بکثرت احادیث میں ہے کہ صحابہ آپ سے استغفار کی درخواست کرتے اور آپ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے اور کہیں یہ وارد نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے استغفار کے لیے اذن لیتے پھر استغفار کرتے، سو یہی حال معجزات کا ہے۔

اچھی آزمائش کا معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا تاکہ وہ مومنوں کو اچھی آزمائش کے ساتھ گزارے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں آزمائش کا معنی انعام ہے، یعنی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس خاک پھینکنے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عظیم نعمت عطا فرمائے گا اور وہ نعمت معرکہ بدر میں مسلمانوں کی فتح ہے اور مال غنیمت اور اجر و ثواب ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معرکہ بدر کی فتح کے بعد اللہ عزوجل مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالے گا کہ اس کے بعد کی جنگوں میں وہ بدر کی فتح کے گھمنڈ میں چور ہو جاتے ہیں یا حسب سابق عجز و نیاز کے پیکر بنے رہتے ہیں یا آئندہ وہ اپنی قوت اور عددی برتری پر اتراتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر نگاہ رکھتے ہیں۔

پھر فرمایا "اللہ کفار کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے" یعنی اللہ سبحانہ کفار کے دلوں میں رعب ڈال دے گا، حتیٰ کہ وہ بکھر کر کمزور ہو جائیں گے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۸

لغۃ القرآن: [ذٰلِكُمْ : یہ ہے] [وَاَنَّ : اور یہ کہ] [اللّٰهَ : اللہ] [مُوْهِنُ : کمزور کرنے والا] [كَيْدِ : تدبیر] [الْكٰفِرِيْنَ : کافروں کی]

ترجمہ: یہ (تو ایک لطف و احسان) ہے اور (دوسرا) یہ کہ اللہ کافروں کے مکر و فریب کو کمزور کرنے والا ہے

تشریح:

کافر جب بدر کیلئے مکہ شریف سے نکلے تو حرم کے پردے پکڑ کر بولے کہ اے اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قوم کی طرف ہم جاتے ہیں تو ان دونوں قوموں میں جو ہدایت یافتہ ہوں اور جن کا دین افضل ہو اور جو تیرا بڑا دوست ہو اسے فتح دیدے۔۔ لڑائی کے دن بھی ابو جہل نے یہی دعا کی تھی کہ اے اللہ مدد کر دونوں گروہوں میں سے اس ایک گروہ کی جو تجھے بہت دوست ہو تو حق تعالیٰ اپنے حاکمانہ غلبہ و قوت کو ظاہر فرماتے ہوئے اہل مکہ سے خطاب فرماتا ہے۔ (تفسیر اشرفی)

کافروں کے لیے غزوہ بدر سے عبرت

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس جنگ کے بہت سے مقاصد تھے اور سب سے بڑا مقصد اللہ وحدہ 'لا شریک کی عظمت، طاقت، حکمت اور رحمت کا ثبوت دینا تھا۔ مسلمانوں کی مدد خود اللہ نے انعام کے طور پر کی اور پھر سمجھا دیا کہ یہ سب کچھ فرمان بر داری کے صلہ میں ہوا اور سب سے بڑا سبق بھی یہی دیا گیا کہ اسباب پیدا کرنے والا اور حق کو اپنانے والے مسلمانوں کی حمایت کرنے والا اور مسلمانوں کو فتح و کامیابی دینے والا رب العالمین ہی ہے کوئی بندہ اس غرور میں مبتلا نہ ہو جائے کہ یہ سب خود اس کا اپنا کمال ہے۔ صحابہ کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے رشتہ داروں، گھر بار حتی کہ ساری دنیا کو چھوڑ کر صرف اللہ واحد کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور یوں اپنے آپ کو شیطان کی شرارت سے بچا کر اللہ کی حفاظت میں دے دیا اور پھر اللہ و رسول کی محبت میں اپنا سب کچھ بھلا دیا تو بھلا ایسے بندوں کی مدد اللہ تعالیٰ خود کیوں نہ کرے گا۔ جبکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ ارادہ فرماتا ہے جو بندہ میری طرف ایک بالشت چل کر آئے میں اس کی طرف ایک ہاتھ چل کر آتا ہوں، جو چل کر آتا ہے میں اس کے پاس بھاگ کر جاتا ہوں۔ (صحیح بخاری)

غرض غزوہ بدر میں اللہ نے مسلمانوں کی جان نثاری کے بدلے میں بہترین فتح عطا کی تو پھر مسلمانوں کو یہ بھی بتا دیا کہ کہیں غرور میں نہ آ جانا اور کفار کو بھی یہ بتا دیا کہ اب تو سمجھ جاؤ کہ دین اسلام ہی حق ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب ابو جہل مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلنے لگا تو اس نے بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر یہ دعا مانگی:

" یا اللہ! دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ و افضل ہے اور دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اور دونوں پارٹیوں میں سے جو زیادہ کریم و شریف ہے اور دونوں میں سے جو دین افضل ہے اس کو فتح دے دیجئے۔ "

(مظہری بحوالہ معارف القرآن صفحہ 203)

جنگ ختم ہونے پر اللہ رب العزت نے ان پر واضح کر دیا کہ اگر تم اللہ کا انصاف چاہتے ہو تو پھر وہ سامنے آ چکا ہے، اس لیے اب تمہیں سمجھ جانا چاہیے اور اپنے عقیدے کو درست کر لینا چاہیے ورنہ پھر اسی طرح شکست کھاؤ گے کیونکہ یہ جنگ تو تمہاری، حق یعنی اللہ کے ماننے والوں کے ساتھ ہو گی چاہے کتنا بھی بڑا زبر ست انتظام کر لو فتح پھر بھی مسلمانوں کی ہی ہو گی کیونکہ ان کی مدد قادر مطلق الہ العالمین کی طرف سے ہو گی۔ اس کا مقابلہ تم مشرک اور باطل کے حمایتی کیا کر سکتے ہو؟

کتنی بڑی حقیقت ہے جو بدر کے واقعہ میں بیان کر دی گئی ہے۔ کہ بیشک کفار بتوں کو پوجتے تھے لیکن اللہ کو ضرور مانتے تھے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ رب العزت نے تمام انسانوں کی فطرت میں اپنا تصور ضرور رکھ دیا ہے جیسا کہ عہد ربوبیت (جس کا ذکر ہو چکا) عالم ارواح میں ہر بندے سے لیا جا چکا ہے۔ مگر انسان اپنے پیدا کرنے والے کو بھول جاتا ہے اور غلط اعتقادات میں پڑ جاتا ہے۔ اسی لیے اس کی ہدایت کے لیے ہمیشہ انبیاء اور

رسول بھیجے جاتے رہے ہیں جو طرح طرح سے لوگوں کو توحید کی تعلیم دیتے رہے ہیں مگر خوش نصیب ہیں وہ جنہوں نے توحید کی تعلیم کو سمجھا اور مانا اور بد نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی ہٹ دھرمی اور بے عقلی کی وجہ سے شرک اور کفر کی راہوں کو چھوڑ نہ سکے اور اللہ کی رحمت سے محروم رہے۔
اللہ کی رحمت، مدد اور فضل و کرم ہر وقت ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کے طلب گار ہیں۔ایسے لوگوں کا ہر کام، ہر سوچ اور ہر ارادہ اللہ کے فرمان کے مطابق ہوتا ہے۔اسی لیے مومن کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ کہا گیا ہے۔اس کی وضاحت علامہ اقبال نے شعر میں یوں بیان کی ہے۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط ایک نکتہ ایماں کی تفسیریں

مطلب یہ ہے کہ سلطنتوں اور حکومتوں کا قیام، علوم وفنون میں ترقی، یہ سب ایمان کامل کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔جو اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اس پر پورا بھروسہ کرتے ہیں۔اسی کی رضا کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھتے ہیں تو ایسے ہی لوگوں کی اللہ بھی مدد کرتا ہے۔لیکن کبھی احسان کر کے اور کبھی تکلیف دے کر ان کو آزماتا ضرور رہتا ہے۔اگلی آیات میں مرد کامل، سچے مسلمان کی تعریف اللہ کن الفاظ میں کرتا ہے؟ (تفسیر مفہوم القرآن)

آیت مبارکہ:

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝190

لغۃ القرآن: [اِنْ : اگر] [تَسْتَفْتِحُوْا : تم لوگ فیصلہ مانگتے ہو] [فَقَدْ جَآءَكُمُ : تو آچکا تمہارے پاس] [الْفَتْحُ : فیصلہ] [وَاِنْ : اور اگر] [تَنْتَهُوْا : تم لوگ باز آجاؤ] [فَهُوَ : تو یہ] [خَيْرٌ: بہتر ہے] [لَّكُمْ : تمہارے لیے] [وَاِنْ : اور اگر] [تَعُوْدُوْا : تم لوگ دوبارہ کروگے] [نَعُدْ : تو ہم (بھی) دوبارہ کریں گے] [وَلَنْ تُغْنِيَ : اور ہرگز بے نیاز نہیں کرے گی] [عَنْكُمْ : تم کو] [فِئَتُكُمْ : تمہاری جماعت] [شَيْـًٔا : کچھ بھی] [وَّلَوْ : اور اگر] [كَثُرَتْ ۙ: وہ زیادہ (بھی) ہو] [وَاَنَّ : اور یہ کہ] [اللّٰهَ : اللہ] [مَعَ : ساتھ] [الْمُؤْمِنِيْنَ : مومنوں]

ترجمہ: (اے کافرو!) اگر تم نے فیصلہ کن فتح مانگی تھی تو یقیناً تمہارے پاس (حق کی) فتح آچکی اور اگر تم (اب بھی) باز آجاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اگر تم پھر یہی (شرارت) کروگے (تو) ہم (بھی) پھر یہی (سزا) دیں گے اور تمہارا لشکر تمہیں ہرگز کفایت نہ کر سکے گا اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو اور بیشک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے

تشریح: اب روئے سخن کفار کی طرف ہے۔ کفار جب مکہ سے روانہ ہوئے تھے تو غلاف کعبہ کو پکڑ کر انھوں نے دعا مانگی تھی اللھم انصر اقرانا للضیف واوصلنا للرحم وافکنا للعانی وان کان محمد علی حق فانصرہ وان کنا علیٰ حق فانصرنا (کشاف) اے اللہ ہم دونوں فریقوں میں سے جو زیادہ مہمان نواز ہے، جو زیادہ صلہ رحم ہے، جو قیدیوں کو زیادہ آزاد کرنے والا ہے۔ اس کی مدد فرمایا۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حق پر ہے تو اسے فتح دے اور اگر ہم حق پر ہیں تو ہمیں غلبہ بخش۔ کفار سے کہا جارہا ہے کہ وہ دعا جو تم نے مانگی تھی وہ قبول ہوئی۔ جو حق پر تھا وہ غالب ہوا اور جو باطل سے چمٹے ہوئے تھے وہ مغلوب۔ اب باز آجاؤ۔ تمہارے میعاد کے مطابق حق واضح ہو گیا اب تو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہی۔ اگر پھر بھی تم نے حق کو قبول نہ کیا اور اس کی مخالفت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو تمہیں آئندہ بھی ایسی اندوہناک شکستوں سے دوچار ہونا پڑے گا فتح کا معنی فیصلہ بھی کیا گیا ہے۔

اے کفار! جب تم تائید خداوندی سے محروم ہو اور مسلمان اس نعمت سے مشرف ہیں تو پھر خود ہی سوچوں کیا تمہاری کامیابی کا کوئی امکان ہے۔ چلو مان لیا تم بڑے نڈر اور بہادر ہو اور تمہاری تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن خود ہی بتاؤ کیا تم اللہ تعالیٰ کی طاقت سے ٹکرلے سکتے ہو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

غیب کی ایک خبر

اس آیت میں غیب کی خبر ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کے بھاری لشکر بھی مغلوب ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ نے یہ خبر پوری فرمادی، تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے، صحابہ کرام (رض) کے عہد خلافت اور بعد میں بھی تھوڑے مسلمان بہت سے کافروں پر غالب آئے۔ مسلمانوں کی جنگی تاریخ کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ

(1)۔۔ غزوہ موتہ میں صرف تین ہزار جانثاران مصطفیٰ کے مقابلے میں روم کے بادشاہ قیصر کی فوج کی تعداد دو لاکھ تھی، لیکن اللہ عَزَّوَجَلَّ کے شیروں نے اس جنگ میں پرچم اسلام سرنگوں نہ ہونے دیا۔

(2)۔۔ جنگ یرموک میں حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح (رض) تقریباً 40000 کی قلیل فوج کے ساتھ دشمن کے دس لاکھ ساٹھ ہزار فوجیوں سے ٹکرائے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نصرت وحمایت سے کامیاب وکامران ہوئے۔

(3)۔۔ اسی جنگ میں حضرت خالد بن ولید (رض) نے صرف 60 کفن بردوش مجاہدین کے ساتھ دشمن کے 60000 جنگجو اور سرتاپا لوہے سے لیس فوجیوں کے ساتھ صبح سے لے کر شام تک مقابلہ کیا اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کے فضل سے ان پر غالب آگئے۔

(4)۔۔ حضرت طارق بن زیاد (رض) نے صرف 1700 جانباز مجاہدین کے ساتھ اندلس کے بادشاہ لڈریک کے ستر ہزار شہسواروں سے جنگ کی اور نصرت الٰہی کے صدقے انھیں کچل کر رکھ دیا۔

یہ غازی یہ تیرے پُراَسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا

(تفسیر صراط الجنان)

کفار کا غلبہ عارضی ہے، دائمی غلبہ اہل ایمان کا ہے:

وَاَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ سے معلوم ہوا کہ دور حاضر میں کفار کا موجودہ غلبہ عارضی ہے، دائمی کامیابی مسلمانوں کے لئے ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمادیا ہے کہ اللہ اہل ایمان کے ساتھ ہے، تو جس کے ساتھ اللہ ہو وہی کامیاب ہے۔

اگر کہا جائے کہ جب اللہ مومنوں کے ساتھ ہے تو پھر آج انھیں ہر میدان میں ذلت و خواری کا سامنا کیوں ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں المومنین میں لام تعریف عہد خارجی کے لیے یعنی مومنین کی ایک خاص جماعت یہاں مراد ہے انہی کے ساتھ اللہ ہے اور وہی کامیاب ہیں۔ وہ خاص مومنین کون ہیں تو قرآن مجید میں اس کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿٢﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴿٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ﴿٤﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٥﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٦﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿٧﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٩﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ﴿١٠﴾ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١﴾۔

"مومنین کامیاب ہیں جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں اور اور جو بے کار باتوں سے اعراض برتتے ہیں اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوا اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے، اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں، تو جو اس کے سوا کوئی طریقہ ڈھونڈے تو یہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرتے ہیں اور نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، تو یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (مومنون: 1 تا 11)

تو جب تک مومنین ان صفات کے حامل تھے تو وہی کامیاب تھے اور اللہ کی رحمت انہی کے ساتھ تھی۔ (تفسیر برہان القرآن)

حق والوں کی مشکلات

بغوی نے اپنی سند سے حضرت قیس بن حباب کا قول نقل کیا ہے ' حضرت قیس نے فرمایا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چادر سر کے نیچے رکھے کعبہ کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ ہم نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بطور شکوہ عرض کیا کہ آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا نہیں کرتے اور اللہ سے نصرت کی درخواست نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے ' چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا: تم سے پہلے بعض لوگ ایسے گذرے ہیں کہ زمین میں گڑھا کھود کر گڑھے میں ان کو کھڑا کر کے آرہ سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے لیکن یہ اذیت بھی ان کو ان کے دین سے نہیں لوٹا سکتی تھی۔ بعض لوگوں کے گوشت کے اندر لوہے کی کنگیاں ' ہڈی اور پٹھے تک کی جاتی تھیں مگر یہ دکھ بھی ان کو ان کے دین سے نہیں پھیر سکتا تھا۔ اللہ اس کام کو ضرور پورا کرے گا یہاں تک کہ تمہارا سوار صنعاء سے حضر موت تک بلاخوف و خطر جائے گا اور

راستہ میں سوائے اللہ کے اور کسی کا اس کو ڈر نہ ہو گا (یعنی مسلمانوں کے لیے امن عام ہو جائے گا) مگر تم جلدی کرتے ہو (اور وقت سے پہلے غلبہ کے خواہشمند ہو)۔

دو بچوں کا کارنامہ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے: میں بدر کے دن لائن میں کھڑا ہوا تھا ' میں نے دیکھا کہ میرے دائیں بائیں دو لڑکے ہیں اور میں دو نوجوان لڑکوں کے درمیان ہوں ' مجھے خیال پیدا ہوا کہ اگر میرے دونوں طرف طاقتور آدمی ہوتے تو بہتر ہوتا (کہ وقت پر کچھ میری مدد کرتے اور کچھ کام کرتے) اتنے میں ایک لڑکے نے چپکے سے مجھے دبایا اور پوچھا: چچا! کیا آپ ابو جہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں ' لیکن بھتیجے! تم کو اس سے کیا سروکار؟ کہنے لگا: مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گالیاں دیتا ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میں نے اس کو دیکھ پایا تو میری نظر کے سامنے سے وہ ہٹنے نہ پائے گا یہاں تک کہ ہم میں سے جس کی موت پہلے آئی ہے ' وہ مارا جائے گا۔ دوسرے نے مجھے ہاتھ سے دبا کر یہی بات کہی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر اچنبھا ہوا۔ اتنے میں ابو جہل یہ شعر گاتا ہوا لوگوں میں نظر پڑا: ماتنقم الحرب العوان منی بازل عامین حدیث سنی۔ پھر کہنے لگا: ایسے ہی دن کے لیے میری ماں نے مجھے جنا تھا۔
میں نے ان لڑکوں سے کہا: جس شخص کے متعلق تم دریافت کر رہے تھے ' وہ یہ ہے۔ یہ سنتے ہی دونوں تلواریں لے کر اس پر جھپٹ پڑے اور دونوں نے فوراً مار کر اس کو ٹھنڈا کر دیا اور لوٹ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دے دی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے۔ پھر آپ نے ابو جہل کے اسلحہ اور اس سے چھینا ہوا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو عطا فرما دیا۔ یہ دونوں شخص معاذ بن عمرو اور معاذ بن عفراء تھے۔
بخاری نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کوئی دیکھ کر آئے کہ ابو جہل کس حال میں ہے۔ حسب الحکم حضرت ابن مسعود گئے اور جا کر دیکھا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو مار کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے جا کر اس کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا: کیا تو ابو جہل ہے (کہ اتنا غرور کرتا تھا) ابو جہل نے کہا: کیا جس شخص کو اس کی قوم نے ' یا یہ کہا کہ تم لوگوں نے قتل کر دیا ہے ' اس سے بڑا کوئی ہے۔
ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت معاذ اس کے بعد حضرت عثمان غنی کے دور خلافت تک زندہ رہے۔ قاضی (عیاض) نے العیون میں لکھا ہے کہ ابن وہب کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت معاذ اپنا (لٹکا یا کٹا ہوا) ہاتھ اٹھائے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر لعاب مبارک لگا دیا ' فوراً ہاتھ جڑ گیا۔ قاضی عیاض نے شفاء میں ابن وہب کی روایت سے اس طرح نقل کیا ہے کہ ابو جہل نے حضرت معاذ کا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ حضرت معاذ وہ ہاتھ اٹھائے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر لعاب لگا کر (اس کی جگہ پر) جوڑ دیا اور وہ جڑ گیا۔
ابن اسحاق نے بیان کیا: ابو جہل زمین پر پچھڑا پڑا تھا۔ حضرت معوذ بن عفراء اس کی طرف سے گذرے اور تلوار کا ایک کاری ہاتھ مارا مگر کچھ جان اس میں باقی رہی۔ حضرت معاذ جنگ میں شہید ہو گئے۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود ' ابو جہل کی طرف سے گذرے ' آپ کا بیان ہے: میں نے اس کو آخری سانسوں میں پایا اور گردن پر پاؤں رکھ کر کہا: دشمن خدا! اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا۔ بولا: ذلیل کیسے کر دیا ' تم نے جس

شخص کو قتل کیا ہے ' کیا اس سے زیادہ کوئی باعزت ہے (یعنی جس شخص کو اس کی قوم قتل کر دے ' وہ ذلیل نہیں ہوتا) مجھے یہ بتاؤ کہ انجام کس کے ہاتھ رہا (یعنی فتح کس کی ہوئی) میں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فتح ہوئی۔

ابو جہل کا سر

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ابو جہل نے مجھ سے کہا: اے بکریوں کے چرواہے! تو سخت (دشوار رس) بلندی پر چڑھا ہے (یعنی میرا سینہ اونچے پہاڑ کی طرح ہے جس کی چوٹی پر پہنچنا سخت دشوار تھا اور تو اس پر چڑھا بیٹھا ہے) پھر میں اس کا سر کاٹ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں لے آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ اللہ کے دشمن ابو جہل کا سر ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (تعجب سے) فرمایا: قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں ' قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے سر ڈال دیا ' حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ سجدہ میں گر گئے۔ تیسری روایت میں ہے کہ (بطور شکر) دو رکعت نماز پڑھی۔ ابن عابد نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر امت کا ایک فرعون ہوتا ہے ' اس امت کا فرعون ابو جہل ہے۔ اس پر اللہ کی مار! عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو قتل کر دیا ' یا فرمایا: ملائکہ نے اس کو قتل کر دیا اور ابن مسعود نے اس کا کام تمام کر دیا اور تیزی سے قتل کر دیا۔ (تفسیر مظہری) (تفسیر گلدستہ)

نظامی نے کہا۔

بحکمش دو نیم ست دریائے نیل

بمرغان کشد فیل واصحاب فیل

اے مشرکین عرب اصحاب فیل کی تباہی کا نقشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے جن کے 17 ہزار کے جرار لشکر کو چھوٹے پرندوں نے ایسا تباہ کیا جیسے " فجعلھم کعصف ماکول " جیسے کہ اونٹوں کے سامنے رکھے گھاس اور چارہ جنہیں کھا کر فنا کیا گیا ہو۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝20ۖ

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو ! جو] [اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے][اَطِيْعُوا : تم لوگ اطاعت کرو] [اللّٰهَ : اللہ کی] [وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کے رسول کی] [وَلَا تَوَلَّوْا : اور روگردانی مت کرو] [عَنْهُ : ان سے] [وَ اَنْتُمْ : اور ہو تم] [تَسْمَعُوْنَ : سن رہے ہو]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو حالانکہ تم سن رہے ہو

تشریح:

اطاعت خدا اور اطاعت رسول عقائد اسلامیہ اور شریعت بیضاء کا سنگ بنیاد ہے

۔اس کے بغیر نہ اسلامی عقائد کا پتہ چل سکتا ہے اور نہ شریعت کا۔ وانتم تسمعون کے کلمات کتنے معنی خیز ہیں۔ یعنی اتنا تغافل کہ قرآنی آیات سننے کے باوجود بھی اطاعت خدا اور رسول میں کوتاہی۔ تعجب ہوتا ہے ان لوگوں پر جو تعلیمات قرآنیہ کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اطاعت رسول کے منکر ہیں۔ بلکہ اتباع قرآن کو ترک اطاعت رسول کی دلیل بناتے ہیں۔ وہ اپنی روش پر خود ہی نظر ثانی کریں کیا وہ قرآن سے اس کے نازل کرنے والے کی منشا کے خلاف تو استنباط نہیں کر رہے؟ کیا وہ اتنا بھی غور نہیں کرتے کہ اتباع قرآن تب ہی ہو سکتا ہے جب اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم بھی قرآن کا ہی حکم ہے جو ایک بار نہیں سینکڑوں بار دیا گیا ہے۔ کیا وہ قرآن کے اس صریح حکم کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو قرآن کا متبع کہہ سکتے ہیں۔

آپ ہی اپنے ذرا طرز عمل کو دیکھیں   ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی   (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اہمیت

یعنی تم اللہ اور اس کے رسول کا جو بھی حکم سنو اسے سن کر منہ نہ پھیرو بلکہ اس کے آگے سر تسلیم خم کر دو خواہ وہ جہاد جیسا سخت تر حکم ہو۔ چونکہ گزشتہ آیات میں غزوہ بدر کی بات ہو رہی ہے اور جہاد میں اللہ و رسول کی اطاعت ہی سے کامیابی مل سکتی ہے۔ اس لیے اب اطاعت پر زور دیا جا رہا ہے۔

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے

1۔ حجیت حدیث: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ سے معلوم ہوا جیسے اللہ کا ہر حکم مطلقاً واجب الاطاعت ہے یونہی ہر قول رسول بھی مطلقاً واجب الاطاعت ہے۔ اسی لیے حدیث صحیح سے فقہاء کے نزدیک واجبات اور حلال و حرام کے احکام ثابت ہوتے ہیں، خواہ وہ خبر واحد ہو۔

2۔ ختم نبوت: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ سے معلوم ہوا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی طرح مطاع مطلق ہیں۔ آپ کے سوا ہر کسی کی اطاعت، اطاعت رسول سے مشروط ہے۔ اگر آپ کے بعد کوئی نیا نبی مانا جائے تو وہ بھی مطاع مطلق ہو گا اور آپ کی اطاعت اس کی اطاعت سے مشروط

ہو جائے گی۔ اس طرح اَطِيْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کو منسوخ ماننا پڑے گا اور اس کی جگہ پہ نئے رسول کی اطاعت کو لانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں وَرَسُوْلَہٗ صیغہ معرفہ بھی ایک رسول کے اختصاص پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اللہ رب العزت ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا کے مخاطب ہیں ان کے لیے صرف ایک ہی رسول ہے، ہاں اگر کوئی اس دائرہ سے باہر ہے تو وہ جو مرضی کہتا پھرے۔ (تفسیر برہان القرآن)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم پر عمل کا واجب ہونا

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ فرمایا ہے کہ جب تم کسی چیز کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم سن رہے ہو تو اس حکم کی اطاعت کرو اور اس حکم سے اعراض نہ کرو۔ اس جگہ یہ نہیں بتایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وہ کونسا حکم سن رہے تھے۔ جس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے اور اس سے اعراض کرنا حرام ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس حکم کا ذکر نہ کر کے اس کے عموم پر متنبہ کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہر حکم کی اطاعت واجب ہے اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کو کوئی حکم دیں تو ان کے لیے اس حکم پر عمل کرنے یا عمل نہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے: " وماکان لمومن ولا مومنۃ اذاقضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا: اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اپنے (اس) کام میں کوئی اختیار ہو اور جانے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو بیشک وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا" (الاحزاب: 36)
اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیتوں میں چونکہ غزوہ بدر اور جہاد کا ذکر آ رہا تھا تو اس قرینہ سے یہاں بھی جہاد کا حکم دینا مراد ہے اور جہاد میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے اور اپنے مال کو خرچ کرنا پڑتا ہے اور یہ دونوں چیزیں انسان پر بہت دشوار ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اہمیت کی وجہ سے خصوصاً جہاد کے حکم میں آپ کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہر چند کے آپ کے ہر حکم کی اطاعت واجب ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا واحد ہونا

اس آیت میں دوسری بحث یہ ہے پہلے فرمایا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو پھر فرمایا اور اس سے اعراض نہ کرو، چونکہ پہلے دو کی اطاعت کا ذکر ہے اس لیے بظاہر تثنیہ کی ضمیر ذکر کرنی چاہیے تھی یعنی ان سے اعراض نہ کرو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے واحد کی ضمیر ذکر کی ہے۔ امام رازی نے اس کا یہ جواب دیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے اعراض کرتے ہوئے پیٹھ نہ پھیرو اور پیٹھ پھیرنا اور اعراض کرنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حق میں متصور ہو سکتا ہے اس لیے واحد کی ضمیر ذکر کی اور مراد یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے اعراض نہ کرو۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 469، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)
اس کا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اکی اطاعت واحد ہے الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "
من یطع الرسول فقد اطاع اللہ: جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کر لی" (النساء: 80)
اس پر متنبہ کرنے کے لیے واحد کی ضمیر ذکر کی ہے کہ اس کی اطاعت سے اعراض نہ کرو۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

"قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین۔ یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام :
بیشک تمہارے پاس آگیا اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین۔ اللہ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہ پر لاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں۔" (المائدہ:15۔16)

اس آیت میں پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے نور اور کتاب مبین (یعنی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید) اس لیے یہاں بھی بظاہر تثنیہ کی ضمیر ذکر کرنی چاہیے تھی۔ یعنی اللہ ان کے ذریعہ۔ لیکن چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید کی ہدایت واحد ہے اس پر متنبہ کرنے کے لیے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

اس کی ایک اور نظیر یہ آیت ہے : واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ : اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے کہ اس کو راضی کیا جائے (التوبہ)
یہاں بھی پہلے اللہ اور رسول کا ذکر ہے تو بہ ظاہر تثنیہ کی ضمیر لانی تھی لیکن واحد کی ضمیر لائی گئی ہے تاکہ اس پر متنبہ کیا جائے کہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا واحد ہے، الگ الگ نہیں ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝21

لغۃ القرآن: [وَلَا تَكُوْنُوْا : اور تم لوگ مت ہو] [كَالَّذِيْنَ : ان کی مانند جنھوں نے] [قَالُوْا : کہا] [سَمِعْنَا : ہم نے سنا] [وَهُمْ : اور وہ] [لَا : نہیں] [يَسْمَعُوْنَ : نہیں سنتے تھے]

ترجمہ: اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے (دھوکہ دہی کے طور پر) کہا: ہم نے سن لیا، حالانکہ وہ نہیں سنتے

تشریح: اہل ایمان کو یہود و منافقین کے طریق کار کو اپنانے سے روکا جارہا ہے کہ وہ زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے کتاب الٰہی کو سن لیا لیکن جب عمل کی باری آتی ہے تو انھیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ جو انھوں نے سنا ہے اگر وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے تو گویا انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ سننا تو وہ ہے جو انسان کو عمل کرنے پر آمادہ کر دے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

یہود کی طرف اشارہ ہے

اس آیت کریمہ میں جن لوگوں کی مشابہت سے روکا گیا ہے اور ان کی بطور خاص ایک صفت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وہ صفت خود بول رہی ہے کہ اشارہ یہود کی طرف ہے کیونکہ قرآن کریم نے متعدد مواقع پر یہود کی اس عادت بد کا ذکر فرمایا کہ جب بھی ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ "سنو اور اطاعت کرو "تو وہ جواب میں کہتے "سمعنا وعصینا "سمعنا کو بلند آواز سے کہتے اور عصینا دبی آواز سے کہتے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ "ہم نے سن لیا اور ہم نے نافرمانی کی "یا ممکن ہے یہ ان کے حال کی تصویر ہو کہ وہ زبان سے تو سمعنا کہتے تھے کہ ہم نے آپ کا حکم سن لیا ہے

لیکن اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے تھے کہ ہم وہ لوگ ہیں جو سننے کے بعد عمل نہیں کیا کرتے بلکہ بعض دفعہ تو ان کی سنگدلی اور حق دشمنی اس انتہا کو پہنچ جاتی کہ وہ صاف کہتے کہ ہمارے دل غلافوں میں ملفوف ہیں تم جو کہتے ہو ہمارے دلوں میں اترتا نہیں۔ اس لیے ہم اس کے قبول کرنے سے معذور ہیں۔ یہاں ان کے اسی رویے کی طرف اشارہ فرما کر مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم ان یہود کی طرح بننے کی کوشش مت کرو کہ وہ لوگ اپنے پیغمبروں کی تعلیمات اور تنبیہات کو سنتے ضرور تھے لیکن قبول نہیں کرتے تھے اور سننے سے مقصود اصل تو قبول کرنا ہی ہوتا ہے کیونکہ محض سننا اور پھر اس کا کوئی اثر قبول نہ کرنا یہ وہ چیز ہے جو حیوانیت کی سطح سے بھی گری ہوئی ہے کیونکہ حیوانوں میں سے جن جانوروں کو سدھایا جاتا ہے وہ نہ صرف سنتے ہیں بلکہ اس کے نتیجے میں وہی کچھ کرنے لگتے ہیں جو انھیں سکھایا جاتا ہے۔ انسانوں میں یہ طرز عمل صرف منافقین کا ہوتا ہے کیونکہ کافر تو سرے سے سنتا ہی نہیں آپ اصرار کریں تو وہ سننے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی نہ سننے دیا جائے۔ لیکن منافق اپنے آپ پر پردہ ڈالنے کے لیے بظاہر قریب ہو کر سنتا ہے لیکن کسی بات کو دل میں اترنے نہیں دیتا کیونکہ اس کے دل اور زبان کے درمیان نفاق کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ تو تم اگر یہی رویہ اختیار کر کے منافقت کے راستے پر چلنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر سوچ لو تمہارا انجام بھی وہی ہو گا جو اس سے پہلے یہود کا ہو چکا ہے۔ وہ دنیا میں عبرت کے طور پر زندہ رکھے گئے ہیں لیکن انسانوں کا عجیب حال ہے بجائے ان سے عبرت حاصل کرنے کے ان کے راستے پر چلنا پسند کرتے ہیں حالانکہ یہ راستہ مسلمانوں سے تو فروتر ہے ہی انسانوں کی سطح سے بھی گرا ہوا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

اللہ پاک نے اس سے پہلے کی آیت میں مومنوں کو خطاب کر کے یہ فرمایا تھا کہ تم ہر ایک امر میں خدا اور اس کے رسول کی تابعداری کرتے رہو اور ہر باب میں ان کے حکم سے پیٹھ نہ پھیرو کیونکہ تم قرآن کی پند و نصیحت کی باتیں اور سمجھتے ہو اور اس کی تصدیق کرتے ہو اس کے بعد اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ان لوگوں کی خصلت نہ اختیار کرو جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم سنتے میں اور حقیقت یہ ہے کہ سنتے نہیں ہیں کیونکہ سننے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس سے کچھ نفع بھی حاصل ہو یہ منافقین یا مشرکین خدا کا کلام صرف کانوں سے سنتے ہیں مگر اس سے کوئی نفع نہیں اٹھاتے اس لیے ان کا سننا اور نہ سننا دونوں برابر ہیں پھر اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ چار پایوں سے بھی بدتر بالکل بہرے گونگے ہیں کچھ سمجھ ہی نہیں رکھتے ان سے تو جانور بھی اچھے ہیں کہ وہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے ہیں جو جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس امر میں وہ خدا کا مطیع ہے انسان ہیں جو اللہ کی عبادت کے لیے بنائے گئے مگر انھوں نے اس سے انکار کیا اس لیے یہ چوپایوں سے بدتر ٹھہرے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کا قول ہے کہ یہ لوگ منجملہ قریش کے عبدالدار بن قصی کے قبیلہ کے چند لوگ تھے جو کہتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو شریعت لائے ہیں اس سے بہرے گونگے ہیں یہ لوگ سب کے سب سوائے دو شخصوں کے جنگ احد میں مارے گئے ان میں سے دو شخص بچے تھے مصعب بن عمیر اور سویبط بن حرملہ یہ دونوں مسلمان ہوئے پھر اللہ پاک نے اپنے علم ازلی کے موافق ان کے سننے میں بھلائی اور بہتری دیکھتے تو ان کو اس کے سننے کی توفیق دے دیتے لیکن اللہ کے علم ازلی کے موافق یہ نتیجہ قرار پا چکا ہے کہ اگر بالفرض انھیں سننے اور سمجھنے کی توفیق بھی دے دی جائے تو بھی یہ لوگ نہیں سنیں گے بلکہ نصیحت سے پیٹھ پھیرنے لگیں گے اور اس سننے سے کوئی نفع نہیں اٹھائیں گے اور عناد اور کفر کی وجہ سے نصیحت کے نفع سے پہلو تہی کریں گے بعضے مفسروں نے یہاں یہ بیان کیا ہے کہ قبیلہ عبدالدار کے لوگ جن کا ذکر ابھی ہو چکا کہ وہ حضرت کا کلام سننے کے وقت یہ کہتے تھے ہم بہرے گونگے ہیں یہ لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے باپ قصی کو آپ زندہ کر دیں تاکہ ہم اس سے دریافت کر لیں اگر وہ آپ کی رسالت کے متعلق گواہی دے گا تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے اسی کے جواب میں اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں کو قصی کی باتیں بھی سنا دی جاویں تو بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور نصیحت کے سننے سے پیٹھ پھیر لیں گے اور دلی کفر کو وجہ سے ایمان لانے سے انکار ہی کریں گے صحیح مسلم کے حوالہ سے عبداللہ (رض) بن عمر بن العاص کی حدیث ایک جگہ گذر چکی ہے جس میں

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا کے پیدا ہونے سے پچاس ہزار برس پہلے اپنے علم ازلی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے وہ سب لوح محفوظ میں لکھ لیا ہے جو دنیا کے پیدا ہونے کے بعد دنیا میں ہونے والا تھا صحیح بخاری و مسلم کے حوالہ سے ابوسعید خدری (رض) کی حدیث بھی گذر چکی ہے جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بڑے لوگوں کی مثال بری زمین کی اور قرآن شریف کی مثال مینہ کی فرمائی ہے۔ ان حدیثوں کو ان آیتوں کی تفسیر میں بڑا دخل ہے کیونکہ آیتوں اور حدیثوں کے ملانے سے یہ مطلب قرار پاتا ہے کہ دنیا کے پیدا ہونے سے پہلے علم آلہی میں جو لوگ برے ٹھہر چکے ہیں ان کے دل میں اسی طرح قرآن کی نصیحت کچھ اثر نہیں کرتی جس طرح بری زمین میں مینہ کا پانی کچھ اثر نہیں کرتا اسی واسطے وہ بہروں کی طرح قرآن کی نصیحت نہیں سنتے اور گونگوں کی طرح حق بات کا اقرار زبان پر نہیں لاسکتے اسی واسطے ایمان داروں کو ایسے لوگوں کی عادتوں سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ (احسن التفاسیر)

آیت مبارکہ:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○22

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک] [شَرَّ الدَّوَآبِّ : زمین پرچلنے والوں کے بد ترین] [عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے ہاں] [الصُّمُّ : بہرے ہیں] [الْبُكْمُ : گونگے ہیں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [لَا : نہیں] [يَعْقِلُوْنَ : وہ عقل رکھتے]

ترجمہ: بیشک اللہ کے نزدیک جانداروں میں سب سے بدتر وہی بہرے، گونگے ہیں جو (نہ حق سنتے ہیں، نہ حق کہتے ہیں اور حق کو حق) سمجھتے بھی نہیں ہیں

تشریح: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا حکم سن کر اسے قبول نہیں کرتے اور دل سے سمجھ کر زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتے (کفر کرتے ہیں) وہ بہرے، گونگے اور عقل سے کورے ہیں اور وہ اللہ کے ہاں زمین پر چلنے والی ساری مخلوق سے بدتر ہیں۔ کیونکہ ہر مخلوق اللہ کی اطاعت میں لگی ہے۔ یسبح للہ ما فی السموات وما فی الارض۔ (جمعہ۔ 1) وللہ یسجد ما فی السموات وما فی الارض (نحل: 49) اگر انسان اطاعت نہ بجالائے تو وہ ہر جانور سے بدتر ہے اسی لیے فرمایا گیا: اولئك هم شر البرية (البينة: 6)۔ یعنی اگر انسان سنبھل جائے تو فرشتوں سے برتر ہے نہ سنبھلے تو کلب و خنزیر سے بر تر۔ گویا کفار کا اللہ کے ہاں کچھ مقام نہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (الانفال: ۲۲)

(بے شک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں۔)

بدترین خلائق لایعقل جانور ہیں

" دَوَآبٌّ "دابّۃٌ کی جمع ہے۔اہل لغت کے نزدیک ہر زمین پر چلنے والے کو دابّۃ کہا جاتا ہے۔ مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابّۃ کہتے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات سے افضل پیدا فرمایا ہے۔اس کی تخلیق احسن تقویم میں ہوئی ہے۔اسے صلاحیتوں سے مالامال کیا گیا ہے۔ اسے حواس خمسہ عطا فرمائے گئے ہیں۔ جس سے وہ محسوسات میں راہنمائی لیتا ہے۔ پھر اسے جوہر عقل عطا فرمایا گیا ہے جس سے حواس سے حاصل کردہ معلومات کو عقل کی قوت سے کام لے کر ایجادات واختراعات میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا میں ایسا تنوع، ایسی رنگارنگی اور ایسی جدت کو بروئے کار لاتا ہے جس سے انسانی زندگی حیوانیت سے بالکل الگ ہو کر اپنی وسعت اور ہمہ ہمی میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور پھر یہی وہ عقل ہے جو قوت تمیز بن کر خیر و شر کی شناخت میں انسان کو راہنمائی مہیا کرتی ہے۔اللہ کے ہاں جزاوسزا کا ترتب اللہ کی عطا کردہ اسی قوت پر ہوتا ہے۔ تو جو شخص عقل سے کام نہیں لیتا اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ جہان خیر و شر میں کسی ایسے فیصلے تک پہنچ سکے جو دنیا اور آخرت میں خیر و فلاح کا باعث ہو۔ یہ وہ انسانی سطح ہے جو ہدایت و ضلالت کے حوالے سے پیغمبروں کی اصل مخاطب ہے۔اس لیے جو آدمی اس سطح سے گر جاتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حیوانیت کی سطح پر اتر گیا کیونکہ حیوان بھی اپنے پاس حواس کی دولت تو رکھتے ہیں۔اسی کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی کے معمولات انجام دیتے ہیں۔ زندگی کی ضروریات فراہم کرتے ہیں۔ بچوں کو پالتے ہیں۔ موسم کی شدت سے بچنے کے لیے اپنے بھٹ بناتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص حواس کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے صحیح فیصلہ کرنا تو دور کی بات ہے وہ کسی بات کو نہ سنتا ہے اور نہ بولتا ہے یعنی کوئی اسے پکارتا ہے تو وہ سنتا نھیں اور نہ خود کسی کو پکارتا ہے تاکہ کوئی اس کے کام آ سکے۔ تو یہ وہ حیوان ہے جسے حیوانوں میں سے بھی بدترین قرار دیا گیا ہے۔ حیوانوں میں بھی عزت کے لائق وہی حیوان ہوتے ہیں جو اپنے مالک کی بات سنتے ہیں اور وہ حیوان جو گدھے کی طرح صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہیں وہ حیوانوں میں بھی حیوانوں جیسی عزت نہیں پاتے۔ مدارج کی اس تقسیم کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ جو منافقین اللہ کے رسول جیسی دلآویز شخصیت اور دل میں اتر جانے والے لب و لہجہ کو بھی سننے کے قابل نہیں سمجھتے اور اگر سنتے بھی ہیں تو سننے کے تقاضوں پر کان نہیں دھرتے۔ تو یہ تو ایسے حیوان ہیں جو حیوانی صفات سے بھی محروم ہیں اور ایسے انسان ہیں جو انسانی صفات سے محروم ہیں کیونکہ یہ بہرے بھی ہیں اور گونگے بھی۔ یہی حیوانی صفات ہیں اور یہ عقل سے کام نہیں لیتے یہ انسانی صفت ہے۔ ایسے لوگوں کو خود سوچنا چاہیے کہ اس روش کا آخر انجام کیا ہوگا؟ کیونکہ انسانی زندگی کا آغاز ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کی سنے، دوسروں سے پوچھے اور سمجھے اور پھر اپنی حاصل کردہ معلومات سے عقل کے ذریعے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک انسان کی اجتماعی زندگی کا تعلق ہے اس کا آغاز سمع و اطاعت سے ہوتا ہے تو اس اجتماعیت میں رہنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے نظم اور اپنے نظم کے سربراہ کی ہدایات کو سنیں، سمجھیں اور انھیں قبول کریں کیونکہ کوئی بھی اجتماعی نظم جسے دنیا میں اپنا وزن ڈالنا ہو اور جسے ایک مضبوط قوت بن کر اٹھنا ہو اور جس کے پیش نظر ایک صالح معاشرے کی تشکیل ہو اور جو خیر کی قوت بن کر دنیا کو راہ راست دکھانے کی فکر بھی رکھتا ہو اس کی اصل قوت سمع و اطاعت میں مضمر ہوتی ہے۔ فوج ہر ملک کی منظّم اور مضبوط قوت سمجھی جاتی ہے۔اس کی تنظیم اور اس کی قوت کا راز کس بات میں ہوتا ہے؟ صرف سمع اطاعت میں۔ کوئی سپاہی یا کوئی افسر فوج میں رہ کر اپنی مرضی کرنے کی عادت نہیں بنا سکتا۔ وہاں سب کو اپنے سے بالا کی بات سننا اور اطاعت کرنا پڑتی ہے اور اسی کے نتیجے میں ان کے اندر ایک ڈسپلن پیدا ہوتا ہے اور فوج کے

تمام افراد ایک اکائی بن کر سیسہ پلائی دیوار میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان تین آیتوں میں بنیادی طور پر یہی حقیقت واشگاف کی گئی ہے کہ ایک مضبوط قوت بننے کے لیے تمہیں اپنے اندر سمع اطاعت کی خو پیدا کرنی چاہیے اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم حیوانوں کی ایک بھیڑ تو بن سکتے ہو ایک مضبوط امت نہیں بن سکتے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ 23○

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر] [عَلِمَ : جانتا] [اللّٰهُ : اللہ] [فِيْهِمْ : ان میں] [خَيْرًا : کوئی بھلائی] [لَّاَسْمَعَهُمْ: تو وہ ضرور سناتا ان کو] [وَلَوْ : اور اگر] [اَسْمَعَهُمْ : وہ سناتا ان کو] [لَتَوَلَّوْا : تو وہ ضرور روگردانی کرتے] [وَّهُمْ : اور وہ] [مُّعْرِضُوْنَ : ضرور وہ منہ پھیرتے]

ترجمہ: اور اگر اللہ ان میں کچھ بھی خیر (کی طرف رغبت) جانتا تو انھیں (ضرور) سنا دیتا، اور (ان کی حالت یہ ہے کہ) اگر وہ انھیں (حق) سنا دے تو وہ (پھر بھی) روگردانی کرلیں اور وہ (حق سے) گریز ہی کرنے والے ہیں

تشریح:

شان نزول

اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ اہل مکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمائش کیا کرتے تھے کہ آپ ہمارے جد امجد قصی کو زندہ کریں اگر اس نے آپ کی نبوت کی شہادت دی تو ہم بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ان کے ایمان لانے کی توقع ہوتی تو قصی کو زندہ کرنا کچھ دشوار نہ تھا۔ لیکن ان کی ہٹ دھرمی اور اسلامی دشمنی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اگر قصی کو زندہ کر بھی دیا جائے اور وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق بھی کردے اور وہ اس کو آنکھوں سے دیکھ لیں اور اس کی شہادت کو اپنے کانوں سے سن بھی لیں تو پھر بھی پیٹھ پھیر دیں اور اپنے کفر و شرک سے ہی چمٹے رہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

سنت اللہ

اس آیت کریمہ میں ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جو ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ یہاں منافقین کی جس عادت بد کا ذکر فرمایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کے خیر سے محروم ہو گئے ہیں وہ ان کا نہ سننا ہے یا سن کر اثر قبول نہ کرنا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر انھیں سننے کی طرف مائل کر دے اور جو وہ سنیں ان کے دلوں میں اتار دے ؟ اس طرح سے وہ بنیادی رکاوٹ جو ان کی ہدایت کے راستے میں حائل ہے وہ دور ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے یا اس شبہ کو دور کرنے کے لیے اپنی ایک سنت اور قانون کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کو عقل اور قوت تمیز سے نوازا ہے پھر اس کی عقل کی رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاری ہیں جو ان کے سامنے حق اور باطل کو پوری طرح واضح کر کے رکھ دیتے ہیں۔ حق کا حق ہونا دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح مبرہن کر دیا جاتا ہے جس آدمی کی عقل ہر طرح کے ٹیڑھ، الجھن، آلودگی اور جانب داری سے پاک ہے اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا ہے کہ حق مجھ سے کس بات کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اسے حق کا ساتھ دے کر اللہ کے نبی پر ایمان لانا ہے یا باطل کا ساتھ دے کر خیر کی قوتوں کی مخالفت کرنی ہے۔ وہ اگر حق کی حمایت کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حواس اور اس کی عقل میں توفیق کا چراغ جلا دیتا ہے وہ حق کی بات کو سنتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ حق کے راستہ میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے باطل کا ساتھ دینا ہے اور خواہشات نفس کی پیروی کرنی ہے تو پروردگار اسے مہلت عمل دیتا ہے۔ اس کے نبی تبلیغ و دعوت میں تیزی پیدا کر دیتے ہیں لیکن جب وہ پوری طرح اپنے بارے میں ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے اندر خیر کی ہر قوت دم توڑ چکی ہے اور خیر کے سوتے خشک ہو چکے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اسے توفیق دینے کی بجائے اس کی محرومی کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ اگر اس نے خیر کی قوتوں کو مفلوج نہ کر دیا ہوتا اور بھلائی کے سوتے خشک نہ ہو گئے ہوتے تو ضرور اللہ تعالیٰ اسے حق کی آوز سناتا اور ضرور یہ حق کی آواز اس کے دل و دماغ میں اترتی لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس سے محروم کر چکا ہے۔ تو اب اگر اللہ تعالیٰ اسے زبردستی بھی سنائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی روگردانی میں اور اضافہ ہو گا۔ اس کو مثال میں یوں سمجھئے کہ جب کسی شخص کا معدہ خراب ہو جاتا ہے اور اس میں ہضم کرنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو آپ اسے جتنی بہتر سے بہتر غذا دینے کی کوشش کریں گے اتنا ہی معدہ اسے قبول کرنے سے انکار کرے گا۔ آپ اس کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے مرغن اور طاقت بخش غذائیں تجویز کریں گے لیکن اس کا معدہ چونکہ ہضم کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے اس لیے فوراً قے کر کے اسے نکال دے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مریض کی صحت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ جائے گی۔ (تفسیر روح القرآن)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا ارشاد سننے کے باوجود ایسا طرز حیات اختیار کرتے ہیں جیسا کہ انھوں نے اسے سنا ہی نہیں۔ ان کو جانوروں کے ساتھ تشبیہ دے کر فرمایا یہ عقل و فکر سے عاری ہیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۷۹ میں ان لوگوں کو جانوروں سے بدتر شمار کرتے ہوئے انھیں غافل قرار دیا گیا ہے۔ یہاں فرمایا ہے اگر اللہ تعالیٰ ان میں خیر کا جذبہ دیکھتا تو ان کو بات سننے، سمجھنے کی توفیق دیتا۔ کیونکہ یہ جانوروں کی طرح محض اپنے مالک کی آواز سنتے ہیں سمجھتے نہیں۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے۔ اسی لیے انھیں ہدایت سے نہیں نوازا گیا۔ ایسے لوگوں کو اگر

جبراً کوئی بات سنوائی جائے تو پھر بھی وہ اعراض کرنے والے ہوں گے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں آیا ہے کہ ان کے سروں پر پہاڑ بلند کیا گیا لیکن پھر بھی انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔
یہی حال ان لوگوں کا ہے جو جان بوجھ کر بات کو سننا اور اسے سمجھنا نہیں چاہتے لہٰذا اے مسلمانو! تم اس طرح کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کی بات کو قبول کرو۔ جب بھی تمہیں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلائے تم اس کی طرف دوڑتے ہوئے آؤ یہی تمہارے زندہ اور عقل مند ہونے کا ثبوت ہے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اللہ کے بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہونے کا یہ معنیٰ نہیں کہ بندہ ہدایت طلب کرنا چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ بندے اور ہدایت کے درمیان حائل ہو گیا ہے۔ اس فرمان کا مفہوم یہ ہے جب کوئی شخص ہدایت سے ارادۃً انحراف کرے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے ارادے کے مطابق اس کو ہدایت کی طرف نہیں آنے دیتا کیونکہ ہدایت خیر ہے اور خیر ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے طالب اور اس کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اسی بات کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوں بیان فرمایا۔

(عَنْ عَبْدَ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ یَقُوْلُ أَنَّہُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُوْلُ إِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ آدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ إِصْبَعَیْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کَقَلْبٍ وَّاحِدٍ یُصَرِّفُہُ حَیْثُ یَشَاءُ)

[رواہ مسلم: کتاب القدر، باب تصریف اللہ القلوب کیف شاء]

”حضرت عبداللہ بن عمرو بن (رض) عاص فرماتے ہیں کہ بلاشبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو انھوں نے یہ فرماتے سنا کہ آدم کی اولاد کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں جو ایک ہی دل کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جس طرح چاہتا ہے پھیرتا رہتا ہے۔“

(عَنْ أَنَسٍ (رض) قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یُکْثِرُ أَنْ یَّقُوْلَ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ) [رواہ الترمذی: کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمٰن]

”حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثر یہ دعا کرتے تھے۔ اے اللہ دلوں کو پھیرے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا۔“

(عن مُعَاوِیَۃَ یَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُوْلُ مَنْ یُّرِدُ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ)

[رواہ البخاری: کتاب العلم، باب مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ]

”حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں میں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ نے فرمایا اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔“ (تفسیر فہم القرآن)

نا اہل قوم

یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں کیونکہ حقیقی بھلائی انسان کو اس وقت ملتی ہے جب اس کے دل میں طلب حق کی سچی تڑپ اور نور ہدایت قبول کرنے کی لیاقت ہو۔ جو قوم طلب حق کی روح سے یکسر خالی ہو چکی اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں برباد کر چکی ہو، رفتہ رفتہ اس میں قبول حق کی لیاقت و استعداد بھی نہیں رہتی۔ اسی کو فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قبول خیر و

ہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی۔ اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ضرور ان کو اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا۔ باقی بحالت موجودہ اگر انھیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو یہ ضدی اور معاند لوگ سمجھ کر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں۔

رسول اللہ نے فرمایا تم میں سے بعض لوگ اہل جنت کے کام (ساری عمر کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اس وقت کتاب (لوح محفوظ) کا لکھا غالب آجاتا ہے اور وہ دوزخیوں کا کام کر کے دوزخ میں چلے جاتے ہیں، الخ (رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین عن عبداللہ بن مسعود (تفسیر مظہری) (تفسیر گلدستہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر اللہ کے علم میں ان میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ ان کو ضرور سنا دیتا، اور اگر (بالفرض) وہ ان کو سنا دیتا تو وہ ضرور اعراض کرتے ہوئے پشت پھیر لیتے۔

اللہ تعالیٰ کی معلومات واقعیہ اور اس کی معلومات فرضیہ

اس آیت کا لفظی معنی اس طرح ہے اگر اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم ہوتا تو وہ ان کو ضرور سنا دیتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم نہیں ہے اور اللہ کو جس چیز کے ہونے کا علم نہ ہو اس کا ہونا محال ہے، یعنی اللہ کو اس چیز کے متعلق یہ علم ہوگا کہ وہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی چیز فی نفسہ نہ ہو اور اللہ کو یہ علم ہو کہ وہ ہے تو یہ علم خلاف واقع ہوگا، اور جو علم خلاف واقع ہو وہ جہل ہوتا ہے، اور اللہ کے واقع کے مطابق ہے، لہٰذا جو چیز ہے اس کے متعلق اللہ کو علم ہوگا کہ وہ نہیں ہے، اور چونکہ ان میں کوئی خیر نہیں تھی اس لیے اللہ کو علم تھا کہ ان میں کوئی خیر نہیں ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے یوں تعبیر فرمایا کہ اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم ہوتا یعنی اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم نہیں ہے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم ہوتا تو وہ ان کو دین کے حق کے دلائل اور آخرت کے متعلق نصیحتیں سناتا اور ان کے ذہنوں اور دماغوں میں اس کی فہم پیدا کرتا، اور اگر وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ان میں کوئی خیر نہیں ہے اور وہ دلائل اور نصائح سے کوئی نفع حاصل نہیں کریں گے، پھر بھی ان کو دلائل اور نصائح سنا دیتا تو وہ ضرور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ پھیر لیتے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی معلومات کی چار قسمیں ہیں۔

(1) تمام موجودات

(2) تمام معدومات

(3) اگر ہر موجود نہ ہوتا تو اس کا کیا حال ہوتا

(4) اگر ہر معدوم موجود ہوتا تو اس کا کیا حال ہوتا۔

پہلی دو قسموں کا علم واقع کا علم اور بعد کی دو قسموں کا علم فروضات کا علم ہے اور یہ واقعات کا علم نہیں ہے۔ اس کی نظیر قرآن مجید میں منافقین کے متعلق یہ آیت ہے: "

الم تر الى الذین نافقوا یقولون لاخوانهم الذین کفروا من اهل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا وان قوتلتم لننصرنکم واللہ یشھد انھم لکذبون۔ لئن اخرجوا لا یخرجون معھم ولئن قوتلوا لا ینصرونھم ولئن نصروھم لیولن الادبار ثم لا ینصرون:

کیا آپ نے ان منافقوں کو نہ دیکھا جو اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم کو نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور تمہارے متعلق ہم کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے قتال کیا گیا تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے اور تم سے قتال کیا گیا تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ (منافق) یقیناً جھوٹے ہیں۔ اگر وہ (اہل کتاب) نکالے گئے تو منافق ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے قتال کیا گیا تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر ان کی کہیں سے مدد نہیں کی جائے گی" (الحشر: 11-12)

اس آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ اگر منافقوں نے اہل کتاب کی مدد کی تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے یہ مفروضات کا علم ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ منافقین کا یہ کہنا جھوٹ ہے کہ وہ اہل کتاب کی مدد کریں گے تو ان کا اہل کتاب کی مدد کرنا محال ہے۔ اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بر سبیل فرض فرمایا ہے کہ اگر انھوں نے ان کی مدد کی تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

اور مفروضات کے علم کی دوسری مثال یہ آیت ہے: "ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنه: اور اگر (بالفرض) یہ کافر دنیا میں دوبارہ بھیج دیے گئے تو پھر یہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا" (الانعام: 28)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اگر معدوم چیز موجود ہو جائے تو اس کا کیا حال ہوگا اور یہ ایک فرضی چیز کی مثال ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 470-471، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں اس کی اور بھی مثالیں ہیں۔

"قل ان کان للرحمن ولد فانا اول العابدین: آپ کہیے اگر (بالفرض) رحمان کا بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے میں اس کی عبادت کرنے والا ہوتا" (الزخرف: 81)۔ اس آیت میں معدوم چیز کا حال بیان فرمایا ہے اور یہ بھی فرضی چیز کا علم ہے۔

"لو کان فیھما الھة الا اللہ لفسدتا: اگر زمین و آسمان میں (بالفرض) اللہ کے سوا اور بھی خدا ہوتے تو آسمان اور زمین کا نظام الٹ پلٹ ہو جاتا"۔

"فان کنت فی شك مما انزلنا الیك فسئل الذین یقرءون الکتب من قبلك: پس اگر (بالفرض) آپ کو اس چیز کے متعلق شک ہو جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں" (یونس: 94)

آپ کا قرآن مجید میں شک کرنا معدوم ہے لیکن بالفرض اگر اس کا وقوع ہو تو اس کا حال بیان فرمایا ہے۔ "لئن اشرکت لیحبطن عملك: اگر (بالفرض) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے۔ (الزمر: 65)"

آپ کا شرک کرنا محال ہے لیکن بہ فرض وقوع اس کا حال بیان فرمایا ہے۔

قرآن مجید میں اس طرح کی اور بھی بہت مثالیں ہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○24

لغۃ القرآن: [يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو ! جو] [اٰمَنُوا : ایمان لائے][اسْتَجِيْبُوْا : تم لوگ حکم مانو] [لِلّٰهِ : اللہ کا] [وَلِلرَّسُوْلِ : اور ان رسول کا] [اِذَا : جب بھی] [دَعَاكُمْ : وہ بلائیں تم کو] [لِمَا : اس کے لیے جو] [يُحْيِيْكُمْ : زندگی دیتی ہے تم کو] [وَاعْلَمُوْٓا : اور جان لو] [اَنَّ : کہ] [اللّٰهَ : اللہ] [يَحُوْلُ : حائل کردیتا ہے] [بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ : آدمی اور اس کے دل کے درمیان] [وَاَنَّهٗٓ: اور حقیقت تو یہ ہے کہ] [اِلَيْهِ : اس کی طرف] [تُحْشَرُوْنَ : تم اکٹھے جاؤگے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! جب (بھی) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں کسی کام کے لیے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے تو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرمان بر داری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے (فوراً) حاضر ہو جایا کرو، اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے قلب کے درمیان (شانِ قربت خاصہ کے ساتھ) حائل ہوتا ہے اور یہ کہ تم سب (بالآخر) اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے

تشریح:

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا مکرر حکم دینے کے بعد اس کی حکمت بھی بیان فرمادی کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب رسول ﷺ جس چیز کی طرف انہیں دعوت دے رہا ہے وہ تمہارے مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور تمہاری جاں بلب روحوں کو تازگی و نشاط عطا فرمانے والی ہے۔ اذا دعا کم کا فاعل حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات ہے۔ لما میں لام بمعنی الی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی روشن اور سچی کتاب تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سنت نبوی ہی تمہاری زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اسی کی پیروی میں تمہاری بقاء و دوام کا راز مضمر ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بھی بلائیں تو ان کی بارگاہ میں حاضر ہونا ضروری ہی:-

اس آیت سے ثابت ہوا کہ تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بھی کسی کو بلائیں تو اس پر لازم ہے کہ وہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائے چاہے وہ کسی بھی کام میں مصروف ہو۔

حدیث مبارکہ میں ہے، حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت اُبَی بن کعب (رض) کی طرف تشریف لائے اور انھیں آواز دی "اے اُبَی! حضرت اُبَی (رض) نماز پڑھ رہے تھے، انھوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا، پھر مختصر نماز پڑھ کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہ" رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "وَعَلَیْکَ السَّلَامُ" اے اُبَی! جب میں نے تمھیں پکارا تو جواب دینے میں کونسی چیز رکاوٹ بنی۔ عرض کی: یارسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "کیا تم نے قرآن پاک میں یہ نہیں پایا کہ

"اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ"

ترجمہ کنزالعرفان: اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ جب وہ تمھیں اس چیز کے لیے بلائیں جو تمھیں زندگی دیتی ہے۔

عرض کی: ہاں یارسول اللہ! اِنْ شَآءَ اللہ عَزَّوَجَلَّ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ (1)

{لِمَا يُحْيِيكُمْ: اس چیز کے لیے جو تمھیں زندگی دیتی ہے۔} زندگی دینے والی چیز کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے ایمان مراد ہے کیونکہ کافر مردہ ہوتا ہے ایمان سے اس کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت قتادہ (رض) فرماتے ہیں کہ وہ چیز قرآن ہے کیونکہ اس سے دلوں کی زندگی ہے اور اس میں نجات ہے اور دونوں جہان کی حفاظت ہے۔ حضرت محمد بن اسحاق (رح) فرماتے ہیں کہ وہ چیز جہاد ہے کیونکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ ذلت کے بعد عزت عطا فرماتا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ چیز شہادت ہے، کیونکہ شہداء اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے پاس زندہ ہیں اور انھیں رزق دیا جاتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

ابو سعید بن معلیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پاس سے گزرے اور مجھے بلایا۔ میں نے نماز پڑھی اور آپ کے پاس حاضر ہوا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: کس چیز نے تمھیں میرے پاس حاضر ہونے سے روکا؟ میں نے عرض کیا: میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اے ایمان والو! جس وقت تمھیں اللہ اور اس کا رسول بلائے تو فوراً حاضر ہو جاؤ۔

(ابوداؤد: ۱۴۵۸: کتاب الصلوٰۃ: باب ۳۵۱)

فقہائے کرام نے اس آیت اور حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو بلائیں تو اس پر واجب ہے کہ وہ نماز چھوڑ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنا ہے۔ (تفسیر روح المعانی) ویسے بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سلام کرنا نماز کا حصہ ہے جیسا کہ ہر نمازی اپنی نماز کے دوران نبی کریم کو مخاطب کر کے "السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہتا ہے۔

(خصائص کبریٰ: جلد دوم: ص ۲۳۵)

ام المومنین حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس کو قے آئے، نکسیر پھوٹے یا مذی نکلے تو وہ چلا جائے، وضو کرے، پھر اپنی پہلی نماز پر بنا کرے بشرطیکہ اس نے اس دوران کسی سے کلام نہ کیا ہو۔ (ابن ماجہ: ابواب اقامۃ الصلوٰۃ: باب ۱۳۷) اس سے معلوم ہوا کہ اگر دوران نماز کسی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ وضو کر کے اپنی پہلی نماز کو جاری رکھ سکتا ہے نئے سرے سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں بشرطیکہ اس نے کسی سے بات نہ کی ہو، مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کسی کو بلائیں، وہ نماز چھوڑ کر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور آپ سے گفتگو کرے تو بھی اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سلام کرنا پہلے ہی نماز کا حصہ ہے۔

ارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اور تعظیم میں حکمت یہ ہے کہ ان کی اطاعت تمہارے دل، روح اور ایمان کو زندگی اور تازگی عطا فرماتی ہے۔ علامہ ثناء اللہ عثمانی لکھتے ہیں: ہر بات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت دل کو زندہ کرتی ہے اور ان کی نافرمانی دل کو مردہ بنا دیتی ہے۔ (تفسیر مظہری) نیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت غیر مشروط ہے یعنی ان کے ہر حکم کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھا جائے کیونکہ "وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ وہ (ان کی ہر بات) تو وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے"۔ (قرآن: ۵۳: ۴۔۳)

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت نہیں کرتے انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ وہ ہماری شہ رگ اور ہمارے دلوں سے بھی ہمارے زیادہ قلوب ہے، وہ ہمارے دلوں کے ارادے بھی جانتا ہے اور ان کو بدلنے کی طاقت بھی رکھتا ہے، اس کا حکم اگر انسان اور اس کے دل کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جائے تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا، لہٰذا ہم سب کو اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار بنانے کی فکر کرنی چاہیے بالآخر سب کو ایک دن اسی کی بارگاہ میں اکٹھا ہونا ہے۔

شہر بن حوشب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ام سلمہ (رض) سے پوچھا: اے ام المومنین! جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے پاس ہوتے تو وہ زیادہ کس چیز کی دعا مانگتے۔ ام المومنین ام سلمہ (رض) نے فرمایا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثر دعا کرتے تھے: "**یامقلب القلوب! ثبت قلبی علی دینك**" (اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بہت زیادہ دعا کرتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے ام سلمہ! ہر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے وہ جس دل کو چاہتا ہے سیدھا رکھتا ہے اور جس دل کو چاہتا ہے ٹیڑھا کر دیتا ہے، پھر حدیث کے راوی نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت نمبر ۸ تلاوت کی یعنی اے ہمارے رب! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔۔ (ترمذی: کتاب الدعوات: باب ۹۰) ہمیں بھی یہ دعا کثرت سے مانگنی چاہیے اور اس کے تقاضوں کے مطابق عملی اقدامات کی کوشش کرنی چاہیے۔ (تفسیر امداد الکرم)

صحابہ کرام (رض) پر لازم تھا کہ نماز کو درمیان میں چھوڑ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات سنیں

یاد رہے چونکہ اس آیت میں حکم ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بلانے پر فورا حاضر ہوا جائے اس لیے آپ کی ظاہری زندگی میں صحابہ کرام (رض) پر لازم تھا کہ خواب ہوں نماز میں ہوں جب آپ انھیں بلائیں تو نماز چھوڑ کر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں۔

حضرت سعید بن معلیٰ (رض) سے روایت ہے کہتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا۔ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے قریب سے گزرے اور مجھے بلایا میں حاضر نہ ہوا۔ میں نے نماز مکمل کی اور حاضر ہو گیا۔ آپ نے فرمایا:

مامنعك ان تاتيني الم يقل الله استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم۔ تم میرے بلانے پر فوراً کیوں نہ آئے؟ کیا تم نے یہ آیت نہیں سنی استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم الخ۔ پھر آپ نے مجھے سورۃ فاتحہ سکھلائی۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ انفال باب 6)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہتے ہیں

حضرت ابی بن کعب (رض) نماز پڑھ رہے تھے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے قریب سے گزرے۔ آپ نے انھیں بلایا وہ جلدی جلدی نماز مکمل کر کے حاضر ہو گئے عرض کیا االسلام علیک یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا وہ علیک السلام۔ پھر فرمایا اے ابی جب میں نے تمہیں بلایا تھا تو تم کیوں میرے پاس نہ آئے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے میری طرف جو کتاب اتاری ہے اس میں تم نے یہ نہیں دیکھا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ انھوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیکھا ہے اور انشاء اللہ میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ اس کے بعد نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ایسی صورت سکھا ہو جس کی مثل نہ توراۃ میں ہے نہ انجیل میں نہ زبور میں اور نہ قرآن میں اس کی مثل کوئی سورت اتاری گئی ہے۔ (ترمذی کتاب فضائل القرآن حدیث (2875

امام بدرالدین عینی علیہ الرحمہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

یہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیت ہے کہ آپ کے بلانے پر نماز چھوڑ کر حاضر ہونا ضروری ہے۔ (عینی شرح بخاری جلد 18 صفحہ 81 مطبوعہ دارالفکر بیروت)

امام شرف الدین حسین محمد طیّبی شرح مشکاۃ المصابیح میں فرماتے ہیں:

اگر کوئی صحابی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم پر نماز چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا اور آپ کا حکم پورا کرے تو بھی اس کی نماز نہیں ٹوٹتی جیسا کہ آپ کو نماز میں السلام علیک ایھا النبی کے ذریعے سلام کہنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ (طیّبی شرح مشکوۃ جلد 4 صفحہ 322 مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی) ملا علی قاری نے بھی اس قول سے موافقت کی ہے۔

تعظیم رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معاملہ ہر عبادت سے بلند تر ہے

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ تعظیم واحترام رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معاملہ ہر فرض سے بڑا فرض ہے، کیونکہ دین میں نماز سب سے بڑا فرض ہے، مگر یہاں صحابہ کو نماز چھوڑ کر حاضر دربار رسالت ہونے کا حکم فرمایا گیا۔ اس لیے سیدنا حضرت علی المرتضٰی (رض) عنہٗ نے آرام رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نماز عصر قربان کردی (مواہب لدنیہ جلد 2 صفحہ 528)۔ حضرت سیدنا عثمان غنی (رض) عنہٗ نے احترام رسول میں محرم ہونے اور مسجد حرام میں ہونے کے باوجود طواف سے انکار کردیا۔ (مدارج النبوت جلد 2 صفحہ 343) اسی لیے امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

مولا علی نے واری تیری نیند پر نماز اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے

صدیق بلکہ غار میں جان اپنی دے چکے اور حفظ جاں تو جان فروض غرر کی ہے

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے (تفسیر برہان القرآن)

فرض نماز میں بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بلانے پر حاضر ہونا واجب ہے، اور نفل نماز میں ماں کے بلانے پر

جب کوئی شخص نفل نماز پڑھ رہا ہو اور اس کی ماں اس کو نماز میں بلائے تو اس پر واجب ہے کہ نماز توڑ کر ماں کے بلانے پر حاضر ہو جائے البتہ باپ کے بلانے پر نفل نماز نہ توڑے۔

امام بیہقی نے مکحول سے روایت کیا ہے کہ جب تمہاری ماں تمہیں اس حال میں بلائے کہ تم نماز پڑھ رہے ہو تو اس کے پاس حاضر ہو، اور جب تمہیں تمہارا باپ بلائے تو حاضر نہ ہو حتیٰ کہ تم نماز سے فارغ ہو جاؤ (شعب الایمان، رقم الحدیث: 7883۔ الدر المنثور، ج 4، ص 174، طبع قدیم، مطبعہ المیمنہ، مصر، 1314ھ)

امام ابن ابی شیبہ نے محمد بن المنکدر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تمہاری ماں تم کو نماز میں بلائے تو اس کی خدمت میں حاضر ہو اور جب تمہارا باپ بلائے تو حاضر نہ ہو۔ (الکتاب المصنف ج 2، ص 193، رقم الحدیث: 8013، امام ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو مکحول سے بھی روایت کیا ہے، رقم الحدیث: 8014، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1416ھ)

اور فرض نماز میں سوائے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اور کسی کے بلانے پر جانا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بلانے پر حاضر ہونے کی دلیل مذکور الصدر قرآن مجید کی آیت ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

مسلمانوں کے حق میں کیا چیز حیات آفریں ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہارے لیے حیات آفریں ہو، مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے لیے حیات آفریں ہے۔

مجاہد نے کہا اس سے مراد حق ہے۔ قتدہ نے کہا اس سے مراد قرآن ہے اس میں حیات اور عفت ہے اور اس میں دنیا اور آخرت کے فتنوں سے حفاظت ہے۔ ابن اسحاق نے کہا اس سے مراد جہاد ہے۔ کیونکہ جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ذلت کے بعد عزت اور ضعف کے بعد

قوت عطا کی، اور جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں کے خلاف جارحیت سے روکا۔ امام ابن جریر کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں حق کو مراد لینا اولیٰ ہے، کیونکہ دشمن کے خلاف جہاد کرنے کے حکم کو ماننا بھی حق میں داخل ہے، اور قرآن کے حکم پر عمل کرنا بھی حق میں داخل ہے اور حق کو قبول کرنے میں ہی قبول کرنے والے کی حیات ہے، کیونکہ دنیا میں اس کا ذکر جمیل باقی رہے گا اور اس میں بی اس کی حیات ہے اور آخرت میں اس کو جنتوں میں دائمی حیات حاصل ہو گی۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کو ان کے اسلام لانے کے بعد قبول حق پر برقرار رہنے کی تلقین فرماتے تھے کیونکہ آپ کے تمام احکام حق تھے اور حضرت ابوسعید بن معلیٰ اور حضرت ابی بن کعب جن کو آپ نے بلا کر یہ آیت سنائی تھی وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ (جامع البیان، جز 9، ص 283۔282، ملخصاً مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)

انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ کے حائل ہونے کے محامل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ حائل ہے۔ اس کی تفسیر میں بھی متعدد اقوال ہیں:

سعید بن جبیر نے کہا اللہ، کافر اور اس کے ایمان لانے کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مومن اور اس کے کفر کرنے کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا کافر اور اس کے ایمان اور اللہ کی اطاعت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ ضحاک نے کہا کافر اور اس کی اطاعت اور مومن اور اس کی معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ امام ابن جریر کی رائے یہ ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس آیت میں اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ بندوں سے زیادہ ان کے دلوں کا مالک ہے اور جب بندے کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ ان کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی شخص ایمان لا سکتا ہے نہ کفر کر سکتا ہے، نیک کام کر سکتا ہے نہ گناہ کر سکتا ہے۔ (جامع البیان جز 9، ص 284۔287، ملخصاً مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

انسان اور اس کی موت کے درمیان اللہ حائل ہو جاتا ہے اور انسان سے جو کام رہ گئے ہوں وہ ان کی تلافی نہیں کر پاتا۔ کہا گیا ہے کہ جنگ بدر کے دن مسلمان، کفار کی کثرت سے خوف زدہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے وہ ان کے دل کو خوف کے بعد بے خوفی سے بدل دے گا۔ امام ابن جریر کا یہی مختار ہے کہ انسان کے دلوں کا اللہ زیادہ مالک ہے اور وہ اس کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے، ایمان نہ کفر، نیکی نہ گناہ۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 249، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

انسان اور اس کی موت کے درمیان اللہ حائل ہو جاتا ہے اور انسان سے جو کام رہ گئے ہوں وہ ان کی تلافی نہیں کر پاتا۔ کہا گیا ہے کہ جنگ بدر کے دن مسلمان، کفار کی کثرت سے خوف زدہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے وہ ان کے دل کو خوف کے بعد بے خوفی سے بدل دے گا۔ امام ابن جریر کا یہی مختار ہے کہ انسان کے دلوں کا اللہ زیادہ مالک ہے اور وہ اس کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے، ایمان نہ کفر، نیکی نہ گناہ۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 249، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ جب سب کچھ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے تو نیک کاموں پر انسان مدح اور ثواب کا اور برے کاموں پر مزمت اور سزا کا کیوں مستحق ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشیت کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندے اپنے اختیار اور ارادہ سے کیا کریں گے اور کیا نہیں کریں گے اور اللہ کے اسی علم کا نام تقدیر ہے۔ اللہ اپنے اس علم کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

بنو آدم کے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے کا معنی

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثریوں قسم اٹھاتے تھے لا ومقلب القلوب دلوں کو الٹنے پلٹنے والے کی قسم۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 7391۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 1540۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 3771، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 2092۔ مسند احمد ج 2، ص 25، طبع قدیم، رقم الحدیث : 4788، طبع جدید، سنن دارمی، رقم الحدیث : 2355)

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 279ھ روایت کرتے ہیں :

شہر بن حوشب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ام سلمہ (رض) سے پوچھا یا ام المومنین ! جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے پاس ہوتے ہیں تو وہ زیادہ تر کس چیز کی دعا کرتے ہیں۔ حضرت ام المومنین نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زیادہ تر یہ دعا فرماتے ہیں یا مقلب القلوب ! میرے قلب کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ آپ کس قدر زیادہ یہ دعا کرتے ہیں یا مقلب القلب ثبت قلبی علی دینک ! آپ نے فرمایا اے ام سلمہ ! ہر آدمی کا دل اللہ کی انگلیں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے وہ جس دل کو چاہتا ہے سیدھا رکھتا ہے اور جس دل کو چاہتا ہے ٹیڑھا کردیتا ہے۔ پھر حدیث کے راوی نے یہ آیت تلاوت کی ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا (آل عمران : 8) اے ہمارے رب ہمیں ہدایت یافتہ کرنے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹڑھا نہ کرنا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 3522، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 2834، صحیح ابن حبان رقم الحدیث : 943، مسند احمد ج 4، ص 182، مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث : 29188، مطبوعہ بیروت، الشریعہ للاجری، ص 387۔ 386۔ المعجم الکبیر للطبرانی، ج 1، رقم الحدیث : 759، ج 7، رقم الحدیث : 7232، ج 23، رقم الحدیث : 772، ج 23، رقم الحدیث : 785، ج 23 رقم الحدیث : 865، مجمع الزوائد ج 7، ص 210، ج 10 ص 176۔ المطالب العالیہ، رقم الحدیث : 462، 4940۔ کنزالعمال، رقم الحدیث : 1682، 1684، 1687، 1694، موارد الظمآن، رقم الحدیث : 2419، المستدرک، ج 2، ص 289، 288)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی 852ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

دلوں کو الٹ پلٹ کرنے سے مراد ہے دل کے اعراض اور احوال کو الٹ پلٹ کرنا، دلوں کی ذوات کو الٹ پلٹ کرنا مراد نہیں ہے، اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ کسی فعل کا داعی، محرک اور باعث اور کسی فعل کا ارادہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ (فتح الباری ج 11، ص 527، مطبوعہ لاہور، 1401ھ)

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں : قرآن مجید میں ہے : " ونقلب افئدتھم وابصارھم :

ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں " (110)۔

یعنی ہم جس طرح چاہتے ہیں ان کے دلوں میں تصرف کرتے ہیں۔ معتزلہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پس وہ ایمان نہیں لائیں گے اور مہر لگانے کا ان کے نزدیک یہ معنی ہے کہ ہم ان کے دلوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ جو چاہیں اپنے لیے اختیار کریں۔ اور لغت عرب کے اعتبار سے تقلیب کا یہ معنی صحیح نہیں ہے اور طبع (مہر لگائے) کا معنی ترک کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اہل سنت کے نزدیک طبع (مہر لگانے) کا معنی ہے کافر کے دل میں کفر پیدا کرنا اور موت تک اس کو اسی حال پر برقرار رکھنا۔ اور حدیث میں ہے اللہ جس طرح چاہتا ہے اپنے بندوں کے دلوں پر تصرف فرماتا ہے۔ حافظ عسقلانی نے یہ روایت بالمعنی کی ہے۔ اصل حدیث اس طرح ہے : حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تمام بنو آدم کے قلوب رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک قلب کی طرح ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف فرماتا ہے۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے مصرف القلوب ! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ (صحیح مسلم القدر، 17، (2654) 6626۔ السنن الکبری للنسائی ج 4، رقم الحدیث : 7861)

قاضی بیضاوی نے کہا دلوں کو الٹ پلٹ کرنے کی اللہ کی طرف نسبت کرنے میں یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں پر تصرف فرماتا ہے اور اس نے یہ تصرف اپنی مخلوق میں سے کسی کے سپرد نہیں کیا، اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو یہ دعا فرماتے تھے یا مقلب القلوب ! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ اس دعا میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں کے دلوں پر تصرف فرماتا ہے یہ تصرف اس کے تمام بندوں کو شامل ہے حتی کہ انبیاء (علیہم السلام) کو بھی شامل ہے اور کسی وہم کرنے والے کے اس وہم کو دفع کیا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) اس تصرف سے مستثنیٰ ہیں اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خصوصاً اپنے دل کو دین پر ثابت رکھنے کی دعا فرمائی اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پاکیزہ ترین دل بھی اللہ سبحانہ کی پناہ لینے کا محتاج ہے تو دوسرے لوگ جو آپ سے کہیں کم رتبہ کے ہیں وہ اس دعا کرنے کے کس قدر زیادہ محتاج ہوں گے (فتح الباری، ج 13، ص 377، مطبوعہ لاہور، 1401 ھ)

رحمان کی دو انگلیوں سے کیا مراد ہے

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی 656 ھ لکھتے ہیں :

انگلی کے ظاہر معنی کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنا محال ہے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کے اعضاء ہوں تو اس کا ہر جز دوسرے جز کی طرف محتاج ہوگا اور وہ مجموعہ مفتقر اور حادث ہوگا اور یہ الوہیت کے منافی ہے، اور بعض ائمہ نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مجاز بالاستعارہ ہے جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو میری ہتھیلی میں ہے اور فلاں شخص تو میری مٹھی میں ہے اور اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص پر میں قادر ہوں اور متصرف ہوں اور میں جس طرح چاہوں اس پر تصرف کر سکتا ہوں اور جب اس سے بھی زیادہ مبالغہ کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو میری دو انگلیوں میں ہے یعنی میں بہت آسانی سے اس پر تصرف کر سکتا ہوں، اور بعض علماء نے کہا اس انگلی سے مراد نعمت کو بھی لیا جا سکتا ہے جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی میرے نزدیک اچھی انگلی ہے، یعنی اس کی مجھ پر ایک نعمت ہے جیسا کہ ہاتھ سے نعمت مراد لیتے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو بیشمار ہیں تو یہاں صرف دو انگلیوں کا ذکر کیوں فرمایا ہے جس سے دو نعمتیں متبادر ہوتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہرچند کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بیشمار ہیں لیکن وہ سب نعمتیں دو قسم کی ہیں ایک قسم ہے نفع پہنچانا اور دوسری قسم ہے ضرر دور

کرنا۔ گویا کہ یوں کہا گیا کہ تمام بنو آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کے تحت تصرف ہیں وہ جس سے چاہے ضرر دور فرمائے اور جس کو چاہے نفع پہنچائے، میں کہتا ہوں اس طور پر یہ جواب اس وقت درست ہوگا جب بنو آدم سے مراد صالحین ہوں، جن کے دلوں کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ متکفل ہے۔ باقی رہے کفار اور فساق تو اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے، ان میں تصرف فرماتا ہے۔ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے یا زنگ لگا دیتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ حدیث مقصود سے خارج ہوگی۔ اس لیے پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ حدیث کو تسلیم کرنے میں سلامتی ہے۔ (یعنی انگلی کی کوئی تاویل نہ کی جائے)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! مصرف القلوب! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ اس سے پہلی تاویل کی تائید ہوتی ہے یعنی تمام بنو آدم کے دلوں کا رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہونا اس معنی ہے کہ وہ تمام بنو آدم کے دلوں پر بہت آسانی سے تصرف کرتا ہے۔ (المفہم ج 6، ص 672۔673، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، اکمال اکمال المعلم ج 9، ص 27۔28، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ نووی شافعی متوفی 676ھ نے اس حدیث کے دو جواب دیے ہیں ایک تو یہی جواب دیا کہ دو انگلیوں سے مراد قدرت اور تصرف ہے اور دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث پر بغیر کسی تاویل اور توجیہ کے ایمان لانا چاہیے اور یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ یہ حق ہے اور اس کا ظاہر معنی مراد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "لیس کمثلہ شیء: اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے" (الشوریٰ: 11)۔ (صحیح مسلم مع شرحہ للنواوی، ج 10، ص 6710، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ)

میں کہتا ہوں کہ یہی جواب صحیح ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ رحمان کی انگلیاں ہیں اور وہ انگلیاں مخلوق کی انگلیوں کی مثل نہیں ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم اس میں اپنی طرف سے کوئی تاویل اور توجیہ نہیں کرتے، نہ ان کا معنی بیان کرتے ہیں نہ ان کی کیفیت کو ہم جانتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ (رح) متوفی 150ھ فرماتے ہیں:

اللہ کا ہاتھ ہے اور اس کا چہرہ ہے اور اس کا نفس ہے اور قرآن مجید میں اللہ کے چہرے، اس کے ہاتھ اور اس کے نفس کا جو ذکر ہے، وہ اس کی بلا کیف صفات ہیں اور یہ تاویل نہ کی جائے کہ ہاتھ سے اس کی قدرت ہے یا اس کی نعمت ہے، کیونکہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت کو باطل کرنا ہے اور یہ قدریہ اور معتزلہ کا قول ہے، لیکن اس کا ہاتھ اس کی بلا کیف صفت ہے اور اس کا غضب اور اس کی رضا بھی اس کی بلا کیف صفات ہیں۔ (الفقہ الاکبر مع شرح الفقہ الاکبر ص 36۔37، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر) (تفسیر تبیان القرآن)

افسوس آج ملت کے چند بہی خواہ ہمیں یہ کہہ کر سنت رسول کریم سے برگشتہ کر رہے ہیں کہ اطاعت رسول ہی وہ زنجیر ہے جس نے امت کے ہاتھ پاؤں کو مقید کر رکھا ہے۔ یہی وہ افیون ہے جس نے اس کے قوائے فکر کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور یہی وہ اغلال و سلاسل ہیں جن کے توڑنے کا ہمیں حکم ملا تھا لیکن عجمی سازشیوں (یعنی محدثین کرام) کے فریب میں آکر ان کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو ہم نے مژگان عقیدت سے چن کر پھر اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ آپ خود فیصلہ فرمایئے کہ سنت نبوی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اور قرآن کا فرمان قابل تسلیم ہے۔ یا ان بہی خواہان امت کا جو اپنے عہد کے بدترین اور کامل ترین حاکم پرست ہونے کے باوجود ان مردان احرار کو حکومت وقت کے نمک خوار کہتے ہوئے نہیں شرماتے جن کے نعرہ ہائے حق سے بارہا ظلم واستبداد کے ایوانوں کی بنیادیں لرز اٹھی تھیں۔ صاحب تفسیر مظہری رقمطراز ہیں۔ فان طاعۃ الرسول فی کل امر یحی القلب وعصیانہ یمیتہ کہ ہر بات میں سنت نبوی کی اطاعت سے دل زندہ ہوتا ہے۔ اور اس کی نافرمانی سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم اس طوفان خیز دور میں اپنے چراغ ایمان کو روشن رکھ سکیں اور اطاعت حبیب خدا سے اپنے مردہ دلوں کو

زندہ کر سکیں۔ آمین ثم آمین۔ امام بخاری (رح) نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ حضرت ابی سعید بن المعلیٰ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے یاد فرمایا۔ نماز ختم کرنے کے بعد میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اے حبیب الہٰ! جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس غلام کو یاد فرمایا میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اب فارغ ہو کر حاضر بارگاہ ہو گیا ہوں۔ حضور نے فرمایا اے ابا سعید! کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں پڑھا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعا کم لما یحییکم جس وقت تمہیں اللہ اور اس کا رسول بلائے فوراً حاضر ہو جاؤ فقہاء کرام نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور حضور اسے بلائیں تو وہ حاضر خدمت ہو جائے اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی۔ اجابۃ الرسول لایقطع الصلوٰۃ (مظہری)

یہاں ایک نکتہ اور بھی غور طلب ہے۔ قاعدہ کے مطابق یہاں تثنیہ کا صیغہ دعوا ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ ضمیر فاعل کا مرجع اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول دونوں ہیں اور دو کے لیے تثنیہ کا صیغہ ہوتا ہے۔ یہاں واحد کا صیغہ دعا کا ذکر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی دعوت الگ الگ دعوتیں نہیں بلکہ ایک ہی دعوت ہے اس لیے یہاں تثنیہ کی ضرورت نہیں واحد کا صیغہ ہی کافی بلکہ مناسب ہے۔

انسان کتنا ہی دانشمند اور طاقتور کیوں نہ ہو اگر اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے ارادے میں حائل ہو جائے تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ دل کی قلمرو میں اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ چاہے تو نور عرفان سے اسے درخشاں کر دے اور چاہے تو ہدایت کے سب چراغ بجھ جائیں اور گھپ اندھیرا ہو جائے۔ اسی لیے حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثر دعا فرمایا کرتے یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ اللہم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک: اے دلوں کے پھیرنے والے میرے خدا! ہمارے دلوں کو اپنی فرمان برداری کی طرف پھیر دے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝25

لغۃ القرآن: [وَاتَّقُوْا : اور تم لوگ بچو] [فِتْنَةً : ایک ایسی آزمائش سے جو] [لَّا تُصِيْبَنَّ : ہرگز نہیں پہنچے گی] [الَّذِيْنَ : (صرف) ان لوگوں کو (ہی) جنھوں نے] [ظَلَمُوْا : ظلم کیا] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [خَآصَّةً : خاص کرنیوالی ہوتے ہوئے] [ۚوَاعْلَمُوْٓا : اور جان لو] [اَنَّ : کہ] [اللّٰهَ : اللہ] [شَدِيْدُ : سخت] [الْعِقَابِ : سزا دینے والا ہے]

ترجمہ: اور اس فتنہ سے ڈرو جو خاص طور پر صرف ان لوگوں ہی کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں (بلکہ اس ظلم کا ساتھ دینے والے اور اس پر خاموش رہنے والے بھی انہی میں شریک کر لیے جائیں گے)، اور جان لو کہ اللہ عذاب میں سختی فرمانے والا ہے

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس بات سے ڈرایا تھا کہ بنو آدم اور ان کے دلوں کے درمیان اللہ تعالیٰ حائل ہے اور اس آیت میں اللہ عَزَّوَجَلَّ نے مسلمانوں کو فتنوں، آزمائشوں اور عذاب سے ڈرایا ہے کہ اگر ظالموں پر عذاب نازل ہوا تو وہ صرف ظالموں تک ہی محدود نہ رہے گا بلکہ نیک و بد سب لوگوں پر یہ عذاب نازل ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا ہے کہ وہ اپنی طاقت و قدرت کے مطابق برائیوں کو روکیں اور گناہ کرنے والوں کو گناہ سے منع کریں اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو عذاب ان سب کو عام ہو گا اور خطاکار اور غیر خطاکار سب کو پہنچے گا۔ (تفسیر صراط الجنان)

وہ فتنہ کونسا ہے جس کی آگ جب بھڑک اٹھتی ہے تو سب خشک و تر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے؟ جس کا عذاب چند افراد تک محدود نہیں رہتا بلکہ ساری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ علماء کرام نے اس ضمن میں تین امور کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

ا۔ نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے منع کرنے سے رک جانا۔ جس قوم میں فسق و فجور کا بازار گرم ہو اور اعلیٰ الاعلان احکام شریعت کی خلاف ورزی کی جاتی ہو وہاں اہل علم اور ارباب اثر و اقتدار کا خاموشی اختیار کر لینا اور بدکاروں اور نافرمانوں کو ان کی بداعمالیوں سے نہ روکنا ایک ایسا فتنہ ہے جس کا وبال ساری قوم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایها الناس! مروا بالعروف وانهوا عن المنكر قبل ان تدعوا الله فلا يستجيب لكم وقيل ان تستغفروا فلا يغفر لكم الخ (مظہری) اے لوگو! نیکی کا حکم کیا کرو اور برائی سے روکا کرو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ پھر تم دعائیں مانگو اور وہ قبول ہی نہ فرماتے۔ تم استغفار کرو اور وہ تمہیں بخشے ہی نہیں۔

۲۔ ترک جہاد: جب کوئی قوم جہاد چھوڑ دیتی ہے اور اللہ کی راہ میں جان دینے سے اسے زندگی زیادہ عزیز معلوم ہوتی ہے۔ تو ساری قوم کی ذلت و غلامی کی بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔

۳۔ میدان جہاد سے فرار علماء کرام نے ان تین امور کو بطور مثال ذکر فرمایا ہے۔ حصر مقصود نہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

چونکہ گزشتہ رکوعات سے جہاد کی بات چل رہی ہے لہٰذا اس آیت کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ اے مومنو! اگر تم نے جہاد سے منہ موڑا تو تمہیں وہ فتنہ آ گھیرے گا جو صرف جہاد سے منہ مورنے والے ظالموں ہی کو نہیں بلکہ عورتوں بچوں سمیت تم سب کو گھیر لے گا۔ چنانچہ آج یہی کچھ ہو رہا ہے ہم نے جہاد کا راستہ ترک کیا تو کفار ہم پر اس قدر غالب آ گئے کہ آج عراق، افغانستان، کشمیر اور فلسطین میں امریکی اور اسرائیلی فوجیں مسلمان عورتوں اور بچوں تک کو مار رہی ہیں۔

اس کا دوسرا معنیٰ یہ کیا گیا کہ جب معاشرہ میں کئی لوگ برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہوں تو دوسرے لوگوں پر ضروری ہے کہ انہی امر بالمعروف نہی عن المنکر کریں، اگر وہ باوجود قدرت ایسا نہیں کریں گے تو عذاب کا فتنہ صرف ظالموں کو نہیں پہنچے گا بلکہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے سنا: "جب کسی قوم میں گناہ کیے جاتے ہوں اور اہل قوم ان کے روکنے پر قادر ہوں پھر نہ روکیں تو اللہ ان سب کو عذاب میں شامل کر دیتا ہے۔" (ابو داؤد کتاب الملاحم حدیث 4338) (تفسیر برہان القرآن)

ظالموں پر عذاب کے نزول میں صالحین کا شمول

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس بات سے ڈرایا تھا کہ بنو آدم اور ان کے دلوں کے درمیان اللہ حائل ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتنوں، آزمائشوں اور عذاب سے ڈرایا ہے کہ اگر ظالموں پر عذاب نازل ہوا تو وہ صرف ظالموں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ تم سب پر نازل ہوگا اور نیک لوگوں اور بدکاروں سب پر یہ عذاب نازل ہوگا۔

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس (رض) کا یہ قول روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان بدکاروں کو نہ رہنے دیں ورنہ اللہ تعالیٰ سب پر عذاب نازل فرمائے گا۔ (جامع البیان جز 7، ص 288، رقم الحدیث: 12345، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت زینب بنت جحش (رض) بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھبرائے ہوئے باہر نکلے آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ آپ فرما رہے تھے عرب والوں کے لیے اس شر سے ہلاکت ہو جو قریب آ پہنچا ہے، آج کا دن یاجوج ماجوج کے سوراخ کی وجہ سے فتح کر لیا گیا ہے، پھر آپ نے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر حلقہ بنایا اور فرمایا اس کی مثل۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہم ہلاک کر دیے جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک لوگ بھی ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں! جب بدکاری بہت زیادہ ہو جائے گی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3346۔ صحیح مسلم الفتن 2 (2880) 7104۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2187۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3953، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: 11311)

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی حدود قائم کرنے والے اور اللہ کی حدود کی خلاف ورزی کرنے والے (ترمذی کی روایت میں ہے اللہ کی حدود نافذ کرنے میں سستی اور نرمی کرنے والے) کی مثال اس طرح ہے کہ ایک قوم نے کشتی میں بیٹھنے کے لیے قرعہ اندازی کی، بعض لوگوں کے نام اوپر کی منزل کا قرعہ نکلا اور بعض لوگوں کے نام نچلی منزل کا۔ نچلی منزل والے پانی لینے کے لیے اوپر کی منزل پر گئے پھر انھوں نے کہا کہ اگر ہم کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے سمندر سے پانی لے لیں تو اوپر کی منزل والوں کو زحمت نہیں ہوگی۔ اگر اوپر کی منزل والوں نے ان کو اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو سب ڈوب کر ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انھوں نے ان کے ہاتھوں کو سوراخ کرنے سے روک دیا تو وہ بھی نجات پا لیں گے اور نچلی منزل والے بھی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2493، 2686۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2180۔ صحیح ابن حبان ج 1، رقم الحدیث: 297۔ مسند احمد ج 6، رقم الحدیث: 18389، طبع جدید۔ مسند احمد ج 4، ص 268۔ 270۔ 273، طبع قدیم، سنن کبری للبیہقی، ج 10، ص 288، 91)

حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس قوم میں گناہوں کے کام کیے جا رہے ہوں اور وہ ان گناہوں کو مٹانے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر نہ مٹائیں تو اللہ ان کو مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کی سند حسن ہے۔ (صحیح ابن حبان ج 1، رقم الحدیث : 300۔ سنن ابو داؤد ج 3، رقم الحدیث : 4339۔ سنن ابن ماجہ ج 2، رقم الحدیث : 4009۔ مسند احمد ج 4، ص 364۔ 366، طبع قدیم۔ المعجم الکبیر للطبرانی، ج 2، رقم الحدیث : 2382، 2383، ایک روایت میں ہے کہ جس قوم میں گناہ کیے جائیں، وہ قوم زیادہ اور غالب ہو پھر بھی مداہنت کرے اور خاموش رہے اور برائی کو بدلنے کی کوشش نہ کرے تو پھر ان سب پر عذاب آئے گا۔ المعجم الکبیر ج 2، رقم الحدیث : 2380۔ 2381۔ 2385۔ مسند احمد ج 4، ص 361۔ 363، طبع قدیم، سنن کبری للبیہقی، ج 10، ص 91)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات بیان کی جائے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(سنن ترمذی، ج 4، رقم الحدیث : 2181۔ سنن ابو داؤد ج 3، رقم الحدیث : 4344۔ سنن ابن ماجہ ج 2، رقم الحدیث : 4011۔ مسند البزار رقم الحدیث : 3313۔ مجمع الزوائد ج 7، ص 272)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی 279 ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : بنو اسرائیل میں سب سے پہلی خرابی یہ واقع ہوئی کہ ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کرکے یہ کہتا اے شخص ! اللہ سے ڈر، اور جو کام تو کر رہا ہے اس کو چھوڑ دے، کیونکہ یہ کام تیرے لیے جائز نہیں ہے۔ پھر جب دوسرے دن اس سے ملاقات کرتا، تو اس کا وہ کام اس کو اس کے ساتھ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے سے منع نہ کرتا۔ جب انھوں نے اس طرح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ایک جیسے کردیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا بنو اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ان برے کاموں سے نہیں روکتے تھے جو وہ کرتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ بہت برا کام تھا۔ (المائدہ : 78۔ 79)۔ پھر آپ نے فرمایا ہرگز نہیں ! بہ خدا تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا اور تم ضرور ظلم کرنے والے کے ہاتھوں کو پکڑ لینا، اور تم اس کو ضرور حق پر عمل کے لیے مجبور کرنا، ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک جیسے کردے گا پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی تھی۔

(سنن ابو داؤد ج 3، رقم الحدیث : 4336، 4337۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے، سنن ترمذی، ج 5، رقم الحدیث : 3058، 3059۔ سنن ابن ماجہ ج 2، رقم الحدیث : 4006۔ مسند احمد ج 1، ص 391، طبع قدیم، امام احمد کی سند میں انقطاع ہے اس لیے یہ سند ضعیف ہے، مسند احمد بتحقیق احمد شاکر، ج 4، رقم الحدیث : 3713، طبع دار الحدیث قاہرہ۔ المعجم الاوسط ج 1، رقم الحدیث : 523، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ امام طبرانی کی سند کے تمام راوی صحیح ہیں، مجمع الزوائد ج 7، ص 269)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اور یہود نے کہا اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، خود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، ان کے اسی قول کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ (الایہ) (المائدہ : 64)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو جو لوگ بھی اس قوم میں ہوں، ان سب کو عذاب پہنچتا ہے پھر ان کو ان کے اعمال کے مطابق اٹھایا جاتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 7109، صحیح مسلم صفۃ الجنۃ 84 (2879) 7101)

بدکاروں کے گناہوں کی وجہ سے نیکوکاروں کو عذاب کیوں ہو گا

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے : " ولا تنزر وازرۃ وزر اخری : اور کوئی بوجھ اٹھانے والے کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا " (الانعام : 164)

" کل نفس بما کسبت رھینہ : ہر نفس اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے " (المدثر : 38)

" لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت : اس نے جو نیک کام کیا اس کا فائدہ صرف اسی کو ہے، اور اس نے جو برا کام کیا اس کا ضرر صرف اسی کو ہے " (البقرہ : 286)

ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص سے دوسرے کے گناہوں پر گرفت نہیں کی جائے گی اور دوسرے کے گناہوں کا کسی شخص کو عذاب نہیں ہو گا، اور مذکور الصدر احادیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ جب عذاب آئے گا تو وہ بدکاروں کے ساتھ نیک لوگوں کو بھی ہو گا اور زیر تفسیر آیت بھی یہی منشاء ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب لوگ کسی برائی کو دیکھیں تو ہر دیکھنے والے پر فرض ہے کہ وہ اس برائی کو مٹائے یا اس برائی پر ٹوکے اور ملامت کرے ورنہ کم از کم اس کو دل سے برا جانے اور وہ ان لوگوں سے ناراض ہو اور ان سے محبت کا تعلق نہ رکھے، اور جب نیک لوگ ایسا نہیں کریں گے تو وہ گناہ گار ہوں گے اور عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے۔

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی 360ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ نے ایک فرشتہ کی طرف وحی کی کہ فلاں فلاں بستی والوں پر ان کی بستی کو الٹ دو، اس نے کہا اس بستی میں ایک بندہ ہے جس نے ایک پل بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ نے فرمایا اس بستی کو اس شخص پر اور اس بستی والوں پر الٹ دو کیونکہ میری وجہ سے اس شخص کا چہرہ ایک دن بھی غصہ سے متغیر نہیں ہوا۔ اس حدیث کے دو راویوں کی تضعیف کی گئی ہے، لیکن ابن المبارک اور ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے۔ (مجمع الزوائد ج 7، ص 270۔ المعجم الاوسط ج 8، رقم الحدیث : 7657، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، 1415ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ :

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِيۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰٮكُمۡ وَاَيَّدَكُمۡ بِنَصۡرِهٖ وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝ 26

لغۃ القرآن: [وَاذْكُرُوْٓا : اور یاد کرو] [اِذْ : جب] [اَنْتُمْ : تم لوگ] [قَلِيْلٌ : اقلیت میں تھے] [مُّسْتَضْعَفُوْنَ : کمزور سمجھے جاتے تھے] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [تَخَافُوْنَ : تم لوگ ڈرتے تھے] [اَنْ : کہ] [يَّتَخَطَّفَكُمُ : اچک لیں گے تم کو] [النَّاسُ : لوگ] [فَاٰوٰىكُمْ : تو اس نے ٹھکانا دیا تم کو] [وَاَيَّدَكُمْ : اور اس نے تائید کی تمہاری] [بِنَصْرِهٖ : اپنی مدد سے] [وَرَزَقَكُمْ : اور رزق دیا تم کو] [مِّنَ : سے] [الطَّيِّبٰتِ : پاکیزہ] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تَشْكُرُوْنَ : شکر گزار بنو]

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم (مکی زندگی میں عدداً) تھوڑے (یعنی اقلیّت میں) تھے ملک میں دبے ہوئے تھے (یعنی معاشی طور پر کمزور اور استحصال زدہ تھے) تم اس بات سے (بھی) خوفزدہ رہتے تھے کہ (طاقتور) لوگ تمہیں اچک لیں گے (یعنی سماجی طور پر بھی تمہیں آزادی اور تحفظ حاصل نہ تھا) پس (ہجرت مدینہ کے بعد) اس (اللہ) نے تمہیں (آزاد اور محفوظ) ٹھکانا عطا فرما دیا اور (اسلامی حکومت واقتدار کی صورت میں) تمہیں اپنی مدد سے قوت بخش دی اور (مواخات، اموال غنیمت اور آزاد معیشت کے ذریعے) تمہیں پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا فرما دی تاکہ تم اللہ کی بھرپور بندگی کے ذریعے اس کا) شکر بجالا سکو

تشریح:

ہجرت سے پہلے بے بسی اور بیکسی کی جو حالت تھی وہ مسلمانوں کو یاد دلائی جارہی ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد رکھتے ہوئے اس کی شکر گزاری میں مصروف رہیں۔ آیت میں ارض سے مراد سرزمین مکہ ہے۔ ماویٰ (جائے پناہ) مدینہ طیبہ ہے۔ تائید سے مراد بدر کی فتحمندی ہے۔ رزق سے مراد اموال غنیمت ہیں جو پہلی امتوں پر حرام تھے اور ملت اسلامیہ کے لیے حلال کردیئے گئے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

نعمت کی ناشکری نعمت چھن جانے کا سبب ہے

ہر دور میں اسی طرح اللہ تعالیٰ اجتماعی اور انفرادی طور پر مسلمانوں کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے، مصائب وآلام سے نجات دے کر راحت وآرام عطا کرتا ہے۔ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے، یاد خدا سے غفلت کو اپنا شعار بنالیتے اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اپنے برے اعمال کی کثرت کی وجہ سے خود کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نااہل ثابت کردیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے

اپنی دی ہوئی نعمتیں واپس لے لیتا ہے۔ عالمی سطح پر عظیم سلطنت رکھنے کے بعد مسلمانوں کا زوال، عزت کے بعد ذلت، فتوحات کے بعد موجودہ شکست وغیرہ اس چیز کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہ صحابہ کرام (رض) سے خطاب ہے کہ ہجرت سے قبل والا زمانہ یاد کرو جب مکاں میں رہتے ہوئے تمہاری تعداد بہت کم تھی عورت مظلومیت کا شکار تھے۔ اپنی مرضی سے نماز بھی نہیں پڑھ سکتے تھے تمہیں ڈر تھا کہ کفار کہیں تمہیں اچک نہ لیں جیسے جیل گوشت کی بوٹی اچک لیتی ہے تب اللہ نے تمہیں مدینہ طیبہ میں لاکر پناہ دی اور انصار مدینہ کے ذریعے تمہیں قوت بخشی اور تمہیں اموال غنیمت کی صورت میں پاک روزی دی تاکہ تم شکر بجالاؤ، یہ تفسیر ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے سدی سے روایت کی ہے (در منثور)

مدینہ و انصار کی فضیلت

فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ میں مدینہ وانصار مدینہ کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے یعنی جس شہر کو اللہ نے اپنے محبوب اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کے لیئے پسند کیا اس شہر کی عظمت کا کیا کہنا۔

سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) سے مروی ہے کہ جب ہم مدینہ طیبہ آئے تو یہاں وبا تھی لوگ یہاں آکر بیمار پڑ گئے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا فرمائی:

اللھم حبب الینا المدینۃ کما حببت مکۃ او اشد وصححھا و بارك لنا فی صعھا و مدھا و حول حماھا الی الجحفۃ

"اے اللہ! ہمارے لئے مدینہ کو اسی طرح محبوب بنادیں جس طرح مکہ ہے بلکہ اسے بھی محبوب تر بنادے اس کی وبا دور کردے اور اس کے پیمانوں میں برکت ڈال دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں بھیج دے۔" (مسلم کتاب الحج حدیث 480)

جحفہ مکہ ومدینہ کے مابین ایک جگہ ہے، معلوم ہوا مومن کو مکہ سے بڑھ کر مدینہ سے محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہی دعا کی ہے کہ اے اللہ! ہمیں مکہ سے بڑھ کر مدینہ سے محبت عطا فرما یہی وجہ ہے کہ جس قدر شاعری عظمت مدینہ منورہ پر ہوئی ہے وہ مکہ مکرمہ پر نہیں ہوئی۔ یہ سب دعاء رسول کا نتیجہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کہتے ہیں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ھوئے سنا:

من صبر علی لأوائھا کنت لہ شفیعا او شھیدا یوم القیامۃ۔

"جو شخص مدینہ طیبہ کی تکالیف پر صبر کرے میں روز قیامت اس کا گواہ یا شفیع ہوں گا۔" (مسلم کتاب الحج حدیث 481)

فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ میں انصار مدینہ کی فضیلت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ انھیں نے مہاجرین کو پناہ دی۔ اسی لئے ان کے بارے میں فرمایا گیا: والذی اٰوَوْا و نصروا اولئک ھم المومنون حقا۔ "اور جنھوں نے (مہاجرین) کو پناہ دی اور مدد کی تو وہی لوگ سچے مومن ہیں۔" (انفال۔ 74)

حضرت براء (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

الانصار لا یحبھم الا مؤمن ولا یبغضھم الا منافق فمن احبھم احبہ اللہ و من ابغضھم ابغضہ اللہ۔

(بخاری کتاب مناقب الانصار) (تفسیر برہان القرآن)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اس کی اطاعت اور شکر گزاری کرے

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کریں۔ پھر ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی سے اجتناب کریں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو مزید موکد فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے یہ لوگ تعداد اور قوت میں بہت کم تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کے بعد ان کو بہت قوت اور غلبہ حاصل ہوا، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے گریز کریں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تم تعداد میں کم تھے اور تم کو زمین میں کمزور سمجھا جاتا تھا اور تم دوسرے شہروں میں سفر کرنے سے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو لوٹ لیں گے۔ اللہ نے تمہیں پناہ دی بایں طور کہ تمہیں مکہ سے مدینہ منتقل کیا اور تم کفار کے شر سے محفوظ ہوگئے اور اپنی نصرت سے تمہیں قوت عطا کی یعنی جنگ بدر کے دن کفار پر تمہاری ہیبت طاری کردی۔ جس کے نتیجہ میں وہ تم سے تین گنا زیادہ ہونے کے باوجود شکست کھا گئے اور پاک چیزوں سے تمہیں وزی دی یعنی تمہارے لیے مال غنیمت کو حلال کردیا۔ جبکہ تم سے پہلی امتوں پر وہ حرام تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں سختی سے آسانی کی طرف اور مصیبتوں سے نجات دے کر راحتوں کی طرف منتقل کرتا ہے لیکن مسلمان ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کو اپنا شعار نہیں بناتے۔ یاد خدا سے غافل رہتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں حتی کہ جب وہ اپنے اعمال سے خود کو اللہ کی نعمتوں کا نااہل ثابت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے اپنی نعمتیں واپس لے لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ " وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفو عن کثیر : اور تم کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب پہنچتی ہے اور تمہاری بہت سی خطاوں کو وہ معاف کردیتا ہے "

اندلس میں آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد وہاں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت جاتی رہی بلکہ وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور صرف عیسائی بننے والوں کو زندہ رہنے دیا گیا اور اب وہاں پر صرف برائے نام مسلمان ہیں اور سلطنت بغداد کو چنگیز اور ہلاکو نے تاراج کیا۔ بر صغیر میں کئی صد سالوں پر محیط مسلمانوں کی حکومت انگریزوں نے ختم کی اور ڈیڑھ سو سال تک مسلمانوں کو غلام بنائے رکھا اور ماوراء النہر کی مسلم ریاستیں ایک بڑے عرصہ تک روس کی کالونی بنی رہیں اور وہاں اسلام اقدار اور آثار کو بڑی بے دردی سے مٹایا گیا، اور ماضی میں قریب میں پاکستان کو دولخت کیا گیا اور بھارت نے مشرقی پاکستان کو متحدہ پاکستان سے کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔ اسی طرح جو لوگ انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے اور اس کی نعمتوں کی نہ صرف ناشکری کرتے ہیں بلکہ کفران نعمت کرتے ہیں وہ جلد یا بدیر اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اطاعت پر قائم رکھے اور گناہوں سے بچائے اور اپنا شکر گزار بندہ بنائے رکھے۔ (آمین) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ 27

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو ! جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [لَا تَخُوْنُوا : تم لوگ خیانت مت کرو] [اللّٰهَ : اللہ سے] [وَالرَّسُوْلَ : اور ان رسول سے] [وَتَخُوْنُوْٓا : اور خیانت مت کرو] [اَمٰنٰتِكُمْ : اپنی (آپس کی) امانتوں میں] [وَ : اس حال میں کہ] [اَنْتُمْ : اور ہو تم] [تَعْلَمُوْنَ : تم جانتے ہو]

ترجمہ: اے ایمان والو ! تم اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے (ان کے حقوق کی ادائیگی میں) خیانت نہ کیا کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں خیانت کیا کرو حالانکہ تم (سب حقیقت) جانتے ہو

تشریح:

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے خیانت کا مطلب

حضرت ابن عباس (رض) نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے لا تخونوا اللّٰہ بترك فرائضه والرسول بترك سنته یعنی فرائض کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت نہ کرو اور سنت سے سرتابی کر کے اس کے رسول سے خیانت کرو۔ اور قتادہ فرماتے ہیں اعلموا ان دین اللہ امانۃ فادوا الی اللہ ما ائتمنکم علیہ من فرایضہ وحدودہ : خوب سمجھ لو ! اللہ کا دین امانت ہے۔ اس کے فرائض کی ادائیگی اور حدود کی پابندی کا تمہیں امین بنایا گیا ہے۔ پس امانت میں خیانت نہ کرو۔ (مظہری) اسی طرح مسلمانوں کے راز دشمن تک پہنچانا۔ حکومت کے سربراہوں، اعلیٰ افسروں اور ملازموں کا اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا۔ ملک کے صنعت کاروں اور تجار کا ملکی صنعت اور کاروبار میں دیانتداری کو نظرانداز کر دینا حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کرنے میں داخل ہے۔

غور فرمایئے کتنے پر جلال انداز میں فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے اور ارباب اقتدار کو متنبہ کیا جارہا ہے یعنی فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی اور امانتوں میں خیانت کوئی معمولی بات نہیں جسے نظرانداز کر دیا جائے۔ بلکہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت ہے۔ خیانت کا یہ جرم بھی ازحد سنگین ہے۔ اور پر مرتب ہونے والے نتائج بھی ملک اور قوم کے لیے تباہ کن ہیں اس لیے اس پر جو سزا ملے گی اس کی شدت اور سختی کا تم خود اندازہ کرلو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

فرائض چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ سے خیانت کرنا ہے اور سنت کو ترک کرنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خیانت کرنا ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت حضرت ابولبابہ انصاری (رض) کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بنو قریظہ کے یہودیوں کا دو ہفتے سے زیادہ عرصے تک محاصرہ فرمایا، وہ اس محاصرہ سے تنگ آ گئے اور ان کے دل خائف ہو گئے تو ان سے ان کے سردار کعب بن اسد نے یہ کہا کہ اب تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس شخص یعنی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کرو اور ان کی بیعت کر لو کیونکہ خدا کی قسم! یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ نبی مُرسَل ہیں اور یہ وہی رسول ہیں جن کا ذکر تمہاری کتاب میں ہے، ان پر ایمان لے آئے تو جان مال، اہل و اولاد سب محفوظ رہیں گے۔ اس بات کو قوم نے نہ مانا تو کعب نے دوسری صورت پیش کی اور کہا کہ تم اگر اسے نہیں مانتے تو آؤ پہلے ہم اپنے بیوی بچوں کو قتل کر دیں پھر تلواریں کھینچ کر محمد مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے صحابہ کرام (رض) کے مقابلے میں آ جائیں تاکہ اگر ہم اس مقابلے میں ہلاک بھی ہو جائیں تو ہمارے ساتھ اپنے اہل خانہ اور اولاد کا غم تو نہ رہے گا۔ اس پر قوم نے کہا کہ بیوی بچوں کے بعد جینا ہی کس کام کا؟ کعب نے کہا: یہ بھی منظور نہیں ہے تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صلح کی درخواست کرو شاید اس میں کوئی بہتری کی صورت نکلے۔ انھوں نے تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صلح کی درخواست کی لیکن حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے سوا اور کوئی بات منظور نہ فرمائی کہ اپنے حق میں حضرت سعد بن معاذ (رض) کے فیصلہ کو منظور کریں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس حضرت ابولبابہ (رض) کو بھیج دیجئے کیونکہ حضرت ابولبابہ (رض) سے ان کے تعلُّقات تھے اور حضرت ابولبابہ (رض) کا مال اور ان کی اولاد اور ان کے عیال سب بنو قریظہ کے پاس تھے۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابولبابہ (رض) کو بھیج دیا، بنو قریظہ نے ان سے رائے دریافت کی کہ کیا ہم حضرت سعد بن معاذ (رض) کا فیصلہ منظور کر لیں کہ جو کچھ وہ ہمارے حق میں فیصلہ دیں وہ ہمیں قبول ہو۔ حضرت ابولبابہ (رض) نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ یہ تو گلے کٹوانے کی بات ہے۔ حضرت ابولبابہ (رض) کہتے ہیں کہ میرے قدم اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائے تھے کہ میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ مجھ سے اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خیانت واقع ہوئی، یہ سوچ کر وہ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں تو نہ آئے، سیدھے مسجد شریف پہنچے اور مسجد شریف کے ایک ستون سے اپنے آپ کو بندھوا لیا اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم کھائی کہ نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے یہاں تک کہ مر جائیں یا اللہ کریم ان کی توبہ قبول کرے۔ وقتاً فوقتاً ان کی زوجہ آ کر انھیں نمازوں کے لیے اور طبعی حاجتوں کے لیے کھول دیا کرتی تھیں اور پھر باندھ دیئے جاتے تھے۔ حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب یہ خبر پہنچی تو فرمایا کہ ابولبابہ میرے پاس آتے تو میں ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتا لیکن جب انھوں نے یہ کیا ہے تو میں انھیں نہ کھولوں گا جب تک اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کی توبہ قبول نہ کرے۔ وہ سات روز بندھے رہے اور نہ کچھ کھایا نہ پیا یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، صحابہ کرام (رض) نے انھیں توبہ قبول ہونے کی بشارت دی۔ تو انہوں نے کہا: خدا کی قسم! جب تک رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے خود نہ کھولیں تب تک میں نہ کھولوں گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں اپنے دستِ مبارک سے کھول دیا۔ حضرت ابولبابہ (رض) نے عرض کی: میری توبہ اس وقت پوری ہو گی جب میں اپنی قوم کی بستی چھوڑ دوں جس میں مجھ سے یہ خطا سرزد ہوئی اور میں اپنا پورا مال اپنی ملک سے نکال دوں۔ سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تہائی مال کا صدقہ کرنا کافی ہے۔ ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر صراط الجنان)

آج بھی مسجد نبوی میں روضۃ من ریاض الجنۃ میں استوانہ ابی لبابہ کے نام سے ایک ستون ہے۔ اسی جگہ حضرت ابولباب کو باندھا گیا تھا۔ (تفسیر برہان القرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی قوم کے راز دوسری قوم تک پہنچانا سخت جرم ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

امانت میں خیانت کی برائی

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ سے مطلقاً امانت کی اہمیت بھی معلوم ہوئی۔ دوسری جگہ فرمایا گیا:

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانت الی اھلھا۔ "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے حق داروں کے سپرد کردو" (نساء: 58)

اور اہل ایمان کی یہ شان بیان کی گئی:

والذین ھم لامانتھم وعھدھم راعون۔ "اور جو لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرتے ہیں" (مومنون: 8)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

آیۃ المنافق ثلاث اذا حدث کذب و اذا وعد خالف و اذا اؤتمن خان۔

"منافق کی تین علامات ہیں: جب بات کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔" (بخاری کتاب الایمان حدیث 33، مسلم کتاب الایمان حدیث 58) (تفسیر برہان القرآن)

حضرت عمر بن خطاب (رض) نے فرمایا: کسی شخص کی نماز اور اس کے روازے تمہیں دھوکا میں نہ ڈالیں، جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نماز پڑھے لیکن جو امانت دار نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ (کنزالعمال: جلد ۴: حدیث نمبر ۸۴۳۶)

حضرت عمر بن خطاب (رض) نے فرمایا: کسی شخص کی نماز اور اس کے روزوں کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ وہ اپنی بات میں کس قدر سچا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ کس قدر امانت دار ہے اور جب اس پر دنیا پیش کی جائے تو وہ کس قدر امانت دار ہے اور جب اس پر دنیا پیش کی جائے تو وہ کس قدر متقی ہے۔ (کنزالعمال: جلد ۴: حدیث نمبر ۸۴۳۵)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عنقریب لوگوں کے اوپر ایک ایسا دھوکے کا زمانہ آئے گا جس میں جھوٹے کو سچا کہا جائے گا اور سچے کو جھوٹا کہا جائے گا اور خائن کو امانت دار کہا جائے گا اور امانت دار کو خائن کہا جائے گا۔ (مسند احمد: جلد ۲، ص ۲۹۱) (تفسیر امداد الکرم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تمہیں علم ہو"

اللہ اور رسول سے خیانت کی ممانعت کے شان نزول میں متعدد روایات

اس آیت کے متعدد شان نزول ہیں

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

1۔ عطاء بن ابی رباح روایت کرتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) نے مجھے یہ حدیث بیان کی کہ ابوسفیان مکہ سے روانہ ہوا تو حضرت جبرائیل نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور بتایا کہ ابوسفیان فلاں فلاں جگہ میں ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب کو بتایا کہ ابوسفیان فلاں فلاں جگہ میں ہے تم اس کی طرف روانہ ہو اور اس خبر کو چھپا کر رکھنا۔ ایک شخص نے ابوسفیان کو یہ پیغام بھیج دیا کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر حملہ کرنے کے لیے آرہے ہیں سو تم اپنے دفاع اور اپنی حفاظت کا بندوبست کرلو، تب اللہ عزوجل نے آیت نازل فرمائی: اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 12358، جز 7، ص 294، الدر المنثور، ج 4، ص 48)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ھ روایت کرتے ہیں:

2۔ حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے، ابومرثد کو اور حضرت زبیر (رض) کو بھیجا۔ ہم سب گھوڑوں پر سوار تھے، آپ نے فرمایا یہاں سے روانہ ہو اور روضہ خاخ پر پہنچ جا۔ وہاں مشرکین کی ایک عورت ملے گی جس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ کا مشرکین کی طرف لکھا ہوا ایک خط ہوگا۔ ہم نے اس عورت کا پیچھا کیا جس جگہ کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نشاندہی کی تھی وہاں وہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر جارہی تھی۔ ہم نے اس سے کہا وہ خط لاؤ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ہم نے اس کے اونٹ کو بٹھا لیا اور اس کی تلاشی لی، ہمیں اس کے پاس سے خط نہیں ملا۔ ہم نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غلط نہیں فرمایا تھا تم وہ خط نکالو ورنہ ہم تمہارے کپڑے اتار دیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سنجیدہ ہیں تو اس نے اپنے بالوں کے جوڑے میں سے وہ خط نکال کر ہمیں دیا۔ ہم وہ خط لے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے، حضرت عمر (رض) نے کہا یا رسول اللہ! اس شخص نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے، آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اس کی گردن ماردوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حاطب سے پوچھا تم نے کس وجہ سے یہ کام کیا؟ حضرت حاطب نے کہا اللہ کی قسم! میرے دل میں یہ نہیں تھا کہ میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے والا نہ رہو، میرا ارادہ صرف یہ تھا کہ میرا ان مشرکین پر کوئی احسان ہو جائے اس احسان کی وجہ سے اللہ میرے اہل اور مال سے ان کے شر کو دور رکھے اور آپ کے اصحاب میں سے ہر شخص کا وہاں کوئی قبیلہ ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کے اہل اور ان کے مال سے کافروں کے شر کو دور رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا ہے اور اس کے حق میں سوائے خیر کے اور کوئی کلمہ نہ کہنا۔ حضرت عمر نے کہا اس شخص نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا کیا یہ اہل بدر سے نہیں ہے اور بیشک اللہ اہل بدر کی طرف متوجہ ہوا اور فرمایا تم جو چاہو عمل کرو میں نے تمہارے لیے جنت کو واجب کر دیا ہے۔ یا فرمایا میں نے تمہاری مغفرت کر دی ہے۔ پھر حضرت عمر (رض) کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3983۔ مسند احمد ج 1، ص 105)

حضرت ابولبابہ انصاری کی توبہ

امام عبدالملک بن ہشام متوفی 218 ھ روایت کرتے ہیں:

3۔ بنوقریظہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس ابولباب بن عبدالمنذر کو بھیجیں، ان کا تعلق بنوعمرو بن عورف سے تھا اور یہ اوس کے حلیف تھے۔ (ان کے نام میں اختلاف ہے، رفاعہ، مبشر اور بشیر تین قول ہیں۔ آپ حضرت علی کی خلافت تک زندہ رہے۔ الاستیعاب رقم الحدیث: 3180) تاکہ ہم اپنے معاملہ میں ان سے مشورہ کریں۔ پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

حضرت ابولبابہ کو بنو قریظہ کی طرف بھیجا، جب بنو قریظہ نے ان کو دیکھا تو ان کے مرد ان کے پاس کھڑے ہوگئے اور ان کی عورتیں فریاد کرنے لگیں، اور بچے ان کے سامنے رونے لگے۔ یہ دیکھ کر ان کے لیے حضرت ابولباب کا دل نرم ہو گیا۔ بنو قریظہ نے ان سے کہا اے ابولبابہ آپ کا کیا مشورہ ہے کیا ہم (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم پر قلعہ سے نکل آئیں؟ انھوں نے کہا ہاں! اور ہاتھ سے اپنے گلے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ تم کو ذبح کر دیں گے۔ حضرت ابولبابہ نے کہا اللہ کی قسم ابھی میں نے وہاں سے قدم نہیں اٹھائے تھے کہ میں نے یہ جان لیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے۔ پھر حضرت ابولبابہ سیدھے واپس گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے حتی کہ انھوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور کہا میں اس وقت تک بندھا رہوں گا جب تک کہ میری اس خیانت پر اللہ تعالیٰ توبہ قبول نہیں فرمالیتا۔ اور اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ میں آئندہ کبھی بنو قریظہ کے پاس نہیں جاؤں گا اور نہ کبھی اس شہر میں جاؤں گا جس میں میں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی تھی۔

عبداللہ بن ابی قتادہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابولبابہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو۔ (الانفال: 27) امام ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا اگر وہ میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لیے استغفار کرتا، اور جب انھوں نے اپنے آپ کو باندھ لیا ہے تو میں ان کو اس وقت تک نہیں کھولوں گا جب تک کہ اللہ ان کی توبہ قبول نہیں فرمالیتا۔

امام ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ جس دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ام سلمہ (رض) کے گھر تھے، اس دن سحری کے وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حضرت ابولبابہ کی توبہ کی قبولیت نازل ہوئی۔ حضرت ام سلمہ (رض) فرماتی ہیں میں نے سحری کے وقت دیکھا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہنس رہے تھے، میں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا ہوا رکھے آپ کس وجہ سے ہنس رہے تھے؟ آپ نے فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول کرلی گئی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا میں ان کو یہ خوش خبری نہ دوں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں اگر تم چاہو تو، حضرت ام سلمہ حجرہ کے دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ یہ پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ حضرت ام سلمہ نے فرمایا اے ابولبابہ تمہیں مبارک ہو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی۔ حضرت ام سلمہ نے فرمایا مسلمان انھیں کھولنے کے لیے جھپٹے۔ حضرت ابولبابہ نے کہا اللہ کی قسم! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی آکر اپنے ہاتھوں سے مجھے کھولیں گے اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صبح کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے تو آپ نے انھیں کھول دیا۔

امام ابن ہشام فرماتے ہیں کہ حضرت ابولبابہ ستون کے ساتھ چھ راتیں بندھے رہے، ان کی بیوی ہر نماز کے وقت آکر انھیں کھول دیتی تھیں وہ نماز پڑھتے اور پھر ستون کے ساتھ بندھ جاتے۔ حضرت ابولبابہ کی توبہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی، وہ یہ ہے: " واخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا واخر سیئا عسی اللہ ان یتوب علیھم ان اللہ غفور رحیم: اور دوسرے مسلمان جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا، انھوں نے کچھ نیک کاموں کو کچھ برے کاموں کے ساتھ ملا لیا، عنقریب اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے" (السیرۃ النبویہ لابن ہشام ج 3، ص 260۔ 262۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415 ھ، جامع البیان جز 7، رقم الحدیث: 12359، اسد الغابہ ج 6، ص 260، رقم الحدیث: 6205، اسباب النزول للواحدی رقم الحدیث: 477)

امام عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہ کی توبہ قبول فرمائی تو انھوں نے کہا یا نبی اللہ! میری توبہ یہ ہے کہ میں اس قوم کے اس علاقہ کو چھوڑ دوں جس میں، میں نے گناہ کیا تھا اور میں آپ کے پڑوس میں رہوں اور اپنا تمام مال

اللہ اور اس کے رسول کی طرف صدقہ کر دوں، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے لیے صرف تہائی مال کا صدقہ کرنا کافی ہے۔ (مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث : 16397۔ المستدرک، ج 3، ص 632، کنز العمال رقم الحدیث : 17034)

حافظ ابو عمر یوسف بن محمد بن عبدالبر القرطبی المتوفی 463ھ نے حضرت ابولبابہ کی توبہ کا ایک اور سبب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

حضرت ابولبابہ نے لوہے کی وزنی زنجیروں سے اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ کئی راتیں باندھے رکھا (علامہ ابن اثیر نے سات سے نو راتیں لکھی ہیں) حتی کہ ان کی سماعت بہت کم ہو گئی اور بینائی بھی بہت کم ہو گئی۔ جب نماز کا وقت آتا یا انھوں نے قضاء حاجت کے لیے جانا ہوتا تو ان کی بیٹی ان کو کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر ان کو باندھ دیتیں۔

حضرت ابولبابہ نے جو اپنے آپ کو باندھا تھا حافظ ابن عبدالبر نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں اور سب سے عمدہ وجہ وہ ہے جو زہری سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابولبابہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نہیں گئے تھے، انھوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا اللہ کی قسم ! میں اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا، اور کوئی چیز کھاؤں گا اور نہ پیوں گا حتی کہ اللہ عزوجل میری توبہ قبول فرمالے یا میں مر جاؤں۔ وہ سات دن بندھے رہے کچھ کھایا نہ پیا حتی کہ بے ہوش ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ ان سے کہا گیا کہ اے ابولباب ! اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے، انھوں نے کہا بہ خدا میں اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا، حتی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آکر مجھے کھولیں۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور آپ نے اپنے ہاتھ سے ان کو کھولا۔ التوبہ 103 کی تشریح میں حضرت ابن عباس نے بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابولباب اور ان کے علاوہ سات، آٹھ یا نو افراد کے متعلق نازل ہوئی ہے جو غزوہ تبوک میں نہیں گئے تھے، پھر وہ نادم ہوئے اور انھوں نے توبہ کی اور انھوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا تھا ان کا نیک عمل توبہ تھا اور ان کا برا عمل غزوہ تبوک سے رہ جانا تھا۔

حافظ ابو عمر فرماتے ہیں کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابولبابہ کا گناہ یہ تھا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیفوں میں سے تھے اور انھوں نے بنو قریظہ کو یہ اشارہ کیا تھا کہ اگر تم سعد بن معاذ کے حکم پر قلعہ سے نکل آئے تو تم کو ذبح کر دیا جائے گا اور انھوں نے اپنے حلقوم کی طرف اشارہ کیا تب یہ آیت نازل ہوئی : اے ایمان والو ! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو۔ (الانفال : 27)۔ (الاستیعاب ج 4، ص 304۔ 305، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

اللہ اور رسول اکی مانت میں خیانت کے محامل

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت نہ کریں اور اس کو اس لیے خیانت فرمایا کہ یہ اللہ کے عطیہ میں خیانت کرنا ہے، اور رسول کی اس لیے خیانت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مال غنیمت کی تقسیم کا والی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بنایا ہے۔ سو جس شخص نے اس مال غنیمت میں خیانت کی اس نے اللہ اور رسول کی خیانت کی۔ اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کے اور بھی محامل ہیں : اللہ کی خیانت فرائض کو ترک کرنا اور رسول کی خیانت آپ کی سنت کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اللہ کی خیانت فرائض کو ترک کرنا یا ان کی ادائیگی میں کمی کرنا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ کو مکمل ادا کرنا امانت ہے اور کسی بھی حکم

شرعی میں کمی کرنا یا اس کو ترک کرنا خیانت ہے، اور مال غنیمت میں خیانت کرنا بھی اس میں داخل ہے ہر چند کہ ان آیات کا نزول مال غنیمت میں خیانت کے متعلق ہے لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوصیت مورد اور سبب کا نہیں ہوتا۔

ابن زید نے کہا اس قسم کی خیانت منافقین کرتے تھے ان کو معلوم تھا کہ وہ کافر ہیں اور وہ پھر بھی ایمان کو ظاہر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے : "واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی یراءون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا : اور وہ (منافقین) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں" (النساء : 142)

یہ منافقین تھے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے دین کی وجہ سے امن دیا اور وہ خیانت کرتے تھے، ایمان ظاہر کرتے تھے اور ان کے باطن میں کفر تھا۔ (جامع البیان جز 9، ص 295، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415 ھ)

امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی امانتوں میں خیانت نہ کریں۔ امانت ادا کرنے کی تاکید اور خیانت کرنے پر وعید کے متعلق اس آیت کے علاوہ قرآن مجید میں اور یہ آیات ہیں :

فان امن بعضکم بعضا فلیود الذی اوتمن امانتہ ولیتق اللہ ربہ : پس اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ (البقرہ : 283)

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا : بیشک اللہ تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانت والوں کو ان کی مانت ادا کرو۔ (النساء : 58)

انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا :

ہم نے آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں پر اپنی امانت کو پیش کیا انھوں نے اس امانت میں خیانت کرنے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس میں خیانت کی بیشک وہ ظالم اور جاہل ہے (الاحزاب : 82)

والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون : اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں (المومنون : 8)

امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کے متعلق احادیث اور آثار

1۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 35۔ صحیح مسلم الایمان 106 (58) 206۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2638۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 5020۔ السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث : 1127۔ مکارم الاخلاق، رقم الحدیث : 176۔ سنن کبری ج 6، ص 288)

2۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو تمہارے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کرو اور جو تم سے خیانت کرے اس کے خیانت مت کرو۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 1235، 1234۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 1271۔ المستدرک ج 2، ص 46۔ مسند احمد ج 3، ص 4، مکارم الاخلاق، رقم الحدیث : 160، سنن دارمی، رقم الحدیث : 2600)

3۔ حضرت نواس بن سمعان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بہت بڑی خیانت یہ ہے کہ تمہارا بھائی تم سے کوئی بات کہے اور وہ اس میں سچا ہو اور تم اس کو جھوٹا کہو (مسند احمد ج 4، ص 183، مجمع الزوائد ج 8، ص 98، اتحاف السادۃ المھرۃ ج 8، ص 264، رقم الحدیث : 6023)

4۔ حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم مرے لیے چھ چیزوں کے ضامن ہو جاؤ تو میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہوں، جب تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو تم اس کو ادا کرو، جب تم عہد کرو تو اس کو پورا کرو، جب تم بات کرو تو سچ بولو، تم اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو، اپنی نظروں کو نیچا رکھو اور اپنے ہاتھوں کو کسی کے آگے نہ پھیلاؤ۔ (شعب الایمان ج 4، رقم الحدیث : 5255۔ مکارم الاخلاق رقم الحدیث : 175۔ سنن کبری ج 6، ص 288)

5۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جانے سے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے ماسوا امانت کے۔ قیامت کے دن ایک بندہ کو لایا جائے گا خواہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہو چکا ہو۔ اس سے کہا جائے گا کہ اپنی امانت کو ادا کر۔ وہ کہے گا اے رب میں اب کیسے امانت کو ادا کروں اب تو دنیا ختم ہو چکی ہے، پھر کہا جائے گا اس کو دوزخ کی طرف لے جاؤ، اس کو دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا پھر اس کے سامنے اس امانت کی مثل پیش کی جائے گی جس شکل و صورت میں اس کو وہ امانت دنیا میں پیش کی گئی تھی۔ وہ اس کو پہچان لے گا وہ اس امانت کے پیچھے دوزخ کے ایک گڑھے میں اترے گا حتی کہ اس کو اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھے گا اور جب وہ گمان کرلے گا کہ وہ اس گڑھے میں سے باہر نکل رہا ہے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گڑھے میں نیچے گرتا چلا جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود نے کہا نماز امانات ہے اور وضو امانت ہے اور وزن امانت ہے اور پیمائش امانت ہے اور انھوں نے کئی چیزیں گنیں اور ان سب سے بڑی امانت وہ ہے جو لوگ کسی کے پاس کوئی چیز رکھتے ہیں۔ زازان کہتے ہیں کہ پھر میں حضرت براء بن عازب کے پاس گیا انھوں نے بھی اسی طرح بیان کیا جس طرح حضرت ابن مسعود نے بیان کیا تھا۔ اور قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانت رکھوانے والوں کو ان کی امانتیں ادا کرو۔ (مکارم الاخلاق، رقم الحدیث : 145۔ شعب الایمان، ج 4، رقم الحدیث : 5266، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1410ھ)

6۔ حضرت عمر بن خطاب (رض) عبیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سب سے پہلے لوگوں سے جو چیز اٹھالی جائے گی وہ امانت ہے، اور آخر میں جو چیز باقی رہ جائے گی، وہ نماز ہے اور بہت سے نمازی ایسے ہیں کہ ان کی نماز میں کوئی خیر نہیں ہے (شعب الایمان ج 4، رقم الحدیث : 5274۔ السنن الکبری للبیہقی ج 6، ص 289۔ مکارم الاخلاق، رقم الحدیث : 160)

7۔ حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم کسی شخص کی نماز اور اس کے روزے سے دھوکا نہ کھانا، جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نماز پڑھے لیکن جو امانت دار نہیں وہ دین دار نہیں۔ (مصنف عبدالرزاق ج 11، رقم الحدیث : 20192۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج 6، رقم الحدیث : 30317۔ شعب الایمان ج 4، رقم الحدیث : 5279۔ کنزالعمال رقم الحدیث : 8436۔ مکارم الاخلاق رقم الحدیث : 146)

8۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نے فرمایا کسی شخص کی نماز کو دیکھو نہ اس کے روزے کو، یہ دیکھو وہ اپنی بات میں کس قدر سچا ہے، اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ کس قدر امانت دار ہے اور جب اس پر دنیا پیش کی جائے تو وہ کسی قدر متقی ہے۔ (شعب الایمان ج 4، رقم الحدیث : 5279۔ کنزالعمال رقم الحدیث : 8435)

9۔ حضرت حذیفہ بن ایمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے دو حدیثیں بیان کی تھیں، ایک تو پوری ہوچکی ہے اور دوسری کا میں انتظار کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتری، پھر قرآن نازل ہوا اور لوگوں نے قرآن اور حدیث کا علم حاصل کیا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے امانت اٹھ جانے کی پیش گوئی بیان کی اور فرمایا ایک شخص تھوڑی دیر سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکل جائے گی اور چھالے کی طرح اس کا اثر رہ جائے گا جس طرح پیر کے نیچے انگارہ آنے سے آبلہ پڑ جاتا ہے اور اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے ایک کنکری لے کر اس کو اپنے پیر پر لڑھکا دیا اور فرمایا پھر لوگ خرید و فروخت کریں گے اور ان میں سے کوئی بھی امانت داری اور دیانت داری سے کام نہیں لے گا حتی کہ لوگ کہیں گے کہ فلاں قبیلہ میں ایک دیانت دار شخص ہوا کرتا تھا اور یہ فلاں شخص کس قدر بیدار مغز، خوش مزاج اور زیرک ہے، لیکن اس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت حذیفہ نے فرمایا ایک وہ وقت تھا جب میں ہر شخص سے بغیر کسی خدشہ اور کھٹکے کے خرید و فروخت کرلیتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ شخص اگر مسلمان ہے تو اس کا دین اس کو خیانت سے روکے گا، اور اگر وہ یہودی یا نصرانی ہے تو حاکم کے خوف سے خیانت نہیں کرے گا لیکن اس زمانے میں فلاں فلاں شخص کے علاوہ خرید و فروخت میں اور کسی پر اعتماد نہیں کرتا (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6497۔ صحیح مسلم ایمان 230 (43) 3660۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2186۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 4053۔ مصنف عبدالرزاق ج 11، رقم الحدیث : 20194)

10۔ عطاخراسانی بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے فرمایا جو شخص اللہ عزوجل سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس نے کسی شخص کی امانت ادا نہیں کی ہوگی، اللہ عزوجل اس کی نیکیوں کو لے لے گا جب کہ وہاں دینار ہوگا نہ درہم۔ (مکارم الاخلاق للخرائطی، رقم الحدیث : 148)

11۔ حضرت انس بن مالک نے فرمایا جب کسی گھر میں خیانت ہو تو اس سے برکت چلی جاتی ہے۔ (مکارم الاخلاق للخرائطی، رقم الحدیث : 151، مطبوعہ مطبعہ المدنی قاہرہ، 1411 ھ)

12۔ حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے دین میں سے جو چیز سب سے پہلے گم ہوگی وہ امانت ہے اور آخر میں نماز گم ہوگی۔ ثابت بنانی نے کہا ایک شخص روزے رکھتا ہے، نماز پڑھتا ہے لیکن جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ امانت ادا نہیں کرتا۔ (مکارم الاخلاق للخرائطی رقم الحدیث : 155۔ المعجم الکبیر ج 9، رقم الحدیث : 8699، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج 7، ص 329)

13 :۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مومن وہ ہے جس کو لوگ اپنی جان اور مال میں امین سمجھیں۔ (مکارم الاخلاق رقم الحدیث : 156، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3934)

14 :۔ حضرت ابوبکر صدیق (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جنت میں جبار داخل ہوگا نہ بخیل، نہ خائن اور بد خلق۔ (مکارم الاخلاق، رقم الحدیث : 157۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 1953۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3691)

15 ۔ مجاہد نے کہا مکر، دھوکا اور خیانت دوزخ میں ہیں اور مکر اور خیانت مومن کے اخلاق میں سے نہیں ہیں۔ (مکارم الاخلاق، رقم الحدیث : 158 ۔المستدرک، ج 4، ص 607)

16 ۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عنقریب لوگوں کے اوپر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں سچے کو جھوٹا کہا جائے گا اور جھوٹے کو سچا کہا جائے گا اور خائن کو امانت دار کہا جائے گا اور امانت دار کو خائن کہا جائے گا۔ (مکارم الاخلاق رقم الحدیث : 167، مسند احمد ج 2، ص 291)

17 :۔ حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب بھی خطبہ دیا تو اس میں فرمایا سنو جو امانت ادا نہ کرے وہ ایمان دار نہیں اور جو عہد پورا نہ کرے وہ دین دار نہیں۔ (مکارم الاخلاق رقم الحدیث : 147، سنن کبری للبیہقی ج 6، ص 288 ۔ مسند احمد ج 3، ص 135، 154، 210، 251 ۔ موارد الظمان رقم الحدیث : 100 ۔ مجمع الزوائد ج 1، ص 96، اس کی سند ضعیف ہے)

18 ۔ میمون بن مہران نے کہا تین چیزیں ہر نیک اور بد کو ادا کی جائیں گی، صلہ رحمی کرو خواہ نیک ہو یا بد، عہد جس سے بھی کیا ہے پورا کرو خواہ نیک ہو یا بد، ہر ایک امانت ادا کرو خواہ نیک ہو یا بد۔ (مکارم الاخلاق رقم الحدیث : 159)

19 ۔ حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں اور سچ بولنے کی اور عہد پورا کرنے کی، اور امانت ادا کرنے کی اور خیانت ترک کرنے کی، اور پڑوسی کی حفاظت کرنے کی اور یتیم پر رحم کرنے کی اور ملائمت سے بات کرنے کی اور (ہر مسلمان کو) سلام کرنے کی اور تواضع اور عاجزی کی۔ (حلیۃ الاولیاء ج 1، ص 240 ۔241)

20 : حضرت ابو حمید الساعدی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو صداقت وصول کرنے کا عامل بنایا جب وہ آیا تو اس نے کہا یہ چیزیں تمہارے لیے ہیں اور یہ چیزیں مجھے ہدیہ کی گئی ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا جب وہ آیا تو اس نے کہا یہ چیزیں تمہارے لیے ہیں اور یہ چیزیں مجھے ہدیہ کی گئی ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا جب وہ آیا تو اس نے کہا یہ چیزیں تمہارے لیے ہیں اور یہ چیزیں مجھے ہدیہ کی گئی ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر تشریف فرما ہوئے اور آپ نے اللہ کی حمد کے بعد فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جن کو ہم اپنے بعض مناصب پر عامل بناتے ہیں پھر وہ ہمارے پاس آکر یہ کہتا ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے ہے اور یہ چیز مجھے ہدیہ کی گئی ہے، وہ اپنی ماں کے گھر میں یا اپنے باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گیا پھر یہ دیکھا جاتا کہ اس کو کوئی چیز ہدیہ کی گئی ہے یا نہیں۔ اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، تم میں سے جو شخص بھی کوئی چیز لے گا، وہ قیامت کے اس کی گردن پر سوار ہو گی۔ اگر وہ اونٹ ہے تو وہ بڑبڑا رہا ہو گا، اگر وہ گائے ہے تو وہ ڈکرا رہی ہو گی اور اگر وہ بکری ہے تو وہ ممیا رہی ہو گی ! پھر آپ نے ہاتھ بلند کر کے تین دفعہ فرمایا اے اللہ کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے۔ (مکارم الاخلاق رم الحدیث : 139 ۔ صحیح البخاری رقم الحدیث : 2597، 7174 ۔ صحیح مسلم الامارہ : 26 (1832) 4656 ۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 2946 ۔ سنن دارمی رقم الحدیث : 1669 ۔ مسند احمد ج 5، ص 277 ۔285 ۔423)

النساء : 58 میں بھی ہم نے امانت اور خیانت پر کئی لحاظ سے بحث کی ہے۔ سیر حاصل بحث کے لیے اس تفسیر کو بھی دیکھنا چاہیے۔ البتہ امانت اور خیانت کے موضع پر یہاں زیادہ احادیث بیان کی ہیں اور بعض ان احادیث کا یہاں ذکر نہیں کیا جو وہاں بیان کر دی ہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ 28

لغۃ القرآن: [وَاعْلَمُوْٓا : اور تم لوگ جان لو] [اَنَّمَآ : کہ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ] [اَمْوَالُكُمْ : تمہارے مال] [وَاَوْلَادُكُمْ : اور تمہاری اولاد] [فِتْنَةٌ ۙ: ایک آزمائش ہیں] [وَّاَنَّ : اور یہ کہ] [اللّٰهَ : اللہ] [عِنْدَهٗٓ : اس کے پاس ہی] [اَجْرٌ: اجر] [عَظِيْمٌ : بہت بڑا]

ترجمہ: اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تو بس فتنہ ہی ہیں اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے

تشریح:

مال اور اولاد سے بڑھ کر سخت آزمائش اور کونسی ہے۔ محبت مال و اولاد انسان کو بزدل بھی بنا دیتی ہے اور بخیل بھی۔ حضور کے پاس ایک بچہ لایا گیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے بوسہ دیا اور فرمایا اما انھم مبخلۃ مجبنۃ وانھم من ریحان اللہ (البغوی)۔ یہ اولاد انسان کو بخیل بھی بنا دیتی ہے اور بزدل بھی۔ اور یہ اللہ کے پھول ہیں۔ اب جو اس طبعی محبت کے باوجود احکام الٰہی کی تعمیل میں کوتاہی نہیں کرتا یقیناً وہ کامیاب ترین انسان ہے۔ ایک دوسرے لحاظ سے بھی اولاد بڑی آزمائش ہے۔ بچوں کو صحیح تربیت، ان کو صحیح مسلمان اور کامل انسان بنانا ان کی لوح دل پر اقدار عالیہ کے نقوش ثبت کرنا والدین کے لیے ایک کٹھن آزمائش ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا صحیح شکر ہے۔ گو کم نظر اپنی اولاد کے لیے دولت ہی اکٹھی کرتے رہتے ہیں اور انھیں اسی لکشمی دیوی کی پرستش کا ڈھنگ سکھانا ہی اپنے حقوق پدری کی تکمیل جانتے ہیں۔ انھوں نے اسی نعمت عظمیٰ پر اپنے منعم حقیقی کا ہرگز شکر ادا نہیں کیا۔ اور نہ وہ اس آزمائش میں کامیاب ہوئے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں خیانت سے منع فرمایا اور اس آیت میں دو ایسے امور کی نشاندہی کر دی ہے جو ان حقوق کی خیانت کا سبب بنتے ہیں یعنی مال اور اولاد یہ دونوں تمہارے لیے آزمائش ہیں، کیونکہ ان سے محبت کرنا ایک فطری امر ہے اور اسلام اس کی ترغیب بھی دیتا ہے لیکن اگر مال و اولاد کی محبت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں رکاوٹ بنیں تو پھر عقل سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ انسان ان محبتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترجیح دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم کامل نیکی ہرگز نہ پاسکو گے حتیٰ کہ راہ خدا میں ان چیزوں سے خرچ کرو جن سے تم محبت کرتے ہو۔ (قرآن : ۳ : ۹۲) (تفسیر امداد الکرم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : "اور یقین رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں اور بے اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے"
فتنہ کا لغوی معنی ہے سونے کو آگ میں تپا کر کندن بنانا۔ امتحان اور جانچ کو اسی مناسبت سے فتنہ کہا جاتا ہے (کہ امتحان سے کھرا کھوٹا ظاہر ہو جاتا ہے) اللہ نے فرمایا ہے: نَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔ فتنہ کا لفظ عذاب کیلئے بھی مستعمل ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے: عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ کبھی کفر ' گناہ ' فساد اور تمام اسباب عذاب پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے: واتقوا فتنةً - اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا الفتنةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ مال و اولاد ' گناہ اور عذاب میں مبتلا ہونے کا ذریعہ ہیں اور اللہ کی طرف سے یہ ایک امتحان ہے ' اس لیے ان کو فتنہ فرمایا۔ (تفسیر مظہری)
یہ بات بھی مسلم ہے کہ اکثر سبب کبر اور غرور یہی دونوں چیزیں ہیں جیسے کہ اکثر و بیشتر مشاہدہ اس پر دلیل ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)
قرآن کریم انسانی حقیقت سے مخاطب ہے۔ کیونکہ خالق کائنات انسان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے اس کی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا علم ہے۔ وہ اس راہ کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے۔
وہ اس مخلوق کے کمزور پہلوؤں سے بھی واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ مال کے لالچ اور اولاد کے مفادات اس کی ذات میں رچے بسے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ انسان کو خبردار کرتا ہے کہ مال و اولاد کی حقیقت کیا ہے۔ اللہ نے انسان کو یہ دو محبوب عطیات اس کی آزمائش کے لیے دیے ہیں۔ یہ دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور آزمائش ہیں۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ مال اور اولاد میں کس طرح تصرف کرتا ہے۔ آیا شکر ادا کر کے حق نعمت پورا کرتا ہے یا غفلت اور نافرمانی کرتا ہے۔ ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ۔ اور ہم تم کو خیر و شر کے ذریعے آزما کر فتنے میں ڈالتے ہیں۔ فتنہ فقط مشکلات اور محرومیت کی شکل ہی میں نہیں آتا بلکہ یہ خوشحالی اور اللہ کے عطیات کی شکل میں بھی آتا ہے اور مال و اولاد کی شکل میں بھی آزمائشیں آتی ہیں۔
یہ نہایت ہی اہم تنبیہ ہے۔ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ: اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ جب انسان کو دل سے یہ معلوم ہو جائے کہ کس بات سے اس کا امتحان لیا جا رہا ہے تو یہ بات اس کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے تاکہ وہ بیدار رہے اور محتاط رویہ اختیار کرے۔ یہ نہ ہو کہ امتحان میں اس سے بھول چوک ہو جائے اور وہ امتحان میں پیچھے رہ جائے۔
لیکن اس امتحان میں بھی اللہ بندے کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان امتحان میں فیل بھی ہو سکتا ہے۔ باوجود انتباہات کے۔ اس لیے کہ اس راہ کی مشکلات بہت زیادہ ہیں، خصوصاجب معاملہ مال اور اولاد کا در پیش ہو لہٰذا اللہ انسان کو یہ روشنی دکھاتا ہے۔ مال و اولاد کے مقابلے میں اللہ کا اخروی اجر عظیم یہی تو ہے۔
وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ یہ مال اور دولت دینے والا تو اللہ ہی ہے اور اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ اولاد اور دنیاوی مال سے زیادہ قیمتی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص بھی اس امانت کبریٰ کے حق ادا کرنے سے پیچھے نہ رہے اور یہ اللہ کی طرف سے ایک قسم کا تعاون ہے۔ اس ضعیف انسان کے ساتھ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ خلق الانسان ضعیفا "اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔
غرض اسلامی نظام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اس میں اعتقادات و تصورات بھی ہیں، اس میں ہدایت و تربیت کے سامان بھی ہیں، اس میں رائض و واجبات بھی ہیں۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے اور اللہ علیم و خبیر ہے۔ الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا جبکہ وہ لطیف و خبیر بھی ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کا معنی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت کی جن نعمتوں سے نوازا ہے، اور جو اولاد تمہیں عطا کی ہے وہ تمہارے لیے امتحان اور آزمائش ہیں تاکہ اس آزمائش کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ ظاہر فرمائے کہ تم مال اور اولاد میں اللہ کے حقوق کس طرح ادا کرتے ہو اور مال اور اولاد کی محبت تمہیں اللہ کے احکام پر عمل کرنے سے مانع ہوتی ہے یا نہیں اور تم یہ یقین رکھو کہ اپنے مال اور اولاد میں تم اللہ کے احکام کے مطابق جو عمل کرتے ہو اس کا اجر وثواب اللہ ہی کے پاس ہے سو تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو تاکہ آخرت میں تمہیں اجر جزیل مل جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا تم میں سے ہر شخص فتنہ میں مبتلا ہے پس تم گمراہ کرنے والے فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کیا کرو۔ (جامع البیان جز 9، رقم الحدیث : 12370، ص 295، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، 1415ھ)

مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اولاد، رشتہ داروں اور مال و متاع کی محبت اگر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت سے مانع ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا : قل ان کان اباء کم وابناء کم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین :

آپ کہیے کہ اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور تمہاری وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں خطرہ ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظام کرو حتی کہ اللہ اپنا حکم نافذ کر دے، اور اللہ فاسق لوگوں کو منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

یا ایھا الذین امنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ ومن یفعل ذلک فاولئک ھم الخسرون : اے ایمان والو ! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جس نے ایسا کیا تو وہی درحقیقت نقصان اٹھانے والے ہیں۔

مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق احادیث

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مال کے فتنہ کے متعلق فرمایا :

حضرت عمرو بن عوف (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو بحرین جزیہ لینے کے لیے بھیجا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اہل بحرین سے صلح کر لی تھی اور حضرت علاء بن حضرمی کو ان کا عامل مقرر کر دیا تھا۔ پھر حضرت ابو عبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے، انصار کو جب ان کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ سب فجر کی نماز میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کے پاس پہنچ گئے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز پڑھانے کے بعد ان کی طرف مڑ کر بیٹھ گئے وہ سب آپ کے سامنے پیش ہوگئے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب انھیں دیکھا تو آپ مسکرائے، پھر آپ نے فرمایا میرا گمان یہ ہے کہ تم سب کو یہ خبر پہنچ گئی ہے کہ ابو عبیدہ بحرین سے کچھ مال لے کر آئے ہیں۔ انھوں نے کہاہاں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا تمہیں مبارک ہو اور اس چیز کی امید رکھو جس سے تم خوش ہوگے، پس اللہ کی قسم! مجھے تم پر فقر کا خوف نہیں ہے لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ دنیا تم پر اس طرح وسیع کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر دنیا وسیع کر دی گئی تھی، پھر تم دنیا میں اس طرح رغبت کروگے جس طرح انھوں نے دنیا میں رغبت کی تھی، جس طرح وہ ہلاک ہوگئے تھے، تم بھی اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3158، صحیح مسلم الزہد 6(2961) 7291۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2469۔ سنن ابن ماجہ رقم الھدیث: 3997۔ السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: 8766۔ مسند احمد ج 4، ص 227۔ 137)

اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد ہے

حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں خطبہ دے رہے تھے۔ اچانک حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) آگئے انھوں نے سرخ قمیصیں پہنی ہوئی تھی وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر سے اترے، ان کو اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھا دیا اور پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سچ ارشاد فرمایا ہے تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں۔ (الانفال: 28)۔ میں نے ان دونوں بچوں کو چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو پھر میں صبر نہ کر سکا حتی کہ میں نے اپنے خطاب کو منقطع کیا اور ان بچوں کو اٹھایا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 3781۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 1109۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1412۔ مشکوۃ، رقم الحدیث: 6168)

اولاد کی محبت میں انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے یا کسی عبادت کو ترک کر دے یا ان کی محبت میں کوئی ناجائز کام کرے تو یہ ممنوع ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رحمت اور رقت کے غلبہ سے اپنے ان نواسوں کو جو دوران خطبہ، خطبہ منقطع کر کے اٹھایا تو یہ کسی قسم کا ممنوع کام نہیں تھا بلکہ آپ کا ہر کام وحی الٰہی کی اتباع میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت حسنین کریمین کا جو مرتبہ اور مقام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو ان کا بلند درجہ ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے آپ نے ان کو دوران خطبہ اٹھ کر اپنے پاس بٹھایا اور اپنے اس عمل سے آپ نے یہ مسئلہ بتلایا کہ کم سن بچوں پر شفقت کرنی چاہیے اور اگر دوران وعظ کسی واعظ اور خطیب کو ایسی صورت حال سے سابقہ پڑ جائے تو اس کا اپنے بچوں کو دوران وعظ اٹھا لینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ آپ کی سنت بھی ہے اور آپ کا بچوں کے اٹھانے پر یہ آیت پڑھنا کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں یہ آپ کی تواضع اور آپ کا انکسار ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

(عَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ قَيْسٍ وَكَانَتْ تَحْتَ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ تَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ إِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ مَنْ أَصَابَهُ بِحَقِّهِ بُورِكَ لَهُ فِيهِ وَرُبَّ مُتَخَوِّضٍ فِيمَا شَاءَتْ بِهِ نَفْسُهُ مِنْ مَالِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لَيْسَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا النَّارُ) [رواہ الترمذی: کتاب الزہد، باب ماجاء فی اخذ المال بحقہ]

”حضرت خولہ بنت قیس (رض) جو کہ حمزہ بن عبدالمطلب (رض) کی بیوی تھیں فرماتی ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سنا آپ فرما رہے تھے بلاشبہ یہ مال خوشنما اور دلفریب چیز ہے جو کوئی اس کو حق کے ساتھ لے گا تو اس کے لیے برکت کی جائے گی اور کتنے ہی متکلف لوگوں کے دل اللہ اور اس کے رسول کے مال سے چاہ رہے ہوتے ہیں لیکن قیامت میں آگ کے سوا ان کے لیے کچھ نہ ہوگا۔“

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ (رض) قَالَ أَخَذَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بِمَنْکِبِی فَقَالَ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَأَنَّکَ غَرِیبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِیلٍ وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ یَقُولُ إِذَا أَمْسَیْتَ فَلَا تَنْتَظِرْ الصَّبَاحَ وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرْ الْمَسَاءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِکَ لِمَرَضِکَ وَمِنْ حَیَاتِکَ لِمَوْتِکَ) [رواہ البخاری : کتاب الرقاق، باب قول النبیکن فی الدنیا کانک غریب]

”حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے کندھے سے پکڑتے ہوئے فرمایا دنیا میں اس طرح رہو جس طرح تم اجنبی یا مسافر ہو اور عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے تھے جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب تم صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو اپنی صحت کو مرض سے پہلے غنیمت جانو اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو۔“ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ۭ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ○29

لغۃ القرآن: [یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ : اے لوگو ! جو] [اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے] [اِنْ : اگر] [تَتَّقُوا : تم لوگ تقوی کروگے] [اللّٰہَ : اللہ کا] [یَجْعَلْ : تو وہ بنا دے گا] [لَّکُمْ : تمہارے لیے] [فُرْقَانًا : ایک واضح فرق کرنے والا] [وَّیُکَفِّرْ : اور وہ دور کردے گا] [عَنْکُمْ : تم سے] [سَیِّاٰتِکُمْ : تمہاری برائیوں کو] [وَیَغْفِرْ : اور وہ معاف کردے گا] [لَکُمْ: تم کو] [وَاللّٰہُ : اور اللہ] [ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ : عظیم فضل والا ہے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اگر تم اللہ کا تقوی اختیار کرو گے (تو) وہ تمہارے لیے حق و باطل میں فرق کرنے والی حجت (و ہدایت) مقرر فرمادے گا اور تمہارے (دامن) سے تمہارے گناہوں کو مٹادے گا اور تمہاری مغفرت فرمادے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے

تشریح:

لغوی تشریح

فُرْقَانًا: اس لفظ کی جڑ "فرق" سے ہے، یعنی دو چیزوں کے درمیان تمیز اور تفریق۔ الطبری نے کہا: یہ وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی کے درمیان فرق کرتا ہے۔

يُكَفِّرْ عَنْكُمْ: یعنی آپ کے پچھلے گناہوں کو چھپاتا اور مٹا دیتا ہے۔ "کَفَرَ" اصل میں چھپانے کے معنی میں ہے۔

سَيِّئَاتِكُمْ: گناہ اور خطائیں۔

يَغْفِرْ لَكُمْ: یعنی آپ کے گناہوں سے درگزر کرتا ہے اور ان کو چھپاتا ہے، ساتھ ہی ان کے اثرات کو مٹا دیتا ہے۔

ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ: یعنی وہ جو بے حد و حساب عطا کرنے والا ہے۔

یہ آیت کریمہ سورۃ الانفال میں واقعہ بدر کے ذکر کے بعد آئی، جہاں مؤمنین کی تعداد کم ہونے کے باوجود مشرکین پر عظیم فتح کا ذکر ہے۔ تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ یہاں مؤمنین کو یاد دلاتے ہیں کہ حقیقی نصرت اور حق و باطل میں فرق صرف مادی طاقت سے نہیں، بلکہ تقویٰ سے ہے۔

تو آیت مؤمنین سے خطاب کرتی ہے: اگر تم تقویٰ الٰہی کو اپناؤ گے، تو وہ تمہارے لیے ایک روشنی فراہم کرے گا جس سے تم صحیح اور غلط میں فرق کر سکو گے، اور تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا، اور تمہیں بخش دے گا، کیونکہ سارا فضل اسی کی طرف سے ہے۔

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ وہ رب کریم ہر حال میں تقویٰ والوں اور ایمان والوں کا حامی و ناصر ہے اور انھیں دشمنوں کے شر سے بچانے والا اور شر پسندوں کے فتنوں سے دور فرمادینے والا ہے۔ اگلی آیت میں اپنے محبوب کو مخاطب فرما کر اس کی ایک واضح مثال ارشاد فرمارہا ہے۔

اسکا مختصر قصہ یہ ہے کہ جب ہجرت کی اجازت ہوئی اور صحابہء کرام نے مدینہ منورہ کا قصد کر لیا اور حضرت صدیق اکبر اور حضرت علی مرتضیٰ (رض) کے سوا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں کوئی نہ رہا تو قریش اس حال سے متردد ہو کر دارالندوہ میں جمع ہوئے اور ابلیس شیخ نجد کی صورت میں اس مجمع میں داخل ہوا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے باب میں مشورہ معلوم کیا۔ ایک کافر بولا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک گھر میں قید کر دینا چاہیے اور دروازہ مضبوط بند کر کے پیالے سے کھانا پانی دینا چاہیے یہاں تک کہ انھیں موت آجائے۔

ابلیس نے یہ صلاح پسند نہ کی کہ مدینہ کے بہت لوگ ایمان لا چکے ہیں اور ان کے یار وہاں جا پہنچے ہیں بنی ہاشم بھی اس شہر میں بہت ہیں سب متفق ہو کر تم سے لڑینگے اور انھیں چھڑالینگے۔ دوسرا بولا انھیں اس ملک سے نکال دینا چاہیے جہاں ان کا جی چاہے چلے جائیں۔

ابلیس بولا کہ وہ جہاں جاتے ہیں لوگ ان کے گرویدہ اور فریفتہ ہو جاتے ہیں تو بہت لوگوں کو فریب دینگے اور پھر آ کر تم سے مقاتلہ کرینگے۔

ابو جہل بولا کہ میری رائے یہ ہے کہ قریش اور ان کے حلفاءً کے ہر قبیلے میں سے ایک ایک آدمی کو جن لیا جائے جو سب کے سب اکٹھا مل کر ایک ہی ساتھ انھیں قتل کر دیں۔ اس طرح اس کا خون سب قبیلوں پھیل جائے گا اور بنی ہاشم سب قبیلوں سے نہیں لڑ سکتے تو ضرور با (رح) لضرور ویت پر راضی ہو جائینگے۔ ابلیس بولا کہ یہی رائے درست ہے۔

۔۔ چنانچہ ۔۔ ابو جہل نے ہر قبیلہ سے ایک ایک فرد کو جمع کیا اور طے کر دیا کہ آج ہی رات میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا جائے جس کی خبر حضرت جبرائیل نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک پہنچادی۔۔ چنانچہ ۔۔ آپ نے اس رات اپنے بستر شریف پر حضرت علی کو آرام کرنے کی ہدایت فرمادی اور خود حضرت صدیق اکبر کے ساتھ غار میں تشریف لے گئے۔ ارشاد الٰہی میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔۔ (تفسیر اشرفی)

شیخ نجدی نے اس رائے کو بہت پسند کیا اور ابو جہل کی فطانت و ذہانت کی تعریف کی آخر ش اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ ادھر حضرت روح الامین (علیہ السلام) بحکم رب العالمین عزوجل سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مشرکین مکہ کی خفیہ مٹنگ سے مطلع کر گئے اور عرض کر گئے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آج سے اپنی خواب گاہ پر شب باش نہ رہیں اور اللہ کی طرف سے اذن ہے کہ اب آپ مدینہ طیبہ کا عزم فرمالیں۔ یہ مبادیات ہجرت ہیں۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس روز مولائے کائنات سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کہ شب میں اپنی خوابگاہ پر شب باش رہنے کا حکم دیا اور اپنی ردا مبارک عطافرما کر ارشاد فرمایا کہ یہ اوڑھ کر سو یا کرو۔ اس کی برت سے کوئی ناگوار بات پیش نہ آئے گی۔ پھر دولت سرائے عالی سے باہر تشریف لائے اور ایک مشت خاک دست اقدس میں لی اور یہ آیہ کریمہ (ان جعلنا اعنقھم اغلالا پڑھ کر مشرکین محاصرین کی طرف پھینکی یہ معجزہ ہوا کہ وہ ایک مشت خاک تمام حضار کرنے والوں کی آنکھوں میں سر پر پڑی سب اندھے ہو کر آنکھیں ملتے رہ گئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہ دیکھ سکے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معہ رفیق غار سید صدیق اکبر (رض) کے سیدھے غار ثور میں تشریف لے آئے حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اپنی خواب گاہ پر چھوڑ آنے کی وجہ خاص یہ تھی کہ لوگوں کی امنتیں جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تھیں وہ آپ کے ذریعہ سب کو پہنچانی تھیں۔ مختصر یہ کہ مشرکین شی بھر سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دولت سرائے عال کے گرد پھرتے رہے۔ صبح جب بغرض قتل یکبارگی حملہ کر کے باب عالی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہاں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہیں ہیں بلکہ حضرت شیر خدا اسد اللہ ہیں۔ حضرت اسد اللہ سے پوچھا حضور کہاں ہیں۔ آپ نے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی۔ مایوس ہو کر تلاش کو نکلے حتیٰ کہ غار تک پہنچ گئے۔ ابو جہل نے طاق غار میں مکڑی کا جالا دیکھ کر کہا اگر یہاں سے کوئی داخل ہوا ہوتا تو یہ جالا ٹوٹ جاتا پھر کفار واپس چلے گئے اور حضور تین روز تک اس غار میں جلوہ افروز رہ کر مدینہ طیبہ کو روانہ ہو گئے۔ ارباب سیر نے اس واقعہ کو احادیث روایات کی روشنی میں ذرا وضاحت سے لکھ کر اور پر لطف بنا دیا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں علامہ خرپوتی شارح قصیدہ بردہ (رح) کا مضمون "طیب الردہ علی قصیدۃ البردہ" سے جو میری شرح ہے نذر ناظرین کرتے ہیں وھو ھذا۔

(فالصدق فی الغار والصدیق لم یرما وھم یقولون ما بالغار من ارم)

لفظی ترجمہ) سراپا صدق غار میں جلوہ فرما تھے اور صدیق اکبر بھی حاضر تھے اور سانپ کے ڈسنے سے آپ متورم بھی نہ ہوئے اور مشرکین وہاں دیکھ کر یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ اس غار میں کوئی نہیں ہے۔ شرح۔ لم یرما۔ یہ اس ورم انف کو کہا جاتا ہے جبکہ انسان غصہ میں نتھنے پھلاتا ہے۔ اس جگہ لم یرما کے معنی یہ بنیں گے کہ غار ثور میں سانپ کے ڈسنے پر بھی صدیق غضب ناک نہ ہوئے بلکہ قضاو قدر الٰہی پر راضی برضاو شاکر بقضا رہے۔ لم یرما۔ کو اگر ورم سے منا جائے تو ایک معنی یہوں گے کہ صدیق اکبر (رض) کا پائے مبارک لدغ حیہ کے بعد بھی متورم نہ ہوا۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ صدی قاکبر (رض) نے جو ایک سورخ باقی رہ گیا تھا اس کو اپنے پائے اقدس کے انگوٹھے سے بند فرمایا تو اس سوراخ میں جو سانپ تھا اس نے ڈس لیا۔ حضرت صدیق اکبر (رض) نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں اس کی شکایت کی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے لعاب دہن سے ان کا علاج فرمایا۔ باذن الٰہی عزوجل آپ کا پائے اقدس درست ہو گیا اور ورم وغیرہ

جاتا رہا۔ اور جنہوں نے لم یر یا مضارع کا تثنیہ بنا کر پڑھا ہے اسے رویت سے لیا ہے ان کا رد شیخ زادہ اور علامہ خرپوتی رحمہم اللہ نے کہا۔ شیخ زادہ (رح) فرماتے ہیں (وروی بعض لم یریا وما ذلك من الناظم وانما حمله علی ذلك المعجز عن التاویل۔ یعنی بعض نے لم یریا لکھا ہے لیکن یہ ناظم فاہم کے لفظ نہیں اور ایسے ہی علامہ خرپوتی (رح) فرماتے ہیں (وقرا بعض الناس لم یریا علی انه تثنیة مضارع من الرویة لکن رده شیخ زاده وآنا من الداخلین معه۔ بعض آدمیوں نے لم یریا تثنیہ مضارع رویت سے لے کر بنایا ہے۔ لیکن شیخ زادہ نے اس کا رد کیا اور ہم بھی ان کے ساتھ اس رد میں شریک ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ لم یر یا جو پڑھے گا وہ ایجادی طور پر پڑھے گا۔ قصیدہ کے ورد میں یم یرما پڑھنا چاہیے اس لیے کہ شیخ زادہ خرپوتی رحمہم اللہ اس کے خلاف ہیں اور شیخ زادہ (رح) تو نہایت وثوق سے فرماتے ہیں که وما لذلك من الناظم که لم یرما امام بوصیری کی زبان نکلا ہوا لفظ نہیں ہے تو اب حاصل مفہوم بیت یہ ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے جان نثار صدیق (رض) جب داخل غار ثور ہوئے تو اس میں قضا و قدر الٰہی عزوجل کے ساتھ نہایت راضی رہے اور حکم الٰہی عزوجل پر غضب ناک نہ ہوئے اور کفار مکہ قدموں کے کھول لیتے درواہ غار تک آ گئے مگر ان دونوں طالب و مطلوب۔ شمع نبوت اور اس کے پروانہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں لے لیا جب کفار کھوج لے کر اس غار تک آئے تو یہاں سے کھوج غائب دیکھ کر پہاڑ پر چڑھ گئے تو حضرت صدیق اکبر (رض) نے عرض کیا (لو ان احدهم نظر الی قدمیه لا نصرنا۔ حضور اگر کسی بے ایمان نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں یہاں دیکھ لیں گے۔ حضور نے فرمایا ابا بکر ماظنک باثنین اللہ ثالثہما۔ ابو بکر تمہارا ان دو کے متعلق کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔ چنانچہ حمایت و نصرت الٰہی عزوجل کی شان آئندہ بیت میں فرماتے ہیں۔ ع

ظنوا الحمام وظنوا العنکبوت علی خیر البریة لم تنسبح ولم تحم

(لفظی ترجمہ) مشرکین نے گمان کیا کبوتر کو اور گمان کیا مکڑی کو یہ خیر عالم پر جالا تاننے والی نہیں ہے اور نہ کبوتر انڈے دینے والا۔ شرح: ظاہری سب کفار کے نہ دیکھنے کا یہ ہوا کہ انھوں نے غار کے منہ پر دیکھا کہ کبوتر انڈے دیئے بیٹھا ہے اور مکڑی جالا پارے ہوئے ہے تو انھیں گمان ہوا کہ اگر اس میں سے کوئی جاتا تو یہ جالا ٹوٹ جاتا۔ کبوتر کا گھونسلہ خراب ہو جاتا۔ انڈے ٹوٹ جاتے ان دلائل کے ماتحت فیصلہ کیا کہ اس غار میں ہرگز کوئی نہیں ہے۔ اس طرف ان کا ذہن نارسا جا ہی نہیں سکتا تھا کہ اللہ کے محبوب و صدیق کے لیے یہ مکڑی اور کبوتر یہاں آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے شیون قدرت کا اس صورت میں مظاہرہ فرمایا ہے کہ کفار شریر النفس اشد ترین انسان نما حیوانوں سے ایک کمزور ترین مخلوق کے ذریعہ یہ حفاظت کی کہ بیضہ حمام بروج مشیدہ بن گئے اور تار عنکبوت جسے قرآن (ان اوهن البیوت لبیت العنکبوت) فرما رہا ہے ایک مستحکم قلعہ بنا دیا گیا۔ غالباً اسی بنا پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے محرم محترم کے رہنے والے کبوتر اور مکڑی کے مارنے کو منع فرمایا۔ صاحب بندہ فرماتے ہیں (نھی (علیہ السلام) عن قتل العنکبوت والحمام الکائینین فی الحرم) اور عام طور پر مکڑی کے لیے حکم ہے (العنکبوت شیطان مسخه اللہ تعالیٰ فاقتلوه) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مکڑی شیطان ہے اللہ نے اسے مسخ فرمایا اسے مار دیا کرو (ذکرہ فی الجامع الصغیر) اور ثعلبی (رح) سے مروی ہے علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ (طهروا بیتکم من انسج العنکبوت فان ترکه فی البیوت یورث الفقر۔ اپنے گھروں کو مکڑی کے جالے سے پاک رکھو اگر گھروں میں جالا چھوڑا تو وہ تنگدستی پیدا کرے گا۔ حلیہ میں ہے (نسجت العنکبوت مرتین علی الانبیاء مرة علی داؤد (علیه السلام) حین کان جالوت یطلبه ومرة علی النبی (علیه السلام) فی الغار) مکڑی نے دوبارہ انبیاء (علیهم

السلامہ) پر جالا تنا ایک بار داؤد (علیہ السلام) پر جبکہ جالوت آپ کی تلاش میں تھا اور دوسری بار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے غار پر۔
ویلمی (رح) نے جت فردوس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال ہوا کہ مسخ شدہ جانور کتنے ہیں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (ھذا الفیل (ہاتھی) والدب (ریچھ) والخنزیر (سور) والقرد (بندر) والحریت (مچھلی مخصوص) والصب گوہ والوزغ (چھپکلی) والعقرب (بچھو) والدعموس (کرم آبی) والعنکبوت (مکڑی) والارنب (خرگوش) والسھیل (ستارہ) والزھرۃ (ستارہ) امیہ بن خلف نے باوجود قطعی مایوسی کے غار میں داخل ہوکر دیکھنا چاہا تو اسے کہا گیا کہ ما تصنع فی الغار وان علیہ عنکبوتا کانت قبل میلاد سید الابرار)A کیا کرتا ہے غار میں جا کر اس غار کے منہ پر یہ مکڑی تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت سے بھی پہلے کی ہے۔
اور وہ اپنے مکر کر رہے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی تدبیر سب سے بہتر ہے اور جب پڑھی جائیں ان پر ہماری آیتیں تو کہتے ہیں ہاں ہم نے سنا ہم چاہتے تو ایسے ہم بھی کہہ دیتے۔ یہ کچھ نہیں مگر اگلوں کے قصے ہیں۔آیات کریمہ کا شان نزول نضر بن خارث کے حق میں ہے اور وہ اخبث سرکش تھا جس نے حضور سید یوم النشور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قرآن پاک سن کر بکواس کی تھی کہ اگر ہم چاہتے تو ایسی ہی کتاب بنا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ قول بیان فرمایا اور ظاہر کیا کہ یہ اس کی انتہائی بے حیائی کا دعویٰ تھا۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فصحائے عرب کو قرآن کریم کی مثل ایک سورت بنالانے کی دعوت دی اور وہ سب اس کے مقابلہ میں عاجز آگئے اس وقت نضر بن حارث کہاں گم ہو گیا تھا۔ حال آنکہ اس وقت بھی تو یہ نضر بن حارث ان میں موجود تھا۔ آج اس کی یہ ڈھٹائی خالص بکواس اور ذلیل حرکت ہے۔ اور جب وہ بولا یعنی نضر بن حارث اور ابو جہل بن ہشام (کمار واہ البخاری والمسلم) اے اللہ اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا اور اللہ کا یہ کام نہیں کہ انھیں عذاب کرے جب تک (اے محبوب) آپ ان میں تشریف فرما ہوں اس لیے کہ ہم نے آپ کی ذات اقدس کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ اور عادت اللہ یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں اس کا نبی موجود ہو اس پر عام عذاب نہیں بھیجا جاتا جو سب کی ہلاکت کا موجب ہو۔ مفسرین کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ یہ آیت صرف اور صرف حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ مکہ مکرمہ میں جلوہ افروز تھے بعد ازاں جب آپ نے ہجرت فرمائی اور کچھ مسلمان وہاں رہ گئے جو استغفار کر رہے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر الحسنات)
اس آیت میں ان تین چیزوں کو بیان فرمایا گیا ہے جو تقوی کے نتیجے میں اس کے صلے کے طور پر عطا ہوتی ہیں، پہلی چیز "فرقان" ہے، جس کا معنی ہے فرق کرنے والی چیز، اس کا ایک معنی فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقین اور ان کے مخالفین کے درمیان دنیا میں فیصلہ فرمائیں گے کہ متقین کو عزت و فتح عطا فرمائیں گے اور مخالفین کو ذلت و ہلاکت سے دوچار کریں گے، جیسا کہ غزوہ بدر وغیرہ میں ہوا، اور آخرت میں یہ فیصلہ ہونا تو واضح ہے۔ اس کا دوسرا معنی قوت فیصلہ ہے، تقوی کی بدولت دل میں ایک نور اور صلاحیت پیدا کر دی جاتی ہے جس سے حق و باطل سچ اور جھوٹ، کھرے اور کھوٹے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ دوسری چیز کفارہ سیئات ہے، یعنی لغزشوں اور خطاؤں کے بعد ایسے اعمال کی توفیق ہوتی ہے جو ان کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں، تیسری چیزی مغفرت ہے، جس میں آخرت کی مغفرت اور سب گناہوں کی معافی شامل ہے۔ (تفسیر فہم القرآن)

فرقان سے مراد وہ چیز ہے جو حق و باطل میں فرق کرے۔

اس کے متعلق مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے نور اور بصیرت قلبی مراد ہے جس سے تم حق و باطل میں تمیز کرو گے۔ فراست مومن کا جو لفظ حدیث میں آیا ہے اس سے یہی قلبی بصیرت مراد ہے جو کہ تمام نعمتوں کے لئے بمنزلہ سر چشمہ ہے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو (آگاہ رہو) وہ اللہ تعالیٰ کے نور یعنی خداداد نور بصیرت سے دیکھتا ہے (رواہ البخاری فی التاریخ والترمذی والطبرانی عن ابی سعید الخدری والطبرانی عن ابی امامۃ وابن عدی ایضا عنہ وابن جریر الطبری عن ابن عمر)

دوسری حدیث ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا خواہ مفتی تجھے فتوی دے چکے ہو مگر تو پھر بھی اپنے دل سے فتویٰ طلب کر (رواہ البخاری فی التاریخ عن وابصۃ بسند حسن) یہ قلبی فتوی ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتا یہ اسی وقت ہوتا ہے جب تلک شیشہ صاف و شفاف ہو جس میں کسی قسم کا گرد و غبار نہ ہو اور نفس تمام بری باتوں سے پاک ہو گیا ہو اور قلب کی نفسانیت مکمل فنا ہو چکی ہو۔ صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کا نام کشف باطنی ہے اور یہ مقام نفس مطمئنہ کا ہے یہ بہت اونچا مقام ہے جس کی بنیاد زہد و ریاضت وغیرہ پر ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ فرقان سے مراد نصرت الہی ہے جس سے اہل حق اور باطل پرستوں میں فرق ہو جاتا ہے اہل ایمان کو باعزت اور اہل کفر کو ذلیل کیا جاتا ہے جیسے غزوہ بدر میں اس کا ظہور ہو گیا اور غزوہ بدر کو یوم الفرقان کا نام دیا گیا یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ امام مجاہد نے کہا یعنی اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں متقیوں کے لیے تمام خطرات اور ہولناکیوں سے بچاؤ کا راستہ بنا دے گا مقاتل بن حیان نے کہا کہ دین میں شکوک و شبہات واقع ہونے سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتادے گا۔ بخاری کا قول اول الذکر تفسیر کے قریب ہے جس میں فرقان سے بصیرت قلبی مراد لی گئی ہے (مظہری)

وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ۔ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔ اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ امام بزار نے حضرت انس کی روایت لکھا ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کے تین رجسٹر (اعمال نامہ) سامنے لائے جائیں گے ایک رجسٹر نیک اعمال کا دوسرا رجسٹر گناہوں کا اور تیسرے رجسٹر میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی نعمتوں کا اندراج ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے اس بندہ کو عنایت کی ہیں پھر انعامات کے رجسٹر میں سے کسی حقیر ترین نعمت کو حکم ہو گا کہ تو اپنے مقابل کسی عمل صالح کو وصول کر لے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس حقیر نعمت کا مقابلہ بندہ کے نیک عمل سے کیا جائے گا تو اس نعمت کے مقابل تمام نیک اعمال بھی پورے نہ اتریں گے نعمت کہے گی تیری عزت کی قسم میں نے تو پورے اعمال کو بھی اپنے مقابل نہیں پایا نیک اعمال سب ختم ہو گئے مگر تمام گناہ ابھی باقی ہیں اور دوسری نعمتیں بھی موجود ہیں اب اگر اللہ تعالیٰ کو کسی بندہ پر رحم کرنا مقصود ہو گا تو فرمائے گا میرے بندے میں نے تیری نیکیاں دو چند کر دیں اور تیری بداعمالیاں معاف کر دیں اور تجھے اپنے انعام و بخشش سرفراز کیا، گویا نیک اعمال نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے انعام و کرم سے اور اس کی بے پناہ رحمت سے بندہ کی بخشش ہو جائے گی (مظہری)

ظاہر ہے کہ بندہ کے نیک اعمال اگرچہ اس کی عمر 500 سال ہو اور پوری عمر اس نے نیکیاں ہی نیکیاں بجالائی ہوں پھر بھی اس کی نیکیاں محدود ہوں گی۔ جب کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کی جو بارش کی ہے وہ غیر محدود اور بیشمار ہوں گی جن کا حساب و شمار اور احاطہ نہیں ہو سکتا پس کوئی

بھی شخص یہاں تک کہ انبیاء کرام بھی اپنی نیکیوں سے جنت میں نہیں جائیں گے ہاں اس کے کرم اور رحمت ہی سے سارے جنتی جنت میں جائیں گے یہی خلاصہ ہے صحیح احادیث نبوی کا۔ (متفق علیہ)

طبرانی نے حضرت واسلہ بن اسقع کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایک ایسے بندہ کو قبر سے اٹھائے گا جس کا (اس کے اعمال نامہ میں) کوئی گناہ درج نہ ہوگا۔ اللہ اس سے فرمائے گا: (تیرا کوئی گناہ درج نہیں 'تو بے گناہ ہے) اب بتا 'تجھے تیرے نیک اعمال کے مطابق جزا دی جائے یا میں اپنے انعام کی وجہ سے تجھے ثواب دوں؟ تجھے دونوں باتوں میں سے کونسی بات پسند ہے؟ بندہ عرض کرے گا: پروردگار! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیری کوئی نافرمانی نہیں کی 'اس لیے میری نیکیوں کا ثواب عطا فرما۔ اللہ فرمائے گا: میرے بندے کی نیکیوں کا میری نعمتوں سے مقابلہ کرو۔ نتیجہ میں کوئی نیکی ایسی نہ بچے گی کہ جس کے مقابل بندہ کو نعمت نہ دے دی گئی ہو (ایسی حالت میں تمام نیکیوں کا معاوضہ دنیوی نعمتوں کی شکل میں مل چکا ہوگا اور کوئی نیکی قابل ثواب باقی نہ رہے گی 'ناچار ہوکر) بندہ عرض کرے گا: اپنی رحمت اور انعام سے مجھے ثواب عطا فرما۔ اسی بناء پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تھا کہ تم میں سے کسی شخص کو اس کا (نیک) عمل نہیں بچائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا آپ بھی (اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پائیں گے) فرمایا: نہ میں بھی بغیر اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت و فضل سے ڈھانک لے۔ متفق علیہ من روایۃ ابی ہریرۃ۔

صحیحین میں حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: راستی اختیار کرو اور (پوری راستی ممکن نہ ہو تو) راستی کے قریب آجاؤ اور بشارت پاؤ کیونکہ تم میں سے کسی کے اعمال تو جنت میں لے جانے والے نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا آپ بھی (اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے) فرمایا: نہ میں بھی بغیر اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔ اسی کی طرف اللہ نے اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یعنی اللہ نے نیک اعمال کے اجر کا جو وعدہ کیا ہے 'اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہارا تقویٰ موجب اجر ہے بلکہ یہ تو محض اللہ کا کرم اور مہربانی ہے (کہ اس نے نیک اعمال کو نجات کا ذریعہ بنا دیا ہے ورنہ تمام نیک اعمال تو اس قابل بھی نہیں کہ اللہ کے دنیوی احسانات کا بدل ہوسکیں) جیسے کوئی آقا کسی کام کے کرنے پر اپنے غلام کیلئے کوئی انعام مقرر کر دے (تو یہ محض اس کی مہربانی ہوگی) ورنہ اس خدمت کی انجام دہی تو غلام کیلئے ویسے بھی ضروری ہوتی ہے۔

بعض اہل تفسیر نے یُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تمہارے صغیرہ گناہ ساقط کر دے گا اور کبیرہ گناہ معاف فرما دے گا۔ (تفسیر مظہری)

آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے فرمایا اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کے اجر کا جو وعدہ کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہارا تقوی موجب اجر ہے بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے کہ اس نے نیک اعمال کو نجات کا ذریعہ بنا دیا ہے ورنہ تمام نیک اعمال تو اس قابل بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دنیوی احسانات کا بدلہ ہوسکیں جیسے کوئی آقا صاحب کسی کام پر اپنے غلام کے لیے انعام مقرر کرے یہ تو محض اس کی مہربانی ہے ورنہ خدمت کی انجام دہی بغیر انعام کے اس غلام کا فریضہ ہے اور اس پر ہر حال میں لازم ہے۔

علامہ سیوطی (رح) نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد نے 500 سال دریا کے کنارے عبادت میں گزارے ساری رات نماز پڑھتا رہا اور پوری زندگی روزہ رکھا وہاں ایک درخت انار تھا روزانہ ایک انار تیار ہوتا تھا جسے وہ تناول کر کے افطار کرتا تھا جب اس کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے فضل و کرم سے جنت میں جاؤ یہ بات اس پر گراں گزری کہ جنت مجھے فضل سے مل رہی ہے میری پانچ سو سالہ ریاضتوں کی کوئی قیمت ہی نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کا منہ جہنم کی طرف پھیر دو پس کیا ہوا کہ اس پر ناقابل برداشت

پیاس کا حملہ ہوا جس سے وہ نہایت بے قرار ہو کر تڑپنے لگا فرشتہ کو حکم ہوا کہ ایک گلاس پانی کا اس کے سامنے ہاتھ میں لے کر اسے دکھاؤ جب اس نے پانی دیکھا کہنے لگا یہ مجھے پلاؤ ملک نے کہا کہ اس کی قیمت ادا کرو تب یہ آپ کو ملے گا وہ کہنے لگا اس کی قیمت کیا ہے فرشتہ نے کہا پانچ سو سالوں کی عبادت کہنے لگا مجھے منظور ہے میں نے دے دیا تب اسے پانی لا کر پلایا ایک ہی نعمت کے عوض پورا سرمایہ ہاتھ سے نکل گیا اب سمجھ گئے اور عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھے خاص اپنے فضل سے جنت عطا کر (در منثور)

اندازہ لگائیں اللہ تعالیٰ کی ایک حقیر نعمت انسانوں کی پانچ سو سالہ نیکیوں کی قیمت سے بڑھ کر ہے اور ایک نعمت پورے سرمایہ عمل کو کھا کر ختم کر سکتی ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)

کبیرہ گناہوں کے اجتناب سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں

اللہ سے ڈرتے رہنے کا معنی ہے تقویٰ اختیار کیے رہنا۔ اور تقویٰ کا معنی ہے ایمان لانے کے بعد تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا اور تمام محرمات اور مکروہات سے اجتناب کرنا۔ تقویٰ کا پہلا مرتبہ مراد ہے یعنی کبیرہ گناہ سے بچنا۔ کیونکہ اس پر جو دوسری جزاء مرتب کی ہے وہ ہے تمہارے گناہوں کو مٹادے گا۔ اور شرط اور جزاء میں تغایر ہوتا ہے، اس لیے اس آیت کا معنی ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو گے تو اللہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو مٹادے گا۔

مومنوں اور کافروں کا دنیا اور آخرت میں فرق

اللہ سے ڈرتے رہنے اور تقویٰ اختیار کرنے پر جو پہلی جزا مرتب کی ہے وہ ہے تمہیں کفار سے الگ اور ممتاز کر دے گا۔ اس سے مراد یا دنیا میں الگ اور ممتاز کرنا ہے یا آخرت میں۔ اگر دنیا میں مسلمانوں کو کافروں سے الگ اور ممتاز کرنا مراد ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں اپنے احوال باطنہ اور احوال ظاہرہ کے لحاظ سے کافر سے ممتاز ہوتا ہے۔ احوال باطنہ سے اس لیے کہ کافر کے دل میں اللہ کا انکار ہوتا ہے اور مسلمان کے دل میں اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور کافر کا دل کینہ، بغض، حسد اور مکر و فریب سے پر ہوتا ہے اور مومن کا دل ان تمام اوصاف رذیلہ سے پاک اور صاف ہوتا ہے۔ اور مسلمان جس قدر اللہ کی اطاعت کرتا ہے اس کے دل میں اللہ کی معرفت کا نور بڑھتا جاتا ہے۔ اور جب اس کے دل میں یہ انوار اور تجلیات ہوں تو پھر ان اوصاف رذیلہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور احوال ظاہرہ میں مومن کافر سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ مومن کو اللہ کی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے جبکہ کافر اللہ کی تائید اور نصرت سے محروم ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مومن آخرت میں کافر سے ممتاز ہو گا تو یہ بالکل ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں پر آخرت میں لطف و کرم فرمائے گا ان کو اجر و ثواب عطا فرمائے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا اور کافروں کو ذلیل و رسوا کر کے دوزخ میں داخل کر دے گا۔

پھر فرمایا: اور تم کو بخش دے گا۔ اگر دوسرے جز میں گناہوں کے مٹانے سے مراد صغیرہ گناہوں کا معاف کرنا ہو تو بخشنے کا معنی یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے مسلمانوں کے کبیرہ گناہ بھی بخش دے گا یا اپنے فضل محض سے کبیرہ گناہوں کو بخش دے گا

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گناہوں کو مٹ آنے سے مراد دنیا میں گناہوں پر پردہ رکھنا ہو اور بخشنے سے مراد آخرت میں گناہوں کو بالکلیہ زائل کرنا ہو۔

جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیا میں گنہگاروں کے لیے شفاعت کر دی ہے تو آخرت میں شفاعت کیوں ہو گی؟

ایک دفعہ مجھ سے ایک عالم نے سوال کیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر جمعرات کو مجھ پر تمہارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں جو نیک عمل ہوں ہیں ان پر اللہ کی حمد کرتا ہوں اور جو گناہ ہوں تو میں تمہارے گناہوں پر استغفار کرتا ہوں۔ (الوفا باحوال المصطفیٰ ص 801)
اور حضرت جابر (رض) سے ایک طویل حدیث کے آخر میں ہے ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو، یا جن کے دل میں ایک جو کے برابر بھی نیکی ہو۔ ان کو جنت کے صحن میں ڈال دیا جائے گا۔ اہل جنت ان کے اوپر پانی چھڑکیں گے۔ پھر ان سے جلن کے آثار دور ہوں گے اور زندگی اور تروتازگی کے آثار نمودار ہوں گے۔ (صحیح مسلم الایمان 316 (191) 461)
تو جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیا میں گنہگاروں کے لیے استغفار کر لیا تو پھر حشر میں شفاعت کیوں ہو گی! اور جب دنیا اور قبر میں شفاعت ہو چکی تو پھر بعض گنہگاروں کو دوزخ میں عذاب کیوں ہو گا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان ہی کے لیے شفاعت فرمائیں گے جن کی شفاعت کی اللہ آپ کو اجازت دے گا۔ اور یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے بعض گنہگاروں کی شفاعت کی اجازت آپ کو دنیا میں دے اور بعض کی شفاعت کی اجازت آپ کو حشر میں دے، اور جن کو دوزخ میں ڈالا جائے گا ان کی شفاعت کی اجازت آپ کو نہ دے بلکہ محض اپنا فضل ظاہر فرمانے کے لیے کسی کی شفاعت کے بغیر اپنے مجرد کرم سے ان کو بخش دے اور دوزخ سے نکال لے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی شفاعت کی وجہ سے ان کو صرف صورۃً عذاب ہو اور حقیقتاً عذاب نہ ہو کیونکہ عذاب تو درد کے ادراک اور احساس کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ جب ان کو دوزخ میں ڈالے تو ان کا ادراک اور احساس زائل کر دے اور اس کو عذاب کو بالکل پتا نہ چلے جیسے بیہوش کر کے سرجری اور جراحی کا عمل کرتے ہیں تو مریض کو چیر پھاڑ کا بالکل پتا نہیں چلتا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل محض سے ان کو دوزخ سے نکال لے اور ان سے جلنے اور عذاب کے آثار کو دور کر دے۔ دوسرا جواب میں نے یہ دیا کہ ہو سکتا ہے دنیا میں آپ ان کی پردہ پوشی یا تخفیف عذاب کے لیے یا قبر کے عذاب سے نجات کے لیے استغفار کریں اور حشر میں بالکلیہ عذاب سے نجات کے لیے استغفار کریں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل

اس کے بعد فرمایا: اللہ بڑے فضل والا ہے۔ اور یہ اس کا کتنا بڑا فضل ہے کہ نیکی کرنے کا جذبہ بھی دل میں وہ پیدا کرتا ہے۔ پھر اس نیک کام کو کرنے کے لیے بدن میں طاقت اور منہ میں زبان بھی وہ پیدا کرتا ہے۔ اس نیک کام کے لیے جن دیگر اسباب اور ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ان کو بھی وہ پیدا کرتا ہے، اس نیکی کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کو بھی وہ دور کرتا ہے۔ پھر ہم سے کہتا ہے کہ لو یہ تمہارے نیک کاموں

کا اجر ہے ! بعض اوقات ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ شخص اس نیکی سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً وہ ایک بھوکے کو کھانا کھلانا چاہتا ہے لیکن اس کے منہ میں کینسر ہے وہ کھا نہیں سکتا۔ ایک شخص کسی مریض کو صحت یاب کرنے کے لیے بے دریغ پیسہ خرچ کرتا ہے لیکن اس کو کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا، اور بعض اوقات کوئی مانع اور رکاوٹ نہ ہو لیکن جس کے ساتھ ہم نیکی کرنا چاہتے ہیں وہ ہماری نیکی قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو جس کو ہم نے کھانا کھلا دیا، تو یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے کھانے والے میں کھانے کی صلاحیت پیدا کی۔ ہم نے جس کا علاج کیا تو یہ بھی اس کا کرم ہے کہ اس نے دواؤں میں شفا کی تاثیر رکھی، اور ہم نے جس کے ساتھ نیکی کی تو یہ بھی اس کا فضل ہے کہ اس نے اس شخص میں ہماری نیکی قبول کرنے پر آمادگی پیدا کی سب کچھ تو اس نے کیا ہے پھر اس کا کتنا فضل ہے کہ ہم سے کہتا ہے کہ لو یہ اپنی نیکیوں کا انعام اور اجر وثواب لے لو۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ 30

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [يَمْكُرُ : سازش کی] [بِكَ : آپ کے لیے] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں نے جنھوں نے] [كَفَرُوْا : کفر کیا] [لِيُثْبِتُوْكَ : کہ وہ قید کریں آپ کو] [اَوْ : یا] [يَقْتُلُوْكَ : قتل کریں آپ کو] [اَوْ : یا] [يُخْرِجُوْكَ : نکال دیں آپ کو] [وَ : اس حال میں کہ] [يَمْكُرُوْنَ : وہ لوگ چال چلتے تھے] [وَيَمْكُرُ : اور تدبیر کرتا تھا] [اللّٰهُ : اللہ] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ : تدبیر کرنے والوں کا بہترین ہے]

ترجمہ: اور جب کافر لوگ آپ کے خلاف خفیہ سازشیں کر رہے تھے کہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو (وطن سے) نکال دیں، اور (اِدھر) وہ سازشی منصوبے بنا رہے تھے اور (اُدھر) اللہ (ان کے مکر کے ردّ کے لیے اپنی) تدبیر فرما رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر مخفی تدبیر فرمانے والا ہے

تشریح:

اہل یثرب میں اسلام کی روشنی پھیلنے سے کفار مکہ کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی تھی کہ کہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ہجرت کر کے انھیں کے پاس نہ چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر اسلام کے خطرہ کا سد باب ان کے اختیار سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے انھوں نے اپنی قوم پارلیمنٹ (دار الندوہ) میں قوم کے مفکرین اور دانشوروں کا اجلاس طلب کیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت میں اس واقعے کا ذکر ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے ذکر فرمایا کہ کفار قریش دارالنّدوہ (یعنی کمیٹی گھر) میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوئے اور ابلیس لعین ایک بڈھے کی صورت میں آیا اور کہنے لگا کہ میں نجد کا شیخ ہوں، مجھے تمہارے اس اجتماع کی اطلاع ہوئی تو میں آیا، مجھ سے تم کچھ نہ چھپانا میں تمہارا رفیق ہوں اور اس معاملہ میں بہتر رائے سے تمہاری مدد کروں گا۔ انھوں نے اس کو شامل کر لیا اور تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق رائے زنی شروع ہوئی۔ ابوالبختری نے کہا کہ "میری رائے یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پکڑ کر ایک مکان میں قید کر دو اور مضبوط بندشوں سے باندھ کر دروازہ بند کر دو، صرف ایک سوراخ چھوڑ دو جس سے کبھی کبھی کھانا پانی دیا جائے اور وہیں وہ ہلاک ہو کر رہ جائیں۔ اس پر شیطان لعین جو شیخ نجدی بنا ہوا تھا بہت ناخوش ہوا اور کہا: بڑی ناقص رائے ہے، جب یہ خبر مشہور ہو گی تو ان کے اصحاب آئیں گے اور تم سے مقابلہ کریں گے اور انھیں تمہارے ہاتھ سے چھڑا لیں گے۔ لوگوں نے کہا: شیخ نجدی ٹھیک کہتا ہے۔ پھر ہشام بن عمرو کھڑا ہوا، اس نے کہا میری رائے یہ ہے کہ ان کو (یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو) اونٹ پر سوار کر کے اپنے شہر سے نکال دو، پھر وہ جو کچھ بھی کریں اس سے تمہیں کچھ ضرر نہیں۔ ابلیس نے اس رائے کو بھی ناپسند کیا اور کہا: جس شخص نے تمہارے ہوش اڑا دیئے اور تمہارے دانشمندوں کو حیران بنا دیا اس کو تم دوسروں کی طرف بھیجتے ہو! تم نے اس کی شیریں کلامی نہیں دیکھی ہے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ دوسری قوم کے دلوں کو تسخیر کر کے ان لوگوں کے ساتھ تم پر چڑھائی کر دیں گے۔ اہل مجمع نے کہا: شیخ نجدی کی رائے ٹھیک ہے۔ اس پر ابو جہل کھڑا ہوا اور اس نے یہ رائے دی کہ قریش کے ہر ہر خاندان سے ایک ایک عالی نسب جوان منتخب کیا جائے اور ان کو تیز تلواریں دی جائیں، وہ سب یکبارگی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حملہ آور ہو کر قتل کر دیں تو بنی ہاشم قریش کے تمام قبائل سے نہ لڑ سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ انھیں خون کا معاوضہ دینا پڑے گا اور وہ دے دیا جائے گا۔ ابلیس لعین نے اس تجویز کو پسند کیا اور ابو جہل کی بہت تعریف کی اور اسی پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے سرکار کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ پیش کیا اور عرض کی کہ حضور! رات کے وقت اپنی خواب گاہ میں نہ رہیں، اللہ تعالیٰ نے اذن دیا ہے، آپ مدینہ طیبہ کا عزم فرمائیں۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی المرتضٰی (رض) کو رات میں اپنی خواب گاہ میں رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہماری چادر شریف اوڑھ لو تمہیں کوئی ناگوار بات پیش نہ آئے گی اور حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دولت سرائے اقدس سے باہر تشریف لائے اور ایک مشت خاک دست مبارک میں لی اور آیت "اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنٰقِهِمۡ اَغۡلٰلًا" پڑھ کر محاصرہ کرنے والوں پر ماری، سب کی آنکھوں اور سروں پر پہنچی، سب اندھے ہو گئے۔ (تفسیر صراط الجنان)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اہل مکہ کی امانتیں حضرت علی (رض) کے سپرد کیں، باہر تشریف لائے، مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور سورۃ یٰسین کی درج ذیل آیت پڑھ کر مٹی اپنے دشمن نوجوان پر پھینک دی: "ہم نے بنا دی ان کے سامنے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار، ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پس وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے"۔ (قرآن: ۳۶:۹)

چنانچہ وہ سارے نوجوان نیند سے اونگھنے لگے اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے درمیان سے گزر کر حضرت ابو بکر صدیق (رض) کے گھر تشریف لے گئے اور ان کو ساتھ لے کر غار ثور کی طرف روانہ ہو گئے۔ (ضیاء النبی: جلد ۳: ص ۵۸)

اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہ دیکھ سکے۔ اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابو بکر صدیق (رض) کے ہمراہ غار ثور میں تشریف لے گئے اور حضرت علی المرتضٰی (رض) کو لوگوں کی امانتیں پہنچانے کے لیے مکہ مکرمہ میں چھوڑا۔ مشرکین رات بھر سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دولت سرائے اقدس کا پہرہ دیتے رہے، صبح کے وقت جب قتل کے ارادہ سے حملہ آور ہوئے تو دیکھا

کہ بستر پر حضرت علی (رض) ہیں۔ ان سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں دریافت کیا کہ کہاں ہیں تو انھوں نے فرمایا: ہمیں معلوم نہیں۔ کفار قریش تلاش کے لیے نکلے، جب غار ثور پر پہنچے تو مکڑی کے جالے دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر اس میں داخل ہوتے تو یہ جالے باقی نہ رہتے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس غار میں تین دن ٹھہرے پھر مدینہ طیبہ روانہ ہوئے۔ (تفسیر صراط الجنان)

مکر کا (لغوی) معنی ہے کسی تدبیر سے دوسرے کو اس کے مقصد سے پھیر دینا۔ مکر کی دو قسمیں ہیں: اچھا 'برا۔ اگر اچھا فعل مقصود ہو تو اچھا مکر ہے اور برا فعل مقصود ہو تو برا مکر ہے (گویا مکر کی اچھائی برائی مقصد کی اچھائی برائی سے وابستہ ہے) مکر کی ابتدائی نسبت اللہ کی طرف صحیح نہیں کیونکہ مطلق مکر سے برے مکر کی طرف ذہنی انتقال ہو سکتا ہے 'ہاں اگر دوسروں کے مکر کے مقابل اللہ کی طرف مکر کی نسبت کی جائے تو درست ہے (یعنی دوسروں کا مکر جب مذموم اور برا ہوگا اور اس کے مقابل اللہ کی طرف مکر کی نسبت کی جائے گی تو لامحالہ اللہ کا مکر اچھا ہی ہوگا اور برا مکر ہونے کا وہم بھی نہ ہو سکے گا)۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ قریش سازشیں کر رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت اکارت جائے اور اللہ کا نور بجھ جائے اور اللہ تدبیر کر رہا تھا کہ اس کا نور پھیل جائے اور کام پورا ہو جائے اور اللہ کے دشمن تباہ ہو جائیں۔

واللہ خیر الماکرین۔ اور سب سے مستحکم اور بہتر تدبیر کرنے والا اللہ ہے کیونکہ اللہ کی ہر تدبیر اور عمل اچھا اور خیر ہی خیر ہے۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک اللہ کے مکر کا معنی ہے مشرکوں کی سازشوں کو ناکام بنا دینا۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ مشرکوں کے مکر کے بدلہ کو اللہ کا مکر کہا گیا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ مکر اللہ کا معنی ہے: بندہ کو ڈھیل دینا اور دنیوی سامان وعیش پر اس کو قابو عطا کرنا۔ اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جس کو دنیوی فراخی حاصل ہو اور وہ اس فراخ حالی کو اللہ کا مکر (ڈھیل) نہ سمجھے 'وہ فریب خوردہ ہے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت علی نے اپنی جان کا ایثار کیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لباس پہن کر آپ کی جگہ سو گئے۔ مشرک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تاک رہے تھے مگر وہاں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جگہ حضرت علی تھے اور حضرت علی کو ہی وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سمجھے ہوئے تھے۔ حضرت علی سوتے میں جب کروٹ لے کر سیدھے ہوئے تو مشرکوں کو حضرت علی کی شکل نظر آئی۔ کہنے لگے: تو بڑا کمینہ ہے 'تیرا ساتھی تو کروٹ نہیں لیتا تھا اور تو (سوتے میں) کروٹ لیتا ہے 'ہم پہچان نہ سکے (چادر کے اندر تجھے دیکھ کر غلط سمجھے)۔

سیدنا علی مرتضیٰ (رض) کا قول ہے "**عرفت ربی بفسخ العزائم**" میں نے اپنے رب کو اس علامت سے پہچانا کہ وہ انسانی عزائم اور ارادوں اور ان کی تدبیروں کو فسخ کر کے ناکارہ بنا دیتا ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)

حاکم نے حضرت علی بن حسین (یعنی امام زین العابدین) کا قول نقل کیا ہے کہ (آیت **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ** کا مصداق حضرت علی ہی ہیں) حضرت علی نے ہی اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کیلئے اپنی جان فروخت کی یا خریدی اور اسی کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار فرمائے۔

وَقِیتُ بِنَفْسِی خَیْرَ مَنْ وَطِی الْحُصٰی
وَمَنْ طَافَ بِالْبَیْتِ الْعَتِّیقِ وَبِالْحَجَر
رَسُولُ إِلٰهٍ اَخَافُ اَنْ یَمْکُرَ وَاَبِہ

فَنَجَاہ ذُوالطُول اِلّااِلٰہِ مَنَ اِلْمَکَر
وَبَاتَ رَسُولُ اللّٰہ فی الغَار اٰمِنًا
مُوقی وَفی حِفْظ الاٰلہٰ وَفی سَتَرُ
وَبَتّ اِرَا عِیہم وَمَا یتھمُونَہ
وَقَدُ وَطّنَتُ نَفْسی عَلی القُتْلِ وَالاُسّرِ

جن لوگوں نے (بطحاء کی) پتھریوں کو روندااور کعبہ اور سنگ اسود کا طواف کیا ' ان میں سب سے برتر ہستی کو اپنی جان کی پیشکش کر کے میں نے بچایا جو اللہ کے رسول تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مشرک ان پر خفیہ داؤنہ کریں ' آخر مشرکوں کے داؤ سے قدرت والے اللہ نے ان کو بچالیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات بھر غار کے اندر بے فکری کے ساتھ محفوظ اللہ کی حفاظت و پناہ میں رہے اور میں نے رات بھر مشرکوں کی اور ان کی سازش کی تاک جھانک رکھی اور اپنی جان کو مارے جانے اور قید ہونے پر جمائے رکھا۔ (تفسیر مظہری)

مشرکین کی ناکامی

جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابو بکر الصدیق (رض) کے ساتھ مکہ سے جبل ثور کی طرف روانہ ہوئے تو عالم اسباب کے قوانین کے تحت پوری طرح اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے سید نا عیسیٰ (علیہ السلام) کو جب اللہ تعالیٰ نے یہود قوم کی گرفت سے بچانا تھا تو جبرئیل امین (علیہ السلام) کے کندھے پر بٹھا کر اوپر آسمان پر اٹھالیا تو کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جبرئیل (علیہ السلام) کے کندھوں پر اٹھا کر اشاروں میں مدینہ طیبہ نہیں پہنچا سکتا تھا کیوں نہیں یہ بہت ہی آسان تھا یایوں کہو کہ آصف بن برخیا جو ایک امتی ہے پیغمبر نہیں اسم اعظم پڑھ کر ملکہ سبا کے بھاری بھر کم تخت کو آنکھوں کے اشاروں میں دوہزار میل سے اٹھا کر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی خدمت میں لاسکتا ہے تو کیا سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسم اعظم کے ذریعہ اپنے رفیق کے ہمراہ اشاروں میں مدینہ طیبہ نہیں پہنچ سکتے تھے مگر ایسا کیوں نہیں ہوا اس لئے کہ دنیادارالاسباب ہے اس میں حق تعالیٰ شانہ کی ہزاروں مخفی حکمتیں مضمر ہیں اگر وہ چاہتا ہے تو اسی ہستی کو مختصر وقت میں معراج کرا سکتا ہے تو اسے بٹھا کر ہجرت بھی کرا سکتا تھا لیکن اس کی حکمتیں اس طرح عجیب و غریب ہیں کہ ایسا نہیں کیا۔
جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غار میں پہنچ کر استراحت فرماتے ہیں تو ضعیف ترین مخلوق کبوتروں کو حکم ہوتا ہے کہ غار کے دروازے پر انڈے جمع کرو اور مکڑی کو حکم ہوتا ہے کہ جلدی سے غار پر بڑی خوبصورتی سے جال بچھا دو یہاں سے دنیا والوں کو سبق پڑھانا ہی تھا کہ دین کا تحفظ بڑی اور طاقتور مخلوق سے نہیں ہوتا بلکہ کمزور و ناتوانوں کا انتخاب کیا جاتا ہے آج بھی یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے ہے کہ اسلام اور کتاب و سنت کے تحفظ کا کام بادشاہ صدور وزراء اور سرمایہ داروں سے نہیں ہوا بلکہ مسجد و مدارس خانقاہوں کے مفلوک الحال بے سہارا علماء و مشائخ اور غریب طلباء کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ فطوبیٰ للغرباء۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت۔
سر دوستان سلامت گر تو خنجر آزمائی۔

جب دشمن غار پر پہنچ گئے تو دیکھا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے ایک خوبصورت جالا بن رکھا ہے اور کبوتر نے انڈے دیے ہیں یہ دیکھ کر ٹھٹھک کر حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ اگر اس کے اندر گئے ہوتے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہوتا اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا۔ للذا یہاں نہیں آئے۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا قَالُوۡا قَدۡ سَمِعۡنَا لَوۡ نَشَآءُ لَقُلۡنَا مِثۡلَ هٰذَاۤ ۙ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ○31

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب کبھی] [تُتْلٰی عَلَیْهِمْ : پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کو] [اٰیٰتُنَا : ہماری آیتیں] [قَالُوْا : تو وہ لوگ کہتے ہیں] [قَدْ سَمِعْنَا : ہم سن چکے ہیں] [لَوْ : اگر] [نَشَآءُ : ہم چاہیں] [لَقُلْنَا : تو ہم (بھی) ضرور کہہ لیں گے] [مِثْلَ هٰذَآ : اس کے جیسا] [اِنْ : نہیں ہے] [هٰذَآ : یہ] [اِلَّآ : مگر] [اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ پہلے لوگوں کی کہانیاں]

ترجمہ: اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں (تو) وہ کہتے ہیں: بیشک ہم نے سن لیا اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس (کلام) کے مثل کہہ سکتے ہیں یہ تو اگلوں کی (خیالی) داستانوں کے سوا (کچھ بھی) نہیں ہے

تشریح:

قریش کا اسلام سے متعلق عام رویہ

گزشتہ آیت کریمہ میں کافروں نے جس طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان لینے اور اسلامی دعوت کو فنا کرنے کی تدبیر کی اور اللہ نے جس طرح اسے ناکام بنایا اس کا تذکرہ ہم نے پڑھا ہے۔ پیش نظر آیت کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ قریش نے اس آخری منصوبہ بندی سے پہلے بھی کوئی تدبیر ایسی نہیں چھوڑی جس سے اسلامی دعوت کو ناکام کیا جاسکتا ہو اور قریش نے اسے بروئے کار لانے کی کوشش نہ کی

ہو۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب اپنی دعوت کے مبادی کا ذکر اور بنیادی عقائد کی وضاحت فرماتے تو اس کی تائید میں جستہ جستہ انبیائے کرام کی دعوت کا ذکر بھی ضرور فرماتے۔ اسی طرح جب قریش کو ان کے انجام سے باخبر کرنے کے لیے تنبیہ فرماتے تو سابقہ انبیائے کرام کی امتوں پر آئے ہوئے عذابوں کا ذکر بھی کرتے۔ مقصود صرف یہ ہوتا کہ قریش آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کو کوئی نئی بات یا اجنبی خیال نہ کریں اور جب سابقہ امتوں پر عذاب کا ذکر کرتے تو مقصد یہ تھا کہ انھیں اس بات کا یقین آ جائے کہ ہم کوئی سابقہ امتوں سے کوئی مختلف امت نہیں ہیں اگر ہم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اللہ کا عذاب ہم پر بھی اتر سکتا ہے۔ لیکن قریش کے بگڑے ہوئے سردار بجائے اس سے اثر قبول کرنے کے مذاق اڑاتے انبیائے کرام کی عبرت آموز اور پر از حکمت دعوت اور حالات زندگی کو گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیوں سے تعبیر کرتے اور لوگوں کو یہ تصور دیتے کہ کہانیاں تو ہمیشہ دل بہلانے کے لیے ہوتی ہیں ہم تمھیں اس سے بہتر کہانیاں سنا سکتے ہیں۔ قریش کا ایک سربرآوردہ آدمی نضر بن حارث جو اپنی تجارت کے سلسلے میں ملکوں ملکوں گھومتا اور مختلف قوموں کے حالات سے آشنا تھا وہ وہاں سے بطور خاص ایسی دلچسپ کہانیاں خرید کر لاتا تاکہ قرآن کریم کے مقابلے میں انھیں لوگوں کو سنایا جاسکے۔ اس لیے جب کبھی اس کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو وہ اپنی لائی ہوئی کہانیوں کو سنانا شروع کر دیتا اور قرآن کریم کو بھی کہانیوں پر مشتمل کتاب قرار دیتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ میں اگر چاہوں تو اس سے بہتر کہانیاں لکھ سکتا ہوں۔ اندازہ کیجیے کہ اللہ کی آخری کتاب جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں نہیں اور عرب اپنی ساری کاوشوں کے باوجود اس کی ایک سورۃ کا جواب نہ لا سکے اور اس کتاب کے پیش کرنے والے کی دلآویز شخصیت اور اس کا ہر عیب سے پاک کردار جس پر قریش کبھی کوئی چھینٹا نہ اڑا سکے ان کو دیکھتے ہوئے بھی جو شخص یا قریش کے سربرآوردہ لوگ اس طرح کی باتیں کریں تو ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں انتہائی جسارتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کے دین کے بارے میں اس حد تک دلیر ہو چکے ہیں کہ انھیں کوئی بات کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے نہ اللہ کے عذاب کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

اللہ نے اپنے بندے پر جو قرآن نازل کیا ہے اس کے من جانب اللہ ہونے پر تمھیں شک ہے اور تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا دنیا جہاں کے جن وانس اور جس کو جیسے اور جب چاہو اپنے ساتھ ملا کر انفرادی یا اجتماعی طور پر ایک ہی سورۃ بنا کر لے آؤ۔ لیکن یاد رکھو! اب تک نہ ہوا اور نہ قیامت تک ایسا ہو سکے گا۔ کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے اعلیٰ وارفع، لازوال اور بے مثال ہے اسی طرح اس کا کلام اعلیٰ، ارفع، لازوال اور بے مثال ہے۔ قرآن مجید انسانوں کی اصلاح اور فلاح کے لیے اللہ کریم کی طرف سے نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایسا معجزہ عطا کیا گیا ہے۔ جس کی بلاغت نے قیامت تک دنیا کے سخن وروں، قانون دانوں، شاعروں اور ادیبوں کو لاجواب کر دیا ہے۔ اس کے باوجود ہر دور کے کافر قرآن مجید 'فرقان حمید کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ لیکن بالآخر انھیں اپنی ناکامیوں کا اعتراف کرنا پڑا اور کرتے رہیں گے۔ جس کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں تاکہ قرآن کے طالب علم کو معلوم ہو جائے کہ منکرین قرآن کس طرح اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس لیے ارشاد ہوا کہ جب مقابلہ تمہارے بس کا روگ نہیں تو اس آگ سے بچو جس میں پتھروں اور انسانوں کو جھونکا جائے گا جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (البقرۃ: ۲۴)

فرانس کا مشہور مستشرق ڈاکٹر مارڈریس جس کو حکومت فرانس کی وزارت معارف نے قرآن حکیم کی باسٹھ سورتوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرنے پر مامور کیا تھا اس نے اعتراف کیا:

"بیشک قرآن کا طرز بیان اللہ تعالیٰ کا طرز بیان ہے، بلاشبہ جن حقائق و معارف پر یہ کلام حاوی ہے وہ کلام الٰہی ہی ہو سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ کرنے والے بھی جب اس کی عظیم تاثیر کو دیکھتے ہیں تو تسلیم و اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پچاس کروڑ مسلمان (اس تحریر کے وقت مسلمانوں کی تعداد اتنی ہی تھی 2005 میں یہ تعداد سوا ارب سے زائد ہے) جو سطح زمین کے ہر حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں قرآن کی خاص تاثیر کو دیکھ کر مسیحی مشن میں کام کرنے والے بالاجماع اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ " [معارف القرآن مفتی محمد شفیع]

ڈاکٹر گستاد لی بان نے اپنی کتاب "تمدن عرب " میں قرآن کی حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"نبی اُمّی اسلام کی ایک حیرت انگیز سر گزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔"

مسٹر وڈول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا لکھتے ہیں:

"جتنا بھی ہم اس کتاب یعنی قرآن کو الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی مرغوبیت نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، فوراً ہمیں مسخر اور متحیر کر دیتی ہے، اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کر چھوڑتی ہے۔ اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین کے، عفیف، عالی شان اور تہدید آمیز ہے اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں، غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پر زور اثر دکھاتی رہے گی۔ " (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳) (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝32

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [قَالُوا : انهوں نے کہا] [اللّٰهُمَّ : اے الله] [اِنْ : اگر] [كَانَ : ہے] [هٰذَا : یہ] [هُوَ الْحَقَّ : ہی حق] [مِنْ عِنْدِكَ : تیرے پاس سے] [فَاَمْطِرْ : تو، تو برسا] [عَلَيْنَا : ہم پر] [حِجَارَةً : کچھ پتھر] [مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے][اَوِ : یا] [ائْتِنَا : تو لے آہم پر] [بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ : کوئی درد ناک عذاب]

ترجمہ: اور جب انھوں نے (طعناً) کہا: اے اللہ! اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو (اس کی نافرمانی کے باعث) ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی درد ناک عذاب بھیج دے

تشریح:

قرآن اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ جدو جہد سے تنگ آکر کفار کی انتہا درجے کی جہالت، اکھڑ مزاجی اور اللہ تعالیٰ کے حضور گستاخی۔

مکہ کے سردار اس قدر ہٹ دھرمی اور جہالت پر اتر آئے کہ ایک دن ابو جہل کے ساتھ مل کر بیت اللہ میں جمع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے ہدایت اور اس کی توفیق مانگنے کے بجائے بیت اللہ کے غلاف کو پکڑ کر یہ دعا مانگتے ہیں۔ بار الٰہا! اگر واقعی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچا رسول ہے اور اس پر تونے حق نازل کیا ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ یا ہمیں اپنے عذاب میں مبتلا کر دے۔ دنیا کی تاریخ میں شاید یہ پہلا اور آخری واقعہ ہو گا کہ جس میں انسان اس حد تک بغاوت پر اتر آیا ہو کہ وہ اللہ کے گھر میں کھڑے ہو کر اس سے اس کی رحمت اور ہدایت طلب کرنے کے بجائے۔ اس کے غضب کو چیلنج کر رہا ہو۔ جس طرح مکہ والوں نے انتہا کی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی منہ مانگی مراد پوری کرتے ہوئے انھیں ایک لمحہ کی تاخیر دیے بغیر بیت اللہ کے صحن کے اندر ہی تہس نہس کر دیا جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شفقت و مہربانی، حلم اور بردباری اس قدر بے کنار ہے کہ ان پر پتھر برسانے کی بجائے یہ کہہ کر مہلت دی کہ اللہ کے لیے عذاب نازل کرنا کوئی مشکل نہیں کہ وہ تم پر قوم لوط کی طرح پتھر برسائے یا قوم عاد کی طرح پٹخ پٹخ کر زمین پر دے مارے کیونکہ تم واقعی اس لائق ہو کہ تمہیں فی الفور ختم کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمہارا وجود معاشرے کے لیے ناسور اور دین حق کی راہ میں رکاوٹ بن چکا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تم پر اس لیے عذاب نازل نہیں کر رہا کہ اس کا محبوب اور اس کے توبہ واستغفار کرنے والے ساتھی تم میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ جس بستی میں اس کا رسول ہو اس بستی کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک رسول کو وہاں سے ہجرت کا حکم نہ ہو جائے۔ دوسری بات جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرتی اور اس کے عذاب کو ٹالتی ہے۔ وہ اس کے مومن بندوں کا توبہ واستغفار کرنا ہے جس بستی میں توبہ واستغفار کرنے والے لوگ زیادہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کبھی ہلاک نہیں کرتا اس لیے ہم پر لازم ہے کہ ہم صبح وشام اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتے رہیں۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ رَبُّهٗ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَّغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَّغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا اٰخَرَ فَاغْفِرْهُ لِیْ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَّغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ فَلْیَفْعَلْ مَا شَآءَ) [رواہ البخاری: کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ]

”حضرت ابوہریرہ (رض) کا بیان ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ’کوئی شخص گناہ کرتا ہے پھر اپنے رب سے عرض کرتا ہے کہ میں گناہ کر بیٹھا ہوں تو اے رب معاف فرما۔ اس کا رب فرشتوں سے کہتا ہے ’کیا میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان پر مواخذہ بھی کرتا ہے؟ لہٰذا میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ پھر جب تک اللہ کی توفیق ہوتی ہے وہ گناہ سے باز رہتا ہے ’پھر اس سے گناہ ہو جاتا ہے اور پھر اپنے رب کو پکارتا ہے۔ میرے پروردگار مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ میرے اللہ! مجھے معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے استفسار کرتا ہے کہ میرا بندہ جانتا ہے کہ کوئی اس کا مالک ہے جو گناہوں کو معاف بھی کرتا ہے اور ان پر پکڑ بھی کرتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا! اب وہ جو چاہے کرے۔ ” (یعنی سابقہ گناہ پر کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔)“

(عَنْ أَبِي سَعِيدٍ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَنْ قَالَ حِينَ يَأْوِي إِلَى فِرَاشِهِ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيَّ الْقَيُّومَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ذُنُوبَهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ وَإِنْ كَانَتْ عَدَدَ وَرَقِ الشَّجَرِ وَإِنْ كَانَتْ عَدَدَ رَمْلِ عَالِجٍ وَإِنْ كَانَتْ عَدَدَ أَيَّامِ الدُّنْيَا)

[رواہ الترمذی: کتاب الدعوات]

"حضرت ابوسعید (رض) نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں جو شخص اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے تین مرتبہ یہ کلمات کہتا ہے "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيَّ الْقَيُّومَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ "تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں، اگرچہ درختوں کے پتوں کی تعداد کے برابر بھی ہوں، اگرچہ صحرا کی ریت کے ذروں کے برابر بھی ہوں، اگرچہ دنیا کے دنوں کی تعداد کے برابر بھی ہوں۔" (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝33

لغۃ القرآن: [وَمَا كَانَ : اور نہیں ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [لِيُعَذِّبَهُمْ : کہ وہ عذاب دے ان کو] [وَ : اس حال میں کہ] [اَنْتَ : آپ] [فِيْهِمْ: ان میں ہیں] [وَمَا كَانَ : اور نہیں ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [مُعَذِّبَهُمْ : ان کو عذاب دینے والا] [وَ : اس حال میں کہ][هُمْ : وہ لوگ] [يَسْتَغْفِرُوْنَ : استغفار کرتے ہیں]

ترجمہ: اور (درحقیقت بات یہ ہے کہ) اللہ کو یہ شان نہیں دیتا کہ ان پر عذاب فرمائے درآنحالیکہ (اے حبیب مکرّم!) آپ بھی ان میں (موجود) ہوں، اور نہ ہی اللہ ایسی حالت میں ان پر عذاب فرمانے والا ہے کہ وہ (اس سے) مغفرت طلب کر رہے ہوں

تشریح:

ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ جس عذاب کا کفار نے سوال کیا وہ عذاب انھیں دے جب تک اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، تم ان میں تشریف فرما ہو، کیونکہ آپ رحمۃٌ لِلعالمین بنا کر بھیجے گئے ہو اور سنت اِلٰہیہ یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں اس کے نبی موجود ہوں ان پر عام بربادی کا عذاب نہیں بھیجتا کہ جس سے سب کے سب ہلاک ہو جائیں اور کوئی نہ بچے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہاں قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار سالہا سال تک اسلام کو مٹانے اور پیغمبر اسلام کو اذیت پہنچانے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر رہے تھے۔ اب تو انھوں نے چیلنج بھی دے دیا تھا کہ اے خدا! اگر یہ دین اور رسول حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا کر ہمیں ہلاک کر دے۔ اتنی باتوں کے باوجود غضب الٰہی کو کیوں حرکت نہ ہوئی۔ اور ان پر کیوں ایسا عذاب نہ اتارا گیا جو انھیں نیست و نابود کر کے رکھ دیتا تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہوتی۔ اس آیت میں اسی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ درست ہے کہ ان کے اعمال، ان کے کرتوت اور ان کی دانستہ کفر پر اصرار اس امر کی مقتضی تھے کہ ان کی خواہش کے مطابق ان پر تباہ کن عذاب نازل کیا جاتا، لیکن اے میرے حبیب! جب تک تیرا وجود سراپا رحمت ان میں موجود ہے ان پر عذاب نہیں اترے گا۔ میں نے تیرے سر پر رحمۃ للعالمینی کا تاج رکھا ہوا ہے۔ تیرے سایہ رحمت میں کفار اور عصیاں شعار سب کے لیے پناہ ہے لانک الرحمۃ للعلمین (روح المعانی)۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان میں تیرے ایسے غلام موجود ہیں جو ہر وقت میری بارگاہ اقدس میں سر نیاز خم کر کے طلب مغفرت کر رہے ہیں۔ کیا شان ہے اللہ کے محبوب کی اور کیا عزت ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے نیکوکار بندوں کی ان کی برکت سے کافر اور نافرمان بھی عذاب سے بچے ہوئے ہیں۔ مجاہد کی رائے ہے کہ وہم یستغفرون سے مراد وہ سعید روحیں ہیں جو ان کفار کی پشتوں میں تھیں اور ابھی تک عالم اجسام میں ظہور پذیر نہیں ہوئی تھیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ آیت سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ پھر جب آپ نے ہجرت فرمائی اور کچھ مسلمان رہ گئے جو استغفار کیا کرتے تھے تو "وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ" جب تک استغفار کرنے والے ایماندار موجود ہیں اس وقت تک بھی عذاب نہ آئے گا۔ نازل ہوئی۔ پھر جب وہ حضرات بھی مدینہ طیبہ کو روانہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کا اذن دیا اور یہ عذاب موعود آگیا جس کی نسبت اگلی آیت میں فرمایا "وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ"۔ حضرت محمد بن اسحاق (رح) نے فرمایا کہ "مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ" بھی کفار کا مقولہ ہے جو ان سے حکایۃً ذکر کیا گیا، اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ان کی جہالت کا ذکر فرمایا کہ اس قدر احمق ہیں کہ آپ ہی تو یہ کہتے ہیں کہ یارب اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر نازل کر اور آپ ہی یہ کہتے ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب تک آپ ہیں عذاب نازل نہ ہو گا کیونکہ کوئی امت اپنے نبی کی موجودگی میں ہلاک نہیں کی جاتی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) اسی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَنتَ فِیہِم نے عَدُو کو بھی لیا دامن میں
عیشِ جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست

عذاب سے امن میں رہنے کا ذریعہ

علامہ علی بن محمد خازن (رح) فرماتے ہیں اس آیت سے ثابت ہوا کہ استغفار عذاب سے امن میں رہنے کا ذریعہ ہے۔

احادیث میں استغفار کے بہت فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے، سرکارِ عالی وقار، مدینے کے تاجدار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے میری اُمّت کے لیے مجھ پر دو امن (والی آیات) اتاری ہیں، ایک "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ" اور دوسری "وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ" جب میں اس دنیا سے پردہ کر لوں گا تو قیامت تک کے لیے استغفار چھوڑ دوں گا۔

(2)۔۔ حضرت ابو سعید (رض) سے روایت ہے، حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: شیطان نے کہا: اے میرے رب! تیری عزت وجلال کی قسم! جب تک تیرے بندوں کی روحیں ان کے جسموں میں ہیں، میں انھیں بھٹکاتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میری عزت وجلال کی قسم! جب تک وہ مجھ سے استغفار کریں گے تو میں انھیں بخشتا رہوں گا۔

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے استغفار کو اپنے لیے ضروری قرار دیا تو اللہ تعالیٰ اسے ہر غم اور تکلیف سے نجات دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے اسے وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔ (تفسیر صراط الجنان)

پہلے انبیائے کرام (علیہم السلام) مخصوص علاقہ اور مخصوص قوم کے نبی تھے جیسے حضرت لوط (علیہ السلام)، حضرت صالح (علیہ السلام) اور حضرت ہود (علیہ السلام) کو پہلے ان کی بستیوں اور قوموں سے علیحدہ کیا اور پھر ان قوموں پر عذاب نازل کیا مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور رحمت کا دائرہ قیامت تک آنے والے ہر زمانہ، ہر علاقہ اور ہر قوم کو شامل ہے اور آپ جہاں بھی ہوں اپنے دائرہ رسالت سے باہر نہیں ہیں اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عالمگیر نبوت کے ہوتے ہوئے دنیا میں کسی قوم پر اجتماعی عذاب نہیں آئے گا۔ نیز جہاں استغفار کرنے والے متقی لوگ ہوں وہاں بھی اللہ تعالیٰ عذاب نازل نہیں فرماتا، البتہ جہاں ایسے اہل ایمان ہوں جو ظلم کے ساتھ راضی ہوں یا طاقت ہوتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھائیں تو پھر ظالموں کے ساتھ ان پر بھی عذاب آجاتا ہے مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میں استغفار کرنے والے متقی لوگ قیامت تک باقی رہیں گے اس لیے ان کی برکت سے اب پہلی امتوں کی طرح اجتماعی کہیں نہیں آئے گا۔ جزوی اور علاقائی عذاب کا آنا اس خصوصی حکم کے منافی نہیں ہے جیسے غزوہ احد میں مسلمانوں کو جزوی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر کفار مکہ کے مطالبہ پر اس وقت عذاب نازل ہوتا اور اہل مکہ کو تباہ کر دیا جاتا تو ان میں سے جو کفار یعنی ابو سفیان، صفوان اور عکرمہ وغیرہ بعد میں مسلمان ہو گئے وہ مسلمان کیسے ہوتے؟ اور کفار کی پشتوں سے قیامت تک پیدا ہونے والی نسلیں جو اسلام قبول کر کے استغفار کرنے والی تھیں ان کو پیدا ہونے کا موقع کہاں سے ملتا؟ (تفسیر روح المعانی)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: کفار کے لیے دو امانیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کا نبی اور دوسرا استغفار کرنے والے اہل ایمان، نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو وصال فرما گئے مگر استغفار کرنے والے تو قیامت تک باقی رہیں گے۔ (تفسیر کبیر) اس سے معلوم ہوا کہ جہاں انبیائے کرام (علیہم السلام) یا استغفار کرنے والے متقی اہل ایمان ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں کو مکمل تباہ کرنے والا اجتماعی عذاب نہیں آتا۔ (تفسیر امداد الکرم)

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے دو امانیں نازل کیں ایک اس وقت جب کہ وہ استغفار کرتے ہوں اور دوسری اس وقت جب میں ان میں رونق افروز ہوں۔ آگے ارشاد ہے۔ اور وہ اس کے اہل نہیں یہ واقعہ حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان طواف کعبہ کو گئے تو مشرکین مکہ نے انھیں روکا۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اور حال یہ ہے کہ وہ اس کے اہل نہ تھے کہ امور کعبۃ اللہ میں متصرف اور نظام کے مختار

ہوں اس لیے کہ مشرک کو بیت اللہ سے کیا نسبت اس کے متصرف و مجاز تو سوائے متقی افراد کے کوئی نہیں مگر ان میں اکثر جاہل ہیں اور جہالت ہی سے ایسا کرتے ہیں اور کعبہ کے پاس ان کی نماز نہیں مگر سیٹی اور تالی سر نائی۔ کرنائی۔ ناچنا۔ کودنا ہی مشرک کی عبادت ہوتی ہے۔ سید المفسرین ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ مشرکین قریش خانہ کعبہ میں ننگے ہو کر طواف کرتے اور سیٹیاں تالیاں بجاتے اور یہ فعل ان کے اعتقاد باطل کی بناپر تھا یا محض شرارت تھی کہ مومنین اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عبادت میں اختلال پیدا کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے تواب عذاب چکھو قید و قتل بدر کا یہ بدلہ ملاہے انھیں اپنے کفر کا۔ بیشک وہ جو کافر ہیں خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ لوگوں کو روکیں اللہ کی راہ سے یہ آیہ کریمہ ان بارہ مطعمین مشرکین کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے لشکر کفار کا کھانا اپنے ذمہ لیا اور بموجب معاہدہ نمبر وار ہر ایک مشرک لشکر کو کھانا دیتا تھا جو دس اونٹ روزانہ کی اوسط سے دیتے تھے۔ ان میں ابو جہل۔ عتبہ۔ شیبہ۔ ابناء ربیعہ بن عبدالشمس اور اس کے بیٹے منبہ اور ابناء حجاد اور ابوالجنتری بن ہشام اور نضر بن حارث۔ حکیم بن حزام۔ ابی بن خلف۔ زمعہ بن اسود۔ حرث بن عامر بن نوفل اور عباس بن عبدالمطلب تمام کے تمام قریشی تھے اور ہر ایک دس اونٹ دیتا تھا جس روز مشرکین کو ہزیمت ہوئی اس دن عباس بن عبدالمطلب کی باری تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اب تو وہ خرچ کریں گے پھر انھیں اس پر پچھتاوا ہو گا کہ افسوس مال بھی گیا اور کام بھی نہ بنا ہزیمت کی ذلت بھی ہمیں ہی اٹھانی پڑی۔ پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے اور کافروں کا حشر جہنم کی طرف ہو گا تاکہ اللہ خبیث کو نیک سے ممیّز فرما کر جدا کرے یعنی مومنین کو کفار سے علیحدہ کر کے ممتاز کر دے اور نجس گروہ تلے اوپر رکھ کر سب کا ڈھیر جہنم کے اندر کر دے اور یہی نقصان و خسران والے ہیں جو ہمیشہ ٹوٹے میں رہیں گے جو اپنا مال خرچ کر کے بھی عذاب آخرت مول لے رہے ہیں۔ (روح المعانی) تفسیر نسفی عربی)۔ (تفسیر الحسنات)

آیت مبارکہ:

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭاِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○34

لغۃ القرآن: [وَمَا لَهُمْ : اور ان کے لیے کیا ہے] [اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ : کہ عذاب نہ دے ان کو] [اللّٰهُ : اللہ] [وَ : اس حال میں کہ] [هُمْ : وہ لوگ] [يَصُدُّوْنَ : روکتے ہیں] [عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : مسجد حرام سے] [وَ : حالانکہ] [مَا كَانُوْٓا : وہ نہیں ہیں] [اَوْلِيَآءَهٗ : اس کے والیو وارث] [اِنْ : نہیں ہیں] [اَوْلِيَآؤُهٗٓ : اس کے والی ووارث] [اِلَّا : مگر]

[اَلْمُتَّقُوْنَ : تقوی کرنے والے] [وَلٰكِنَّ : اور لیکن] [اَكْثَرَهُمْ : ان کے اکثر] [لَا يَعْلَمُوْنَ : جانتے نہیں ہیں]

ترجمہ: (آپ کی ہجرت مدینہ کے بعد مکہ کے) ان (کافروں) کے لیے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اللہ انھیں (اب) عذاب نہ دے حالانکہ وہ (لوگوں کو) مسجد حرام (یعنی کعبۃ اللہ) سے روکتے ہیں اور وہ اس کے ولی (یا متّولی) ہونے کے اہل بھی نہیں، اس کے اولیاء (یعنی دوست) تو صرف پرہیزگار لوگ ہوتے ہیں مگر ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) جانتے ہی نہیں

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میرا حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں تشریف فرما ہے اللہ تعالیٰ انھیں عذاب نہ دے گا اور اس آیت میں فرمایا کہ انھیں عذاب دے گا۔ تو اس آیت کا معنی یہ ہوا جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے بیچ سے چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں عذاب دے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں عذاب سے مراد (قتل اور قید ہونے کا) وہ عذاب ہے جو بدر کے دن انھیں پہنچا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو فتح مکہ کے دن انھیں پہنچا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے اور جس عذاب کی ان سے نفی کی گئی ہے اس سے دنیاوی عذاب مراد ہے۔ ان کفار کو عذاب دیئے جانے کا سبب یہ ہے کہ یہ مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور مومنین کو طواف کعبہ کے لیے نہیں آنے دیتے جیسا کہ واقعہ حُدَیْبِیَہ کے سال رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب (رض) کو روکا۔

{ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ : اور یہ اس کے اہل ہی نہیں۔ } کفار یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم خانہ کعبہ اور حرم شریف کے مُتَوَلّی ہیں تو ہم جسے چاہیں اس میں داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں روک دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں ارشاد فرمایا کہ یہ مسجد حرام کے اہل نہیں اور کعبہ کے امور میں تَصَرُّف و انتظام کا کوئی اختیار نہیں رکھتے کیونکہ یہ مشرک ہیں، مسجدِ حرام کا متولی ہونے کے اہل تو پرہیزگار ہی ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

مسجد سے مراد وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا جائے

لہٰذا مسجد کے متولی صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو مگر مکہ میں گنگا الٹی بہہ رہی تھی، جو اللہ تعالیٰ کے منکر تھے مسجد حرام کے متولی بنے ہوئے تھے اور انھوں نے متقی لوگوں پر مسجد میں داخلہ بند کر رکھا تھا حتیٰ کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سن ٦ ہجری میں چودہ سو صحابہ کرام (رض) کے ساتھ جب عمرہ کرنے کے لیے تشریف لائے تو کفار مکہ نے انھیں بھی مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا، لہٰذا ایسے ظالم لوگ واقعی عذاب کے مستحق تھے مگر وہ عذاب جو ساری قوم کا استیصال کر دے وہ تو اب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور استغفار کرنے والوں کی برکت سے نہیں آئے گا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں جزوی عذاب میں مبتلا کر دیا یعنی پہلے جنگ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سردار ہلاک کر دیئے گئے اور پھر آٹھ ہجری میں مکہ فتح کر کے اہل مکہ کے بتوں اور ان کے عقائد و نظریات کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا۔

علامہ سید آلوسی ایک قول نقل کرتے ہیں کہ گزشتہ آیت میں جس عذاب سے نفی کی گئی ہے وہ استیصال کرنے والا عذاب دینا ہے اور اس آیت میں جس عذاب کی نشاندہی کی گئی ہے یہ عذاب آخرت ہے یعنی دنیا میں جن کفار کو سزا نہ ملے وہ بے فکر نہ ہوں آخرت میں انھیں اپنے مظالم کا عذاب ضرور ملے گا۔ (تفسیر روح المعانی) (تفسیر امداد الکرم)

اللہ کو ماننے والی یا کسی بھی مذہب کی پرستار قومیں جب بگڑتی ہیں تو وہ اللہ کے دین اس کے احکام اور اس کے عطا کردہ ضابطہ حیات کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں اور خانہ ساز قسم کی چند مذہبی رسوم کو مکمل مذہب قرار دے کر اور اللہ سے اپنی چند نسبتیں اختراع کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہیں اور یہ یقین کر لیتی ہیں کہ ہماری زندگی کا یہ رویہ اور اللہ سے ہماری نسبتیں ہمارا وہ سرمایہ ہیں جس کی موجودگی میں ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی نوازشات ہمارے ساتھ ہیں اس کی رحمتیں ہمارے ہی لیے ہیں اور آخرت میں بھی ہم اس کی نعمتوں سے سرافراز کیے جائیں گے۔

قریش نے بھی ایسی ہی چند مذہبی رسوم اور اللہ سے چند تعلق کی بنیادوں کو اپنے لیے وجہ اختصاص بنا رکھا تھا اور وہ مطمئن تھے کہ ہمیں اللہ کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اپنا سب سے بڑا امتیاز یہ سمجھتے تھے کہ ہم خانہ کعبہ کے متولی ہیں، رفادہ اور اسقایا کی خدمتیں انجام دینے والے ہیں اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں۔ اللہ کے گھر کے سائے میں رہتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی حفاظت میں آباد ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ کا عذاب ہمیں کیسے چھو سکتا ہے ؟ اس کے جواب میں اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں کوئی حسب نسب نہیں چلتا بلکہ وہاں ایمان و عمل کا سکہ چلتا ہے۔ اس لحاظ سے تم نے کبھی غور کیا ہے کہ تمہارے اندر ایسی کون سی خصوصیت ہے جو تمھیں اللہ کے عذاب سے بچانے کی ضمانت دے سکتی ہو۔ تم اپنا سب سے بڑا امتیاز مسجد حرام سے وابستگی کو سمجھتے ہو اور حال تمہارا یہ ہے کہ تم لوگوں کو مسجد حرام آنے سے روکتے وہ تم نے اپنے آپ کو اللہ کے گھر کا متولی سمجھ رکھا ہے حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ اللہ کے گھر کے متولی اللہ سے ڈرنے والے اس کی عبادت کرنے والے اور اس دین کے پیروکار ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) لے کر آئے تھے کیونکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو جب امامت کے منصب پر سرفراز کرنے کا وعدہ فرمایا گیا تھا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے وچھا تھا کہ "کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا ؟ " تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا :

لاینال عہدی الظالمین (میرا یہ عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا

اس کے مستحق صرف صالحین ہوں گے اور صالحین وہ ہوں گے جو حضرت ابراہیم کے طریقے پر چلنے والے اور ان کی پیروی کرنے والے ہوں گے۔ تم نے حضرت ابراہیم کی پیروی تو کیا کرنا تھی تم نے تو اس گھر کی روایت تک بدل کر رکھ دی۔ اس گھر کو جس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا وہ مقصد تم نے فراموش کر دیا۔ یہ اللہ کی توحید کا مرکز تھا تم نے تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت لا کر یہاں بٹھا دیئے۔ ایسی صورتحال میں تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمھیں اللہ کا عذاب نہیں چھو سکتا ؟ تمہارے کرتوت تو اللہ کے عذاب کو ہر وقت دعوت دے رہے ہیں۔ اگر تمہارے اندر اللہ کے رسول نہ ہوتے اور اب ان کے بعد درپردہ ایمان لانے والے کمزور مسلمان نہ ہوتے تو تم ہر لحاظ سے اس کے مستحق تھے کہ اللہ کے عذاب کا کوڑا تم پر برستا۔ لیکن تم میں سے اکثر کو کچھ خبر ہی نہیں کہ جس گھر کے متولی ہونے کا ہم دعویٰ کرتے ہیں اس گھر کے بنانے والے نے بناتے ہوئے اللہ سے کیا التجائیں کی تھیں ؟ حضرت ابراہیم اس سرزمین پر کیوں تشریف لائے تھے ؟ ان کی دعوت کیا تھی ؟ وہ جس ملت کے داعی

ہوئے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں ؟ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو انھوں نے یہاں کیوں بسایا تھا ؟ تم نے اللہ کے اس گھر کی حیثیت بدل کر اسے قومی معبد بنادیا جس کی کلید برداری اور اس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور تم آبائی جاگیر کی طرح اس پر فخر کرتے ہو۔ تمہاری یہ مجرمانہ حرکتیں تو اس قابل ہیں کہ تم پر اللہ کی طرف سے پتھر برسیں لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم اپنے ان کرتوتوں کے باوصف اس کے متولی ہونے کے دعویدار ہو۔ (تفسیر روح القرآن)

مسجد کے متولی کی صفات

معلوم ہوا کہ مسجد کا متولی مسلمان دیندار پرہیزگار ہونا چاہیے اور بعض حضرات مفسرین نے (آیت) اِنۡ اَوۡلِيَآؤُهٗۤ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع قرار دے کر یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیزگار لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت و سنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعوی کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

یہ امت قیامت تک عذاب سے محفوظ رہے گی

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ قیامت تک دنیا میں ہیں اس لیے یہ امت قیامت تک عذاب عام سے مامون رہے گی۔ (تفسیر گلدستہ)

سید کائنات رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وجود مسعود اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت اور دعا مستجاب کی برکت سے اس امت پر کوئی عمومی آسمانی عذاب تو نہیں آئے مگر زمینی آداب اور جزوی عذاب لوگوں کے اعمال بد اور گناہوں کی وجہ سے ضرور آتے رہیں گے ہمارے موجودہ زمانہ میں غیر شرعی معاشرہ اور بے دینی کے سبب جو عذاب آیا ہوا ہے یہ نہایت پریشان کن ہے مثلاً یہ کہ پورے خطے میں بدامنی قتل و غارت چوری ڈاکی بے انصافی ظلم و زیادتی حق تلفی عصمت دری بے حیائی ہوشربا ناقابل برداشت مہنگائی قحط سالی غرض ہے کہ عام انسان اتنا مجبور اور غمزدہ اور پریشان ہیں کہ اپنی زندگی سے بے زار اور تنگ ہے یہ سارے زمینی اور ایک حد تک عمومی عذاب ہی پوری معیشت تباہ و برباد ہے پس توبہ اور کثرت استغفار سے اگر آسمانی عذاب ٹل سکتا ہے تو زمینی عذاب بطریق اولیٰ ٹل جاتا ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ مشرکین نے کثرت استغفار سے آسمانی عذاب کو تو ٹال دیا مگر مسلمان کو کون استغفار پر آمادہ کرے جو کبھی کسی قیمت پر استغفار کے لیے تیار نہیں حالانکہ یہ استغفار اس کی تمام بیماریوں کا علاج ہے اور پریشانیوں کا حل بھی ہے پس چاہیے کہ اپنے اوپر رحم کرتے ہوئے ہم استغفار کو اپنا پیشہ بنائے۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○35

لغۃ القرآن: [وَمَا كَانَ : اور نہیں تھی] [صَلَاتُهُمْ : ان کی نماز] [عِنْدَ الْبَيْتِ : اس گھر کے پاس] [اِلَّا : مگر] [مُكَاءً : سیٹی بجانا] [وَّتَصْدِيَةً: اور تالی پٹینا] [فَذُوْقُوا : پس تم لوگ چکھو] [الْعَذَابَ : اس عذاب کو] [بِمَا : بہ سبب اس کے جو] [كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ : تم لوگ کفر کرتے تھے]

ترجمہ: اور بیت اللہ (یعنی خانہ کعبہ) کے پاس ان کی (نام نہاد) نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، سو تم عذاب (کا مزہ) چکھو اس وجہ سے کہ تم کفر کیا کرتے تھے

تشریح:

علامہ راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں پرندہ جو سیٹی بجانے کی آواز نکالتا ہے اس کو مکاء کہتے ہیں۔ اس میں اس پر متنبہ کرنا ہے کہ ان کا سیٹی بجانا قلّت غناء میں پرندوں کی سیٹیوں کے قائم مقام ہے۔ (المفردات، ج 2، ص 610، مطبوعہ مکہ مکرمہ) صدی کا معنی ہے گونج دار آواز جو مثلاً کسی پہاڑ یا گنبد سے ٹکرا کر آتی ہے۔ (المفردات، ج 2، ص 366، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

علمہ محمود بن عمروز مخشری متوفی 528ھ لکھتے ہیں:

المکاء ایک پرندہ ہے جو بہ کثرت سیٹیاں بجاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو مکاء کہتے ہیں اور تصدیہ کا معنی ہے تالی بجانا۔ (الکشاف، ج 2، ص 218، مطبوعہ ایران)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا قریش بیت اللہ میں برہنہ طواف کرتے تھے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔ مجاہد نے کہا وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے طواف کرتے وقت معارضہ کرتے تھے، آپ کے طواف اور آپ کی نماز میں خلل ڈالنے کے لیے سیٹیاں بجاتے تھے، مقاتل نے کہا جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد حرام میں نماز پڑھتے تو وہ آپ کے دائیں اور بائیں کھڑے ہو کر سیٹیاں بجاتے تاکہ آپ کی نماز میں التباس اور اشتباہ پیدا کریں۔ پس حضرت ابن عباس (رض) کے قول پر ان کا سیٹیاں اور تالیاں بجانا ان کی عبادت تھی۔ اور مجاہد اور مقاتل کے قول پر وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا پہنچانے کے لیے ایسا کرتے تھے اور حضرت ابن عباس کا قول زیادہ قریب بہ صحت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان افعال کو ان کی نماز قرار دیا ہے۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 481، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ) (تبیان القرآن)

جعفر بن ابی ربیعہ نے حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے مکاء و تصدیۃ کا معنی پوچھا تو حضرت ابو سلمہ نے دونوں ہتھیلیاں ملا کر بیچ میں پھونکا جس سے سیٹی جیسی آواز پیدا ہوئی۔ رواہ ابن جریر۔ مقاتل کا بیان ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد حرام میں نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو دو آدمی آپ کے دائیں جانب کھڑے سیٹی کی آواز نکالتے اور دو آدمی آپ کے بائیں کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے تھے تاکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نماز میں گڑبڑ ہو جائے۔ یہ لوگ قبیلہ عبدالدار کے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: تصدیۃ سے مراد ہے مسلمانوں کو مسجد حرام اور دین اور نماز سے روکنا۔ اس قول کی بناء پر تصدیۃ کا مادہ صَدٌّ قرار پائے گا۔ دوسری دال کو یاء سے بدل دیا گیا۔

بہرصورت لفظ صلوٰۃ سے مراد کافروں کی وہ حرکات ہوں گی جن کو نماز کے قائم مقام انھوں نے بنا رکھا تھا۔ حکم تو دیا گیا تھا مسجد میں نماز پڑھنے کا اور انھوں نے بجائے نماز کے ان حرکات کو اختیار کیا۔ (تفسیر مظہری)

اہل مکہ تمہاری بے خبری کا عالم تو یہ ہے کہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کیا کیا دعائیں مانگی تھیں اور اس میں بطور خاص اقامت صلوٰۃ کی جو دعا مانگی تھی اس کی شکل و صورت اور اس کا مفہوم کیا تھا؟ قرآن کریم نے سورۃ ابراہیم میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی چند دعاؤں کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۔ ط رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ج فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ج وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ لا رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ (ابراہیم: ۳۵تا۳۷)

(اور یاد کرو! جب ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب! اس سرزمین کو پرامن سرزمین بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ۔ اے میرے رب! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر رکھا ہے سو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو غفور رحیم ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولادوں میں سے کچھ کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی سرزمین میں بسایا ہے۔ اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکرگزار ہوں۔)

اس دعا کو غور سے پڑھئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حضرت اسماعیل کو کس مقصد کے لیے مکہ معظّمہ بسایا تھا اور انھوں نے اپنی اولاد کے لیے کیا دعائیں مانگی تھیں۔ ربنالیقیموالصلوٰۃ کے الفاظ سے بطور خاص معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کو عبادت کا مرکز بنایا گیا تھا اور حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد کو اس گھر کے پڑوس میں بسانے سے اصل مدعا نماز کا اہتمام و قیام تھا۔ لیکن قریش نے جس طرح بیت اللہ کو توحید کا مرکز بنانے کی بجائے بت خانہ بنا کر رکھ دیا اسی طرح جس نماز کی خاطر انھیں یہاں بسایا گیا تھا اس کی صرف شکل ہی نہیں بگاڑی بلکہ اسے کھیل تماشے میں بدل ڈالا۔

یہ لوگ بیت اللہ کے پاس سیٹیاں بجاتے تالیاں پیٹتے اور اس مسخرہ پن کو نماز سمجھتے۔ جس قوم کو عبادت کا ذرا سا بھی تصور میسر ہو وہ کم از کم اسے ایسی شکل تو نہیں دے سکتی جسے دیکھنے والا کھیل تماشا سمجھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومیں جب نفسانیت کا شکار ہوتی ہیں اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متانت رخصت ہو جاتی ہے تو جس طرح وہ عام زندگی میں میلوں ٹھیلوں کی رسیا ہو جاتی ہیں اور ہر وقت یہ چاہتی ہیں کہ ان کی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کی تسکین کا سامان ہوتا رہے اسی طرح وہ اپنے مذہب کو بھی بگاڑ کر اسی ڈھب میں لے آتی ہیں۔ عیسائیوں نے

جس طرح اپنے عبادت خانوں میں گھنٹے بجانے کی رسم ڈالی اور ہندوؤں نے بھجن گانے کے ساتھ ساتھ دوشیزاؤں کے رقص کو عبادت کا حصہ بنایا اور مسلمانوں نے تعزیہ داری کی رسوم، مزاروں پر ہونے والی خرافات اور ذکر اللہ کی مجلسوں میں ناچ اور بھنگڑا، اسی بگڑے ہوئے ذوق کی علامتیں ہیں۔ قریش چونکہ اپنے بگاڑ میں حیوانی سطح تک اتر چکے تھے انھوں نے نماز جو اللہ کے ساتھ قرب اور تعلق کا سب سے اہم ذریعہ ہے کو بگاڑ کر ایسی شکل میں تبدیل کر دیا جس سے کبھی وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ ایسی چیز کبھی نماز رہی ہو گی۔ تو ایسی قوم جنھوں نے اللہ کے گھر کی ہیئت بدل ڈالی روایات پامال کر دیں، تاریخ مسخ کر دی، مقاصد تبدیل کر دیئے، بیت اللہ کی بجائے قومی معبد کی شکل دے دی اور عبادت اور نماز کو سیٹی اور تالیوں میں تبدیل کر دیا ان کا انجام عذاب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لیے پروردگار نے براہ راست ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ تم اب بگاڑ کی جس انتہا کو پہنچ گئے ہو کہ اب اس کی پاداش میں اللہ کا عذاب چکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ اس عذاب کا پہلا تھپڑ تو میدان بدر میں انھیں مارا گیا اور آئندہ کے لیے انھیں وارننگ دی گئی کہ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو پھر ایسے ہی اور تھپڑ لگیں گے اور بالآخر تمہاری ہر حیثیت تباہ کر دی جائے گی۔ (تفسیر روح القرآن تلیقا)

جاہل صوفیاء کے رقص و سرود پر علامہ قرطبی کا تبصرہ

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے اس میں ان جاہل صوفیاء کا رد ہے جو رقص کرتے ہیں، تالیاں پیٹتے ہیں اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 359، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

سو اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے۔ اس عذاب سے مراد تلوار کا عذاب ہے جو ان کو جنگ بدر کے دن پہنچا اور یا ان سے یہ قول آخرت میں کہا جائے گا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

حمد و نعت کے ساتھ آلات موسیقی کے بجانے (قوالی کرنے) کی حرمت

کفار مکہ نے طواف میں تالیاں اور سیٹیاں بجانا داخل کیا اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا آج کل کے قوال ڈھول باجوں اور تالیوں کے ساتھ حمد نعت کہتے ہیں بلکہ قرآنی آیات بھی ڈھول کی تھاپ پر پڑھنے لگتے ہیں حالانکہ شریعت نے مزامیر (ڈھول باجوں) کو حرام قرار دیا ہے۔

حضرت ابو امامہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

ان اللہ تعالیٰ بعثنی رحمۃ وھدی للعالمین وامرنی ان امحق المزامیر والکفارات یعنی البرابط والمعازف والاوثان التی کانت تعبد فی الجاہلیۃ۔ یعنی "مجھے اللہ نے تمام جہانوں کے لئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور مجھے اللہ نے حکم فرمایا ہے کہ سارنگیاں (منہ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی) اور ڈھول اور ہاتھ سے بجائے جانے والے دیگر آلات موسیقی کو توڑ ڈالوں اور دور جاہلیت میں جن بتوں کو پوجا جاتا تھا ان کو بھی توڑ ڈالوں" (مسند احمد جلد 5 صفحہ 257)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تمام آلات موسیقی کا استعمال حرام ہے بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ نے اسی لئے دنیا میں بھیجا کہ ان شیطانی آلات کا خاتمہ فرمائیں اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوئی قید اور استثنا ذکر نہیں فرمایا کہ کس صورت میں ان

کو استعمال کیا جاسکتا ہے کس صورت میں نہیں۔ آج بعض جہلاء کہتے ہیں کہ ان چیزوں کو فلمی گانوں اور بے حیائی کے نغمات کے ساتھ بجانا حرام ہے اور حمد و نعت قوالی کے ساتھ بجانا حلال ہے، میں کہتا ہوں اگر یہ بات تھی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام آلات موسیقی کے مطلقاً توڑنے کا حکم نہ فرماتے بلکہ فرماتے ان کو سنبھالو البتہ ان کو بے ہودگیوں بے حیائی کے نغمات کے ساتھ نہ جاؤ بلکہ حمد و نعت کے ساتھ بجاؤ۔

کیا ہے کوئی منصف مزاج شخص جو اس حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سمجھے اور مروجہ قوالی کی حلت کے قول سے باز آجائے؟

(تفسیر برہان القرآن)

بچوں اور پاگلوں کو مسجد سے دور رکھو

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے، اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے، چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے، اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذاء کا بھی۔ اس حدیث کی رو سے متولی مسجد کے لیے یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولی مسجد کو حق نہیں۔ (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ 36○

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک] [الَّذِيْنَ : جن لوگوں نے] [كَفَرُوْا : کفر کیا] [يُنْفِقُوْنَ : وہ خرچ کرتے ہیں] [اَمْوَالَهُمْ : اپنے مال] [لِيَصُدُّوْا : تاکہ وہ روکیں] [عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کے راستے سے] [فَسَيُنْفِقُوْنَهَا : پس وہ لوگ (ابھی اور) خرچ کریں گے ان کو] [ثُمَّ : پھر] [تَكُوْنُ : وہ ہوگا] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [حَسْرَةً : ایک حسرت] [ثُمَّ : پھر] [يُغْلَبُوْنَ : وہ لوگ مغلوب کیے جائیں گے] [وَالَّذِيْنَ : اور جنھوں نے] [كَفَرُوْٓا : کفر کیا][اِلٰى جَهَنَّمَ : جہنم کی طرف ہی] [يُحْشَرُوْنَ : وہ اکٹھا کیے جائیں گے]

ترجمہ: بیشک کافر لوگ اپنا مال و دولت (اس لئے) خرچ کرتے ہیں کہ (اس کے اثر سے) وہ (لوگوں کو) اللہ (کے دین) کی راہ سے روکیں، سو ابھی وہ اسے خرچ کرتے رہیں گے پھر (یہ خرچ کرنا) ان کے حق میں پچھتاوا (یعنی حسرت و ندامت) بن جائے گا پھر وہ (گرفت الٰہی کے ذریعے) مغلوب کر دیئے جائیں گے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے

تشریح:

عبادت تین قسم کی ہوتی ہے

قولی، فعلی اور مالی۔ ان کی قولی و فعلی عبادت کی جو کیفیت تھی وہ تو پہلے مذکور ہوئی۔ اب ان کی عبادت مالی کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ مال خرچ کرتے تو ہیں لیکن اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی یاد اور ذکر سے لوگوں کو روکنے کے لیے۔ اور انھوں نے دیکھ لیا کہ اس کا انجام بجز حسرت و ندامت کے کچھ نہ ہوا۔ آئندہ بھی اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس کا انجام بھی ایسا ہی حسرتناک ہوگا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

شانِ نزول

یہ آیت کفار قریش کے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے جنگ بدر کے موقع پر کفار کے لشکر کا کھانا اپنے ذمہ لیا تھا، یہ کل بارہ اشخاص تھے جن میں سے ہر شخص لشکر کو روزانہ دس اونٹ ذبح کر کے کھلاتا تھا۔ ان بارہ افراد میں سے دو اشخاص حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت حکیم بن حزام (رض) بعد میں ایمان لے آئے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ابو سفیان کے بارے میں نازل ہوئی، ابو سفیان نے جنگ احد کے موقع پر دو ہزار کفار کو کرایہ پر جنگ کے لیے تیار کیا اور ان پر چالیس اوقیہ سونا خرچ کیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جنگ بدر کی شکست کے بعد مقتولین کے اہل خانہ نے ابو سفیان کے تجارتی قافلے میں شریک تاجروں کو اپنا مال مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور تمام تاجر کفار اس بات پر راضی ہوگئے، ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بدنی عبادات کا حال بیان فرمایا کہ ان کی بدنی عبادت سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا ہے۔ اور اب ان آیتوں میں ان کی مالی عبادات کا حال بیان فرما رہا ہے کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے کے لیے یہ مال خرچ کرتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک ان کی مالی عبادت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ کفار اپنا مال مشرکین کو دیتے ہیں تاکہ وہ اس مال کے ذریعے قوت حاصل کر کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کا یہ مال خرچ کرنا عنقریب ان کے لیے ندامت کا سبب ہوگا۔ کیونکہ ان کے اموال خرچ ہو جائیں گے اور ان کی تمنا پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اور کلمۃ الکفر کو کلمۃ اللہ پر غالب کر دیں اور اللہ تعالیٰ اپنے کلمہ کو بلند کرتا ہے اور کلمۃ الکفر کو پست کرتا ہے پھر مسلمانوں کو غلبہ عطا فرماتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کفر کرنے والوں کو قیامت کے دن جمع کرے گا اور ان کو عذاب دے گا۔ پھر ان کو اپنے ساتھ زندہ رہنے والوں اور مرنے والوں کے انجام پر اور اپنے انجام پر حسرت اور ندامت ہوگی۔ کیونکہ جو کافر ان کے ساتھ زندہ رہے ان

کا مال اس جنگ میں ضائع ہو گیا اور وہ غمزہ اور شکست خوردہ لوٹے اور جو ہلاک ہوگئے وہ قتل کیے گئے اور ان کے ہتھیار، سواری اور لباس اتار کر مجاہدین کو دیے گئے اور ان کو بہ عجلت دائمی عذاب اور آگ میں ڈال دیا گیا اور جس شخص نے اس مہم میں مال خرچ کرنے کا انتظام کیا تھا وہ حسب ذیل روایات کے مطابق ابوسیفان ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

الحکم بن عتیبہ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ابوسفیان کے متعلق نازل ہوئی ہے جس نے جنگ احد میں مشرکین کے اوپر چالیس اوقیہ سونا خرچ کیا تھا اور ایک اوقیہ اس وقت 42 مثقال کا تھا۔

محمد بن یحیٰی، عاصم بن عمر اور الحصین بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ بدر میں مسلمانوں نے کفار پر غلبہ حاصل کر لیا اور کفار شکست خوردہ ہو کر مکہ لوٹے، ادھر ابوسفیان بھی اپنے قافلہ کو لے کر مکہ پہنچ گیا۔ تو عبداللہ بن ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ چند قریش کے ساتھ لے کر ان لوگوں کے پاس تعزیت کے لیے گئے جن کے باپ، بھائی اور بیٹے اس جنگ میں مارے گئے تھے۔ انھوں نے ابو سفیان بن حرب اور قافلہ کے دیگر تاجروں سے کہا کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تمھیں شکست سے دوچار کیا اور تمہارے بہترین جنگ جوؤں کو قتل کر دیا اب تم ان کے خلاف جنگ میں اس مال سے ہماری مدد کرو۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری بار جنگ میں ہم اس شکست کی تلافی کر لیں، تو تمام کفار تاجر اس تجویز پر راضی ہوگئے۔ امام ابن جریر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ مشرکین مسلمانوں پر حملہ کرنے اور لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں اور یہ نہیں بتایا کہ وہ ابوسفیان ہے یا کوئی اور، بلکہ بالعموم کفار کے مال خرچ کرنے کی خبر دی ہے۔ اور یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کس جنگ میں مال خرچ کر رہے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس آیت سے معرکہ بدر میں مال خرچ کرنے والے کافر مراد ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد جنگ احد میں مال خرچ کرنے والے کافر مراد ہوں۔ (جامع البیان جز 9، ص 322۔324، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، 1415ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

کفار کی زر پاشیاں بھی اسلامی انقلاب کو روک نہ سکیں گی

ہم نے گزشتہ آیات میں دیکھا ہے کہ کفار کی جسارتیں اور اسلام سے عداوتیں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ اللہ کا رسول جو دنیا میں اللہ کا نمائندہ اور انسانیت کا شاہکار ہوتا ہے، اسے قتل کرنے کی تدبیریں کی گئیں۔ قرآن کریم جو اللہ کا اہل زمین کے لیے پیغام ہے اس کا مذاق اڑایا گیا اور جب انھیں تنبیہ کی گئی تو منہ پھاڑ کر یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر یہ دین اللہ کی جانب سے ہے تو ہم بجائے اسے قبول کرنے کے اس بات کو ترجیح دیں گے کہ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں۔ نماز جو عبد اور معبود کے درمیان رابطہ کی سب اہم صورت ہے اسے کھیل تماشہ بنا دیا گیا۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر اپنے آخری داؤ کھیلنے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک بات اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے کہ کسی بھی ضابطہ حیات طرز زندگی اور انقلابی فکر کو ناکام کرنے کے لیے دو ہی چیزیں ضروری ہوتی ہیں ایک یہ کہ مخالفین اپنی افرادی قوت کو اسے روکنے پر لگا دیں اور دوسری یہ کہ اپنی تجوریوں کا منہ اپنی مخالفت اور عناد کو مستحکم کرنے کے لیے کھول دیں۔ چنانچہ کفر نے افرادی قوت کے ساتھ ساتھ مالی قوت کو بھی مکمل طور پر اس راستے پر لگا دیا ہے۔ جب وہ لوگ میدان بدر میں ہمیشہ کے لیے اسلامی قوت کو کچلنے کے لیے آئے تھے تو مکہ کی پوری طاقت میدان میں آگئی تھی اور ساتھ ساتھ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ان کے سرداروں میں سے ایک ایک

آدمی ایک ہزار کے لشکر کو تنہا کھانا کھلاتا اور اس کی جنگی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ لیکن نہ ان کی قوت کام آئی اور نہ ان کی زرپاشیاں کام آئیں۔ ان کی قیادت کی پہلی صف اس طرح ڈھیر ہوئی کہ ایک اندھا کنواں ان کا مدفن بنا اور ان کا تمام سرمایہ خود اپنی موت کا ذریعہ بن گیا۔ لیکن ابھی تک ان میں کس بل باقی تھا۔ وہ اتنا نقصان اٹھا کر بھی اپنی دشمنی اور رعونت سے باز آنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ جن لوگوں کے عزیز جنگ بدر میں مارے گئے انھوں نے اکٹھے ہو کر ابوسفیان سے درخواست کی کہ تم جو ایک بڑا قافلہ تجارت لے کر ملک شام گئے تھے اور وہاں سے تم بہت کچھ کما کر واپس آئے ہو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس قافلۂ تجارت کا سارا منافع آئندہ جنگ کی تیاری اور مسلمانوں کے استیصال پر صرف کر دیا جائے۔ اس آیت میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ پہلے بھی خرچ کر کے اس کا انجام دیکھ چکے ہیں۔ یہ آئندہ بھی خرچ کریں گے اور تم دیکھو گے کہ آئندہ کا سارا خرچ کیا ہوا مال حسب سابق ان کے لیے سرمایہ حسرت بن جائے گا۔ یہ جس طرح اپنے مقتولوں پر روئیں گے اسی طرح اپنے مال و دولت کے ضائع ہونے پر بھی آنسو بہائیں گے۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ساری کاوشیں اس طوفان کو روک نہیں سکیں گی جو اسلام کے نام پر آ گے بڑھ رہا ہے۔ یہ اپنی تمام انسانیت دشمن کاروائیوں سے اس چشمہ صافی سے لوگوں کو زیادہ دیر تک دور رکھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے جس چشمہ کا ایک ایک قطرہ آب حیات کا حکم رکھتا ہے بلکہ ان کا اپنا انجام یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں انھیں جہنم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا اور وہاں اس فرقان کا پوری طرح ظہور ہوگا جو مسلمانوں کا اصل سرمایہ ہے۔ وہاں خبیث کو طیب سے الگ کر دیا جائے گا۔ ہر کافر خبیث ہے اور ہر مومن طیب ہے۔ طیب طیب جگہ میں یعنی جنت میں رکھے جائیں گے اور ان تمام خبثاء کو ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ڈھیر کر دیا جائے گا۔ رَکَم کا معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ڈھیر کرنا ہے۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو سارا کوڑا جمع کر کے تہہ بہ تہہ ڈھیر کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہہ بہ تہہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن دستیاب ہونے کی وجہ سے پوری قوت سے بڑھ سکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصے کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اہل کفر نے جس طرح اسلام کا راستہ روکنے میں ایک دوسرے کی مدد اور پشت پناہی کی ہے اسی طرح جہنم میں یہ ایک دوسرے کو جلانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ لاشیں ایندھن کی طرح جلیں گی اور ہر لاش دوسرے کو جلانے کا کام دے گی۔ اس وقت انھیں اندازہ ہوگا کہ قرآن کریم نے اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ فرما کر انھیں کس انجام کی خبر دی تھی۔ لیکن اس وقت کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۧ 37

لغۃ القرآن: [لِيَمِيْزَ : تاکہ الگ کرے] [اللّٰهُ : اللہ] [الْخَبِيْثَ : ناپاک کو] [مِنَ الطَّيِّبِ : پاکیزہ سے] [وَيَجْعَلَ : اور تاکہ وہ کردے] [الْخَبِيْثَ : ناپاک کو] [بَعْضَهٗ : اس کے بعض کو] [عَلٰي بَعْضٍ : بعض کے اوپر] [فَيَرْكُمَهٗ : تب وہ ڈھیر لگائے گا اس کا] [جَمِيْعًا : سب کے سب کا] [فَيَجْعَلَهٗ : تب وہ رکھے گا اس کو] [فِيْ جَهَنَّمَ: جہنم میں] [اُولٰٓئِكَ : وہ لوگ] [هُمُ الْخٰسِرُوْنَ : ہی خسارہ پانے والے ہیں]

ترجمہ: تاکہ اللہ (تعالیٰ) ناپاک کو پاکیزہ سے جدا فرمادے اور ناپاک (یعنی نجاست بھرے کرداروں) کو ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھ دے پھر سب کو اکٹھا ڈھیر بنادے گا پھر اس (ڈھیر) کو دوزخ میں ڈال دے گا، یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں

تشریح:

مشرک اور کافر فکر و عمل کے اعتبار سے گندے لوگ ہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ذریعے مومنوں اور مشرکوں کے درمیان ایک امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے اور قیامت کے دن اسی امتیاز کی بناء پر انھیں الگ کر دیا جائے گا۔

انسان جب کفر و شرک کا وطیرہ اختیار کرلیتا ہے تو وہ فکری طور پر منتشر اور عملی طور پر خبیث اور گندا ہو جاتا ہے قرآن مجید میں عقیدہ کفر و شرک کو شجرہ خبیثہ کہا ہے اور شرک کے مرتکب شخص کو نجس قرار دیا ہے۔ (ابراہیم : ۲۶)

عربی میں گندی، پلید اور بری چیز کو خبیث کہا جاتا ہے۔ شیطان ہر قسم کی خباثت کا منبع ہے اس بنا پر اس کا دوسرا نام خبیث ہے۔ خبیث کے مقابلہ میں طیب کا لفظ آیا ہے۔ عقیدہ توحید کو سورۃ ابراہیم میں شجرہ طیبہ کہا گیا ہے۔ جس کی جڑیں مضبوط اور اس کی شاخیں آسمان تک بلند ہیں۔ یہ ایسا سدابہار درخت ہے جو ہر آن پھل دیتا ہے۔ اس عقیدہ کے تقاضے پورے کرنے والا شخص طیب ہو گا۔ جس کا معنیٰ پاک، عمدہ اور بہترین ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حلال و حرام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ طیب ہے اور وہ طیب مال کو پسند کرتا ہے گویا کہ طیب اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ یہاں کافر و مشرک کو خبیث اور مسلمان کو طیب قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان امتیاز کرے گا۔ یہ

امتیاز اللہ تعالیٰ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اور آخرت میں بھی ہوگا۔ اسلام کے نفاذ سے یہ امتیاز دنیا میں مدت تک قائم رہا لوگوں نے کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھا کہ قرآن کے ماننے اور عقیدہ توحید اختیار کرنے والوں کا کیا کردار ہوتا ہے اور خدا کے باغیوں کے عقیدہ و عمل سے دنیا میں کیا غلاظت اور تعفن پیدا ہوتا ہے اسی امتیاز کی بنا پر آخرت میں مومنوں اور مشرکوں کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ جہنم میں مشرکوں اور کافروں کو ایک دوسرے کے اوپر جمع کرے گا اور یہ لوگ ہمیشہ کے لیے نقصان میں رہیں گے۔ ایک دوسرے کے اوپر جمع کرنے سے مراد جہنم کے طبقات ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنمیوں کو ذلیل کرنے اور سزا کے طور پر ایک دوسرے پر پھینکا جائے۔

(اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَّا يَسْتَوٗنَ) [سورۃ السجدۃ : ۱۸]

"کیا مومن ایسے ہی ہوتا ہے جیسے فاسق ؟ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔"

(اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا) [النساء : ۱۴۵]

" بلاشبہ منافق جہنم کے نچلے گڑھے میں ہوں گے اور تو ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پائے گا۔ " (تفسیر فہم القرآن)

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ آیت کا سبب نزول اگرچہ خاص ہے مگر مضمون عام ہے چنانچہ ہر زمانہ کے کفار کو یہ شامل ہے اس میں آج کے کفار یہود و نصاریٰ اور دیگر تمام کافر داخل ہیں جو لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اپنے باطل دین کی طرف دعوت دینے پر کروڑوں روپیہ شفاخانوں تعلیم گاہوں اور سڑکوں کی تعمیر، کھانے پینے کی اشیا، این جی اوز کے ذریعہ مالی امداد صدقہ خیرات کے عنوان سے خرچ کرتے ہیں اسی طرح وہ گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلام کے مسلم اجماعی عقائد میں شبہات و شکوہ اور اوہام پیدا کر کے ان کے خلاف لوگوں کو دعوت دینے کے لئے اپنے بہت سے مال خرچ کرتے ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے دین اسلام کی حفاظت خود فرماتے ہیں اور بہت سے ہم واقعات میں مشاہدہ بھی ہوجاتا ہے کہ یہ لوگ اکثر اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتے ہیں اور ان کے بیشمار اموال رائگان اور ضائع ہوجاتے ہیں اور وہ جن مقاصد میں مال خرچ کرتے ہیں ان کا وہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔

"لیمیز اللہ الخبیث من الطیب "یعنی تا کہ اللہ تعالیٰ گندی ناپاک چیز اور پاک صاف چیز میں فرق ظاہر لفظ خبیث ناپاک گندے اور حرام کے لئے بولا جاتا ہے اور طیب اس کے مقابل پاک صاف ستھرے اور حلال کے لئے بولا جاتا ہے اس جگہ ان دونوں لفظوں سے کفار کے اموال خبیثہ اور مسلمانوں کے اموال طیبہ بھی مراد ہوسکتے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کفار نے جو مال کثیر خرچ کیے وہ مال خبیث اور ناپاک تھے ان کا برا نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ مال بھی گیا اور جانے بھی گئیں۔

اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بہت تھوڑا مال خرچ کیا مگر وہ مال پاک اور حلال تھا ان کے خرچ کرنے والے کامیاب ہوئے اور مزید مال غنیمت بھی انہیں ہاتھ آئے چنانچہ ارشاد فرمایا "**ویجعل الخبیث بعضه علی بعض فیر کمه جمیعا فیجعله فی جهنم اولئك هم الخسرون** "یعنی اللہ تعالیٰ جمع کر دیتا ہے ایک خبیث کو دوسرے خبیث کے ساتھ پھر ان سب کو جہنم میں جمع کردے گا یہی لوگ خسارے میں پڑنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اور کھرپہ گھاس کو کھینچتا ہے اور موجودہ سائنس کے تجربات نے ساری دنیا کا نظام باہمی کشش پر قائم ہے اسی طرح اعمال و اخلاق میں بھی کشش ہے ایک برا عمل دوسرے برے عمل کو اور ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کو کھینچتا ہے اور مال خبیث دوسرے مال خبیث کو کھینچتا ہے اور پھر یہ عموالخبیث اعصار خبیثا پیدا کرتے ہیں اور نیک اعمال کی جو رحمت ہے اسے ختم کرتے چلے جاتے ہیں حرام رزق کھانے سے دیانت و تقوی کا مادہ دل سے اتر جاتا ہے اور گناہوں اور

معاصی کا شوق پیدا ہوتا ہے ان کے ساتھ جہنم میں پھینک دی جاتی ہیں "لا ید خل الجنتہ جسد غزی بالحرام " (مشکوۃ) جس بدن کی پرورش حرام کے ساتھ ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔ فالنار اولی بہ "وہ جہنم کا حقدار ہو گا۔
بعض مفسرین کرام نے کہا ہے کہ پاک وطیب سے مراد مومن ہے اور ناپاک وخبیث سے مراد کافر ہے اور جنت پاکیزہ لوگوں کا ٹھکانہ ہے جب کہ جہنم ناپاک اور خبیث لوگوں کا ٹھکانہ ہو گا مومن جنت میں جمع ہوں گے اور کافر دوزخ میں۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَۚ وَ اِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ○38

لغۃ القرآن:

[قُلْ : آپ کہہ دیجیے] [لِّلَّذِیْنَ : ان سے جنہوں نے] [كَفَرُوْۤا : کفر کیا] [اِنْ : (کہ) اگر] [یَّنْتَهُوْا : وہ باز آجائیں] [یُغْفَرْ : تو معاف کردیا جائے گا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [مَّا : اس کو جو] [قَدْ سَلَفَ : گزرا ہے] [وَاِنْ : اور اگر] [یَّعُوْدُوْا : وہ لوگ پھر کریں گے] [فَقَدْ مَضَتْ : تو گزر چکا ہے] [سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ : اگلے لوگوں کا طریقہ]

ترجمہ:

آپ کفر کرنے والوں سے فرمادیں: اگر وہ (اپنے کافرانہ افعال سے) باز آجائیں تو ان کے وہ (گناہ) بخش دیئے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اگر وہ پھر وہی کچھ کریں گے تو یقیناً اگلوں (کے عذاب در عذاب) کا طریقہ گزر چکا ہے (ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو گا)

تشریح:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے فرمادیجئے کہ وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرنے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے سے باز آجائیں اور دین اسلام میں داخل ہو کر دین اسلام کو مضبوطی سے تھام لیں تو اللہ تعالیٰ ان کا کفر اور اسلام سے پہلے کے گناہ معاف فرمادے گا اور اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہے، آپ کے اور مسلمانوں کے خلاف پھر جنگ کی تو اس معاملے میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی سنت گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو ہلاک فرمادیتا ہے اور اپنے انبیاء واولیاء کی مدد فرماتا ہے جیسے پچھلی امتوں کے کفار نے جب اللہ عَزَّوَجَلَّ کے رسولوں کو جھٹلایا، ان کی نصیحت قبول کرنے کی بجائے سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عبرتناک عذاب میں مبتلا کر دیا، یونہی جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی اور مشرکوں کو شکست ورسوائی سے دوچار کیا وہ پھر ایسا ہی کرے گا۔

کافر توبہ کرے تو اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں :
اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر جب کفر سے باز آئے اور اسلام قبول کر لے تو اس کا پہلا کفر اور حالت کفر میں کئے گئے گناہ سب معاف ہو جاتے ہیں۔
صحیح مسلم میں ہے
کہ جب عمرو بن عاص اسلام قبول کرنے کے لیے بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہوئے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دستِ اقدس تھام کر عرض کی کہ میں اس شرط پر اسلام قبول کرتا ہوں کہ میری مغفرت کر دی جائے، تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام قبول کرنا سابقہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

اسلام لانے والے شخص کے تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں

حضرت عمرو بن العاص (رض) سے مروی ہے وہ کہتے ہیں جب میں اسلام لانے کے لئے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا میں اس شرط پر اسلام لاؤں گا کہ میرے صاحب کا تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ہجرت اور حج یہ تینوں کام اپنے سے قبل والے تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں (مسلم کتاب الایمان حدیث 291) اس حدیث کو شیعہ مورخ مرزا محمد تقی ایرانی نے بھی اپنی کتاب ناسخ التواریخ جلد 2 صفحہ 333 مطبوعہ تہران میں نقل کیا ہے۔
اس جگہ اہل تشیع کے لیے درس ہدایت ہے کہ وہ حضرت عمر فاروق، ابوسفیان، امیر معاویہ، عمرو بن العاص اور دیگر صحابہ (رض) کو قبول اسلام سے قبل والی کاروائیوں کی وجہ سے مورد طعن بناتے ہیں جبکہ اللہ نے معاف فرمایا : اِنۡ يَّنۡتَهُوۡا يُغۡفَرۡ لَهُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ۔ کہ اگر وہ کفر سے باز آ جائیں تو ان کے سب کا گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جو شخص کسی اسلام لانے والے شخص پر اس کے سابقہ عمل کی وجہ سے طعن کرتا ہے تو وہ بڑا موذی انسان ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)
ان آیات کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ گویا حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کفار کو فرمایا : اگر تم اسلام دشمنی سے باز آ جاؤ اور مسلمانوں کو تنگ کرنا چھوڑ دو تو ہم تمہاری گزشتہ زیادتیوں کو معاف کر دیں گے اور کوئی انتقامی کارروائی نہیں کریں گے اور اگر تم اسلام کی مخالفت پر مصر رہے تو جس طرح پہلی کافر قوموں کے ساتھ اہل ایمان جہاد کرتے رہے اسی طرح ہم بھی تمہارے ساتھ برسرپیکار رہیں گے حتی کہ تمہارا فتنہ ختم ہو جائے اور اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ اسلام کے غلبہ سے یہ مراد نہیں کہ ہر ایک کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو مذہبی آزادی ہو اور کوئی کسی کے مذہب میں داخل نہ کر سکے۔
ان آیات کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گزشتہ گناہ معاف کر دے گا لیکن اگر انھوں نے کفر پر اصرار جاری رکھا تو جیسے بدر میں پہلے انھیں سزا مل چکی ہے۔ (تفسیر ابن جریر طبری) آئندہ بھی ایسی ہی سزا دی جائے گی یہاں تک کہ کفار کا زور ٹوٹ جائے اور مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ ہو جائیں۔ (تفسیر امداد الکرم)

سابقہ آیات سے ارتباط اور شان نزول

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی مالی عبادتیں اور بدنی عبادتیں بیان فرمائی تھیں اور اس آیت میں ان کو اسلام لانے کی دعوت دی ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے نبی مکرم ! آپ ان مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرنے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے سے باز آ جائیں اور ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہ معاف کر دے گا اور اگر ان مشرکوں نے پھر آپ کے خلاف جنگ کی اور مسلمانوں پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے جس طرح جنگ بدر میں مسلمانوں کی مدد کی تھی اور مشرکین کو شکست اور رسوائی سے دوچار کیا تھا وہ پھر ایسا ہی کرے گا۔ کیونکہ اس معاملہ میں اللہ کی سنت پہلوں میں جنگ بدر میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح پچھلی امتوں کے کافروں نے جب اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور سرکشی کی اور ان رسولوں کی نصیحت کو قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عبرت ناک عذاب سے دوچار کر دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی : اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً ضرور بہ ضرور غلبہ مجھے ہو گا اور میرے رسولوں کو ہو گا۔ (المجادلہ 21:)

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون : اور بیشک ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھا دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ (الانبیاء : 105)

ایمان لانے سے سابقہ گناہوں کے معاف ہونے کے متعلق قرآن اور سنت سے دلائل

اس آیت میں فرمایا کہ اگر کافر کفر سے باز آ جائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے قرآن مجید میں ہے : وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَـقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○68 يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا ○69 اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○70 : (الفرقان : 68۔70) اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی پرستش نہیں کرتے اور اس شخص کو قتل نہیں کرتے جس کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اور نہ زنا کرتے ہیں، اور جو ایسا کرے گا وہ سزا پائے گا۔ قیامت کے دن اس کو دگنا عذاب دیا جائے گا اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ ذلت سے رہے گا۔ البتہ جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیے تو اللہ ان کے گناہوں کو بھی نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

اور کفر کے ترک کرنے اور ایمان لانے سے گناہوں کے مٹ جانے کے متعلق امام مسلم نے ایک طویل حدیث روایت کی ہے :

ابن شماسہ مہری بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرو بن العاص کے پاس گئے وہ اس وقت قریب المرگ تھے۔ وہ بہت دیر تک روتے رہے پھر انھوں نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ ان کے بیٹے نے کہا اے ابا جان ! کیا آپ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی، کیا آپ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی، حضرت عمرو بن العاص نے ان کی طرف منہ کر کے فرمایا ہمارے نزدیک سب سے افضل عبادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا ہے اور میری زندگی میں تین دور گزرے ہیں ایک

وہ دور تھا کہ میرے نزدیک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ کوئی مبغوض نہیں تھااور میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ بات یہ تھی کہ میں آپ پر قدرت پاتا اور آپ کو قتل کر دیتا۔ اگر میں اس دور میں مر جاتا تو میں بلاشبہ اہل دوزخ میں سے ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے عرض کیا: اپنے ہاتھ پھیلایئے تاکہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں، آپ نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ نے پوچھا اے عمرو! کیا ہوا؟ میں نے کہا میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا تم کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ میری مغفرت کر دی جائے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام پہلے کے کیے ہوئے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور ہجرت پہلے کے کیے ہوئے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور حج پہلے کے کیے ہوئے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اس وقت مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھااور نہ میری آنکھوں میں آپ سے زیادہ کوئی بزرگ تھا۔ اور آپ کے جلال کی وجہ سے میں یہ طاقت نہیں رکھتا تھا کہ میں آپ کو نظر بھر کر دیکھ سکوں اور اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرتا کہ میں آپ کا حلیہ بیان کروں تو میں اس پر قادر نہ تھا، کیونکہ میں نے آپ کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھااور اگر میں اس دور میں مر جاتا تو مجھے امید ہے کہ میں اہل جنت میں سے ہوتا۔ پھر ہمیں چند مناصب پر فائز کیا گیا اور میں نہیں جانتا کہ ان میں میرا کیا حال ہے۔ پس اگر میں مر جاؤں تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی نہ ہو، نہ آگ ہو، اور جب تم مجھے دفن کر چکو تو میری قبر پر مٹی چھڑک دینا اور پھر میری قبر پر اتنی دیر ٹھہرنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو تقسیم کیا جاتا ہے حتیٰ کہ میں تم سے مانوس ہو جاؤں اور میں دیکھوں کہ میں اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں۔ (صحیح مسلم الایمان: 192 (121) 314، مطبوعہ مکتبہ نزار المصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ 1417ھ)

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی 6565ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ اسلام، ہجرت اور حج پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ اور حدیث کے الفاظ کے عموم سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ان اعمال سے حقوق شرعیہ اور حقوق آدمیہ دونوں معاف ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کافر حربی جب مسلمان ہو جائے تو اس سے کسی حق کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا خواہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا کسی کا مال غصب کیا ہو۔ (المفہم ج 1، ص 329، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت 1417ھ)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: یارسول اللہ کیا زمانہ جاہلیت کے اعمال کا ہم سے مواخذہ کیا جائے ا؟ آپ نے فرمایا تم میں سے جس نے اسلام میں نیک عمل کیے اس سے مواخذہ نہیں کیا جائے گا اور جس نے برے عمل کیے اس سے جاہلیت اور اسلام کے اعمال کا مواخذہ کیا جائے گا۔ دوسری روایت میں ہے اس سے اول اور آخر کا مواخذہ کیا جائے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 6921۔ صحیح مسلم الایمان: 189 (120) 311۔ مسند احمد ج 1، ص 379،462)

علامہ ابوالعباس القرطبی المالکی المتوفی 656ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو یہ ارشاد ہے کہ جس نے اسلام میں نیک عمل کیے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا دین اسلام میں دخول صحیح ہو۔ وہ اسلام میں اخلاص سے داخل ہو اور تاحیات اسلام پر قائم رہے۔ مرتد نہ ہو، اور اس حدیث میں اساءت، کفر اور نفاق کے مقابلہ میں ہے۔ اور اس حدیث میں اساءت سے گناہ کبیرہ اور صغیرہ کا ارادہ کرنا صحیح نہیں ہے، ورنہ اس سے یہ لازم آئے گا اسلام اسی شخص کے سابقہ گناہوں کو مٹائے گا جس نے اسلام لانے کے بعد تاحیات کوئی گناہ نہ کیا ہو اور یہ قطعاً باطل ہے۔ قرآن مجید، حدیث صحیح اور اجماع

کے خلاف ہے۔ اور مواخذہ سے مراد یہ ہے کہ اس نے زمانہ جاہلیت اور اسلام میں جو گناہ کیے ہیں ان پر سزا ہوگی اور یہ مواخذہ اس شخص سے ہوگا جو نفاق سے اسلام میں داخل ہوا ہو یا اسلام کے بعد مرتد ہو گیا ہو۔ (المفہم ج 1، ص 327، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، 1417ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی متوفی 676ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں احسان اور نیک عمل سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے اسلام میں داخل ہوا ہو اور یہ کہ وہ حقیقی مسلمان ہو تو اس کے سابقہ گناہ قرآن مجید کے نصوص صریحہ، حدیث صحیح اور جماع سے معاف کر دیے جائیں گے، اور برے عمل اور اساءت سے مراد یہ ہے کہ وہ دل سے اسلام میں داخل نہ ہو بلکہ وہ صرف بظاہر کلمہ شہادت پڑھے اور دل سے اسلام کا معتقد نہ ہو۔ پس ایسا شخص منافق ہے اور وہ اپنے کفر پر باقی ہے۔ لہٰذا اس سے صورتاً اسلام کے اظہار سے پہلے اور اس کے بعد کے تمام گناہوں پر مواخذہ ہوگا اور اس کو سزا ملے گی کیونکہ وہ اپنے کفر پر دوام اور استمرار کے ساتھ قائم ہے۔ (شرح النواوی مع المسلم، ج 1، ص 810، مطبوعہ مکتبہ نزار المصطفیٰ مکہ مکرمہ، 1417ھ)

کافر کے سابقہ گناہوں کے بخشنے میں اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم

اللہ تعالیٰ کافر کے جو پچھلے تمام گناہ بخش دیتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر بہت بڑا لطف و کرم ہے۔ کیونکہ کفار انواع واقسام کے کفر اور جرائم، فواحش و منکرات اور معاصی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ان کے سابقہ گناہوں پر موخذہ کیا جاتا تو وہ توبہ سے ان گناہوں کی تلافی کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے اور ان کو مغفرت کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قبول توبہ کو آسان کر دیا اور اسلام کے بعد ان کے پچھلے گناہوں کی مغفرت کا اعلان کر دیا تا کہ ان کا دین اسلام میں داخل ہونا آسان ہو جائے، اور اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے پچھلے گناہوں پر ضرور مواخذہ ہوگا تو وہ توبہ کرتے نہ اسلام لاتے۔ کیونکہ انسان کو جب معلوم ہو کہ اس کو اس کے جرائم کی معافی نہیں مل سکتی تو پھر وہ بغاوت پر اتر آتا ہے اور کھل کر جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کی نظیر یہ حدیث ہے:

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم سے پہلی امتوں میں ایک شخص نے ننانوے قتل کیے۔ اس نے پوچھا روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے تو ایک راہب (عیسائیوں کا پیر) کی طرف اس کی رہنمائی کی گئی وہ گیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے ننانوے قتل کیے ہیں کیا اس کی توبہ ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ اس شخص نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا اور ایک سینکڑہ پورا کر دیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے تو ایک عالم کی طرف اس کی رہنمائی کی گئی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ اس نے سو قتل کیے ہیں کیا اس کی توبہ ہو سکتی ہے، اس نے کہا ہاں۔ توبہ اور اس کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے تم فلاں فلاں جگہ چلے جاؤ وہاں کچھ لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اپنے علاقہ کی طرف لوٹ کر نہ جانا وہ بری جگہ ہے۔ وہ وہاں سے چل پڑا۔ ابھی آدھے راستے پر پہنچا تھا کہ اس کو موت نے آلیا۔ پھر اس کے متعلق رحمت کے فرشتوں اور عذب کے فرشتوں کے درمیان مباحثہ ہوا۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا یہ شخص توبہ کرتا ہوا اور اپنے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوا آیا تھا۔ عذاب کے فرشتوں نے کہا اس نے کوئی نیک عمل بالکل نہیں کیا۔ تب ان کے پاس ایک اور فرشتہ آدمی کی صورت میں آیا انھوں نے اس کو اپنے درمیان حکم

(منصف) بنالیا۔ اس نے کہاان دونوں زمینوں کے درمیان پیائش کرو جس زمین کے وہ زیادہ قریب ہو اس کو اسی کے ساتھ لاحق کردو۔ انھوں نے پیائش کی تو وہ اس زمین کے زیادہ قریب تھا جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ تب اس کو رحمت کے فرشتوں نے لے لیا۔
امام مسلم کی دوسری سند کے ساتھ جو روایت ہے (6877) اس میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو حکم دیا کہ تو دور ہو جا (یعنی اس کے علاقہ کی زمین) اور اس زمی (جہاں نیک لوگ رہتے تھے) کو حکم دیا کہ تو قریب ہو جا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3470۔ صحیح مسلم التوبہ: 46 (2766) 6875۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2622)

زندیق کی توبہ مقبل ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق

زیر تفسیر آیت میں فرمایا ہے کہ اگر کافر کفر سے باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور زندیق بھی کافر ہے سو اگر وہ اپنی زندیقی سے باز آجائے تو اس کے پچھلے گناہ بھی معاف ہو جانے چاہئیں۔ لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ زندیق کی توبہ مقبول ہے جیسا کہ اس ظاہر آیت کا تقاضا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی توبہ مقبول نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی زندیقی کو مخفی رکھتا ہے اور اس کی توبہ پر اطمینان نہیں ہے۔ ہم اس مبحث میں پہلے زندیق کا معنی بیان کریں گے پھر زندیق اور دہری وغیرہ کا فرق بیان کریں گے، پھر فقہاء کا اختلاف ذکر کریں گے اور آخر میں یہ بتائیں گے کہ اس کی توبہ قبول نہ ہونے کا کیا محمل ہے۔

زندیق کا معنی اور مفہوم

علامہ محمد طاہر ہندی متوفی 1078ھ علامہ طیّبی متوفی 743ھ سے نقل کر کے لکھتے ہیں:
زنادقہ مجوس کی ایک قوم ہے جس کو ثنویہ بھی کہتے ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نور مبدء خیرات ہے اور ظلمت مبدء شرور ہے۔ پھر اس لفظ کو ہر ملحد فی الدین کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اور یہاں اس سے مراد وہ قوم ہے جو اسلام سے مرتد ہو گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ زنادقہ سبائیہ کو کہتے ہیں جو عبداللہ بن سبا کے اصحاب ہیں، ان لوگوں نے طلب فتنہ اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار کیا۔ پہلے انھوں نے حضرت عثمان (رض) کے خلاف فتنہ پھیلایا، پھر شیعوں سے مل کر ان کو ان کی جہالتوں میں گمراہ کیا، حتیٰ کہ شیعوں نے حضرت علی (رض) کے معبود ہونے کا اعتقاد کیا، حضرت علی نے ان سے توبہ طلب کی انھوں نے توبہ نہیں کی۔ پھر حضرت علی (رض) نہ نے ان کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے ان کو جلا دیا۔ اور علامہ ابن الاثیر متوفی 630ھ نے جامع الاصول کی شرح میں لکھا ہے کہ زندیق وہ شخص ہے جو کفر کو چھپاتا ہو اور اسلام کو ظاہر کرتا ہو، جس طرح منافق ہیں، یا یہ ثنویہ کی ایک قوم ہے۔ (مجوس کی ایک قسم) یا وہ شخص ہے جس کا کوئی دین نہ ہو یا یہ وہ لوگ ہیں جن کو حضرت علی نے جلا دیا تھا جو بتوں کی پرستش کرتے تھے یا رافضی ہیں۔ (مجمع بحار الانوار، ج 2، ص 441، 442، مطبوعہ مکتبۃ دار الایمان، المدینہ المنورہ، 1415ھ)

زندیق، منافق، دہری اور ملحد کی تعرفیوں کا باہمی فرق

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن کمال پاشا نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے عربی زبان میں زندیق کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جو باری تعالیٰ کی نفی کرتا ہو، اور جو شریک کو ثابت کرتا ہو، اور جو اللہ کی حکمت کا انکار کرتا ہو، اور مرتد اور زندیق کے درمیان عموم و خصوص من وجہ کی نسب ہے، کیونکہ کبھی زندیق مرتد نہیں ہوتا جیسا کہ اصلی زندیق جو دین اسلام سے منحرف نہ ہوا ہو۔ اور کبھی مرتد زندیق نہیں ہوتا جیسے کوئی مسلمان مثلاً یہودی یا عیسائی ہو جائے (العیاذ باللہ) اور کبھی زندیق مرتد بھی ہوتا ہے مثلاً کوئی مسلمان زندیق ہو جائے۔ العیاذ باللہ۔ اور اصطلاح شرع میں فرق زیادہ ظاہر ہے کیونکہ شریعت میں زندیق اس کو کہتے ہیں جو کفر کو چھپائے اور ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا اعتراف کرے لیکن یہ دوسری قید مسلمان زندیق کے اعتبار سے ہے اور زندیق، منافق، دہری اور ملحد میں فرق یہ ہے کہ کفر کو چھپانا تو ان سب میں مشترک ہے لیکن منافق ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا اعتراف نہیں کرتا، اور دہری اس کے ساتھ ساتھ حوادث کی اللہ سبحانہ کی طرف نسبت کا بھی انکار کرتا ہے۔ (یعنی خدا کو نہیں مانتا) اور ملحد وہ شخص ہے جو شریعت مستقیمہ سے انحراف کر کے جہات کفر میں سے کسی جہت کی طرف مائل ہو اور جو شخص ملحد ہو اور دین سے انحراف کرے اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا اعتراف کرے اور نہ اس کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے فاعل مختار ہونے کا اعتراف کرے۔ اس قید کے اعتبار سے ملحد، دہری سے مفارق ہو گیا اور اس میں کفر کو چھپانے کی قید بھی نہیں ہے اس اعتبار سے وہ منافق سے مفاق اور الگ ہو گیا۔ اور نہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ پہلے مسلمان ہو اور اس اعتبار سے وہ مرتد سے ممتاز ہو گیا لہٰذا ملحد کی تعریف کفر کے تمام فرقوں کو شامل ہے اور اس کا مفہوم سب سے عام اور وسیع ہے۔ یہاں تک ابن کمال پاشا کے کلام کا خلاصہ مکمل ہوا۔

(علامہ شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں لیکن زندیق اس اعتبار سے کہ وہ کبھی کافر اصلی ہوتا ہے اور کبھی مسلمان زندیق ہو جاتا ہے۔ اس کی تعریف میں نبوت کے اعتراف کی شرط نہیں ہے اور فتح القدیر میں مذکور ہے کہ زندیق کسی دین کا پابند نہیں ہوتا۔ (رد المحتار ج 3، ص 296، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1407ھ)

زندیق کی توبہ اور اس کو قتل کرنے کے شرعی احکام

علامہ عبدالواحد کمال ابن ہمام متوفی 862ھ فرماتے ہیں:

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ظاہر مزہب کے مطابق ساحر اور زندگیق کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور زندیق وہ شخص ہے جو کسی دین کا پابند نہ ہو اور رہا وہ شخص جس کے باطن میں کفر ہو اور وہ اسلام کو ظاہر کرتا ہو وہ منافق ہے، اور توبہ قبول نہ کرنے میں اس کا حکم بھی زندیق کی طرح ہے۔ زندیق کی توبہ اس لیے قبول نہیں کی جائے گی کہ وہ کسی دین کو بھی نہیں مانتا اور اپنے اس کفر کو مخفی رکھتا ہے، اور اس کی زندیقی کا علم اس طرح ہو گا کہ بعض لوگ اس پر مطلع ہو جائیں یا وہ خود اپنے کس معتمد علیہ کو بتائے۔ اس لیے اس کی توہ پر اطمینان نہیں ہے۔ اور منافق بھی اپنے کفر کو مخفی رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہو گی، اور حق یہ ہے کہ جس کو قتل کیا جائے گا اور جس کی توبہ قبول نہیں ہو گی،

وہ منافق ہے اور زندیق اگر عربی ہو اور وہ کسی دین کے نہ ماننے کو منافق کی طرح مخفی رکھتا ہو تو اس کو بھی قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اور اگر بالفرض وہ اپنی زندیقی کا اظہار کرتا ہو اور پھر تائب ہو جائے تو پھر واجب ہے کہ اس کو قتل نہ کیا جائے اور اس کی توبہ قبول کر لی جائے، جیسا کہ باقی دیگر ان کفار کا حکم ہے جو اپنے کفر کو ظاہر کرتے ہیں اور پھر توبہ کر لیتے ہیں تو ان کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کا حکم ہے جو اپنے باطن میں بعض ضروریات دین مثلاً حرمت خمر (انگوری شراب) کی حرمت کا انکار کرتا ہو اور بظاہر اس کی حرمت کا اعتراف کرتا ہو۔ (فتح القدیر، ج6، ص91، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)

علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی المتوفی 1081ھ لکھتے ہیں:

فتح القدیر میں مذکور ہے کہ زندیق کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کو ظاہر المذاہب قرار دیا ہے، لیکن خانیہ کی بحث خطر واباحات میں مذکور ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ اگر ساحر یا اس زندیق کو توبہ سے پہلے گرفتار کر لیا جائے جو مشہور ہو اور اپنے مذہب کا داعی ہو پھر گرفتاری کے بعد وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر توبہ کرنے کے بعد اس کو گرفتار کیا جائے تو پھر اس کی توبہ قبول کی جائے گی (میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن ہمام نے اس زندیق کی توبہ قبول نہ کرنے کے متعلق لکھا ہے جو اپنی زندیقی کو مخفی رکھے لیکن جو اپنی زندیقی کا اعلان کرے اور اس کی دعوت دے اس کا انھوں نے عام کافروں کی طرح حکم بیان کیا ہے۔ سعیدی غفرلہ۔ (در مختار علی رد المحتار، ج3، ص296، مطبوعہ بیروت)

زندیق کی توبہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے الگ الگ محمل

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

صاحب ہدایہ نے تجنیس میں لکھا ہے اگر زندیق اپنی زندیقیت میں معروف نہ ہو اور نہ اپنی زندیقی کی دعوت دیتا ہو تو اگر وہ زندیق مشرکین عرب سے ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر وہ عجمی ہو تو اس کو اس کے شرک پر چھوڑ دیا جائے گا اور اگر وہ مسلمان ہو اور پھر زندیق بنا ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ وہ مرتد ہے، اور اگر وہ ذمی ہو اور پھر زندیق بنا ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ کفر ملت واحدہ ہے، اور اگر زندیق اپنی زندیقی میں معروف ہو اور اپنی زندیقی کی دعوت دیتا ہو تو اگر وہ گرفتار ہونے سے پہلے اپنے اختیار سے توبہ کرے اور اپنی زندیقی سے رجوع کرے تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور اگر وہ گرفتار ہونے کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ واضح رہے کہ فقہاء نے جو کہا ہے کہ ساحر یا زندیق کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو قتل نہ کرنے کے معاملہ میں اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب وشتم کرنے والے کے متعلق جو کہا گیا ہے اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس کا بھی یہی محمل ہے کہ سب وشتم کرنے والے کو قتل نہ کرنے کے معاملہ میں اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ زندیق کی توبہ قبول کرنے یا نہ کرنے میں جو اختلاف ہے وہ دنیا کے اعتبار سے ہے باقی آخرت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی توبہ بالاتفاق قبول کر لی جائے گی۔ (رد المحتار ج3 ص296، مطبوعہ بیروت)

زندیق کی توبہ کے قبول ہونے پر امام رازی کے دلائل اور تحقیق مقام

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:
فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ زندیق کی توبہ قبول ہو گی یا نہیں؟ اور صحیح یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول ہو گی اور اس کی دو دلیلیں ہیں، پہلی دلیل سورۃ الانفال کی یہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ کفر سے باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (الانفال: 38) یہ آیت کفر کی تمام انواع کو شامل ہے اور اس میں زندیق بھی داخل ہے۔
اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ زندیق کے حال سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے واقعی زندیقی سے توبہ کر لی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کے احکام ظاہر پر مبنی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: "ہم ظاہر پر حکم کرتے ہیں" اور جب اس نے زندیقی سے توبہ کر لی تو اس کی توبہ کو قبول کرنا واجب ہے۔
دوسری دلیل یہ ہے کہ زندیق زندیقی سے رجوع کرنے کا مکلّف ہے اور اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ وہ توبہ کرے اور اگر اس کی توبہ قبول نہ کی جائے تو لازم آئے گا کہ اس کو ایسی چیز کا مکلّف کیا جائے جو اس کی طاقت میں نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفوا عن السیئات: وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے" (الشوریٰ: 25)۔ (تفسیر کبیر، ج5، ص483، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)
امام رازی نے زندیق کی جس توبہ کے قبل کرنے پر دلائل دیے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک توبہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ اور اس توبہ کے متعلق فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ توبہ قبول ہو گی۔ فقہاء کا اختلاف اس میں ہے کہ زندیق توبہ کرلے تو آیا اس کو قتل کرنے کا حکم ساقط ہو گا یا نہیں اور دنیا میں اس کی یہ توبہ مفید ہو گی یا نہیں، اور زندیق کی توبہ کے قبول کرنے یا نہ کرنے سے ان کی یہی مراد ہے اور آخرت میں اس کی توبہ کے مقبول ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے جیسا کہ ہم علامہ شامی کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○39

لغۃ القرآن: [وَقَاتِلُوْهُمْ : اور تم لوگ جنگ کرو ان سے] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [لَا تَكُوْنَ : نہ رہے] [فِتْنَةٌ : کوئی تشدد] [وَّيَكُوْنَ : اور یہاں تک کہ ہوجائے] [الدِّيْنُ : نظام حیات] [كُلُّهٗ : اس کا کل] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [فَاِنِ : پھر اگر] [انْتَهَوْا : وہ لوگ باز

آجائیں] [فَاِنَّ اللّٰهَ : تو بیشک اللہ] [بِمَا : اس کو جو] [یَعْمَلُوْنَ : وہ لوگ کرتے ہیں] [بَصِیْرٌ: دیکھنے والا ہے]

ترجمہ: اور (اے اہل حق !) تم ان (ظلم وطاغوت کے سرغنوں) کے ساتھ (قیام امن کے لیے) جنگ کرتے رہو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ (باقی) نہ رہ جائے اور سب دین (یعنی نظام بندگی وزندگی) اللہ ہی کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بیشک اللہ اس (عمل) کو جو وہ انجام دے رہے ہیں، خوب دیکھ رہا ہے

تشریح:

فتنہ کا معنی

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ اگر یہ کفار اپنے کفر سے باز آگئے تو ان کی بخشش کر دی جائے گی اور اگر انھوں نے دوبارہ وہی روش اختیار کی تو جس طرح پچھلی امتوں کو سزا دی گئی تھی ان کو بھی سزا دی جائے گی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ اگر کفار باز نہیں آتے تو وہ ان سے قتال کریں حتی کہ کفر کا غلبہ نہ رہے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کفار سے قتال کرو حتی کہ فتنہ نہ رہے۔ فتنہ کی حسب ذیل تفسیریں کی گئی ہیں :

حضرت ابن عباس (رض)، حسن، قتادہ اور سدی سے مروی ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ اور پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین اسلام کی وجہ سے تنگ نہ کیا جائے اور شرک اور بت پرستی کی بیخ کنی کر دی جائے۔

عروہ بن زبیر نے بیان کیا ہے کہ دعوت اسلام کی ابتداء میں مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دوسرا فتنہ یہ تھا کہ جب مکہ کی گھاٹیوں میں انصار نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت عقبہ کی تو قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں ایذاء دینی شروع کی اور یہ دوسرا فتنہ تھا۔ پھر ہجرت کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کفار کے خلاف قتال کریں تاکہ کفر کا زور ٹوٹ جائے اور وہ اسلام لانے کی بناء پر مسلمانوں کو تنگ نہ کر سکیں۔ (جامع البیان جز 9، ص 327۔ 32، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415 ھ)

صرف جزیرہ عرب سے کفر کا غلبہ ختم کرنا مقصود ہے یا پوری دنیا سے

اور " پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے " امام رازی نے لکھا ہے کہ مکہ اور اس کے گردونواح میں، کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہوں گے۔ اور اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ کافروں سے جنگ کرتے رہو حتی کہ تمام دنیا میں شرک نہ رہے اور تمام شہروں میں اسلام قائم ہو جائے۔ ہماری رائے میں اس آیت کا صحیح معنی یہ ہے کہ جب تک دنیا میں کفر کا زور اور شرک کا غلبہ کافروں سے جنگ کرتے رہو۔ اور مسلمان اپنے آپ کو ہر وقت حالت جہاد میں سمجھیں اور ایسے اسباب اور وسائل کے حصول میں کوشاں رہیں جس سے وہ پوری دنیا سے شرک کا قلع قمع کر سکیں اور کافروں کے جن جن علاقوں کو فتح کریں وہاں تبلیغ کر کے کافروں کو مسلمان بنائیں

تاکہ ان کی عددی قوت میں اضافہ ہو، اور ہر دور میں جنگ ہتھیاروں کی جو تازہ ایجادات ہوں ان کو حاصل کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنسی علوم میں ترقی کریں۔ اس دور میں مسلمانوں کی پس ماندگی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے تبلیغ اسلام نہیں کی۔ مغلوں نے ہندوستان پر کئی صدیوں تک حکومت کی لیکن وہ اپنی حکومت کے استحکام میں لگے رہے اور اسلام کی تبلیغ سے غافل رہے۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے لیکن مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ اسلام کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید سائنسی علوم کے حصول میں کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ پوری دنیا سے کفر اور شرک کا غلبہ ختم کیا جائے اور توحید اور اسلام کا پوری دنیا میں غلبہ ہو اور جب مسلمانوں نے اس حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں مغلوب اور محکوم ہوگئے، بعض علاقے انھوں نے جہاد کے ذریعے فتح ضرور کیے لیکن ویکون الدین کلہ للہ پر عمل نہیں کیا اور کافروں کو مسلمان کرنے کی کوئی موثر کوشش نہیں کی چنانچہ وہ علاقے بھی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے۔

اس کے بعد فرمایا پس اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ ان کے کاموں کو دیکھنے والا ہے اور اگر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ بیشک اللہ تمہارا کارساز ہے۔ یعنی اگر کفار توبہ نہ کریں اور ایمان نہ لائیں تو تم ان کی پروانہ کرو، اللہ تمہارا مولیٰ ہے وہ تمہاری حفاظت کرے گا اور تم سے مصیبتوں کو دور کرے گا۔ وہ کیسا اچھا کارساز اور کیسا اچھا مددگار ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

جہاد کے 2 فضائل

اس آیت میں جہاد کا ذکر ہوا اس مناسبت سے یہاں جہاد کے دو فضائل ملاحظہ ہوں،

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک گھڑی ٹھہرنا حجر اسود کے پاس شب قدر میں قیام کرنے سے بہتر ہے۔

(2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "جو شخص میرے راستے میں جہاد کرتا ہے میں اس کا ضامن ہوں، اگر میں اس کی روح قبض کرتا ہوں تو اسے جنت کا وارث بناتا ہوں اور اگر واپس (گھر) لوٹاتا ہوں تو ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ لوٹاتا ہوں۔ (تفسیر صراط الجنان)

مسلمانوں کو جہاد کا حکم

کفر کی طاقتیں اگر اپنا رویہ بدلنے کے لیے تیار نہیں تو پھر مسلمانوں کے لیے حکم یہ ہے کہ کافروں سے لڑائی لڑو اور یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے جب تک فتنے کا سدباب نہیں ہو جاتا اور دین سراسر اللہ کا نہیں ہو جاتا۔ سوال یہ ہے کہ یہاں دین سے کیا مراد ہے؟ اور فتنہ کا کیا معنی ہے؟

فتنہ سے کیا مراد ہے؟

حضرت عبداللہ ابن عباس (رض) سے جو تفسیر منقول ہے اس کے حوالے سے فتنہ سے مراد کفر ہے اور دین سے مراد دین اسلام ہے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی براہ راست بعثت عربوں کی طرف ہوئی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عربوں پر اتمام حجت ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اللہ کے رسول کو دیکھا، اس کی دعوت کو سنا، اس کے کردار کو پرکھا، اس کے معجزات دیکھے، اب ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا کہ وہ اسلام کو قبول نہ کریں کیونکہ اللہ کے نبی کی شخصیت بجائے خود معجزہ ہوتی ہے۔ اس کی دعوت اپنے اندر بلا کی تاثیر رکھتی ہے۔ اس کے معجزات ہر زندہ ضمیر کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ تو ہر نبی کی شان ہے، نبی آخر الزماں جو اہل زمین کے لیے اللہ کا آخری نمائندہ اور آخری حجت بن کر آیا ہے، اس کی شان کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا اس کو دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد کسی طرح کی حیل و حجت کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اس لیے جزیرہ عرب سے باہر تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور پروردگار نے کفر کے باقی رہنے کی اجازت دی کہ وہ مسلمان ملکوں میں شہری بن کر بھی رہ سکتے ہیں اور معاہد بن کر بھی، اور کافر اور مسلمان ملکوں میں باہمی معاہدات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جزیرہ عرب کی حد تک پابندی لگادی گئی کہ یہاں دو دین نہیں رہ سکتے۔ اللہ کے دین کے آجانے کے بعد کسی دوسرے دین کے لیے کوئی گنجائش نہیں اور اللہ کے رسول کی بعثت کے بعد کسی کفر کے لیے کوئی موقع نہیں۔ یہاں کسی کو کافر رہ کر رہنے کی اجازت نہیں ہو سکتی کیونکہ جزیرہ عرب اسلام کا مرکز اور Oase ہے۔ یہاں کے رہنے والے اسلام کا ہراول ہوں گے۔ ان کے ساتھ ایسی قوتوں کو رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو مسلمانوں کو مذہبی، اخلاقی یا سیاسی طور پر پریشان کر سکتے ہوں۔ اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وصیت فرمائی کہ اہل کتاب کو جزیرہ عرب سے نکال دینا اور عربوں کے بارے میں حکم دیا کہ انھیں ایک محدود مدت تک مہلت دی جاتی ہے اسلام قبول کر لیں یا ملک چھوڑ دیں ورنہ اس کے بعد ان کا خون مباح ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق (رض) نے یہود کو خیبر سے نکال دیا اور عیسائیوں سے نجران خالی کرالیا گیا اور پورا جزیرہ عرب خالص مسلمانوں کا مرکز بن کر رہ گیا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ فتنہ سے مراد، حضرت عبداللہ ابن عمر (رض) کی رائے کے مطابق وہ رویہ ہے جو قریش نے مسلمانوں کو دین حق سے روکنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے امکانی حد تک لوگوں کے لیے دین قبول کرنا ناممکن بنادیا تھا اور اگر کوئی پھر بھی دین قبول کرنے کی جسارت کر گزرتا تو اس کے لیے زندگی عذاب بنادی جاتی۔ نہ اس کی عزت محفوظ رہتی اور نہ مال و دولت اور نہ اس کی جان کے لیے کوئی تحفظ رہتا۔ اسی صورتحال سے نکلنے کے لیے مسلمانوں کو جب بھی موقعہ ملا وہ ہجرت کر گئے۔ حتیٰ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ہجرت فرما کر مدینہ پہنچ گئے۔ اب کوئی ایسا شخص مکہ میں باقی نہ رہ گیا جو ہجرت کی استطاعت رکھتا ہو اور پھر بھی وہ مکہ میں قیام پذیر ہو۔ لیکن قریش کے ظلم و تعدی کو کسی حد پر بھی قرار نہ تھا انھوں نے جب دیکھا کہ مسلمان مدینہ کو اپنا مرکز بنا چکے ہیں تو انھوں نے مدینہ پر شب خون مارنا شروع کر دیئے اور مدینہ میں بھی مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنا مشکل کر دیا۔ اس آیت کریمہ میں اس صوتحال کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے اس سے مراد غلبہ دین ہے یعنی اسلام جزیرہ عرب کی حد تک ایک غالب قوت بن جائے کیونکہ اس کے بغیر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کا مقصد اولیٰ بھی پورا نہیں ہوتا تھا کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پوری دنیا کی ہدایت اور ساری زمین پر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے تشریف لائے تھے۔ لیکن آپ کا اولین ہدف یہ تھا کہ اللہ کا وہ گھر جسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے توحید کا مرکز اور ہدایت کا سرچشمہ بنایا تھا اور جہاں سے ایک ایسی امت کے اٹھائے جانے کی دعائیں مانگیں تھیں۔ امت مسلمہ یعنی

خالص اللہ کے سامنے جھکنے والی اللہ کی توحید کی پرستار اور اپنا سب کچھ اللہ کی رضا اور غلبہ دین کے لیے جھونک دینے والی ہو اور اس منبع ہدایت کو پوری دنیا کا مرکز بنانے کے لیے ایک ایسے رسول کے لیے دعائیں مانگی تھیں جو قریش میں سے ہو یعنی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہو اور جو اللہ کے اس گھر سے ہدایت کی ایسی تحریک لے کر اٹھے جو پوری دنیا کو روشنی سے منور کر دے۔ لیکن جب حضور کی بعثت مبارکہ ہوئی تو آپ کو یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جیسے موحّدِ اعظم کی اولاد نے توحید کے اس منبع کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ عرب کے تمام قبائل کے بتوں کو اللہ کے گھر میں جگہ دی گئی تاکہ عرب کے تمام قبائل اپنے بتوں کی وجہ سے مکہ معظّمہ سے وابستہ رہیں اور قریش کو اللہ کے گھر کے متولی سمجھ کر ان کو پروہتوں کی طرح پوجتے رہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی شریعت کی ایک ایک بات کو انھوں نے بدل کر رکھ دیا تھا۔ مناسکِ حج تک تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ عبادت کے بنیادی تصورات کے بگاڑ کے ساتھ ساتھ انھوں نے اللہ کے اس گھر کو قومی معبد کی شکل دے دی تھی۔ جس میں مرضی خدا کی نہیں بلکہ قریش کی چلتی تھی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چونکہ ملت ابراہیم پر مبعوث ہوئے تھے اس لیے آپ کی پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ اللہ کے گھر کی اصل حیثیت کو بحال کیا جائے۔ اس کی عظمت واپس لائی جائے۔ شرک کی ایک ایک بات کو وہاں سے نکالا جائے اور اللہ کے گھر کو ان ہاتھوں میں دیا جائے جو اللہ سے ڈرنے والے اور اس کی توحید کے پرستار ہیں۔ چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ معظّمہ میں تیرہ سال تک اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کام کیا۔ لیکن قریش بجائے اس کام کی قدر کرنے اور اسلام کی آغوش میں آنے کے انھوں نے اس دعوت کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی اور مسلمان جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے تو انھوں نے مسلمانوں پر اس گھر کے راستے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے۔ ٦ ہجری میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے صحابہ کے ساتھ اللہ کے گھر کا عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو قریش نے آپ کا مکہ معظّمہ میں داخلہ بند کر دیا آپ تمام تر کوششوں کے باوجود عمرہ ادا نہ کر سکے۔ یہ وہ فتنہ تھا جس نے اسلام کا ہر راستہ روک رکھا تھا۔ جہاں ملت ابراہیمی کے لیے مشکلات تھیں اور بت پرستی کے لیے آسانیاں۔ اللہ کا دین مظلوم و مقہور تھا اور کفر اور شرک کی قوتیں برسر اقتدار تھیں۔ جب تک کفر و شرک کے غلبہ کی جگہ دین کو غلبہ نہ ملے اور کفر کی جارحانہ قوت کا پنجہ نہ مروڑا جائے اس وقت تک توحید اور اسلام کے مستقبل کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ مسلمان اللہ کے بھروسے پر طاقت کا علم لے کر اٹھیں اور تلوار کے زور سے کفر و شرک کی طاقت کو جڑ سے اکھاڑ دیں چنانچہ اس آیت کریمہ میں اسی مقصد کے لیے قتال کا حکم دیا گیا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے بعض ارشادات میں اس کی وضاحت بھی فرمائی۔ صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

(مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں دشمنان اسلام سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو قبول کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں اور جب وہ ایسا کریں تو ان کے خون اور اموال سب محفوظ ہو جائیں گے بجز اس کے کہ اسلامی قانون کے تحت کسی جرم کی پاداش میں ان کو سزا دی جائے۔)

مسلمانوں کو تسلی

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ اگر اس قتال کے نتیجے میں کفار فتنہ پروری سے رک جائیں وہ اسلام قبول کر لیں یا اللہ کا گھر مسلمانوں کے حوالے کر دیں تو پھر مسلمانوں کو بھی ہاتھ روک لینا چاہیے اور اس بات پر ان کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے رویے کی یہ تبدیلی ممکن

ہے دھوکہ دہی کی ایک چال ہو فرمایا وہ تمہیں دھوکہ دے سکتے ہیں لیکن اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال سے باخبر ہے اور اگر وہ اپنا رویہ بدلنے سے انکار کردیں تو پھر خوب جان لو اللہ تمہارا مولا ہے، وہی تمہارا ملجا ہے، وہی تمہارا کارساز ہے، وہی تمہارا پشت پناہ ہے، کافروں کی کثرت تعداد اور اسلحہ کی قوت تمہیں پریشان نہ کرے کیونکہ جس کا مولا پروردگار ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے کیونکہ اللہ سے بہتر نہ کوئی مولا ہے اور نہ کوئی مددگار۔ جس نے اس کا دامن پکڑ لیا دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی قوت اس کے ہاتھ میں آگئی۔

کیا غم ہے اگر ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
(تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوۡلٰٮكُمۡ‌ؕ نِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ ○40

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر] [تَوَلَّوْا : وہ روگردانی کریں] [فَاعْلَمُوْٓا : تم لوگ جان لو] [اَنَّ : کہ] [اللّٰهَ : اللہ] [مَوْلٰكُمْ : تمہارا کارساز ہے] [نِعْمَ : کیا ہی اچھا] [الْمَوْلٰى : کارساز ہے] [وَنِعْمَ : اور کیا ہی اچھا] [النَّصِيْرُ : مدد گار ہے]

ترجمہ: اور اگر انھوں نے (اطاعت حق سے) روگردانی کی تو جان لو کہ بیشک اللہ ہی تمہارا مولیٰ (یعنی حمایتی) ہے، (وہی) بہتر حمایتی اور بہتر مددگار ہے

تشریح:

ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں اگر مشرک تمہاری دعوت سے روگردانی کریں یعنی ایمان نہ لائیں، کفر پر رہتے ہوئے ترک قتال نہ کریں بلکہ کفر و قتال پر مصر ہوں تو ان سے قتال کرو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت پر یقین کرو وہ اپنے دوستوں کا بہترین مددگار ہے، وہ خوب ملعون ہے۔

شواہد

ہمیں ابن حمید نے ابن اسحاق سے " وَاِنۡ تَوَلَّوۡا۔۔۔ الآیۃ" کی تفسیر یہ ذکر کی اگر تمہارے حکم کی بجائے وہ کفر کی طرف رخ موڑیں تو اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے جس نے بدر میں تمہیں نصرت و عزت دی، باوجودیکہ تم قلیل تھے اور دشمن کثیر تھا، وہ خوب کارساز و خوب مددگار ہے۔ (تفسیر طبری)

تلوار سے جہاد تا قیامت جاری ہے

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ سے معلوم ہوا جہاد تا قیامت جاری ہے۔ جب تک ساری دنیا پر اسلام غالب نہیں آ جاتا جہاد جاری رہے گا اور یہ غلبہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول اور امام مہدی کے خروج کے وقت ہو گا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عیسیٰ کے نزول کی بابت فرمایا: یھلك اللہ الملل کلھا الاسلام۔ "اللہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد پر تمام ادیان کو ہلاک کر دے گا صرف اسلام رہ جائے گا۔" (ابو داؤد کتاب الملاحم باب 41)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگو (کافروں) سے جنگ جاری رکھوں تاوقتیکہ کے وہ گواہی دے دیں گے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔" (بخاری کتاب الایمان حدیث 23)

معلوم ہوا جب تک کفار ہیں جہاد بھی ہے۔ کیونکہ یہ وہ جس وقت بھی اسلام کے خلاف دشمنانہ کارروائی کریں گے مسلمانوں پر اس کا بھرپور جواب دینا لازم ہو گا لہٰذا مطلقاً جہاد کے ارتفاع کا حکم جاری کرنا صریح کفر ہے اس کے باوجود مرزا غلام احمد قادیانی کا کہنا کہ اس کے آنے سے جہاد مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے سراسر کفر و الحاد ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

مسلمانوں ہی کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اگر کفار و مشرکین ایمان نہیں لاتے اور کفر و معاصی سے باز نہیں آتے، تو تم لوگ اس یقین کے ساتھ زندہ رہو کہ تمہارا حامی و ناصر اللہ ہے اور جس کا حامی و ناصر اللہ ہو اسے کون مٹا سکتا ہے؟

ارشاد فرمایا: (اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ) [محمد: ۱۰، ۱۱] "تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈال دی اور ان کافروں کے لیے بھی اسی جیسی (سزائیں) ہیں۔ یہ اس لیے کہ بیشک اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے اور اس لیے کہ بیشک جو کافر ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں۔" اور فرمایا: (بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ) [آل عمران: ۱۵۰] "بلکہ اللہ ہی تمہارا مالک ہے اور وہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر ہے۔"

سیدنا براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ اس (احد کے) دن مشرکوں سے ہماری مڈ بھیڑ ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیر اندازوں کے ایک گروہ کو درے پر مقرر فرما کر عبداللہ بن جبیر (رض) کو ان کا امیر مقرر کر دیا اور فرمایا: "تم اسی جگہ ڈٹے رہنا، اگر تم یہ دیکھو کہ ہمیں فتح ہو گئی تو بھی اس جگہ سے نہ ہلنا اور اگر یہ دیکھو کہ دشمن ہم پر غالب آ گیا ہے تو پھر بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ہماری مدد نہ کرنا۔" ہمارا مقابلہ ہوا تو دشمن بھاگ اٹھا، حتیٰ کہ ہم نے دیکھا کہ ان کی عورتیں بھی اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اٹھائے ہوئے پہاڑوں کی طرف بھاگ رہی تھیں، جس کی وجہ سے ان کی پازیبیں نظر آ رہی تھیں، تو اس صورت حال کو دیکھ کر درے پر مقرر لوگوں نے کہنا شروع کر دیا، غنیمت! غنیمت! عبداللہ بن جبیر (رض) نے ان سے کہا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ اپنی جگہ سے نہ ہلنا، مگر ساتھیوں

نے انکار کر دیا۔ جب انھوں نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی فتح کو شکست سے بدل دیا اور ستر (۷۰) مسلمان شہید ہوگئے۔ ابوسفیان نے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا، کیا ان لوگوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجود ہیں؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اسے کوئی جواب نہ دو۔" پھر اس نے پوچھا، کیا لوگوں میں ابن قحافہ (یعنی ابوبکر) موجود ہیں؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اسے کوئی جواب نہ دو۔" اس نے کہا، کیا لوگوں میں ابن خطاب موجود ہیں؟ جب مسلمانوں کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو کہنے لگا، گویا یہ سب لوگ قتل ہوگئے ہیں، اگر زندہ ہوتے تو میری بات کا جواب ضرور دیتے۔ سیدنا عمر (رض) اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور کہنے لگے، اے اللہ کے دشمن! تو جھوٹ کہہ رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تیرے لیے باقی رکھا ہے، تاکہ تجھے غم و حزن لاحق ہو۔ اس کے بعد ابوسفیان نے نعرہ بلند کیا، ہبل بلند ہو۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اسے جواب دو۔" صحابہ نے عرض کی، ہم کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا: "تم یہ کہو کہ اللہ ہی اعلیٰ اور اجل ہے۔" ابوسفیان نے کہا، ہمارے پاس عزیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اسے جواب دو۔" صحابہ نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! کیا جواب دیں؟ فرمایا: "یہ کہو کہ اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔" ابوسفیان نے کہا، یہ دن جنگ بدر کے دن کا جواب ہے اور لڑائی کنویں کے ڈول کی طرح ہوتی ہے، تم دیکھو گے کہ تمہارے کچھ لوگوں کا مثلہ کر دیا گیا ہے، مگر اس کا میں نے حکم نہیں دیا تھا اور نہ یہ بات مجھے بری لگتی ہے۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ احد : ۴۰۴۳۔ ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الکمناء : ۲۶۶۲] (تفسیر دعوۃ القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ 41

لغۃ القرآن: [وَاعْلَمُوْٓا : اور تم سب جان لو] [اَنَّمَا : بیشک] [غَنِمْتُمْ : تم نے غنیمت حاصل کی] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : چیز کو] [فَاَنَّ : تو بیشک] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [خُمُسَهٗ : اس کا پانچواں " حصہ "] [وَلِلرَّسُوْلِ : اور رسول کے لیے] [وَلِذِي الْقُرْبٰى : اور قرابت والے کے لیے] [وَالْيَتٰمٰي : اور یتیموں] [وَالْمَسٰكِيْنِ : اور مساکین] [وَابْنِ

السَّبِيْلِ : اور مسافروں " کیلیے ہے "] [اِنْ : اگر] [كُنْتُمْ : ہو تم] [اٰمَنْتُمْ : تم ایمان لائے ہو] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَمَآ : اور جو] [اَنْزَلْنَا : ہم نے اتاری] [عَلٰي عَبْدِنَا : اپنے بندے پر] [يَوْمَ : دن] [الْفُرْقَانِ : فیصلے کے] [يَوْمَ : وہ دن] [الْتَقَى : آپس میں ٹکرائیں] [الْجَمْعٰنِ : دو فوجیں] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز پر] [قَدِيْرٌ : قادر ہے] [

ترجمہ: اور جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے پایا ہو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اور (رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے) قرابت داروں کے لیے (ہے) اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس (وحی) پر ایمان لائے ہو جو ہم نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر (حق و باطل کے درمیان) فیصلے کے دن نازل فرمائی وہ دن (جب میدان بدر میں مومنوں اور کافروں کے) دونوں لشکر باہم مقابل ہوئے تھے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

تشریح:

وہ مال جسے کوئی فرد یا جماعت کوشش اور سعی سے حاصل کرے اسے لغت میں غنیمت کہتے ہیں۔ الغنیمۃ فی اللغۃ ما ینالہ الرجل او الجماعۃ بسعی (قرطبیؒ) لیکن عرف شرع میں صرف اس مال کو غنیمت کہتے ہیں جو کفار سے قوت و غلبہ اور لشکر کشی سے حاصل کیا جائے۔ مال الکفار اذا ظفر بہ المسلمون علی وجہ الغلبۃ والقھر (قرطبیؒ)۔ لیکن کفار کا وہ مال جو بغیر لڑے ہاتھ آجائے اسے اصلاح شریعت میں فیی کہتے ہیں۔ والفیی ھو کل مال دخل علی المسلمین من غیر حرب ولا ایجاف (قرطبیؒ)۔ غنیمت کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب اس کے متعلق جو ارشاد ربانی ہے اسے سمجھئے۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ الگ کرلیا جائے گا اور بقیہ چار حصے نمازیوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ سنت نبوی نے ہمیں بتایا کہ پیادہ مجاہد کو ایک حصہ ملے گا اور سوار کو تین حصے ملیں گے۔ حضرات فاروق (رض)، شیر خدا (رض) عمر بن عبدالعزیز (رح) اور فقہاء میں سے امام مالک (رح)، شافعی (رح)، احمد، ابویوسف و محمد (رح) کا یہی مسلک ہے۔ حضرت امام صاحب (رح) کا مسلک ہے کہ پیادہ کو ایک حصہ اور سوار کو دو۔ (مظہری)

باقی رہا مال کا پانچواں حصہ (خمس) تو اس کو مصارف اس آیت میں وضاحت سے بیان فرما دیئے بعض علماء کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام محض تبرک کے لیے لیا گیا ہے۔ یہ کوئی مستقل مصرف نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کا ایک حصہ ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ الگ مصرف ہے اور اس حصہ کا مال کعبہ شریفہ پر خرچ کیا جائے گا۔ ۲۔ دوسرا حصہ حضور رحمۃ عالمیان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ہے۔ حضور اسے اپنی ضروریات اور اہل و عیال پر خرچ کر سکتے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد یہ مصرف ختم ہو گیا۔ ۳۔ ذی القربی سے مراد حضور کریم کے قریبی رشتہ دار ہیں اور وہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے افراد۔ اور بعض کے نزدیک صرف بنی ہاشم ہیں۔ کیونکہ ان پر صدقات حرام ہیں اس لیے ان کی کفالت کا انتظام اس مد سے کر دیا گیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

رشتہ داروں سے مراد بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: " بیشک ہم (بنو ہاشم) اور بنو مطلب نہ تو جاہلیت میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے اور نہ ہی اسلام میں یقیناً ہم اور وہ ایک چیز ہیں۔ (پھر اس باہمی قرب کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے) آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالا"۔ (ابوداؤد: کتاب الخراج: باب ۲۰: حدیث نمبر: ۲۹۸۰) نیز قریش مکہ نے جب بنو ہاشم سے سوشل بائیکاٹ کیا اور ان کو شعب ابی طالب میں محدود کر دیا تو بنو مطلب کو قریش نے اگرچہ بائیکاٹ میں داخل نہیں کیا تھا مگر یہ لوگ بنو ہاشم کا ساتھ دینے کیلئے خود اس بائیکاٹ میں شریک ہوگئے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت مولا علی المرتضیٰ شیر خدا (رض) عنہٗ کے بیٹے اور خاندان اہلبیت کے چشم وچراغ حضرت محمد بن حنفیہّ (رض) عنہٗ کے بیٹے حسن سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد صحابہ کرام میں اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حصہ آپ کے خلیفہ کو ملنا چاہیے۔ پھر تمام اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اجماع ہوا کہ خمس میں سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حصہ اور آپ کے رشتہ داروں کا حصہ یہ دونوں حصے جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر گھوڑے اور اسلحہ وغیرہ خریدنے پر صرف کیے جائیں گے اور خلفاء راشدین نے اسی پر عمل کیا۔ (تفسیر ابن جریر جلد 6 صفحہ 352 مطبوعہ بیروت۔ تفسیر ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 1704۔ حدیث 9091 مطبوعہ مکہ)

اسی طرح اہل بیت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ فرمایا اللہ اور اس کے رسول کا حصہ اور رسول کے قریبی رشتہ داروں کا حصہ جہاد کے لیے گھوڑے اور اسلحہ خریدنے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے، البتہ یتامی، مساکین اور مسافرین کا حصہ بدستور انہی کو دیا جاتا ہے کسی اور کو نہیں۔ " (تفسیر ابن جریر حوالہ مذکورہ)

بلکہ امام باقر (رض) سے کسی نے پوچھا کہ خمس میں سے ذوی القربیٰ کہ حصہ کے بارے میں حضرت علی (رض) نے اپنے عہد خلافت میں کیا فیصلہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! حضرت علی نے ابو بکر وعمر (رض) کے طریقے پر عمل کیا (مظہری جلد 5 صفحہ 111)

یاد رہے کہ شیعہ مفسر ابو علی طبرسی نے بھی لکھا ہے کہ ذوی القربیٰ کے حصہ میں اختلاف ہے۔

وقال بعضهم سقط هذان السهمان بموت رسول الله (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) على ما ذكرناه۔ یعنی بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ذوی القربیٰ کا حصہ آپ کے وصال کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ (مجمع البیان جلد 4 صفحہ 459 مطبوعہ موسستہ العلمی بیروت)

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی اپنی حیات مبارکہ میں اپنے تمام ذوی القربیٰ کو خمس میں سے حصہ نہ دیتے تھے بلکہ صرف بنو ہاشم اور بنو مطلب کو دیا جاتا تھا بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو اس میں سے اپنے کچھ نہ دیا، حالانکہ وہ سب عبد مناف کی اولاد تھے۔ جب حضرت عثمان غنی (رض) عنہٗ نے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہی چیز ہیں (سنن ابی داؤد کتاب الخراج باب 20) اس کا مطلب شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنی خونی قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا تھا اور بنو نوفل اور بنو عبد شمس نے نہ دیا تھا اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بنو نوفل و بنو عبد شمس کو محروم رکھا۔

معلوم ہوا ذوی القربیٰ کا حصہ محض رشتے داری کی وجہ سے نہیں بلکہ ساتھ میں اعانت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے بھی تھا اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے گئے تو اس حصہ کا سبب ختم ہو گیا، لہٰذا خمس میں سے صرف یتامیٰ مساکین اور مسافروں کا حصہ رہ گیا۔ اس لیے مال غنیمت کا سارا خمس بیت المال میں جمع کیا جائے گا پھر اسے نادار وحاجت مند لوگوں پر تقسیم کیا جائے گا اور چونکہ قرابتداران رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) والا حصہ الگ سے ختم کر دیا گیا ہے اس لئے یتامیٰ مساکین والے حصہ میں سے غریب قرابتداران

رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دوسرے غرباء پر ترجیح دی جائے گی اور اس میں سے ان کے مسائل پہلے حل کیے جائیں گے بعد میں دوسرے غرباء کو دیا جائے گا۔ اس لئے بعض ائمہ نے بجا فرمایا کہ ذوی القربیٰ کا حصہ ختم نہیں ہوا وہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی موجود ہے (مظہری)۔

اسی لیے فقہاء احناف فرماتے ہیں: **وسهم ذوي القربیٰ كانو يستحقونه في زمن النبي (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بالنصرة و بعده بالفقر** ۔ یعنی رشتہ داران رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذوی القربیٰ والے حصہ کو زمانہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بوجہ نصرت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حاصل کرتے تھے اور اس کے بعد بوجہ فقر حاصل کرتے ہیں (قدوری کتاب السیر صفحہ 395 مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی) یہ فقہاء احناف کا مسلک ہے۔

باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے لہٰذا شیعوں کا یہ کہنا کہ اہل سنت ذوی القربیٰ کا حصہ مانتے ہی نہیں، سراسر غلط ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت شاہ ولی اللہ (رح) نے حجۃ اللہ البالغہ میں تصریح کی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رشتہ داروں کا حصہ قیامت تک بحال رہے گا۔ و **سهم ذوه القربى في بني هاشم وبني المطلب الفقير منهم والغني والذكر والانثى وعندي انه غير الامام في تعيين المقادير وكان عمر (رض) منه يزيد في فرض آل النبي (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ويعين المدين منهم والناكح و ذالحاجة** (حجۃ اللہ البالغہ): رشتہ داروں کا حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کو ملے گا۔ ان کے امیر اور فقیر، مرد اور عورت سب حقدار ہیں۔ اور امام وقت حسب ضرورت حصہ میں کمی بیشی بھی کر سکتا ہے۔ حضرت فاروق اعظم (رض) اہل بیت کرام کو دوسروں سے زیادہ حصہ دیتے اور ان میں سے اگر کوئی زیادہ ضرورت مند ہوتا مثلاً مقروض، شادی کرنے والا، تنگدست تو اس کی زیادہ امداد فرماتے۔ اسی طرح صاحب تفسیر مظہری نے بڑے شرح و بسط سے اس موضوع پر بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ **وبهذا يثبت ان سهم ذوي القربى لم يسقط ويجوز دفعه اليهم غنيهم وفقيرهم** (مظہری)۔ اس بحث سے ثابت ہو گیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رشتہ داروں کا حصہ ساقط نہیں ہوا۔ ان کے اغنیاء اور فقراء سب کو ملے گا۔ علامہ ابن حبان اندلسی لکھتے ہیں۔ **والظاهر بقاء هذا السهم لذوي القربى وانه لغنيهم وفقيرهم** (بحر) ظاہر یہ ہے کہ حصہ بدستور باقی ہے اور غنی اور فقیر دونوں کو دیا جائے گا۔ ۴۔ یتامیٰ۔ ۵۔ مساکین۔ ۶۔ مسافر۔ مال غنیمت کے خمس کے یہ مصرف ہیں۔

یعنی مال غنیمت کے متعلق یہ احکام جو تمہیں دیئے جا رہے ہیں اگر تمہارے دلوں میں نور ایمان ہے تو ان پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اس سلسلہ میں اپنی من مانی کرنے والے یہ سمجھ لیں کہ ان کو ایمان کامل کی لذت سے ابھی آشنا نہیں کیا گیا۔ اور فیضان نبوت سے فیضیاب ہونے والوں کے متعلق دنیا کو اچھی طرح علم ہے کہ انھوں نے تعمیل حکم کا حق ادا کر دیا۔ انھیں ان کے معلم و مرشد نے یہ حکم دیا کہ **فادوا الخيط والمخيط واكبر من ذالك واصغر ولا تغلوا فان الغلول عار ونار** (حدیث) کہ جو چیز غنیمت میں ملے اسے امام وقت کی خدمت میں پیش کر دو۔ خواہ وہ سوئی دھاگہ ہو یا ان سے بڑی یا چھوٹی چیز۔ اور غنیمت میں خیانت نہ کرو کیونکہ یہ دنیا میں باعث رسوائی ہے اور عقبیٰ میں موجب عذاب ہے۔ جب ان صحرا نشینوں کے لیے کسریٰ کے قصر ابیض نے اپنے دروازے کھول دیئے اور اپنے قیمتی نوادرات اور تاریخی عجائبات کو ان کے قوموں میں ڈھیر کر دیا۔ مورخ کی نگاہ ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ ہر چیز دل لبھانے والی، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی، بڑی

بڑی خشک طبیعتوں کو للچانے والی۔ لیکن کیا مجال کہ غلامان مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء کے دلوں میں خیانت کا خیال تک آیا ہو۔ ہر ایک چیز احتیاط سے اکٹھی کی گئی۔ وہاں سے بارگاہ خلافت میں لائی گئی اور اس بیشمار قیمتی سامان میں ایک پائی کی بددیانتی بھی تو نہ ہوئی۔ یہ قرآن کی تعلیم کا اثر تھا۔ یہ تربیت مصطفوی کی برکت تھی۔ یہی وہ اخلاق کی بلندی اور سیرت کی پختگی اور دیانت وذمہ داری کا قومی احساس تھا جس نے عرب کے ان ان پڑھ بدوؤں کو دنیا کا امام بنادیا۔ کاش ! فرزند خلیل اور دختر بتول اپنے مقام بلند سے آگاہ ہو جائے۔ کاش ! یہ وارفتہ حسن فرنگ اپنی دلآویزیوں اور رعنائیوں کا مشاہدہ کرنے لگے ف

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا مے روی

فرقان کہتے ہیں حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا۔ یوم فرقان سے مراد بدر کا دن ہے۔ جس روز شکوک و شبہات کے سب بادل چھٹ گئے تھے اور حق اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا تھا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

مالِ غنیمت کی حِلّت اس امت کی خصوصیت ہے

یاد رہے کہ مال غنیمت کا حلال ہونا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کی خصوصیات میں سے ہے، سابقہ امتوں میں سے کسی کے لیے غنیمت کا مال حلال نہیں تھا، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ” ہم سے پہلے کسی کے لیے غنیمت حلال نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ہمارا ضعف و عجز دیکھ کر اسے ہمارے لیے حلال کر دیا۔

اور حضرت ابوامامہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ عَزَّوَجَلَّ نے مجھے تمام انبیاء (علیہ السلام) سے افضل فرمایا “ یا ارشاد فرمایا ”میری امت کو تمام امتوں سے افضل کیا اور ہمارے لیے غنیمت حلال کی۔ (تفسیر صراط الجنان)

آپ کو یاد ہو گا کہ سورۃُالانفال کی پہلی آیت میں مسلمانوں نے انفال یعنی مال غنیمت سے متعلق سوال کیا تھا۔ وہاں اس کا اجمالی جواب دیا گیا تھا اور پھر جنگ مسلمانوں اور ان کی مصلحت کے حوالے سے جو باتیں زیادہ ضروری تھیں ان کی طرف کلام کا رخ پھر گیا اور ایک سے دوسری حقیقت واشگاف ہوتی گئی ان بنیادی اور اساسی حقائق کا ذکر کرنے کے بعد اب اسی سوال کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے۔

مالِ غنیمت سے کیا مراد ہے ؟ اور اس کی حیثیت

میں نے عرض کیا کہ نفل اور غنیمت دونوں ایک ہی چیز ہیں غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔ اس لحاظ سے اسلامی شریعت میں اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ مال غنیمت ہے جو لڑائی اور دشمن کی شکست کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے۔ اسے غنیمت یا نفل کہتے ہیں اور دوسرا وہ مال غنیمت ہے جو بغیر لڑائی کے صلح اور رضامندی سے حاصل ہو جائے۔ مثلاً دشمن مرعوب ہو کر جزیہ دینے پر صلح کر لے یا خراج دینا قبول کر لے یا اپنی دشمنی اور جرائم کی معافی کے لیے اپنے مکان اور اپنی زمینیں چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ چھوڑ کر جائے گا وہ سب کچھ مسلمانوں کے قبضے میں آجائے گا۔ اسے ”فَیْ “ کہتے ہیں۔

مالِ غنیمت کے سہام کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اس سورۃ کی پہلی آیت میں صرف اسی حقیقت کے ذکر پر اکتفا کیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے تمام کائنات کا اصل مالک اللہ جل جلالہٗ ہے۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز پر اس کی ملکیت ہے۔ انسان براہ راست اپنی ذات میں کسی چیز کا مالک نہیں بجز اس کے کہ قانون کسی چیز کو اس کی ملکیت میں دے دے۔ سورۃ یٰسین میں جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اولم یروا انا خلقنا لهم مما عملت ایدینا انعاما فهم لها مالکون

(کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ چوپاؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا پھر لوگ ان کے مالک ہو گئے۔)

یعنی تخلیق کے اعتبار سے ذاتی ملکیت صرف اللہ کو حاصل ہے انسانوں کو جانوروں پر تصرف کا حق ذاتی ملکیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ملکیت کی وجہ سے ہے جو اللہ نے انھیں عطا کی ہے۔

انسانوں کی یہ ملکیت قانوناً اور اخلاقاً اس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک وہ اللہ کی حیثیت اور اس کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جب وہ کفر اور شرک کا راستہ اختیار کر کے اللہ سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی عطا کردہ ملکیت سے محروم ہو جاتے ہیں اور قانونی اور اخلاقی طور پر ان کا جان و مال مباح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا عملی وقوع اس وقت ہوتا ہے جب ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسول بھیجتے ہیں کتابیں اتارتے ہیں اور اس طرح سے ان پر اتمام حجت کر دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ راہ راست اختیار نہیں کرتے اور بغاوت سے اطاعت کی طرف نہیں آتے تو پھر اللہ اپنے رسول اور رسول پر ایمان لانے والوں کو ان سے جہاد و قتال کا حکم دے دیتا ہے۔ ان کا قتل جائز ٹھہرتا ہے اور ان کے مال دوبارہ پھر خالصتاً اللہ کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں اور ان کا حق ملکیت ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جہاد و قتال کے نتیجے میں مسلمانوں کو کافروں سے جو مال ہاتھ آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ کافروں کی ملک جب ختم کر دی گئی تو پھر ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹ گئی اور صرف اس پر اللہ کی ملکیت باقی رہی۔ اب جب وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں آئے گا تو وہ اللہ کی ملکیت سے براہ راست منتقل ہو کر آئے گا اور درمیان میں کسی انسانی ہاتھ کا واسطہ نہیں ہو گا جبکہ انسان کے پاس جتنا مال اور جیسا مال بھی آتا ہے وہ انسانوں کے واسطہ سے آتا ہے چاہے وہ ہبہ کی صوت میں ہو، میراث کی صورت میں یا تجارت کے نتیجے میں ہر جگہ انسان انسانوں سے وصول کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ جو مال انسانی ہاتھوں سے آئے گا اس میں انسانی ہاتھوں کا میل بھی شامل ہو گا اور جو مال براہ راست اللہ کی ملک سے مسلمانوں کی ملک میں منتقل ہو گا وہ ایسی ہر آلودگی سے پاک ہو گا۔ چنانچہ مال غنیمت کی اسی طہارت، پاکیزگی اور فضیلت کی وجہ سے پہلی امتوں کو اس کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ خالصتاً اللہ کی ملکیت ظاہر کرنے کے لیے حکم دیا گیا کہ ایسے مال کو کسی بلند جگہ پر رکھ دو تاکہ اللہ کی طرف سے آگ آ کر اسے جلا دے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے اسے قبول فرمالیا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پروردگار کے جو خصوصی انعامات ہوئے ہیں ان میں سے ایک انعام یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کو جسے حدیث میں "اطیب الاموال" کہا گیا ہے، اس امت کو استعمال کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ لیکن اس تصور کو ان کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا کہ یہ کبھی مت بھولنا کہ یہ مال براہ راست اللہ کی ملکیت ہے۔ تمہاری ملک میں اللہ نے اپنی عطا کے طور پر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس بنیادی تصور نے مسلمانوں کو مال غنیمت کے بارے میں اس حد تک محتاط کر دیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مال غنیمت میں سے ایک سوئی لینے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔ ہر چیز اپنی اصل حالت میں مرکز پر پہنچائی جاتی تھی۔ مرکز کی طرف سے جب اس کی تقسیم ہوتی تو ہر ایک کو اس کا حصہ مل جاتا لیکن وہ اپنے طور پر کسی چیز کو روکنا اس لیے حرام سمجھتے تھے کہ یہ سارا مال اللہ کا ہے جسے اللہ کے رسول کی تحویل میں دیا

گیا ہے وہ جیسے سمجھیں گے اسے تقسیم فرمائیں گے۔ اسی تصور نے قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے اندر وہ اخلاق پیدا کیا کہ بڑی بڑی جنگوں میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ کسی سپاہی نے اپنے طور پر مال غنیمت میں سے کوئی چیز ہتھیانے کی کوشش کی ہو۔ قیصر و کسریٰ جیسی حکومتوں کے تخت الٹ دیئے گئے ان کی صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی اور وہاں سے سینکڑے میل دور اسے مدینہ منورہ میں منتقل کیا گیا لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ جنگ کے دوران، جنگ کے بعد یا مدینہ کے سفر میں کوئی ایک مثال بھی ایسی سامنے نہ آئی جسے خیانت سے تعبیر کیا جاسکتا بلکہ مورخین یہ کہتے ہیں کہ جب یہ اربوں روپے کا مال غنیمت مدینہ منورہ پہنچا ہے تو مسلمانوں کے سالار نے اس سامان کی جو فہرست ساتھ بھجوائی تھی اس فہرست میں اور اس مال میں ایک سوئی کا بھی فرق نہیں تھا۔

دوسرا تصور

دوسرا تصور جو نفل اور غنیمت کے لفظ سے لیا گیا وہ یہ ہے کہ غنیمت کارکردگی کا صلہ نہیں بلکہ سرتاسر انعام ہے کیونکہ غنم الشیء کے معنی ہوتے ہیں فاز بہ ونالہ بلابدل اس نے فلاں چیز بغیر کسی عوض کے حاصل کرلی اور جو چیز کسی کے عوض میں حاصل ہو اسے غنیمت نہیں کہتے اسے اجرت کہا جاسکتا ہے یا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے لیکن غنیمت نہیں کہا جاسکتا۔ مقصود یہ تصور دینا ہے کہ اسلامی جہاد و قتال میں اگرچہ گردنیں اترتی ہیں، خون بہتا ہے، جسم زخمی ہوتے ہیں، ایک قیامت سے آدمی گزرتا ہے، لیکن ان میں سے کسی قربانی کا صلہ بھی دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے ہر قربانی کا بدلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس طرح عطا فرمائیں گے کہ جب لینے والا ان بیش قیمت نعمتوں کو دیکھے گا تو آنحضرت کے ارشاد کے مصداق وہ تمنا کرے گا کہ کاش ! میری کھال اللہ کے راستے میں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تاکہ آج میں اس کا اور بھی صلہ وصول کرتا۔ غزا اور شہادت کا صلہ اللہ کے ہاں اخروی انعامات ہیں جو اس کی ابدی زندگی میں محفوظ کردیئے جاتے ہیں۔ دنیا میں وہ کسی عوض اور معاوضے کا روادار نہیں ہوتا وہ جانتا ہے کہ جہاد و قتال میرا فرض ہے اس راستے میں اگر جان چلی گئی تو یہ فرض کی ادائیگی ہے اور اگر اس راستے میں پوری زندگی بھی صرف ہوگئی تو یہ فرض کی ادائیگی کی ایک کوشش ہے جس پر مجاہد کبھی یکسو اور مطمئن ہوکر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اس کے دل میں یہ کھٹک باقی رہتی ہے کہ اللہ نہ کرے میری قربانیوں کو رد کردیا جائے۔ وہ بڑی سے بڑی قربانی دیتا ہے اور ساتھ ہی قبولیت کی بھیک بھی مانگتا ہے۔ جس دین نے اپنے ماننے والوں کو یہ تصورات دیئے ہوں اس میں مال غنیمت کے حوالے سے کسی اختلاف کے پیدا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ لیکن جب یہ تصورات ماند پڑنے لگتے ہیں اور دلوں میں مال غنیمت کی ہوس پیدا ہونے لگتی ہے تو محض اس ہوس کی وجہ سے جیت بھی ہار میں تبدیل ہوجاتی ہے اور کامیابیاں ناکامیاں بن جاتی ہیں۔ خوارزم شاہ نے دولت دنیا کی ہوس اور تخت وتاج کی نخوت میں مبتلا ہوکر ایک بہت بڑی سلطنت تباہ کروالی۔ اس کا بیٹا تلافی کے لیے اٹھا اس نے شجاعت اور بہادری کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور ایک دو جنگوں میں تاتاریوں کو عبرتناک شکست بھی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تاریخ بدل جائے گی اور مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو شاید حاصل کرلیں گے۔ لیکن محض مال غنیمت میں اختلاف کی وجہ سے چالیس ہزار کا لشکر اسے چھوڑ کر چلا گیا جی سے ہی تاتاریوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے زخم چاٹنے کی بجائے آندھی کی طرح اٹھے اور طوفان بن کر حملہ آور ہوئے اب سلطان کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسے ہی عبرتناک نتائج سے بچنے کے لیے قرآن کریم نے مال غنیمت کے بارے میں وہ تصورات دیئے کہ جس نے عموماً مسلمانوں کو ایسی شرمناک صورتحال سے دوچار ہونے سے محفوظ رکھا۔

ضابطہ تقسیم

ان بنیادی تصورات کے بعد اس ضابطہ تقسیم کو بیان کیا جارہا ہے جس کے مطابق مال غنیمت تقسیم کیا جائے گا۔ سورۃ انفال کی پہلی آیت میں یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ مال غنیمت اجتماعی ملکیت ہے اس کا براہ راست مالک اللہ ہے اور اس کے عملی نمائندے اللہ کے رسول ہیں۔ اس لیے اس کی تقسیم فوج کے ذمہ دار اپنی مرضی سے نہیں کرسکیں گے بلکہ پہلے یہ مال جمع کر کے اجتماعی تحویل میں دیا جائے گا اس کے بعد نبی کریم اسے اللہ کے نبی اور سربراہ مملکت کی حیثیت سے تقسیم فرمائیں گے اور آپ کے بعد یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے سربراہ پر ہوگی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس ضابطہ تقسیم کو تفصیلاً بیان کرنے کی بجائے صرف اس کے خمس کو بیان کیا گیا۔ لیکن قرآن کریم کے اسلوب کو جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی میں پورے ضابطے کو بیان کردیا گیا ہے کیونکہ ماغنتم کے لفظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت میں مجاہدین کا حق تسلیم کیا ہے اور اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے حق سے اس مال کو ان کے حق میں منتقل فرمایا۔ اب رہی یہ بات کہ ان کا حق کتنا ہے تو اس میں سب سے پہلے اس حق کو ذکر فرمایا جو سب سے اہم اور سب سے اشرف ہے وہ یہ کہ پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور ذوی القربیٰ اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہوگا۔ باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے۔ البتہ ! اس تقسیم کا طریقہ کار کیا ہوگا ؟ اس کی تفصیل احادیث اور فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کے حصے کا تعلق ہے تو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہر چیز سے بے نیاز اور غنی ہے اس کا حق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اس لیے اصلاً پانچواں حصہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہے اور یہ حق آپ کا اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے ہے اور اسے آپ بعد میں بیان کردہ مستحقین پر صرف فرمائیں گے۔ رسول ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھی تھیں۔ لیکن سربراہ مملکت کی حیثیت سے جب آپ کا ایک ایک لمحہ ریاست کی ذمہ داریوں کی ادائیگیوں کے لیے صرف ہونے لگا تو اب ضروری تھا کہ ریاست کے واسطے سے جو وسائل پیدا ہوتے ہیں اس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حق بھی رکھا جاتا۔ چنانچہ اسی لیے مال غنیمت میں سب سے پہلے آپ کا حق رکھا گیا کہ آپ اس خمس میں اپنی ذات اور اپنی ازواج مطہرات پر بھی خرچ کریں گے اور ان ذوی القربیٰ پر بھی جن کی کفالت کی ذمہ داری آپ پر ہے یا آپ اخلاقاً جن کی مدد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں بنو ہاشم تو اس لیے شریک تھے کہ وہ آپ کا خاندان تھا اور بنو مطلب کو آپ نے اس لیے شریک فرمالیا تھا کیونکہ شعب ابی طالب کے ہولناک مصائب میں انھوں نے خود اپنے آپ کو بنی ہاشم کے ساتھ شریک رکھا تھا اور مزید یہ بات بھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور آپ کی وجہ سے آپ کے خاندان بنی ہاشم پر زکوۃ کا لینا ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ زکوۃ لوگوں کے ہاتھوں کا میل ہے جو آپ کی ذات اور آپ کے خاندان کے لیے مناسب نہیں اور اگر کہیں اسلام اس کی اجازت دے دیتا تو مسلمان آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قرابت داروں کو آپ کی

نسبت کی وجہ سے دوسروں کو محروم کرکے بھی زیادہ سے زیادہ زکوۃ دینے کی کوشش کرتے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بنی ہاشم کو مستقلاً ریاست کے وسائل سے محروم نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے مال غنیمت کے خمس میں سے ان کا بھی حق رکھا اور ذوی القربٰی پر "لام" لاکر بطور خاص اس کی اہمیت کو واضح فرمایا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں تو ذوی القربٰی سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب ہی تھے اور انھیں کا خمس میں حصہ رکھا گیا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد ذوی القربٰی کا حصہ کس کو پہنچتا ہے؟ اس میں مسلمانوں میں اختلاف ہوا۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد یہ حصہ منسوخ ہوگیا۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حضور کی وفات کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضور کی جگہ خلافت کی خدمت انجام دے گا۔ تیسرے گروہ کے نزدیک یہ حصہ خاندان نبوت کے فقراء میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ تحقیق سے تیسری بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ خلفائے راشدین کے زمانے میں حضرت علی (رض) کو تمام ذوی القربٰی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان کے واسطے سے ذوی القربٰی میں یہ حصہ تقسیم کیا جاتا تھا۔

رہے یتیم، مسکین اور مسافر تو یہ ذوی القربٰی میں سے بھی ہوسکتے ہیں اور اس سے باہر بھی خمس کو ان پر خرچ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا۔ خمس میں ان کے متعین حقوق نہیں بلکہ اس کا اختیار سربراہ مملکت کو ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ان پر خرچ کرے اور ان کی ذمہ داریوں کو محسوس کرے۔ ذوی القربٰی کے تحت ان کو ذکر کرنا بجائے خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طبقے کی عزت افزائی فرمائی ہے اور ان کی ضرورتوں کا احساس دلایا ہے۔ اسلامی نظام کو غور سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کی حیثیت سربراہ ریاست کے کنبے کی ہے۔ سربراہِ حکومت کو جس طرح اپنے کنبہ کی فکر کرنی پڑتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کی مدد کرنی پڑتی ہے۔ خلفائے راشدین کا طرز عمل اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ راتوں کو چھپ کر اس لیے گشت کرتے تھے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت سے آگاہ ہوسکیں اور کہیں مدینہ سے باہر کے مسافروں کا قافلہ اترا ہے تو اس کے حالات کا جائزہ لے سکیں اور پھر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جس طرح اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے اس طرح تو ایک باپ بھی شائد اپنے بچوں کے حوالے سے نہیں سوچتا۔ وہ ہر مسکین اور یتیم اور مسافر کی ذمہ داری براہ راست اپنے اوپر محسوس کرتے تھے۔ وہ اسلام کے مزاج شناس تھے وہ جانتے تھے کہ جس مملکت میں یتیم دھکے کھائیں، مسکین لاوارث ہوں اور مسافر کا کوئی پرسان حال نہ ہو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا يَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ تقسیم غنیمت سے متعلق احکام محض انتظامی احکام نہیں ہیں بلکہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر فرقان کے دن نازل کیا یعنی جس دن دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو پھر تمہیں ان احکام کی پابندی میں کمزوری نہیں دکھانی چاہیے اور اگر ان احکام کی بجاآوری میں ذرا سا پس و پیش ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے

ایمان میں بھی کمزوری ہے اور بدر کے دن تم نے جس طرح اللہ کی طرف سے نصرت وتائید اترتے دیکھی ہے اس کی بھی ناقدری ہے۔ ایسی صورتحال میں تم اس دن سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہو جبکہ وہ "یوم الفرقان" ہے یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا دن۔ جس دن ایک مٹھی بھر جماعت نے ایک بڑے لشکر کو محض اللہ کی تائید اور نصرت اور حق کی پاسداری کی برکت سے شکست سے دوچار کیا اور جس نے بھی اس صورتحال پر غور کیا اسے یقین ہو گیا کہ آج کے دن حق و باطل کا فیصلہ ہو گیا۔ حق کے حق ہونے کا کوئی شبہ نہیں رہا اور باطل کے باطل ہونے میں کوئی اخفا نہیں رہا اور اسے یقین ہو گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو اس کے راستے میں سب کچھ قربان کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے وہ تھوڑے بھی ہوں، بے دست و پا بھی ہوں تب بھی اللہ کی قدرت سے کامیاب ہوں گے۔ (تفسیر روح القرآن)

مال غنیمت کے حقدار لوگوں کی تفصیلات بتانے سے پہلے "واعلموا" کا لفظ استعمال فرمایا ہے

جس میں کسی بات سے آگاہ کرنے کے ساتھ انتباہ بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی اچھی طرح جان لو کہ جو تمہیں بتلایا جارہا ہے یہ معمولی مسئلہ نہیں حقیقت ہے کہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس لیے کہ وہی اسے حلال کرنے والا اور تمہیں فتح دینے والا ہے۔ مال غنیمت کے حق داروں میں رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام پہلے اس لیے لیا کہ پہلے انبیاء اور ان کی امتوں پر یہ مال حرام تھا۔ پھر یاد رکھو کہ رسول محترم کی قیادت اور محنت کی وجہ سے تم اس قابل ہوئے ہو۔

نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیت ہے کہ ان کے لیے غنیمت کا مال جائز قرار دیا گیا جس کی تقسیم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے مال غنیمت میں پانچواں حصہ ہے جس کا مفہوم ائمہ کرام (رض) نے یہ متعین کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حصہ سے مراد بیت اللہ کی تعمیر و ترقی پر خرچ کرنا ہے کچھ مفسرین کا خیال ہے اللہ تعالیٰ کا نام صرف تبرک کے طور پر لیا گیا ہے۔ میرا ذاتی نقطہ نظر یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا نام اس لیے لیا ہے تاکہ غازیوں کو احساس ہو جائے کہ یہ مال ہماری بہادری اور جواں مردی کا نتیجہ نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اس لیے اس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے جس نے اس کی تقسیم اس طرح فرمائی ہے کہ پہلا حصہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہے وہ جہاں چاہیں اسے خرچ فرمائیں۔ جس کے بارے میں آپ فرمایا کرتے تھے میرا حصہ بھی مسلمانوں کے لیے ہے جسے آپ مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات پر خرچ کیا کرتے تھے۔ امیر المومنین حضرت عمر (رض) جب خلیفہ بنے تو انھوں نے فرمایا کہ میں امت کا ذمہ دار ہونے کی بناء پر اس سے اتنا ہی اپنی ذات پر خرچ کروں گا۔ جتنا یتیم کی کفالت کرنے والا اس کے مال سے اپنی ذات پر خرچ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ گویا کہ خلیفہ وقت اپنے اہل و عیال پر اس سے بڑھ کر خرچ نہیں کر سکتا۔ جہاں تک رسول کریم (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کو اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس کے بارے میں آپ کی سنت یہ ہے کہ جب حضرت فاطمہ (رض) نے آپ سے بیت المال میں ایک کنیز لینے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ ابھی مستحق باقی ہیں۔ اس لیے میں آپ کو کنیز دینے کے بجائے وظیفہ بتلاتا ہوں کہ آپ ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر۔ رات سونے سے پہلے پڑھا کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا سربراہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو کن حالات میں کس قدر مال غنیمت دے سکتا ہے۔ اس کے بعد خمس مال میں یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حصہ رکھا گیا۔ اس تقسیم پر عمل کرنا ہر اس شخص پر لازم ہے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ ہی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بدر کے دن اپنی خاص مدد نازل فرمائی تھی جب دو جماعتیں آپس میں برسر پیکار ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا اختیار رکھنے والا ہے۔

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جَعَلَ لِلْفَرَسِ سَھْمَیْنِ وَلِصَاحِبِہٖ سَھْمًا)

[رواہ البخاری: کتاب الجہاد، باب سہام الفرس]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑے والے کے لیے دو حصے اور پیادہ کے لیے ایک حصہ مقرر فرمایا۔"

(عَنْ عُرْوَۃَ الْبَارِقِیِّ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ الْخَیْلُ مَعْقُوْدٌ فِیْ نَوَاصِیْھَا الْخَیْرُ الْأَجْرُ وَالْمَغْنَمُ إِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ) [رواہ البخاری: باب قَوْلِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُحِلَّتْ لَکُمُ الْغَنَاءِمُ]

"حضرت عروہ البارقی (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک خیر لکھ دی گئی ہے اجر اور غنیمت کی صورت میں۔"

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ إِذَا أَصَابَ غَنِیْمَۃً أَمَرَ بِلَالًا فَنَادٰی فِی النَّاسِ فَیَجِیْءُوْنَ بِغَنَاءِمِھِمْ فَیُخَمِّسُہٗ وَیُقَسِّمُہٗ فَجَاءَ رَجُلٌ بَعْدَ ذٰلِکَ بِزِمَامٍ مِنْ شَعَرٍ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھٰذَا فِیْمَا کُنَّا أَصَبْنَاہُ مِنَ الْغَنِیْمَۃِ فَقَالَ أَسَمِعْتَ بِلَالًا یُنَادِیْ ثَلَاثًا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَمَا مَنَعَکَ أَنْ تَجِیْءَ بِہٖ فَاعْتَذَرَ إِلَیْہِ فَقَالَ کُنْ أَنْتَ تَجِیْءُ بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَلَنْ أَقْبَلَہٗ عَنْکَ)

[رواہ ابوداؤد: بَابٌ فِی الْغُلُوْلِ إِذَا کَانَ یَسِیْرًا یَتْرُکُہُ الْاِمَامُ وَلَا یُحَرِّقُ رَحْلَہٗ]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جب مال غنیمت پہنچتا آپ بلال کو حکم دیتے کہ لوگوں میں اعلان کرے تو صحابہ کرام مال غنیمت ایک جگہ جمع کرتے اس مال میں سے پانچواں حصہ نکال کر باقی مال تقسیم کردیا جاتا۔ ایک دن ایک آدمی مال کی تقسیم کے بعد بالوں کی ایک گچھی لیکر آیا اور عرض کی اے اللہ کے رسول یہ مال غنیمت میں سے ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تو نے بلال کو اعلان کرتے ہوئے سنا تھا آپ نے یہ بات تین بار دہرائی۔ اس نے عرض کی

جی ہاں آپ نے فرمایا پھر تو اسے کیوں نہیں لیکر آیا۔ اس نے عذر پیش کیا۔ آپ نے فرمایا اسے اپنے پاس رکھو اور قیامت کو لیکر آنا اب ہر گز میں تجھ سے قبول نہیں کرونگا۔ " (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ 42

لغۃ القرآن: اِذْ : جب] [اَنْتُمْ : تم] [بِالْعُدْوَةِ : قریبی کنارے پر] [الدُّنْيَا : دنیوی] [وَهُمْ : اور وہ] [بِالْعُدْوَةِ :" تھے " کنارے پر] [الْقُصْوٰي : دور کے] [وَالرَّكْبُ : اور قافلہ] [اَسْفَلَ : سب سے نیچے] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [وَلَوْ : اور اگر] [تَوَاعَدْتُّمْ : تم آپس میں وعدہ کرتے] [لَاخْتَلَفْتُمْ :" تو " ضرور تم اختلاف کرتے] [فِي : میں] [الْمِيْعٰدِ : وقت مقرر] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [لِّيَقْضِيَ :" اکٹھا کردیا تمہیں " تاکہ پورا کردے] [اللّٰهُ : اللہ] [اَمْرًا :" اس " کام کو] [كَانَ : ہے] [مَفْعُوْلًا : ہوکر رہنے والا] [لِّيَهْلِكَ : تاکہ ہلاک ہو] [مَنْ : جس پر] [هَلَكَ : فوت ہوجائے] [عَنْۢ : سے] [بَيِّنَةٍ : کھلی] [وَّيَحْيٰي : اور وہ زندہ رہے] [مَنْ : جس پر] [حَيَّ : زندہ رہے] [عَنْۢ : سے] [بَيِّنَةٍ : کھلی] [۔اِنَّ : اور بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [لَسَمِيْعٌ : یقینا خوب سننے والا] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے] [

ترجمہ: جب تم (مدینہ کی جانب) وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ (کفار دوسری جانب) دور والے کنارے پر تھے اور (تجارتی) قافلہ تم سے نیچے تھا، اور اگر تم آپس میں (جنگ کے لئے) کوئی وعدہ کر لیتے تو ضرور (اپنے) وعدہ سے مختلف (وقتوں میں) پہنچتے لیکن (اللہ نے تمہیں بغیر وعدہ ایک ہی وقت پر جمع فرما دیا) یہ اس لیے (ہوا) کہ اللہ اس کام کو پورا فرما دے جو ہو کر رہنے والا تھا تاکہ جس شخص کو مرنا ہے وہ حجت (تمام ہونے)

سے مرے اور جسے جینا ہے وہ حجت (تمام ہونے) سے جیئے (یعنی ہر کسی کے سامنے اسلام اور رسول بر حق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صداقت پر حجت قائم ہو جائے)، اور بیشک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں غزوہ بدر کے معرکہ کو یوم الفرقان کہا گیا ہے۔ یعنی ایسا دن جس میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ کے درمیان دو اور دو چار کی طرح فرق واضح کر دیا گیا۔ غزوہ بدر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جو مرے وہ دلیل پر مرے اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل پر زندہ رہے۔ اس لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر سے نکلنے کے بارے میں فرمایا کہ آپ کو آپ کے رب نے ہی گھر سے نکالا تھا حالانکہ مومنوں میں سے ایک جماعت اسے پسند نہیں کر رہی تھی۔ (الانفال: ٦)

یہاں بدر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے کہ جب تم نے بدر میں مدینہ کی جانب اور کفار نے مکہ کی جانب پڑاؤ ڈالا تھا اور جس قافلہ کے لیے تم نکلے تھے وہ نیچے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے نکل گیا۔ اگر کفار اور تم آپس میں جنگی اصول طے کرتے تو یہ معرکہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ جس طرح تم جنگ کرنے میں متردد تھے اسی طرح کفار کے درمیان بھی اختلاف تھا۔ سیرت کی کتب میں تفصیل ہے کہ بدر سے پہلے ابو جہل اور ان کے ساتھیوں کے درمیان اختلاف ہوا، کہ جب قافلہ بچ کر نکل چکا ہے تو اب جنگ کرنے کا کیا مقصد؟ لیکن ابو جہل کی رائے غالب آئی جس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی مشیت کارفرما تھی۔ اس آیت میں اسی اختلاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں جس طرح غزوہ بدر کی جزیات بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح احد، احزاب، فتح مکہ اور غزوہ تبوک کی جزیات کی تفصیل بیان نہیں کی گئیں کیونکہ اس معرکہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں کہ ہم نے اس مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر رزم آرا کیا تھا

١۔ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت کے ساتھ حق ثابت کرنا چاہتا تھا تاکہ حق، حق اور باطل، باطل ثابت ہو جائے۔

٢۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں جو فیصلہ کر رکھا تھا اسے لوگوں کے سامنے آشکار کرنا چاہتا تھا۔

٣۔ ہلاک ہونے والا دلیل کی بنیاد پر ہلاک ہو اور زندہ رہنے والا دلیل کی بنیاد پر زندہ رہے۔

دلیل پر مرنے اور دلیل کی بنیاد پر زندہ رہنے کا میرے نزدیک دو معانی ہو سکتے ہیں۔ بدر میں مرنے والے کفار نے اپنی آنکھوں سے اللہ کا وہ وعدہ دیکھ لیا۔ جس کے بارے میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں انھیں بتایا کرتے تھے کہ تم جتنی چاہو مخالفت کر لو۔ اللہ تعالیٰ دین کو غالب کر کے رہے گا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے رب کا وعدہ سچا پایا گویا کہ دونوں فریق نے حق کی پاسداری اور باطل کی ناپائیداری اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا فرمائی ہے اس کے وجود کی ایک بنیاد قائم فرمائی خواہ وہ چیز روحانی وجود رکھتی ہو یا مادی۔ انسانی وجود روح اور جسم پر مشتمل ہے۔ انسان کا وجود زمین سے بنا ہے۔ اس کی خوراک بھی زمین سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر اسے مادی خوراک نہ ملے تو وجود لاغر، کمزور یہاں تک کہ مردہ ہو جاتا ہے۔ روح آفاقی اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس کی خوراک روحانی یعنی آسمانی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی شکل میں اتارا ہے۔ جو شخص کفر و شرک کی راہ اختیار کرتا ہے اس کا روح مردہ ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے حق زندہ جاوید اور حیات بخش ہے۔ باطل کے لیے دلیل نہ ہونے کی وجہ سے مردہ اور مردگی کی علامت ہے۔ اس بنا پر ایمان والا زندہ اور کفر والا مردہ ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جس کی بنا پر مذکورہ بالا حقائق کو نمایاں اور مسلمانوں کو غالب کرنے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خواب میں کفار کی تعداد اصل تعداد سے کم دکھائی۔ آپ نے اسی طرح صحابہ کرام (رض) کے سامنے اپنا خواب بیان فرمایا اور مسلمانوں کی تعداد کفار کو کم دکھائی گئی۔ جس سے فریقین کے حوصلے دوبالا ہوئے۔ (تفسیر فہم القرآن)

جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ کی کارسازی

جنگ بدر جس طرح وقوع پذیر ہوئی اور جیسے کچھ اس کے نتائج نکلے اس پر غور کرنے سے قدم قدم پر اللہ کی تدبیر اور قدرت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ہر صاحب بصیرت محسوس کرنے لگتا ہے کہ جن حالات سے مسلمان گزر رہے تھے اور مسلمانوں کی جماعتی حیثیت جس صورتحال سے دوچار تھی اور وسائل کی کمیابی نے مسلمانوں کے لیے جس طرح کے مسائل پیدا کر رکھے تھے اسے دیکھتے ہوئے مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ قریش مکہ کی طاقت سے ٹکرانے کی کبھی غلطی کر سکتے تھے۔ مسلمان امت تعمیر کے مراحل سے گزر رہی تھی اور اسلامی ریاست ابھی پوری طرح استحکام پیدا نہیں کر سکی تھی۔ مدینہ میں پھیلے ہوئے دشمن ابھی تک مسلمانوں کے لیے ایک مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورتحال میں کسی بڑے اقدام کا فیصلہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ دوسری طرف قریش مکہ بھی ابھی تک لشکر کشی کا فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ وہ عرب کی روایت کو دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے کہ جنگوں کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ اگرچہ انھیں اپنی طاقت کا زعم تھا لیکن ابھی مزید تیاری کی فکر میں تھے اور اسی تیاری کے لیے انھوں نے ایک بڑا قافلۂ تجارت ملک شام بھیجا تھا تاکہ اس کے منافع سے فوجی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ لیکن ان تمام موانع کی موجودگی میں جنگ بدر کے حالات کا پیدا ہو جانا اور پھر دونوں فوجوں کا بیک وقت میدان جنگ میں پہنچ جانا اللہ کی قدرت کے ظہور کے سوا کچھ نہیں۔ فوجیں ہزار منصوبہ بندی کے ساتھ کسی جنگ کا فیصلہ کرتی ہیں لیکن میدان جنگ میں اس طرح ایک ساتھ دونوں فوجوں کا پہنچنا کہ جس میں نہ تقدیم کی شکایت ہو نہ تاخیر کی، ایک حیران کن بات ہے۔ چنانچہ انہی باتوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس آیت کریمہ میں پروردگار نے میدان جنگ کا نقشہ کھینچا ہے تاکہ ہر صاحب بصیرت جان سکے کہ یہاں قدم قدم پر اللہ کی منصوبہ بندی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ "عدوۃ" عربی زبان میں ایک جانب کو کہتے ہیں اور "دنیا" ادنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں قریب تر۔ آخرت کے مقابلے میں اس جہان کو بھی دنیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم آخرت کی نسبت انسان کے زیادہ قریب ہے۔ "قصویٰ"، اقصیٰ سے بنا ہے۔ اقصیٰ کے معنی ہیں بعید تر۔ میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے تم اور قریش جس طرح میدان بدر میں پہنچے حیرانی کی بات ہے کہ اس کے قریبی کنارے پر تم تھے اور دوسرے کنارے قریش تھے اور جس قافلے کو بچانے کے لیے قریش نکلے تھے وہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ تین میل کے فاصلے پر جا رہا تھا۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے دو فوجوں کا ایک ہی میدان میں اور ایک ہی دن صبح شام کے فاصلے سے پہنچ جانا جنگ کی تاریخ کا ایک حیرت ناک واقعہ ہے کیونکہ فوجوں کا پس و پیش اور فوجوں کا دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش، عزائم کو چھپا کر رکھنے کے لیے اقدام کا رخ کسی اور طرف رکھنا یہ فوجوں کے معمولات میں سے ہیں۔ لیکن دونوں فوجوں کا اچانک آمنے سامنے آجانا اور دونوں کا آمادہ جنگ ہونا اور پس و پیش کے کسی امکان کا باقی نہ رہنا یہ سراسر اللہ کی منصوبہ بندی تھی جو کھلی آنکھوں سے نظر آتی تھی۔

جنگ کا مقصد

اس کے بعد فرمایا کہ یہ منصوبہ بندی بےسبب نہیں تھی اور یہ محض حسن اتفاق نہ تھا بلکہ یہ حسن اتفاق اللہ کی منصوبہ بندی سے وجود میں آیا تھا اور پیش نظر یہ تھا کہ قریش اور مسلمانوں کا ایک تصادم ہو جس میں نظر بظاہر فتح کی تمام علامتیں اور تمام اسباب قریش کے ساتھ ہوں اور

مسلمانوں کے پاس بجز اللہ کی تائید و نصرت کے یقین اور حسن کردار کے اسباب کی دنیا کے کوئی چیز نہ ہو۔ دنیا اس تصادم سے پہلے یقین رکھتی ہو کہ مسلمان موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور ان کے دین نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن جب تصادم کا غبار چھٹے اور جنگ کا نتیجہ سامنے آئے تو مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کامیاب اور کامران دکھائی دے اور قریش کی بے پناہ قوت لاشوں کے انبار میں بدل جائے اور ایک بڑی تعداد قیدیوں کی صورت رسیوں میں بندھی ہوئی دکھائی دے، پورا لشکر ڈرے ہوئے جنگلی جانوروں کی طرح بھاگتا ہوا دکھائی دے، تو یہ ساری صورتحال خود منہ سے بولتی ہے کہ جس پروردگار نے اس جنگ کی منصوبہ بندی فرمائی تھی اس کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ہم یہ جنگ اس لیے کروا رہے ہیں تاکہ حق و باطل کا فرق واضح ہو جائے۔ حق غالب آجائے اور باطل مغلوب ہو جائے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ باطل مٹ جانے والی چیز ہے اور حق غالب آنے والی قوت ہے۔ حق کی قبولیت زندگی کی علامت ہے اور کفر سے تعلق ہلاکت اور بربادی ہے۔ اس جنگ کی صورت میں سب کچھ واضح ہو جانے کے بعد اب جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی زندگی اور حق کی دلیل دیکھ کر زندہ رہے اور جس کی قسمت میں ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کر ہلاک ہو تاکہ اہل کفر کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ابہام کی دھند چھٹ جائے۔ چنانچہ یہ ہے وہ حقیقت جسے بروئے کار لانے کے لیے اللہ نے اس جنگ کا اہتمام فرمایا اور اسے فرقان بنا دیا۔ بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

اِذۡ يُرِيۡكَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَنَامِكَ قَلِيۡلًا ؕ وَّلَوۡ اَرٰٮكَهُمۡ كَثِيۡرًا لَّـفَشِلۡتُمۡ وَلَـتَـنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝43

لغۃ القرآن: اِذْ : جب] [يُرِيْكَهُمُ : دکھا رہا تھا آپ کو انہیں " کافروں کے لشکر کو "] [اللّٰهُ : اللہ] [فِي : میں] [مَنَامِكَ : آپ کے خواب] [قَلِيْلًا : بہت کم] [وَلَوْ : اور اگر] [اَرٰىكَهُمْ : وہ دکھلاتا آپ کو انہیں] [كَثِيْرًا : کثرت سے] [لَفَشِلْتُمْ :" تو " ضرور تم ہمت ہار جاتے] [وَلَتَنَازَعْتُمْ : اور ضرور تم آپس میں جھگڑتے] [فِي : میں] [الْاَمْرِ : معاملے] [وَلٰكِنَّ : اور لیکن] [اللّٰهَ : اللہ] [سَلَّمَ : سلامت رکھا] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے] [بِذَاتِ الصُّدُوْرِ : سینے والی " بات " کو]

ترجمہ: (وہ واقعہ یاد دلائیے) جب آپ کو اللہ نے آپ کے خواب میں ان کافروں (کے لشکر) کو تھوڑا کر کے دکھایا تھا اور اگر (اللہ) آپ کو وہ زیادہ کر کے دکھاتا تو (اے مسلمانو!) تم ہمت ہار جاتے اور تم یقیناً اس (جنگ کے) معاملے میں باہم جھگڑنے لگتے لیکن اللہ نے (مسلمانوں کو بزدلی اور باہمی نزاع سے) بچالیا۔ بیشک وہ سینوں کی (چھپی) باتوں کو خوب جاننے والا ہے

تشریح:

جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ اور کفار کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خواب میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کفار کی تعداد تھوڑی دکھائی یعنی صرف وہی چند کافر دکھائے جو میدان جنگ میں ڈٹ کر لڑنے والے تھے باقی اکثر بزدل اور بھاگنے والے تھے، ان کو دکھانے کی ضرورت ہی کیا تھی کیونکہ ان کا لشکر میں ہونا نہ ہونے کے برابر تھا یا تھوڑا دکھانے سے مراد کفار کا مغلوب ہونا دکھایا۔ (روح المعانی) اور اگر مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہونے والے فرشتوں کو شمار کیا جائے تو کافروں کی تعداد واقعی تھوڑی تھی۔ چنانچہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجاہدین کو خوشخبری سنائی کہ تمہارے مقابلہ میں لڑنے والے بالکل تھوڑے ہیں باقی سب بھاگنے والے ہیں جیسے ایک شیر اگر سینکڑوں بھیڑوں پر حملہ آور ہو تو ساری بھیڑیں اپنی کمزوری اور بزدلی کے باعث بھاگنے لگتی ہیں، اسی طرح جب شیر دل مسلمان اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے حملہ آور ہوں گے تو کفار اپنی بزدلی کے باعث بھاگ جائیں گے۔

اس سے مجاہدین کے حوصلے بلند ہوگئے اور اگر اللہ تعالیٰ صرف ان کی ظاہری تعداد کی کثرت دکھاتا تو مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جاتے اور تھوڑی تعداد کے باعث باہم اختلاف کرنے لگتے، بعض کہتے: جنگ کرنی چاہیے اور بعض کہتے: نہیں کرنی چاہیے مگر اللہ تعالیٰ نے کفار کی بزدلی کا مشاہدہ کرا کے مسلمانوں کو کمزوری دکھانے سے بچالیا، نیز جنگ بدر میں کفر پر مرنے والے کفار کی تعداد واقعی تھوڑی تھی کیونکہ بعد میں ان میں سے اکثر مسلمان ہوگئے تھے۔ (تفسیر خزائن العرفان) (تفسیر امداد الکرم)

بدر کے دن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے عریشہ میں تشریف فرما تھے آپ پر نیند طاری ہوئی، حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دشمن قریب آگئے ہیں۔ ان کی آواز سے آپ بیدار ہوئے اور فرمایا مجھے کفار کی تعداد خواب میں بہت کم دکھائی گئی ہے۔ (مظہری جلد 5 صفحہ 140)

اس بارہ میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اے مسلمانو! ہم نے تمہیں کفار کی تعداد کم کر کے دکھائی تاکہ تمہارا حوصلہ بڑھے اگر ان کی تعداد تمہیں زیادہ دکھائی جاتی تو تم ہمت ہار جاتے اور باہم تنازع کرنے لگتے کوئی کہتا لڑا جائے کوئی کہتا نہیں، مگر اللہ نے تمہیں ایسی بزدلی اور تنازع سے بچا لیا۔

گویا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھا سکتا ہے اور بڑی چیز کو چھوٹی کر کے پیش کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پہ قادر ہے اور ہمارے حواس اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ ان سے جیسا چاہے کام لے سکتا ہے بلکہ جب چاہے ان کو معطل کر سکتا ہے جب چاہے ان کو فعال بنا سکتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہمارے حواس کو توفیق دے کہ وہ اس کی رضا کے کاموں میں مصروف رہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

بدر کے دن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے عریشہ میں تشریف فرما تھے آپ پر نیند طاری ہوئی، حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دشمن قریب آگئے ہیں۔ ان کی آواز سے آپ بیدار ہوئے اور فرمایا مجھے کفار کی تعداد خواب میں بہت کم دکھائی گئی ہے۔ (مظہری جلد 5 صفحہ 140)

اس بارہ میں اللہ تعالیٰ فرمارہاہے کہ اے مسلمانو! ہم نے تمہیں کفار کی تعداد کم کر کے دکھائی تاکہ تمہارا حوصلہ بڑھے اگر ان کی تعداد تمہیں زیادہ دکھائی جاتی تو تم ہمت ہار جاتے اور باہم تنازع کرنے لگتے کوئی کہتا لڑا جائے کوئی کہتا نہیں، مگر اللہ نے تمہیں ایسی بزدلی اور تنازع سے بچا لیا۔

گویا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھا سکتا ہے اور بڑی چیز کو چھوٹی کر کے پیش کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پہ قادر ہے اور ہمارے حواس اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ ان سے جیسا چاہے کام لے سکتا ہے بلکہ جب چاہے ان کو معطل کر سکتا ہے جب چاہے ان کو فعال بنا سکتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہمارے حواس کو توفیق دے کہ وہ اس کی رضا کے کاموں میں مصروف رہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

خواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو دشمنوں کی تعداد کم دکھائی تھی

جس کی آپ نے صحابہ کو بشارت دی۔ یہ وہ نعمت الٰہیہ تھی جو میدان بدر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو کفار کی تعداد تھوڑی دکھائی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا خواب صحابہ علیہم رضوان سے بیان فرما کر ان کی ہمتیں بلند کیں۔ جانبازان بدر کے حوصلے بڑھائے ان میں جرأت پیدا ہوئی اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ پھر نبی الانبیاء (علیہم السلام) کا خواب تو مبنی بر حقیقت تھا اس لیے کہ جن کفار کا کفر پر مرنا مقدر تھا وہ حقیقت میں تھے بھی بہت تھوڑے اور ہا بھی ایسا ہی جو لشکر مقابل آیا اس میں سے کر تعداد ایسی تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی نعمت عطاء کی اور ان کو ایمان نصیب ہوا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خواب میں قلب سے تعبیر ضعف کفار تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب فرمایا۔ اور کفار کو شکست دے کر ان کا ضعف ظاہر فرمادیا۔ (**ولو ارکھم کثیراً لفیلتم و لتنازعتم فی الامر ولکن اللہ سلم، ان علیم بذات الصدور** اور اگر اللہ آپ کو ان کی تعداد کثیر دکھا دیتا تو آپ ہمت ہار جاتے اور اس امر میں تم میں باہم نزاع ہو جاتا مگر اللہ نے اس اختلاف سے بچا لیا بیشک وہ دونوں کی باتوں کو جانتا ہے۔ قلب اعداء دکھانے سے یہ غرض تھی کہ مسلمانوں کے حوصلے بلند رہیں اور مسلمان جنگ میں ثابت قدم رہیں۔] لفشلتم۔ یعنی تم پست حوصلہ اور بزدل ہو جاتے۔ (ولتنازعتم فی الامر۔ اور جنگ کے متعلق تمہارے خیالات مختلف ہو جاتے۔ (ولکن اللہ سلم۔ مگر اللہ نے تم کو باہمی اختلاف اور بزدلی سے محفوظ رکھا اللہ تمہارے دلوں کی حالت جانتا ہے۔ (**واذیر کموھم اذالتقیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعنھم**۔ اور جب تم آمنے سامنے آگئے تو اللہ ان کی تعداد کم کر کے دکھا رہا تھا اور تمہاری تعداد بھی ان کو کم دکھا رہا تھا۔ حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا کہ اس کافر ہمیں اس قدر کم نظر آئے کہ میں نے اپنے ساتھ والے سے کہا کہ یہ ستر کفار ہیں تو ساتھ والے نے جواب دیا کہ یہ سو ہوں گے حالانکہ یہ ہزار کے قریب تھے۔ جب ہم نے ان کا ایک آدمی قید کیا اور اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک ہزار تھے۔ کافروں کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی زیادہ تعداد دیکھ کر بھاگ نہ جائیں۔ ابو جہل نے مسلمانوں کی تعداد دیکھ کر رہا تھا کہ انھیں رسیوں سے باندھ لو ان میں سے کسی کو قتل نہ کرنا۔ گویا ابو جہل کی نظر میں مسلمان کی جماعت اتنی قلیل نظر آتی تھی کہ وہ قتل قتال ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ یہ تعداد کی تقلیل کفار کی نظر سے جنگ چھڑنے سے پہلے تھی لیکن جب گھمسان کا رن ہوا تو کافروں کو مسلمانوں کی تعداد دوگنی نظر آئی۔ (لیقضی اللہ امرا کان مفعولا۔ تاکہ جو بات اللہ کو منظور تھی وہ پوری کر دے۔ وہ کام جو ہونا ہے یعنی اسلام کا غلبہ ایمان والوں کی فتح۔ (والی اللہ ترجع الامور۔ اور اللہ کی طرف سب کاموں کا رجوع ہے وہ چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ (تفسیر الحسنات)

اللہ کی کارسازی کی دوسری مثال

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی کی دوسری مثال بیان فرمائی ہے کہ جس طرح اس نے اپنی قدرت کاملہ سے مسلمانوں اور قریش کو ایک ساتھ میدان جنگ میں پہنچایا اور جنگ کے امکانات پیدا فرمائے اسی طرح اس نے کچھ ایسے اقدامات بھی فرمائے جن کی وجہ سے دونوں فوجوں کے لیے ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے میں تردد اور تامل کے تمام امکانات ختم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا احسان یہ فرمایا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خواب میں قریش مکہ کی جو فوج دکھائی گئی اسے قلیل التعداد دکھایا گیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بہت بڑی فوج نہیں بلکہ ایک چھوٹا لشکر ہے اور ساتھ ہی اللہ نے یہ وعدہ بھی فرمایا کہ اس لشکر پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کیا جائے گا۔ اسی آیت کے دوسرے حصے میں یہ بھی فرمایا کہ ہمارا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا ہم نے اپنے پیغمبر کے خواب میں اس فوج کی تعداد اس لیے تھوڑی دکھائی تاکہ مسلمانوں کے حوصلوں پر اس کا اثر نہ پڑے جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں کے سامنے اپنا خواب بیان فرمائیں تو ان کے اندر پست ہمتی کی بجائے امیدوں کے چراغ جلنے لگیں اور اگر قریش کی فوج جیسی تھی ویسی ہی آپ کے خواب میں دکھائی جاتی اور آپ یقیناً اسی طرح مسلمانوں کے سامنے بیان فرماتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ بعض مسلمانوں کے حوصلے کمزور پڑنے لگتے اور وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کرتے کہ ہمیں اس جنگ کو ٹالنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہمیں تیاری کے لیے موقعہ مل جائے ورنہ اس صورت میں تو مقابلے کی کوئی صورت بنتی ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام امکانات کو ختم کرنے کے لیے آپ کی نگاہوں میں انھیں تھوڑا کر کے دکھایا۔ دوسری آیت میں ایک اور کارسازی کا ذکر فرمایا کہ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو حیرت کی بات ہے کہ مسلمان دیکھنے کے باوجود کفار کو اپنے آپ سے کم دیکھ رہے تھے اور کفار کا حال یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی تعداد کو کم دیکھ رہے تھے۔ مسلمانوں کو قریش کی تعداد عین لڑائی کے وقت اس لیے کم دکھائی جارہی تھی تاکہ وہ جرأت اور ہمت سے آگے بڑھیں اور ان کی افرادی قوت سے مرعوب نہ ہوں اور کافروں کو مسلمانوں کی تعداد اس لیے تھوڑی دکھائی گئی کہ کافر تو بنیادی طور پر بزدل ہوتا ہے۔ انھیں اگرچہ اپنی افرادی قوت پر ناز تھا لیکن دل ان کے پھر بھی دھڑک رہے تھے۔ اب جب کہ مسلمانوں کو انھوں نے اپنے آپ سے کم دیکھا تو اس بات کا امکان کم ہوگیا کہ وہ مسلمانوں سے مرعوب ہو کر جنگ سے بچنے کی کوشش کریں گے اور پروردگار کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی فوج بھی میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرے کیونکہ اس کے بعد ہر فوج کو تاویل اور توجیہ کرنے کا موقع باقی رہے گا اور اصل صورتحال پردوں میں لپٹی رہے گی۔ لیکن اگر حق و باطل کا تصادم ہوگیا اور حق نے باطل کو تہہ و بالا کرڈالا تو دنیا پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسباب اور قوت رکھنے کے باوجود قریش کو اس لیے شکست ہوئی کہ وہ اہل باطل تھے اور مسلمانوں کو اس لیے فتح ہوئی کہ وہ اہل حق تھے۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے کافروں کو کم تعداد میں دیکھا اور کافروں نے مسلمانوں کو۔ اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود (رض) فرماتے ہیں کہ لڑائی شروع ہونے کے وقت ہم نے جب اپنے مقابل لشکر کی طرف نظر ڈالی تو میں نے اپنے قریب ایک آدمی سے کہا کہ یہ لوگ نوے (۹۰) آدمیوں کی تعداد میں ہوں گے اس شخص نے کہا کہ نہیں سو (۱۰۰) ہوں گے۔ اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی جن کی خوراک ایک اونٹ ہو۔

عرب میں کسی لشکر کی تعداد معلوم کرنے کے لیے اس سے اندازہ کیا جاتا تھا کہ کتنے جانور ان کی خوراک کے لیے ذبح ہوتے ہیں۔ ایک اونٹ سو (۱۰۰) آدمیوں کی تعداد کے لیے سمجھا جاتا ہے۔

فوجوں کی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ فوجیں دوسری فوجوں کے بارے میں ہمیشہ وہی احساسات رکھتی ہیں جن کی امنگ اور ترنگ ان کے دل و دماغ سے پھوٹتی ہے۔ اگر کوئی فوج عددی قوت کو ہی سب کچھ سمجھتی ہو اور اسلحہ جنگ کو فیصلہ کن حیثیت دیتی ہے اور ہر چیز کو ظاہر بین نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے سامنے ایک بڑی فوج بھی چھوٹی دکھائی دیتی ہے لیکن جب معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے تو ایسی سرسری نگاہ رکھنے والی فوجیں ہمیشہ ریت کا انبار ثابت ہوتی ہیں۔

اسی طرح وہ فوجیں جو معنوی اور اخلاقی حیثیت کو اصل قوت سمجھتی ہیں اور ان کے فیصلے ہمیشہ دل کے تابع ہوتے ہیں وہ جب محسوس کرتی ہیں کہ ان کے دلوں میں ایک حوصلہ اور ایک امنگ ہے ایمان و اعتماد ہے جذم و یقین ہے مقصد کی صداقت اور اس کے لیے مر مٹنے کا جذبہ ہے انھیں اپنے سامنے بڑی سے بڑی فوج بھی چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ شاید اسی حقیقت سے اس آیت کریمہ میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔ کافروں کا مسلمانوں کو قلیل التعداد دیکھنا یا تو اس لیے تھا کہ مسلمانوں کی تعداد ہی تھوڑی تھی یا اس لیے تھا کہ طاقت کے زعم نے انھیں ایک نشہ میں مبتلا کر رکھا تھا اور مسلمانوں کا کافروں کو اپنے سے قلیل دیکھنا اس وجہ سے تھا کہ کافروں کے سروں کی تعداد تو زیادہ تھی لیکن ان کے اندر معنوی اور اخلاقی قوت نہیں تھی اور مسلمانوں کے دل اسی قوت سے ابل رہے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے سامنے پہاڑ بھی ایک تودہ ریگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بعض دفعہ کوئی غلط چیز بھی دکھا دیتا ہے جیسے یہاں فوج کی تعداد کو غلط دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے اس لیے کہ پیغمبر کا خواب وحی الٰہی ہوتا ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا البتہ ! یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ خواب میں کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں دکھائی جائے یا کوئی چیز ظاہر کی بجائے معنوی حقیقت میں سامنے لائی جائے۔ ایسی صورت میں خواب کی تعبیر میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خواب میں قریش کی فوج کو کم دکھانا درحقیقت ان کی معنوی اور اخلاقی حیثیت کو دکھانا تھا کہ وہ تعداد میں اگرچہ زیادہ ہیں لیکن اخلاقی اور معنوی قوت کے اعتبار سے نہایت فروتر۔ ان کے اندر جزم و یقین نہیں عزائم کا فقدان ہے وہ صرف قوت پر اعتماد کرنا جانتے ہیں۔ ایسی فوج بڑی تعداد میں بھی ہو تو کوئی معرکہ انجام نہیں دے سکتی چنانچہ جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں یعنی معاملات کا سررشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے فتح دیتا ہے، جسے چاہتا ہے شکست دیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت کا شکار کر دیتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فرض انجام دے لیکن بھروسہ اللہ پر رکھے۔ کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ میں اللہ سے بے نیاز ہو کر بھی کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہوں۔

(تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭوَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ 44

لغۃ القرآن: وَ اِذْ : اور جب] [يُرِيْكُمُوْهُمْ : وہ دکھلا رہا تھا تمہیں ان " کافروں " کو] [اِذِ : جب] [الْتَقَيْتُمْ : تم باہم ملے] [فِيْٓ : میں] [اَعْيُنِكُمْ : تمہاری آنکھوں] [قَلِيْلًا : بہت کم] [وَ : اور] [يُقَلِّلُكُمْ : وہ کم دکھلا رہا تھا تمہیں] [فِيْٓ : میں] [اَعْيُنِهِمْ : ان کی آنکھوں] [لِيَقْضِيَ : تاکہ پورا کردے] [اللّٰهُ : اللہ] [اَمْرًا :" اس " کام کو] [كَانَ : ہے] [مَفْعُوْلًا : ہوکر رہنے والا] [وَاِلَى : اور کی طرف] [اللّٰهِ : اللہ] [تُرْجَعُ : لوٹائے جائیں گے] [الْاُمُوْرُ : تمام معاملات] [

ترجمہ:

اور (وہ منظر بھی انھیں یاد دلایئے) جب اس نے ان کافروں (کی فوج) کو باہم مقابلہ کے وقت (بھی محض) تمہاری آنکھوں میں تمہیں تھوڑا کر کے دکھایا اور تمہیں ان کی آنکھوں میں تھوڑا دکھلایا (تاکہ دونوں لشکر لڑائی میں مستعد رہیں) یہ اس لیے کہ اللہ اس (بھرپور جنگ کے نتیجے میں کفار کی شکست فاش کے) امر کو پورا کردے جو (عند اللہ) مقرر ہو چکا تھا، اور (بالآخر) اللہ ہی کی طرف تمام کام لوٹائے جاتے ہیں

تشریح:

غزوہ بدر کے آغاز میں ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مومنوں کی تعداد حقیقت سے کم کر کے دکھائی اور مومنوں کو کفار کی تعداد ان کی حقیقی تعداد سے کم کر کے دکھائی تاکہ دونوں لشکر بلا خوف وخطر میدان میں اتریں اور غلبۂ اسلام کا جو فیصلہ ہو چکا تھا وہ پورا ہو۔ اگر کفار مسلمانوں کی تعداد زیادہ دیکھتے تو جنگ سے قبل ہی بھاگ جاتے اور قتل سے بچ نکلتے مگر اللہ ان کی قوت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔

مروی ہے کہ جنگ سے قبل ابوجہل کہہ رہا تھا (محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) اور ان کے ساتھی ایک اونٹ کی خوراک سے بھی کم ہیں ہم انھیں کیا قتل کریں انھیں تو ہم رسیوں میں باندھ لیتے ہیں (مدارج النبوت)

ادھر حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) کہتے ہیں ہمیں کفار کی تعداد اس قدر کم کر کے دکھائی گئی کہ میں نے اپنے پاس کھڑے شخص سے کہا کیا کفار کی تعداد 70 اس نے کہا 70 تو نہیں البتہ 100 ہے مگر جب ہم نے ان میں سے ایک شخص کو گرفتار کر کے اس سے پوچھا کہ تمہاری تعداد کتنی تھی تو اس نے کہا ہم ایک ہزار تھے (در منثور بروایت ابن ابی شیبہ جلد 4 صفحہ 47)

یاد رہے یہ جنگ شروع ہونے سے قبل کی بات ہے پھر جب کفار میدان بدر میں اتر آئے اور جنگ شروع ہو گئی تو وہ مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھنے لگے۔
قرآن مجید میں ہے

واخری کافرۃ یرونھم مثلیھم رأی العین

اور دوسرا کافر گروہ جو (بدر میں) ان کو (مسلمانوں کو) اپنے سے دوگنا دیکھ رہا تھا۔ "(آل عمران 13)
یعنی جنگ سے قبل اللہ نے ہر گروہ کو اپنے مخالف گروہ کی تعداد کم کر کے دکھائی تاکہ کوئی گروہ خوف زدہ ہو کر میدان جنگ میں اترنے سے قبل بھاگنے کی کوشش نہ کرے، پھر جب دونوں گروہ میدان میں اتر آئے تو اللہ نے اپنی قدرت کا دوسرا نشان یہ ظاہر کیا کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھنے لگے اور خوف زدہ ہونے لگے مگر اس وقت بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔
گویا اس جنگ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کیے اللہ رب العزت نے چاہا کہ ایک معرکۂ جنگ بپا ہو جس میں تا قیامت آنے والے مسلمانوں کو دکھایا جائے کہ جب اہل اسلام دین کی سر بلندی کے لئے مخلص ہوں اور ان میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کا جذبہ کار فرما ہو جیسا کہ بدری صحابہ کرام میں تھا تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن پر غلبہ عطا فرماتا ہے۔ گویا جنگ بدر کا واقعہ تا قیامت اہل ایمان کے دلوں میں جوش ایمانی پیدا کرتا رہے گا اور ان کے خون کو حرارت ایمانی سے گرماتا رہے گا اور انھیں یہ بتاتا رہے گا کہ اہل ایمان کو کسی بھی میدان میں کثرت تعداد سے نہیں بلکہ اللہ کی امداد سے فتح ملتی ہے اور ان کو اسلحہ و ہتھیار پہ نہیں بلکہ رحمت پرور دگار پہ نظر رکھنی چاہیے۔
آج مسلمانوں کے پاس تعداد کی کمی نہیں اس تعداد کی کمی ہے اور اللہ پر اعتماد کی کمی ہے بس اہل بدر والا جذبہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔
(تفسیر برہان القرآن)

سب کاموں کا رجوع اللہ ہی کی طرف

سو ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام۔ پس ہوتا وہی ہے جو اس وحدہ لاشریک کو منظور ہوتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو قلّت کو کثرت پر فوقیت اور غلبہ عطا فرما دے اور ضعف کو قوت پر غالب فرما دے کہ سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت و اختیار میں اور اسی کی مشیت و منظوری کے تابع ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ اسی لیے مومن صادق کا کام اور اس کی شان یہ ہے کہ اس کا بھروسہ و اعتماد اللہ وحدہ لاشریک ہی پر رہے۔ پس نہ تو وہ کبھی اپنے اسباب و وسائل پر بھروسہ کرے خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور نہ ہی کبھی دشمن کے اسباب و وسائل سے ڈرے اور خوفزدہ ہو خواہ وہ کیسے اور کتنے ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ دار و مدار اسباب و وسائل پر نہیں بلکہ اسباب و وسائل کے خالق و مالک کی نصرت و امداد پر ہے۔ اس لیے مومن صادق کی توجہ ہمیشہ اس بات پر مرکوز رہے کہ میں اللہ والا بن جاؤں تاکہ اس کی نصرت و امداد سے مشرف ہو سکوں۔ اس کے بعد مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔ بہر کیف اس ارشاد سے اس حقیقت کو واضح فرما دیا گیا کہ سارے کاموں اور جملہ معاملات کا سر رشتہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت و اختیار میں ہے۔ کم دکھانا اور زیادہ دکھانا، جتانا اور ہرانا، بڑھانا یا گھٹانا وغیرہ وغیرہ۔ سو جو بھی کچھ ہوتا ہے وہ اسی وحدہ لاشریک کی طرف سے ہوتا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے اور اپنی ذمہ داری صحیح طرح سے

نبھائے۔ اس کے بعد سب کچھ اسی قادر مطلق پر چھوڑ دے اور اس غلط فہمی میں کبھی بھی مبتلا نہ ہو کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر کچھ بنا یا بگاڑ سکتا ہے اللہ تعالیٰ فکر و نظر اور عمل و کردار کے ہر زیغ و ضلال اور انحراف سے ہمیشہ محفوظ اور اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔ (تفسیر گلدستہ)

اَللّٰھُمَّ خُذْنَا بِنَوَاصِیْنَا اِلٰی مَا فِیْہِ حُبُّكَ وَرِضَاكَ بِکُلِّ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ وَفِیْ کُلِّ مَوْطِنٍ مِّنَ الْمَوَاطِنِ فِی الْحَیَاۃِ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

آیت مبارکہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ﴿45﴾

لغۃ القرآن: یٰۤاَیُّهَا : اے] [الَّذِیْنَ : وہ لوگو جو] [اٰمَنُوْۤا : سب ایمان لائے ہو] [اِذَا : جب] [لَقِیْتُمْ : تم ٹکراؤ] [فِئَةً : گروہ] [فَاثْبُتُوْا : تو تم سب ثابت قدم رہو] [وَ : اور] [اذْكُرُوا : تم سب ذکر کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [ثِیْرًا : کثرت سے] [لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : تاکہ تم سب فلاح پا جاؤ] [

ترجمہ: اے ایمان والو ! جب (دشمن کی) کسی فوج سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ

تشریح:

{ اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا : جب کسی فوج سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔} اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کو بیان فرمایا جو اس نے جنگ بدر میں اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے صحابہ کرام (رض) کو عطا فرمائی تھیں اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کے دو آداب تعلیم فرمائے ہیں۔

پہلا ادب

جنگ میں ثابت قدم رہنا۔ ابتداءً مسلمانوں کو جنگ یا کسی بھی آزمائش کی تمنا نہیں کرنی چاہیے لیکن جب ان پر جنگ مُسلَّط ہو جائے تو اب ان پر لازم ہے کہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور بزدلی نہ دکھائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم دشمنوں سے مقابلے کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو اور جب دشمنوں سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کو یاد کرو۔ اور جنگ میں ثابت قدم رہنے کی فضیلت کے بارے میں حضرت ابو ایوب انصاری (رض) سے روایت ہے کہ رسول

اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے دشمن کے مقابلے میں صبر کیا یہاں تک کہ وہ شہید کر دیا گیا یا اس نے دشمنوں کو قتل کر دیا تو وہ فتنہ قبر میں مبتلا نہ ہوگا۔

دوسرا ادب

لڑائی کے دوران کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ دورانِ جنگ دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور زبان پہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کا ذکر ہونا چاہیے۔ حضرت ابو مجلز (رض) فرماتے ہیں "جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دشمن سے مقابلہ کرتے تو یوں دعا مانگتے "اے اللہ! تو میری طاقت اور مددگار ہے، میں تیری مدد سے پھرتا ہوں اور تیری مدد سے حملہ کرتا اور تیری مدد سے قتال کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو انتہائی شدید حالت میں بھی ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں یہ تنبیہ ہے کہ ہر حال میں انسان کا دل اور اس کی زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔ اگر ایک شخص مغرب سے مشرق تک اپنے اموال کی سخاوت کرے اور دوسرا شخص مشرق سے مغرب تک تلوار سے جہاد کرتا جائے تب بھی اللہ عَزَّوَجَلَّ کا ذکر کرنے والے کا درجہ اور اجر ان سے زیادہ ہوگا۔

یاد رہے کہ دوران جنگ زیادہ تر ذکر زبان سے ہوگا کہ دل عام طور پر سامنے والے سے مقابلے میں مشغول ہوتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

مجاہدین کے لیے جنگی ہدایات:

غزوۂ بدر کے احوال بتاتے ہوئے درمیان میں تا قیامت آنے والے مجاہدین اسلام سے کہا جا رہا ہے کہ جب بھی وہ اسلام دشمن لشکر کے سامنے آئیں تو ثابت قدم ہو کر لڑیں اور اللہ کا ذکر کریں اسی طرح کامیابی مل سکتی ہے۔

اسی لیے میدان جنگ سے فرار ان سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جنہیں موبقات (تباہ کن) کہا گیا ہے۔ (بخاری کتاب الوصایا باب 32)

کیونکہ اسلامی لشکر کا میدان جنگ سے بھاگنا پوری ملت اسلامیہ کشتی حیات کو ڈبو دیتا ہے۔ پھر بچوں اور عورتوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگ جاتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دشمن سے ملنے کی دعا نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگو اور اگر دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو صبر سے کام لو (ڈٹ جاؤ) اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔" (بخاری کتاب الجہاد باب 22)

جنگ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کامیابی دلاتا ہے نہ کہ عورتوں کے گانے

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ قابل غور ارشاد ہے۔ آج ہمارے بعض فوجی مورچوں میں ذکر الٰہی کی بجائے ڈھول سپاہی بن کر عورتوں کے گانے سنتے اور سر دھنتے ہیں۔ مگر کامیابی گانوں میں نہیں اللہ کے ذکر میں ہے کیونکہ ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے اور سینے قوت ایمان سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

پچھلی آیات میں مجاہدین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور خصوصی انعامات کا تذکرہ تھا اب نصرت الٰہی حاصل کرنے کا نسخہ اور قانون اور طریق کار کی تعلیم ہو رہی ہے کہ دشمن کی کثرت قوت سے مت گھبراو تمہارا مددگار سب سے بڑا ہے ظاہر اور باطن اس کی اطاعت اور ذکر جاری رکھو اسی میں تمہاری سربلندی کا راز مضمر ہے اور یہی تمہارے لئے نسخہ اکسیر ہے۔

سبحان اللہ ! مسلمانوں نے اپنی قلّت کے باوجود بے سروسامانی کے ہوتے ہوئے ٹڈی دل کی طرح عظیم فوجیوں کے ساتھ اسی اکسیری نسخہ پر عمل کرتے ہوئے مقابلہ کیا۔ تو تاریخ عالم گواہ ہے کہ انہوں نے کفر و باطل کو وہ شکست دی جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ امیر المومنین فاروق اعظم (رض) کی چھتیس ہزار فوج نے میدان یرموک میں رومیوں کی نو لاکھ ساٹھ ہزار فوج کو شکست فاش دی جس سے پورے کفر کے ایوانوں میں صف ماتم بچھ گئی اسی طرح دوسرے محاذوں پر بھی ایسا ہی ہوا

اکسیری نسخہ کے اجزاء کا بیان

ان آیات میں کامیابی و فلاح کے جن قیمتی اجزا کا ذکر ہے وہ آٹھ ہیں۔ مثلاً :

1۔ قتال کے وقت ثابت قدم باحوصلہ رہنا۔

2۔ کثرت کے ساتھ زبانی و قلبی ذکر جاری رکھنا۔

3۔ اللہ تعالیٰ شانہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اپنے امیر کی اطاعت و مکمل فرمانبرداری کرنا۔

4۔ آپس میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنا اور اختلاف ہو جانے سے پرہیز کرنا۔

5۔ صبر و استقامت اختیار کرنا۔

6۔ عجز و انکساری اخلاص کے ساتھ لڑنا۔

7۔ کبر و غرور سے پرہیز کرنا۔

8۔ ریاکاری نام و نمود سے بچنا وغیرہ۔

ان آٹھوں چیزوں کی مختصر نشاندہی اور مطلب یہ ہے :

اول۔ الثبات

یعنی ثابت قدم رہنا اور جم کر لڑنا اس میں اثبات قدم اور اثبات قلب دونوں داخل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط ثابت نہ ہو اس کے قدم اور اعضاء مضبوط نہیں رہ سکتے انسانی بدن کے تمام اعمال اور ارادے قلب کے تابع ہیں دراصل میدان جنگ کا اصلی ہتھیار قلب ہے باقی ہر چیز اس کے تابع ہیں۔

دوسرے ذکر اللہ

وہ بھی کثرت کے ساتھ ہو یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پورے قرآن کریم میں ذکر اللہ کے علاوہ کسی عبادت کو کثرت سے کرنے کا حکم نہیں مثلاً یہ کہیں نہیں کہ "صلوۃ کثیر زکوۃ کثیر صوماً کثیرا حج کثیرا "اس کا سبب یہ ہے کہ ذکر اللہ ایک ایسی آسان عبادت ہے کہ اس میں نہ کوئی بڑا وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت موزون استقبال قبلہ جلوس نہ خاص وضع قطع نہ مخصوص عمل نقابت لفظ نہ لباس وغیرہ۔ علامہ جزری نے حصن حصین میں تشریح کی ہے کہ زبانی ذکر قلبی ذکر عملی ذکر جیسے نماز صدقہ یا کوئی بھی نیک عمل سب ذکر اللہ میں شمار ہیں یعنی مومن کا ہر عمل ذکر اللہ کا حصہ اور جزء ہے تعلیم تعلم نیک ارادہ کے ساتھ کھانا پینا اور نیک ارادہ کے ساتھ سونا سب ذکر میں شمار ہیں یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ مردہ اور غافل دلوں کے لئے بمنزلہ حیات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس پر توکل واعتماد وہ بجلی کی عظیم طاقت ہے جو ایک ضعیف مسلمان کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے پر آمادہ اور برانگیختہ کردیتی ہے اور کیسی ہی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس پر اعتماد سب کو ہوا میں اڑادیتی ہے اور انسان کے قلب و قدم اور اس کے اعضاء کو مضبوط اور مستحکم رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ذاکرین کا صبر اور شکر دوسرے لوگوں کی بنسبت مثالی ہوتے ہیں اور ان کی محبت خدا کے قلوب میں جاگزین ہوتی ہے جیسے کہ بخاری کی حدیث میں ہے۔

تیسرا عمل

وہ ہے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت نیز امیر لشکر کی فرمانبرداری یہ اطاعت تمام دنیوی واخروی کامیابی وکامرانی کا سرچشمہ اور بنیاد ہے غزوہ احد میں معمولی سی نافرمانی نے جنگ کا نقشہ تبدیل کیا اور بہتر کے قریب جلیل القدر صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا جس کی تفصیل گذر چکی سورۃ آل عمران میں۔

چوتھا عمل

سرمایہ آپس میں منازعات اور جھگڑا نہ کرو کیونکہ یہ چیز بہت نقصان دہ اور ضرررساں ہے جس سے تمہارا رعب اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا تمہارے اندر بجلی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی دشمن تمہارے اختلاف سے فائدہ اٹھائے گا تمہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رہے گا وغیرہ۔

ہمارے زمانے میں چالباز مکار یورپ نے اسی قانون پر عمل کیا سادہ لوح اور نفس پرست اور دنیا پرست لالچی مسلمانوں کے ذریعہ ان کی صفوں میں انتشار پھیلایا اور انہیں غیر ضروری مسائل اور اختلافات میں الجھا کر دست و گریبان کر دیا اور ان میں بجلی پیدا کر کے لڑاؤ اور حکومت کرو کا نعرہ لگایا یہ نادان آپس میں لڑتے رہے اور وہ اپنا کام کرتے رہے پانچ لاکھ انگریز، برصغیر کے تقریبا 40 کروڑ لوگوں پر ڈھائی سو سال تک حکومت کرتے رہے اور انھیں غلام بنائے رکھا۔

پانچواں عمل

صبر کی تلقین ہے جو کہ تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کی کنجی ہے بار باراس کی تاکید ہوتی رہی ہے قرآن کریم کے ایک سو دو مقامات پر اس عظیم عمل کی تاکید ہے سورۃ بقرہ میں اس کی افادیت فوائد درجات و مراتب اور اقسام کا تفصیلی طور پر بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ بہت بڑا انعام ہے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ رہے نوازش اور سعادت کے رب العزت سبحانہ کی معیت صابرین کی پیشانی کا جھومر ہو۔ یہ ساری چیزیں صبر ہی پر موقوف ہیں اگر صبر ہے تو یہ آسان ہے اگر صبر نہ ہو تو کچھ بھی نہیں البتہ صبر کرنا ضرور تلخ اور سخت ہے مگر اسکا پھل بڑا میٹھا ہے اور بنیادی بات بھی یہی ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر سے تعبیر ہے جس کا اجر اور ثواب دوگنا اور بہت بڑا ہے بلکہ آپس کا اتحاد اور موافقت صبر اختیار کرنے سے باقی رہ سکتا ہے جب چند آدمی آپس میں مل کر رہتے ہوں خواہ ایک ہی گھر کے افراد ہوں آپس میں کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی جانب سے قول یا فعل کے اعتبار سے ناگواری پیش آجاتی ہے پس صبر کے ساتھ تمام کدورتیں ختم ہو جاتی ہیں اسی طرح شوہر اور اس کی بیوی میں سے اگر دونوں میں نہ سہی کسی ایک میں صبر کا مادہ اور جذبہ ہو تو کبھی ناراضگی اور ناچاقی نہیں ہو گی کیونکہ اگر ایک طرف سے بے رخی ہوتی ہے تو دوسری طرف سے نہیں ہو گی۔

چھٹا عمل

جو کہ بہت مظہر ترسان ہے وہ کبر و غرور ہے جس کی ضد تواضع اور انکساری ہے جیسے ارشاد ہے "ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا ورئاء الناس "اے اہل ایمان تم تواضع اور انکساری اور اخلاص اور للّٰہیت کا مظاہرہ کرو یہی حضرات انبیاء کرام کے پسندیدہ اعمال اور ان کی سنتوں کے مظاہر ہیں اگر تمہیں قرب الٰہی اور فوز و فلاح دارین حاصل کرنا ہو اور اپنے اعمال کو بنانا ہو تو اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ کبر و غرور اور ریاکاری سے اجتناب کر کے تواضع، عاجزی و انکساری اور اخلاق جیسے کمالات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے غرور کے ساتھ اتراتے ہوئے لوگوں کو اپنی پہلوانی اور قوت دکھاتے ہوئے نکلے۔

علامہ بغوی (رح) معالم التنزیل میں لکھتے ہیں کہ آیت بالا مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ بدر کے لئے روانہ ہوئے تو فخر اور تکبر کے انداز میں چلے ادھر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تواضع اور انکساری کے ساتھ دعا کی اے اللہ تعالیٰ یہ لوگ تکبر اور فخر و گھمنڈ کے ساتھ آئے ہیں آپ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جھٹلاتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو مدد کا وعدہ فرمایا ہے اس کو پورا فرمایئے ابوسفیان تو اپنا قافلہ لے کر بچ نکلا جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے قریش کو رائے دی کہ مسئلہ قافلہ کے تحفظ کا تھا وہ حل ہو گیا اب آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں واپس ہو نا چاہیے اس پر ابو جہل نے کہا اللہ تعالیٰ کی قسم جب تک ہم بدر نہ پہنچ جائیں واپس نہ ہوں گے وہاں تین روز قیام کریں گے اونٹ ذبح کریں گے کھانے کھلائیں گے شراب پلائیں گے گانے والی عورتیں بلائیں گے جو ہمارے پاس ہیں وہ گانے گائیں گی اور پورے عرب میں ہماری شہرت ہو جائے گی پھر وہ ہمیشہ ہم سے ڈرتے رہیں گے بات تو بڑی کہی تھی لیکن قریش کے تکبر و غرور اور فخر کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف روانہ ہوئے عاتکہ کے خواب نے انہیں

مقتل گاہ کو پہنچایا اونٹوں کی جگہ وہ خود بذبح ہوئے گانے والی عورتوں کی بجائے گانے کے نوحے شروع کیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اہل ایمان بندوں کی فرشتوں کے ذریعے وہ محیر العقول مدد فرمائی جس کی نظیر نہ ہوا الحمد للہ۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے کہ ایک شخص سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ مال غنیمت حاصل ہو اور ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اس کی شہرت ہو اور ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اس کی بہادری کا چرچا ہو تو ارشاد فرمائیے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جو شخص اس لئے جنگ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے (متفق علیہ) مطلب یہ ہے کہ حسن نیت اور اخلاص ہر عمل کی قبولیت کے لیے شرط ہے بغیر اخلاص اور صفائی نیت کے کوئی بڑے سے بڑے عمل کا ثواب نہیں ملے گا۔

"ویصدون عن سبیل اللہ۔ واللہ بما یعملون محیط " کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں پہلے فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں اور خود کو مسجد حرام کا متولی سمجھتے ہوئے اور کہتے ہوئے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ شانہ کے گھر سے منع کرتے تھے۔ تفصیل گذر گئی اور اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ہر ہر راہ پر محیط ہے کوئی چیز اس کے علم محیط کے دائرہ سے باہر نہیں۔ (تفسیر منازل العرفان)

بر او علم یک ذرہ پوشیدہ نیست۔

کہ پیدا و پنہان بہ نزدش یکسیت

اس پر علم کا ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

کہ ظاہر و باطن اس کے نزدیک یکساں ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭاِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ 46ۚ

لغۃ القرآن: وَاَطِيْعُوا : اور تم سب اطاعت کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [وَ : اور] [رَسُوْلَهٗ : اسکے رسول سے] [وَلَا : اور نہ] [تَنَازَعُوْا : تم سب آپس میں جھگڑو] [فَتَفْشَلُوْا : ورنہ تم سب کم ہمت ہوجاؤ گے] [وَتَذْهَبَ : اور جاتی رہے گی] [رِيْحُكُمْ : تمہاری ہوا] [وَاصْبِرُوْا : اور تم سب صبر کرو] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [مَعَ : ساتھ] [الصّٰبِرِيْنَ : صبر کرنے والوں کے] [

ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ (متفرق اور کمزور ہو کر) بزدل ہو جاؤ گے اور (دشمنوں کے سامنے) تمہاری ہوا (یعنی قوت) اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

تشریح:

قرآن حکیم تو واضح طور پر ارشاد فرما رہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا رعب دشمن کے دل پر چھایا رہے، تمہاری ہوا بندھی رہے، اور تمہارے اتحاد واتفاق کی بنیاد متزلزل نہ ہو تو اطاعت رسول کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ یہی ایک سپر ہے جس پر تم اہواء واغراض کے تیروں کو سہار سکتے ہو۔ اور ہمارے عصر حاضر کے ماہرین قرآن ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ انتشار وافتراق کی یہ وبا جو اسلامی کیمپ میں قیامت ڈھا رہی ہے یہ سنت رسول سے سرتابی کا نتیجہ نہیں جس میں عملی طور پر امت کا اکثر حصہ مبتلا ہے بلکہ اتباع سنت کی شامت ہے۔ اب خدا کے یہ سادہ دل بندے کیا کریں۔ قرآن کی صاف اور کھلی ہوئی بات مانیں یا معارف قرآنی کے ان شارحین کی نکتہ آفرینیوں کو تسلیم کریں؟

اس آیت میں جو ارشادات فرمائے گئے ہیں ان پر کاربند ہونا آسان کام نہیں۔ قدم قدم پر شیطان نے جال بچھا رکھے ہیں۔ صبر کے بغیر اس پر خار وادی کو طے کرنا ناممکن ہے اس لیے صبر واستقامت کی تلقین کی جا رہی ہے۔ آخر میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت فقط انہی کے شامل حال ہوتی ہے جو مشکلات اور مصائب کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کر رہے ہوتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت میں مسلمانوں کو اپنی قوت وکثرت پر ناز، کسی بھی قسم کی بڑائی اور گھمنڈ سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ جہاد ایک عبادت ہے، اور عبادت میں ریا اور دکھلاوا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، اس سے عبادت برباد ہو جاتی ہے، اور اس میں کفار قریش کی طرف بھی اشارہ ہے، جن کا لشکر مکہ سے اسی انداز سے نکلا تھا اور سارے راستے وہ اسی قسم کی خرافات کا مظاہرہ کرتے رہے تھے، حتیٰ کہ جب انہیں یہ کہا گیا کہ تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے بچ کر مکہ کے راستے چل پڑا ہے، تم لوگ واپس ہو جاؤ تو ابو جہل نے تکبر وغرور کے نشے میں قسم کھا کر کہا کہ ہم بدر پہنچ کر جشن منا کر واپس ہوں گے، بدر میں جو ان کا حشر ہوا، پھر وہ ساری دنیا نے دیکھا۔ (تفسیر فہم القرآن)

رہا اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا حکم تو ان کا مقصد یہ ہے کہ معرکے میں داخل ہوتے ہی انسان سر تسلیم خم کر دے اور وہ دواعی ہی ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان باہم نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ اور حکم یہ ہے ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم "آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی" لوگوں کے درمیان تنازعات صرف اس وقت سر اٹھاتے ہیں جب ان کی قیادت کے مراجع ایک سے زیادہ ہو جائیں اور وہ مختلف جہتوں سے ہدایات لینے والے ہوں یا وہ صرف اپنی خواہشات کے پیروکار ہوں اور ان کے افکار اور تصورات کا ماخذ صرف ان کے سفلی جذبات ہوں۔ اس کے مقابلے میں جب لوگ صرف اللہ اور رسول اللہ کے مطیع فرمان ہوں تو نزاع کی پہلی بڑی وجہ سرے سے ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ لوگوں کا نقطہ نظر مختلف ہے کیونکہ نزاع صرف اختلاف نقطہ نظر ہی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مبدا ہوائے نفس ہوتی ہے۔ ہوائے نفس کی وجہ سے ہر نقطہ نظر رکھنے والا شخص اپنے موقف پر اصرار شروع کر دیتا ہے۔ اگرچہ اسے نظر آ جائے کہ سچائی دوسری جانب ہے۔ اب ترازو کے ایک پلڑے میں ایک شخص کی ذات ہوتی ہے اور دوسرے پلڑے میں سچائی ہوتی ہے۔ اور ابتداء کے طور پر لوگ اپنی ذات کو سچائی پر ترجیح دے دیتے ہیں لہٰذا یہاں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ لوگ جنگ کے وقت اللہ اور رسول کی اطاعت کریں۔ یہ امر ڈسپلن کا تقاضا ہے اور معرکوں میں ڈسپلن اولین فیکٹر ہوتا ہے۔ یعنی اعلیٰ کمان کی اطاعت اور پھر اس امیر کی اطاعت جو اس اعلیٰ کمان کو چلاتا ہے۔ اسلام میں جو اطاعت ہوتی ہے وہ دلی اطاعت ہوتی ہے اور عام دنیاوی افواج کی

طرح کی اطاعت نہیں ہوتی، کیونکہ عام افواج کی معرکہ آرائی اللہ کے لیے نہیں ہوتی۔ اور نہ ان کے افراد کے درمیان للہ فی اللہ اخوت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی افواج کے ڈسپلن اور سیکولر افواج کے ڈسپلن کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

رہا صبر تو وہ معرکہ آرائی خصوصا اسلام کے لیے جنگ کرنے والوں کی اہم صفت ہوتی ہے۔ چاہے یہ معرکہ انسانی نفسیات کے اندر حق و باطل کے درمیان ہو یا قتال کے میدانمیں ہو۔ واصبر وان اللہ مع الصابرین صبر سے کام لینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

یاد رہے

ا۔ اللہ اور اس کے رسول کا حکم اصل میں ایک ہے۔ دین و دنیا کے معاملات اور میدان جنگ، ہر جگہ اطاعت رسول ہی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

۲۔ اللہ ورسول کا حکم مانیں تو آپس میں جھگڑے نہ ہوں گے۔ اختلافات کم ہوں گے اور اتفاق کی برکت سے کامیابی ہوگی ورنہ تمہاری عزت وہیبت ختم ہوگی۔

۳۔ صبر واستقامت سے اللہ کی مدد اور فتح نصیب ہوگی۔ (تفسیر کنزالعرفان)

جنگ میں اطاعت خدا اور رسول

قول باری ہے (**واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم** اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور آپس کے جھگڑوں اور اختلافات سے منع فرمادیا ہے اور یہ بتادیا ہے کہ آپس کے جھگڑے اور اختلاف کا نتیجہ فشل یعنی دل کے اندر کمزوری پیدا ہونے کی صورت میں نکلے گا۔ فشل کسی نادیدہ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے دل میں کمزوری پیدا ہو جانے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت میں حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے تاکہ آپس کے جھگڑوں اور اختلافات کا خاتمہ ہو جائے جن کے نتیجے میں دلوں کے اندر کمزوری پیدا ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے (**اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول**۔ اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو) ایک اور آیت میں فرمایا (ولو اراکھم کثیرا لفشلتم ولتنازعتم فی الامر۔ اگر کہیں وہ انھیں زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کردیتے) اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ اس نے ان مشرکین کو تمہارے نیند کے اندر تھوڑا کر کے دکھایا تاکہ تم انھیں زیادہ دیکھ کر لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا نہ شروع کردو اور پھر تمہارے دلوں میں کمزوری نہ پیدا ہو جائے۔

بارہ ہزار کا لشکر اسلام شکست نہیں کھاتا

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مروی ہے کہ (**ولن یغلب اثنی عشر الفا من قلۃ اذا اجتمعت کلمتھم**۔ بارہ ہزار کی نفری قلّت تعداد کی بناپر مغلوب نہیں ہوسکتی بشرطیکہ ان میں اتفاق واتحاد موجود ہو) یہ سب آیتیں اختلاف و تنازعہ کی نہی پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ

نے ان آیات میں خبردار کر دیا ہے کہ آپس کے جھگڑے اور تنازعات ہمت ہار جانے اور غلب ختم ہو جانے کا سبب ہیں۔ چنانچہ فرمایا (**وتذھب ریحکم** اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی) ایک قول ہے کہ اس سے مراد فتح و نصرت کی ہوائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ چلاتا ہے جن کی وہ مدد کرتا ہے اور ان لوگوں کے خلاف چلاتا ہے جو اس کی مدد سے محروم رہتے ہیں۔ قتادہ سے یہ تفسیر مروی ہے ابو عبیدہ کا قول ہے کہ "تمہارا غلبہ ختم ہو جائے گا" یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہے۔ ذہبت ریحہ یعنی اس کا غلبہ ختم ہو گیا۔ (تفسیر احکام القرآن للجصاص)

عقیدۂ ختم نبوت کی کھلی دلیل

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ سے عقیدہ ختم نبوت بھی واضح ہوتا ہے کیونکہ وَرَسُوْلَهٗ سے معلوم ہوا کہ قرآن جن لوگوں سے مخاطب ہے ان کا ایک ہی رسول ہے اور یہ آیت بتا رہی ہے کہ قیامت تک جب بھی مجاہدین اسلام راہ حق میں جہاد کے لیے نکلیں گے وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہی اطاعت میں نکلیں گے، کسی اور رسول کی اطاعت میں ہرگز نہیں۔

اسی لئے حضرت عبداللہ بن ثابت (رض) سے مروی ہے کہ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔ **انا حظکم من الانبیاء وانکم حظی من الامم**۔ "انبیاء میں سے تمہارے حصہ کا نبی صرف میں ہوں اور امتوں میں سے میرے حصہ کی امت تم ہو۔" (مسند احمد بن حنبل ج 4 ص 266)

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرمایا: **وقل انی انا النذیر المبین**۔ اور آپ فرما دیں کہ میں ہی کھلا ڈرانے والا ہوں۔ (حجر۔ 89) یعنی قرآن کے مخاطبین کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی نذیر ہیں، نذیر کا معنی نبی ہے۔ جیسے فرمایا گیا: **وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر**۔ "ہر امت میں کوئی نبی گزرا ہے۔" (فاطر۔ 24)۔

اور یہ اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: انی انا اللہ۔ انی انا ربک۔ انک انت العزیز الغفار۔ اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بحکم خداوندی فرما رہے ہیں: انی انا النذیر المبین۔ تو جس طرح اللہ کے سوا کوئی رب نہیں، اسی طرح اس امت کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا کوئی نبی نہیں ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ○47

لغۃ القرآن: وَلَا : اور نہ] [تَكُوْنُوْا : تم سب ہوگے] [كَالَّذِيْنَ : ان لوگوں کی طرح جو] [خَرَجُوْا : سب نکلے] [مِّنْ : سے] [دِيَارِهِمْ : اپنے گھروں] [بَطَرًا : اکڑتے ہوئے] [وَّرِئَآءَ : اور دکھلاوا کرتے ہوئے] [النَّاسِ : لوگوں کو] [وَيَصُدُّوْنَ : اور وہ سب روکتے تھے] [عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ سے] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [يَعْمَلُوْنَ : وہ سب کرتے ہیں] [مُحِيْطٌ : احاطہ کیے ہوئے ہے] [

ترجمہ: اور ایسے لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلاتے ہوئے نکلے تھے اور (جو لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے تھے، اور اللہ ان کاموں کو جو وہ کر رہے ہیں (اپنے علم وقدرت کے ساتھ) احاطہ کئے ہوئے ہے

تشریح:

شان نزول

یہ آیت ان کفار قریش کے بارے میں نازل ہوئی جو بدر میں بہت اتراتے اور تکبر کرتے ہوئے آئے تھے۔ جب یہ لوگ آئے تو سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی: یارب! عَزَّوَجَلَّ، یہ قریش آگئے، تکبر وغرور میں سرشار اور جنگ کے لیے تیار ہیں، تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ یارب! عَزَّوَجَلَّ، اب وہ مدد عنایت ہو جس کا تو نے وعدہ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ قافلہ کو کوئی خطرہ نہیں رہا تو انھوں نے قریش کے پاس پیام بھیجا کہ تم قافلہ کی مدد کے لیے آئے تھے، اب اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے لہٰذا واپس چلے جاؤ۔ اس پر ابو جہل نے کہا کہ "خدا کی قسم! ہم واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ ہم بدر میں اتریں، تین دن قیام کریں، اونٹ ذبح کریں، بہت سے کھانے پکائیں، شرابیں پئیں، کنیزوں کا گانا بجانا سنیں، عرب میں ہماری شہرت ہو اور ہماری ہیبت ہمیشہ باقی رہے۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا جب وہ بدر میں پہنچے تو شراب کے جام کی جگہ انھیں ساغر موت پینا پڑا اور کنیزوں کے ساز و نوا کی جگہ رونے والیاں انھیں روئیں اور اونٹوں کے ذبح کی جگہ ان کی گردنیں کٹیں۔

کافروں کی ریاکاری، فخر و غرور اور تکبر کے برے انجام سے مسلمان عبرت حاصل کریں

اللہ تعالیٰ اس آیت میں مومنین کو حکم فرمارہا ہے کہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور سمجھ لیں کہ فخر و ریا اور غرور و تکبر کا انجام انتہائی خراب ہے بندے کو اخلاص اور اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرنی چاہیے۔ (تفسیر صراط الجنان)

جہاد میں ثابت قدم رہنے اور بارگاہ الٰہی میں دامن دعا و دست التجاء پھیلانے کا حکم دینے کے بعد اخلاص نیت کی تعلیم فرماتی جارہی ہے۔ کیونکہ تمام اسلامی اعمال کی روح رواں حسن نیت ہے۔ کفار کا لشکر جب مکہ سے بدر کی طرف روانہ ہوا تو ان کے ہمراہ ایسی دوشیزائیں بھی تھیں جو گانے بجانے اور ناچنے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ ان کے علاوہ شراب ناب کے بھرے ہوئے مٹکے بھی ساتھ تھے۔ جگہ جگہ پر ان کی بزم عیش و طرب منعقد ہوتی جس میں بادہ گلفام کے ساغر گردش میں آتے اور ناچ اور گانا ہوتا۔ ابو جہل کو جنگ کا ارادہ ترک کرنے کے لیے جب کہا گیا تو اس نے جواب دیا واللہ لانرجع عن قتال محمد حتی نرد بدراً فنشرب فیہا الخمور و تعزف علینا القیان۔۔ حتی تسمع العرب بمخرجنا فتھابنا آخر الابد (قرطبیّ) بخدا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے لڑے بغیر ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ یہاں تک کہ ہم میدان بدر میں پہنچیں۔ وہاں شراب کا دور چلے گا۔ رقص و سرور ہوگا۔ سارا عرب سنے گا اور ان کے دلوں پر ہمارا رعب قیامت تک کے لیے جم جائے گا۔ آج بھی کفر کا لشکر جدھر رخ کرتا ہے فسق و فجور کا ایک طوفان بد تمیزی امڈ کر آجاتا ہے جو عصمت و ناموس۔ انسانی شرف، بلند اخلاقی قدروں کو تنکوں کی طرح بہا کرلے جاتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے جاہلیت قدیم و جدید کے مزاج کی یکسانی پر، دو ہزار سال پہلے اس کی جو خصوصیات تھیں، علم و ہنر کی بے انداز ترقی کے باوجود ان میں سر مو فرق نہیں آیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جو امریکی افواج اپنے دوست ملک برطانیہ میں اقامت گزیں رہیں ان کی عیش کوشی کی وجہ سے خود امریکی اخباروں کے اندازہ کے مطابق ستر ہزار حرامی بچے پیدا ہوئے (بحوالہ المصری ۵۴۔ ۳۔ ۲۸) اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ ایسی فوج ظفر موج اپنے قدم جس سرزمین (خصوصاً دشمن ممالک) میں رکھے گی وہاں کیا حشر برپا ہوتا ہوگا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

جنگ کے بارے میں مزید ہدایات

جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کی ہدایات دینے کے بعد شکست سے دوچار کردینے والی مذموم حرکات سے روکا گیا ہے۔

۱۔ غرور، تکبر اور اترانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

۲۔ شہرت، نمائش سے بچ کر اخلاص کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۳۔ بے مقصد جنگ کرنے کے بجائے اللہ کی رضا کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔

مشرکین مکہ بدر کے لیے نکلے تو ان میں اس قدر غرور تھا کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کی حالت یہ تھی کہ جس کسی نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جب تجارتی قافلہ بچ کر مکہ پہنچ چکا ہے اور قافلے کے سردار ابو سفیان کا پیغام آچکا ہے کہ اب لڑنے کی بجائے واپس آجانا چاہیے۔ اس کے بعد آگے بڑھنے کا کیا جواز ہے ؟ اس کا جواب ابو جہل یہی دیتا کہ ہم چاہتے ہیں کہ

مسلمانوں کا صفایا کر دیا جائے۔ اس غرور اور تکبر کے ساتھ وہ آگے بڑھتے رہے اور جہاں پڑاؤ ڈالتے، شراب اور شباب کا دور چلتا۔ مکہ سے نکلتے وقت انھوں نے ناچ گانے اور عیاشی کے لیے کچھ بے حیا عورتوں کو ساتھ لیا ہوا تھا۔ اس گھناؤنے کردار کے ساتھ ان کا جنگ کرنے کا مقصد محض عربوں پر دھاک بٹھانا اور شہرت حاصل کرنا تھا۔ تاکہ لوگ ان کی کامیابی اور قوت و سطوت دیکھ کر اسلام قبول کرنے سے رک جائیں۔ انھیں کیا خبر کہ انسان کی تدبیر اور اس کی کوئی کوشش بھی اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص یا قوم اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھتی ہے تو وہ اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ کفار کا مقصد لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا اور دنیوی رعب اور دبدبہ جمانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے شکست اور ذلت ان کا مقدر ٹھہری۔ مسلمانوں کو ان حرکات سے منع کیا گیا ہے۔

ان کے مقابلے میں صحابہ کرام (رض) کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کو بلند کرنا تھا جس کی وجہ سے وہ تھوڑے اور کمزور ہونے کے باوجود فتح یاب ہوئے۔

(عَنْ أَبِي مُوْسٰی (رض) قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ الرَّجُلُ يُقَاتِلُ حَمِيَّةً وَيُقَاتِلُ شَجَاعَةً وَيُقَاتِلُ رِيَاءً فَأَيُّ ذٰلِكَ فِي سَبِيلِ اللهِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ)

[رواہ البخاری: کتاب التوحید، باب قَوْلِهٖ تَعَالٰی (وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ)]

”حضرت ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا ایک آدمی اس لیے قتال کرتا ہے کہ اسے غیرت مند اور حمیت والا کہا جائے اور وہ بہادری جتلانے کے لیے لڑتا ہے دوسرا آدمی وہ ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے لڑتا ہے۔ ان میں سے کونسا قتال فی سبیل اللہ ہے؟ نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۴۸

لغۃ القرآن: وَ اِذْ : اور جب] [زَيَّنَ : مزین بنادیا] [لَهُمُ : ان سے] [الشَّيْطٰنُ : شیطان نے] [اَعْمَالَهُمْ : ان کے اعمال] [وَ : اور] [قَالَ : فرمایا] [لَا : نہیں] [غَالِبَ : غالب

آسکتا] [لَكُمُ : تمہارے لیے] [الْيَوْمَ : آج] [مِنَ النَّاسِ : لوگوں سے] [وَاِنِّىْ : اور بیشک میں] [جَارٌ : حمایتی ہوں] [لَّكُمْ : تمہارے لیے] [فَلَمَّا : تو جب] [تَرَاۗءَتِ : ایک دوسرے کو دیکھ لیا] [الْفِئَتٰنِ : دونوں جماعتوں نے] [نَكَصَ :" تو " واپس پلٹا " شیطان] [عَلٰي : پر] [عَقِبَيْهِ : اپنی ایڑیوں] [وَ : اور] [قَالَ : فرمایا] [اِنِّىْ : بیشک میں] [بَرِيْۗءٌ : بیزار ہوں] [مِّنْكُمْ : تم میں سے] [اِنِّىْٓ : بیشک میں] [اَرٰي : دیکھ رہا ہوں] [مَا لَا : جو نہیں] [تَرَوْنَ : تم سب دیکھ رہے] [اِنِّىْٓ : بیشک میں] [اَخَافُ : ڈرتا ہوں] [اللّٰهَ : اللہ] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [شَدِيْدُ : سخت] [الْعِقَابِ : عذاب والا ہے] [

ترجمہ: اور جب شیطان نے ان (کافروں) کے لیے ان کے اعمال خوش نما کر دکھائے اور اس نے (ان سے) کہا: آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں (ہو سکتا) اور بیشک میں تمہیں پناہ دینے والا (مددگار) ہوں۔ پھر جب دونوں فوجوں نے ایک دوسرے کو (مقابل) دیکھ لیا تو وہ الٹے پاؤں بھاگ گیا اور کہنے لگا: بیشک میں تم سے بیزار ہوں، یقیناً میں وہ (کچھ) دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، بیشک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے

تشریح:

شیطان بنی کنانہ کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں ان کے پاس آیا

اہل مکہ جب جنگ بدر کے لیے روانہ ہونے لگے تو شیطان بنی کنانہ کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں ان کے پاس آیا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا: تم بڑے نیک اور اچھے کام پر جارہے ہو۔ مسلمانوں کو ختم کرنے کا آج ہی بہترین موقع ہے کیونکہ ابھی ان کی تعداد بہت کم ہے، لہٰذا تم یقیناً غالب رہو گے اور میں بھی تمہاری مدد کے لیے تمہارے ساتھ چلتا ہوں مگر جب میدان بدر میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو شیطان بھاگ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: میں جن فرشتوں کو دیکھ رہا ہوں وہ تمہیں نظر نہیں آتے اور میں ڈرتا ہو کہ تمہارے ساتھ مجھے بھی عذاب میں مبتلا نہ کر دیا جائے، لہٰذا میں تم سے بیزار ہوں اور واپس جارہا ہوں۔ اس پر کفار کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ بھی شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب یہ کفار واپس مکہ پہنچے تو انھوں نے اہل مکہ سے کہا کہ سراقہ بن مالک نے انھیں دھوکا دے کر مروا دیا۔ جب سراقہ کو یہ خبر پہنچی تو وہ قسم اٹھا کر کہنے لگا: نہ میں ان کے ساتھ گیا اور نہ ہی مجھے ان کے جانے کی اطلاع تھی، مجھے تو اب صرف ان کو شکست کی خبر ملی ہے۔ بعد میں جب یہ کفار مسلمان ہوئے تو انھیں پتہ چلا کہ وہ سراقہ نہیں بلکہ شیطان تھا۔ (تفسیر خازن، بیضاوی، روح المعانی وغیرہ)
شیطان ہمیشہ سے لوگوں کو اسی طرح پہلے برائی کی ترغیب دیتا ہے اور جب وہ برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو پھر ان سے بیزاری کا اعلان کر دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو ہمارے عیبوں کی تعریف کرے یا ہم کو گناہوں کی رغبت دے وہ شیطان ہے چاہے انسانی شکل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شیطان کے فریبوں سے محفوظ رکھے۔ آمین !

شیطان صرف جنگ بدر میں شریک ہوا تھا، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی بدر میں فرشتے نازل فرمائے۔ (تفسیر امداد الکرم)

محمد بن اسحاق نے حضرت عروہ بن زبیر (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب قریش نے بدر کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو انھیں بنی بکر سے اپنی دشمنی کا خیال آگیا (کہ کہیں وہ ان کی غیر حاضری میں مکہ پر حملہ نہ کردیں) ممکن تھا کہ وہ ارادہ جنگ ترک کردیتے اتنے میں شیطان لعین سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت میں جو بنی بکر کا سردار تھا نمودار ہوا اور کہنے لگا میں تمہارے ساتھ ہوں میرے ہوتے ہوئے بنی بکر تم پر حملہ نہیں کر سکتے، یہ سن کر قریش بلا خوف وخطر جنگ کے لئے نکل پڑے۔

سراقہ بن مالک بھی ہر منزل پر ان کے ساتھ تھا (مگر وہ حقیقت میں شیطان تھا) جب بدر میں فرشتے اترے تو شیطان انھیں دیکھ کر بھاگ اٹھا حارث بن ہشام کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا جب وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگا تو حارث نے کہا او سراقہ ! کدھر بھاگ رہے ہو ؟ اس نے کہا میں تم سے بیزار ہوں جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اللہ سخت عذاب والا ہے۔ (سیرت ابن ہشام صفحہ 318 مطبوعہ دار ابن حزم بیروت)

یہ بھی مروی ہے کہ قریش نے شکست بدر کے بعد کہا : ہمیں اس سراقہ ابن مالک نے مروایا ہے جب اسے پتہ چلا تو اس نے کہا واللہ مجھے تو کچھ خبر نہیں مجھے تو تمہاری جنگ اور شکست کا اب پتہ چل رہا ہے۔ تب قریش سمجھے کہ وہ شیطان ہوگا۔ اس طرح بھی ان پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صداقت ظاہر کی گئی۔

ایسی ہی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے بھی مروی ہے کہ ابلیس بنی مدلج کی شکل میں ایک جماعت لے کر آیا جن کے پاس ایک جھنڈا تھا شیطان سراقہ بن مالک کی شکل میں تھا اور قریش سے کہہ رہا تھا : لا غالب لکم الیوم من الناس وانی جار لکم۔ یعنی آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارا ساتھی ھوں۔ پھر جب جبرائیل علیہ السلام اترے تو شیطان کا ہاتھ ایک مشرک کے ہاتھ میں تھا وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگا، کہنے لگا جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 78)

تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا : کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان پر خوشنما بنایا اور ان سے کہا کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارا ساتھی ھوں پھر جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو شیطان اٹھا اور کہنے لگا میں تم سے بیزار ہوں جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

گویا کبھی شیطان انسانی شکل میں بھی آکر گمراہ کرتا ہے۔ ہجرت کے موقع پر دار الندوہ میں بھی شیطان شیخ نجدی کی شکل میں آیا تھا۔ معلوم ہوا جب کوئی شخص ہمیں حکم خدا اور رسول کے خلاف اکسائے تو ہمیں فوراً متنبہ ہونا چاہیے کہ کہیں وہ شیطان نہ ہو۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نہ باید داد دست

یہ بھی معلوم ہوا کہ ملائکہ اور شیاطین ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں جیسا کہ بدر میں شیطان ملائکہ کو دیکھ کر ساتھیوں سمیت بھاگ اٹھا۔ (تفسیر برہان القرآن)

ایک اہم حقیقت کا انکشاف

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے واقعات کے تناظر میں ایک ایسی حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے جس کے سمجھ لینے سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور اس حقیقت کی اہمیت کے پیش نظر پروردگار نے قرآن کریم میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے اور آپ کو بھی بعض دفعہ اس صورتحال سے واسطہ پڑا ہوگا کہ آپ اپنے کسی ایسے عزیز کو غلط کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں جو پے درپے غلطیوں کا ارتکاب کررہا ہے۔ لیکن آپ کو اس وقت انتہائی تعجب ہوتا ہے جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی ساری کوششیں اکارت جارہی ہیں۔ وہ شخص یا تو آپ کی بات ہی نہیں سنتا یا سنتا ہے تو آپ کی کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ بالکل سطحی سی باتوں پر اس کا اصرار جاری رہتا ہے۔ آپ اسے جن نقصانات کا حوالہ دے کر روکنا چاہتے ہیں وہ انھیں نقصانات کو فوائد سمجھتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی وجہ سے اس شخص کے دل و دماغ میں اس کے اپنے اعمال بد یا اس کے غلط فیصلے ایک ایسی شکل اختیار کرچکے ہیں جو اس کو اچھی لگنے لگی ہے۔ وہ بری ہونے کے باوجود اسے بری نہیں لگتی بلکہ وہ اسی میں خوش رہتا ہے اور اسی کو اپنی خوشیوں کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ شراب نوشی ہر سمجھ دار آدمی کے نزدیک "ام الخبائث" ہے۔ لیکن شراب نوشوں کو عقلی دلائل یا اخلاقی نصیحتوں سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ کام چوروں کو باور نہیں کرایا جاسکتا کہ تم اپنی زندگی برباد کررہے ہو۔ بدمحنت اور نکمّے لوگوں کو یہ سمجھانا آسان نہیں کہ جو وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے وہ لوٹ کر نہیں آئے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا رویہ ایسا خوشنما محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسے بدلنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم تزئین شیطان کا نام دیتا ہے کہ شیطان نہائیت چابک دستی اور ہوشیاری سے انسانی برائیوں اور کوتاہیوں کو خوشنما شکل میں ارتکاب کرنے والوں کے سامنے رکھتا ہے اور ایسے ایسے سبز باغ ان کو دکھاتا ہے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہوجاتے ہیں کہ جو کچھ ہم کررہے ہیں وہی صحیح ہے۔ ایک سگریٹ پینے والا اپنے ہاتھوں سے اپنی دولت کو آگ لگاتا ہے، شراب پینے والا جانتا ہے کہ میں خود اپنی عقل کا دشمن ہوں۔ باایں ہمہ ! وہ شیطان کے جال سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ پیش نظر آیت کریمہ میں اس حقیقت کے انکشاف کے ساتھ ساتھ قریش مکہ کی صورتحال کی توجیہ پیش کی گئی ہے۔ تیرہ سال تک نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی، حق کا حق ہونا واضح فرمایا اور باطل کا باطل ہونا کھول کر رکھ دیا۔ اپنی صداقت و حقانیت کے عجیب عجیب نشانات دکھائے اپنی استقامت سے اپنا برسرحق ہونا پوری طرح واضح کردیا لیکن قریش کی اکثریت اور بڑے بڑے سردار کسی طرح ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اب وہ حق کی اس آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کی خاطر ایک بڑی قوت لے کر مکہ سے نکل رہے ہیں اور شیطان نے ان کے ایک ایک عمل کو اس طرح ان کے سامنے مزین کیا ہے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہیں کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں اس میں کسی غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مفسرین نے ان کی ایک پریشانی کا بھی ذکر کیا ہے جسے شیطان نے اپنی عیاری سے دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حق کے مقابلے میں ان کی تمام کوششیں شیطان کی اسی فنکاری کا نتیجہ تھیں۔

امام ابن جریر نے حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب قریش مکہ کا لشکر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے مکہ سے نکلا تو ان کے دلوں میں ایک پریشانی تھی کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنو بکر آباد ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کے مقابلہ پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقعہ پا کر اپنا ہاتھ دکھا جائے۔ ابوسفیان کے اطلاع دینے پر قریش گھبرا کر یا طیش میں آکر نکل تو کھڑے ہوئے لیکن یہ خطرہ برابر

ان کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ چنانچہ شیطان نے اس خطرے کے علاج کے لیے سراقہ ابن مالک کی صورت اختیار کی اور اس طرح قریش کے سامنے آیا کہ اس کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور اس کے ساتھ ایک دستہ بہادر فوج کا تھا۔ سراقہ بن مالک اس علاقہ اور قبیلہ کا بڑا سردار تھا۔ وہ آگے بڑھ کر قریش سے ملا اور انھیں یقین دلایا کہ تمہیں کسی طرح کی بھی پریشانی نہیں ہونی چاہیے تم عرب کی سب سے بڑی قوت ہو۔

لَاغَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ (آج لوگوں میں سے تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔)

کیونکہ عرب میں تمہارے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں یہ مٹھی بھر مسلمان تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں یا کوئی اور قبیلہ تمہاری طرف کیسے میلی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے اور دوسری یہ بات اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ (میں تمہارا حمائتی ہوں) اگر کوئی ایسا خطرہ وہوا بھی تو میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا۔

شیطان کی خاص عادت

ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ شیطان کی یہ ہمیشہ سے عادت ہے کہ جب تک انسان برائی میں مبتلا نہیں ہو جاتا وہ برابر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے اور برائی کو خوشنما بنا کر اس کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب وہ شخص برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اسے چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ شیطان کے پیش نظر کسی انسان کا ہمیشہ ساتھ دینا نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد گمراہ کرنا ہے جب مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ الگ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ج فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔

شیطان کی عادت یہ ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کرو یعنی اسے ترغیب دیتا رہتا ہے اور جب انسان کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ میں تو تجھ سے بری ہوں کیونکہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ (الحشر: ۱۶)

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو عقل و خرد اور قوت تمیز دے کر خیر و شر کی پہچان عطا فرمائی ہے اور مزید کرم یہ فرمایا کہ اپنے رسول اور کتابیں بھیج کر حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح واضح فرمادیا۔ اسی طرح انسان کے امتحان کے لیے اللہ نے شیطان کو دجل و تلبیس کی مختلف صلاحیتوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ وہ کبھی دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور کبھی سامنے آکر انسانی شکل میں بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا خاص ہنر یہ ہے کہ انسان جس برائی کی طرف میلان اختیار کرتا ہے اس کو وہ زیادہ سے زیادہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ لیکن اس کی انسان دشمنی کا عالم یہ ہے کہ جب انسان گمراہی میں ڈوب جاتا ہے اور حق کے راستوں سے پوری طرح منہ موڑ لیتا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اللہ کا مزید احسان یہ ہے کہ اس نے شیطانی طریق واردات کو کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ انسان اگر اس سے بچنا چاہے تو بچ سکے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیطانی تلبیسات سے بچنے کے لیے اللہ کے دین و شریعت کا علم بہت ضروری ہے کیونکہ شیطان بعض دفعہ نیکی کی صورت میں برائی دلوں میں اتار دیتا ہے۔ دین کا نام دے کر بے دینی کا بیج بو دیتا ہے۔ جو شخص شرعی احکام سے واقف نہیں ہے وہ بعض دفعہ نیکی کی محبت سے بدعات و خرافات کو نیکی سمجھنے لگتا ہے اور اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص اللہ کی شریعت سے واقف ہے اسے اس طرح فریب دینا شیطان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

مزید یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شیطان چونکہ وسوسہ اندازی میں بہت مہارت رکھتا ہے اس لیے اس کی تلبیس سے بچنے کے لیے جہاں علم واحساس کی ضرورت ہے وہیں اللہ کی توفیق کی اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اللہ سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق مانگتا رہے اور شیطانی تلبیسات سے محفوظ رہنے کے لیے ان تمام اعمال کو بروئے کار لائے جس کا ذکر حدیث وسنت میں موجود ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○49

لغۃ القرآن: اِذْ : جب] [یَقُوْلُ : وہ کہے گا] [الْمُنٰفِقُوْنَ : سب منافق] [وَالَّذِیْنَ : اور وہ لوگ جو] [فِیْ قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں میں] [مَّرَضٌ : بیماری ہے] [غَرَّ : دھوکہ دیا ہے] [هٰٓؤُلَآءِ : وہی لوگ ہو] [دِیْنُهُمْ : ان کے دین نے] [وَمَنْ : اور جو] [یَّتَوَكَّلْ : بھروسا کرے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [فَاِنَّ : تو بیشک] [اللّٰهَ : اللہ تعالیٰ] [عَزِیْزٌ : غالب] [حَكِیْمٌ : حکمت والا ہے] [

ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں (کفر کی) بیماری ہے کہہ رہے تھے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے دین نے بڑا مغرور کر رکھا ہے، (جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ) جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو (اللہ اس کے جملہ امور کا کفیل ہو جاتا ہے)، بیشک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے

تشریح:

وہ لوگ جن کے دلوں میں یقین کا نور نہیں تھا۔ جو زندگی اور موت، فتح وشکست، عزت وذلت کے اسلامی معیار سے ابھی واقف نہ تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ ۳۱۳ نہتے سپاہی اتنی بڑی فوج سے ٹکر لینے جارہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ان کو توان کے دین نے پاگل بنادیا ہے۔ اپنے نفع ونقصان کی بھی تمیز نہیں رہی۔ موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جارہے ہیں اور کس خوشی سے اور کس شوق سے۔ اہل محبت کو ایسے دانا ناصحین سے ہمیشہ واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

یالائمی کف الملام عن الذی اضناہ طول سقامه وشقاۂ

یعنی اے مجھے ملامت کرنے والے! مجھ پر طعن وملامت کے تیز نہ برسا مجھے تو درد محبت اور دیرینہ علالت نے پہلے ہی نحیف ونزار کر دیا ہے۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ ان کی خود فراموشی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس قادر و توانا ذات پر تکیہ کر لیا ہے کہ جس پر جس نے تکیہ کیا وہ کامیاب و کامران ہو گیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)
منافقین سے مراد اوس اور خزرج قبیلے کے چند افراد ہیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے سے مراد مکہ مکرمہ کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کلمہ اسلام تو پڑھ لیا تھا مگر ابھی تک ان کے دلوں میں شک وتَرَدُّد باقی تھا۔ جب کفار قریش سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کے لیے نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ بدر میں پہنچے۔ بدر میں جب انھوں نے مسلمانوں کی تعداد تھوڑی دیکھی تو ان کا شک مزید بڑھا اور وہ مرتد ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ مسلمان اتنی کم تعداد کے باوجود اپنے سے تین گنا بڑے لشکر سے جنگ کرنے لگے ہیں، انھیں ان کے دین اسلام نے دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور آخرت میں ثواب کی امید انھیں اپنی جانیں قربان کرنے پر ابھار رہی ہے۔ یہ تمام لوگ بدر میں مارے گئے تھے۔
{ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ : اور جو اللہ پر توکل کرے۔ } ارشاد فرمایا کہ جو اللہ عَزَّوَجَلَّ پر توکل کرے اور اپنا کام اس کے سپرد کر دے اور اس کے فضل و احسان پر مطمئن ہو تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کا حافظ و ناصر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اللہ عَزَّوَجَلَّ حکمت والا ہے، وہ اپنے دشمنوں کو عذاب میں مبتلا کرتا اور اپنے اولیاء کو رحمت و ثواب عطا فرماتا ہے۔

صحابہ کرام (رض) کے توکل کی تعریف

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام (رض) کی تعریف فرمائی ہے کہ انھوں نے اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے اور اس کی قضا پر راضی ہو گئے تاکہ دشمنوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ ان کی حمایت فرمائے اور اس میں دیگر مسلمانوں کے لیے بھی یہ تعلیم ہے کہ وہ بھی اپنے سب معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور اس کی قضا و تقدیر پر ہر دم راضی رہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

منافقین کا تبصرہ

منافق کا لفظ "نفق " سے نکلا ہے جس کا معنی ہے کہ چوہے کی ایسی بل جس کے دو منہ ہوں۔ اگر ایک منہ بند کر دیا جائے تو چوہا دوسری طرف سے نکل جائے جب تک بل کے دونوں منہ بند نہ کیے جائیں چوہا قابو نہیں آسکتا۔ منافق کو اس لیے منافق کہتے ہیں کہ اگر اسے مسلمانوں کی طرف سے فائدہ ہو تو وہ اسلام اسلام پکارتا ہے اگر دین کے حوالے سے کسی آزمائش سے واسطہ پڑے تو وہ کافروں کا ہمدرد بن کر ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔
انسانی جسم دو چیزوں سے مکمل ہوا ہے روح اور جسم، روح آفاقی ہے اور جسم زمین سے بنا ہے۔ جسم کی خوراک کا تعلق زمین سے ہے، روح کا تعلق اخلاقیات اور ایمانیات سے ہے۔ جس طرح جسم کو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ اسی طرح روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں۔ روح کی بیماریوں میں نفاق ایک بدترین بیماری ہے۔ جو روحانی اور اخلاقی مرض ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کا کردار دوغلا ہو جاتا ہے اور وہ مفاد کا بندہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور دھڑے کا ساتھ دیتا ہے۔ یہی کردار بدر کے موقع پر منافقوں کا تھا۔ جب انھوں نے مسلمانوں کو بدر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مدد ہمارے شامل حال

ہو گی۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کے ساتھ منافق سمجھتے تھے کہ مسلمان جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور ان کا واپس آنا مشکل ہے لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مشکلات میں سرخرو فرماتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والا ہے۔ یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ ہر آیت کے اختتامی الفاظ اس کے مفہوم کا خلاصہ ہوتے ہیں۔ اس معرکہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ حق و باطل میں امتیاز ہو جائے۔ اس لیے بدر کا معرکہ ناگزیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں "العزیز" صفت اس لیے لائی ہے تاکہ منافقوں کو معلوم ہو جائے کہ غلبہ اور کامیابی حربی طاقت اور افرادی قوت پر منحصر نہیں مدد تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا کرتی ہے۔

(قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ (رض) إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) كَانَ يَدْعُو يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوءِ الأَخْلاَقِ) [رواہ ابوداؤد : بَابٌ فِي الِاسْتِعَاذَةِ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا فرمایا کرتے تھے۔ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں بدبختی، نفاق اور برے اخلاق سے۔" (تفسیر فہم القرآن)

مسلمان جب قریش کے مقابلے میں میدان بدر کی طرف نکلے تو جو لوگ صرف سر کی آنکھوں سے دیکھتے اور دماغ سے سوچتے تھے ان کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ یہ مٹھی بھر لوگ قریش کے عظیم لشکر کا مقابلہ کیسے کر پائیں گے۔ افرادی قوت تو جیسی کچھ ہے وہ سامنے ہے، وسائل جنگ کا نام نہیں، نہ جانے کس برتے پر اتنا بڑا اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ابھی تک نفاق کے مریض تھے۔ ایک منافق کے لیے یقینا دل سے سوچنا اور ایمان کے نور سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی یہی بات کہہ رہے تھے جن کے دلوں میں بیماری تھی۔ دلوں کی بیماری کو نفاق بھی کہتے ہیں اور حسد بھی۔ یہاں یقینا نفاق تو مراد نہیں کیونکہ اس کا ذکر "منافقون" کے لفظ میں آ گیا، البتہ ! اس سے مراد حسد ہو سکتا ہے اور حسد کرنے والے یوں تو بہت سے ہوں گے لیکن ان میں نمایاں گروہ یہود کا تھا معلوم ہوتا ہے یہاں وہی لوگ مراد ہیں۔ وہ حسد کے مارے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ایسی باتیں کرتے تھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ طالوت اور جالوت کی جنگ میں منظر نامہ اس سے مختلف نہیں تھا۔ طالوت کا لشکر اتنا ہی تھا جتنا مسلمانوں کا اور جالوت کے ساتھ ایک جمِ غفیر تھا۔ لیکن نتیجہ کیا رہا؟ اہل تورات خوب جانتے تھے۔ لیکن حسد کے مارے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ جس حق کو لے کر حضرت طالوت قلّت تعداد کے باوجود نکلے تھے آج اسی حق کو لے کر مسلمان نکلے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے یہ کہہ رہے تھے کہ درحقیقت مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے ان کے پیغمبر کی شخصیت اور دعوت نے ایک ایسا افسوں پھونکا ہے کہ نفع وضرر کے پیمانے انھوں نے توڑ ڈالے ہیں۔ جنت کی خواہش نے زندگی کی خواہش کو شکست دے دی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھیں موت کی طرف نکلتے ہوئے خوف نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان مادہ پرست لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے ؟ کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کر لیتا ہے اور پھر اسی کے دین کی سربلندی کے لیے سب کچھ اس کی رضا کی خاطر جھونک دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وہ ہمیشہ ان کی مدد فرماتا ہے، وہ چونکہ عزیز ہے اس لیے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جس کی وہ مدد کر رہا ہے اس کے مقابلے میں کتنی بڑی طاقت ہے اور وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اس کا ہر فیصلہ حکمت کی تصویر ہوتا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

مسلمانوں کا بھروسہ اور اعتماد مسبّب الاسباب حق تعالیٰ شانہ پر ہمیشہ ہمیشہ مرکوز ہوتا ہے وہ اگر چاہے تو فیل مست وطاقتور ہاتھی کو ایک کمزور چیونٹی سے مار بھگا یا اور تباہ کرے تو بیشک وہ ہر چیز پر بلا شبہ قادر اور توانا ہے وہ غلبہ والا حکمت والا ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)

بہ حکمش دو نیم ست و دریائے نیل
بمر غان کشد فیل و اصحاب فیل

آیت مبارکہ:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○50

لغۃ القرآن: وَلَوْ : اور اگر] [تَرٰٓي : آپ دیکھتے ہیں] [اِذْ : جب] [يَتَوَفَّى : جان قبض کرتے ہیں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [كَفَرُوا : سب نے کفر کیا] [الْمَلٰٓئِكَةُ : فرشتے] [يَضْرِبُوْنَ : وہ سب مارتے ہیں] [وُجُوْهَهُمْ : ان کے چہروں پر] [وَاَدْبَارَهُمْ : اور ان کی پیٹھوں پر] [وَذُوْقُوْا : اور سب چکھو] [عَذَابَ : عذاب] [الْحَرِيْقِ : دہکتی آگ کا] [ ]

ترجمہ: اور اگر آپ (وہ منظر) دیکھیں (تو بڑا تعجب کریں) جب فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں وہ ان کے چہروں اور ان کی پشتوں پر (ہتھوڑے) مارتے جاتے ہیں اور (کہتے ہیں کہ دوزخ کی) آگ کا عذاب چکھ لو

تشریح:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جزاوسزا کا کچھ سلسلہ اس دنیاوی زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق فرشتوں اور عالم برزخ سے ہے جو ہمارے ادراک اور مشاہدہ سے بالاتر ہیں اس لیے ہم اس دنیا میں اس کا ادراک نہیں کر سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں انھیں مردہ نہ کہا کرو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے"۔ (قرآن : ۲ : ۱۵۴) مگر انبیائے کرام (علیہم السلام) اور فرشتوں کو برزخ کی جزاوسزا کا ادراک ہوتا ہے جیسا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک دفعہ مدینہ منورہ کے ایک باغ کے پاس سے گزرے تو آپ نے دو انسانوں کی آواز سنی جن کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جارہا تھا۔ ان میں سے ایک تو اپنے پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا، پھر آپ نے کھجور کی ایک شاخ منگائی اور اس کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں قبروں پر ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ آپ سے عرض کیا گیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کیوں کیا؟ تو آپ نے فرمایا : شاید جب تک یہ خشک نہ ہوں گے ان قبر والوں سے عذاب میں تخفیف کی جائے گی۔ (بخاری : کتاب الوضوء : باب ۵۵) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مٹی کے نیچے عالم برزخ کے حوالے سے بھی باخبر تھے۔ (تفسیر امداد الکرم)

منافق کا انجام اور موت کے وقت اس کی سزا

"تَرٰی" کا معنی ہے بصیرت یا جسمانی آنکھوں کے ساتھ کسی چیز کو دیکھنا۔ یہاں صاحب ایمان شخص کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر وہ بصیرت یا بصارت کے ساتھ منافقین کی موت کا وقت دیکھ سکے تو اسے معلوم ہو کہ ان کا انجام کتنا بدترین ہوتا ہے۔ موت کے فرشتے ان کے چہروں اور کمروں پر تھپڑ مارتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب جہنم کا جلا دینے والا عذاب ہمیشہ کے لیے چکھتے رہو۔ اس آیت سے پہلے منافقوں کا ذکر ہو رہا تھا لیکن ان کا انجام بیان کرتے ہوئے منافق کی بجائے کافر کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ منافق بظاہر کلمہ گو اور مسلمانوں جیسے کام کرتا ہے لیکن اصلاً وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا منکر ہوتا ہے۔ اس لیے حقیقتاً وہ کافر ہوتا ہے۔ اگر اس کا اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان ہو تو وہ نہ مسلمانوں کو دھوکہ دے اور نہ ہی آخرت کے بدلہ میں دنیاوی مفاد کو ترجیح دے۔ یہ سزا ان کے اپنے کردار کا نتیجہ ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ منافق دنیا میں اللہ کا مخلص بندہ بننے کی بجائے اپنے مفاد کے بندہ بن کر رہا۔ موت کے وقت اسے ہمدردی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ضرورت تھی لیکن یہ منافقت اور دوغلے کردار کی وجہ سے موت کے نازک لمحات میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ٹھہرا اور قیامت کے دن اسے جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں پھینکا جائے گا۔ (سورۃ النساء : ۱۴۵) سورۃ الانعام : آیت ۹۳ میں ہے کہ جب ایسے لوگوں کی جان قبض کی جاتی ہے تو موت کے فرشتے انھیں مارتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جان کیوں نہیں نکالتے ہو؟

"حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں ہم نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ انصار کے کسی آدمی کے جنازہ کے لیے نکلے ہم قبرستان پہنچے تو ابھی قبر کھودی نہیں گئی تھی۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیٹھ گئے ہم بھی ان کے ارد گرد بیٹھ گئے جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی آپ اس کے ساتھ زمین کو کرید رہے تھے آپ نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے دو یا تین مرتبہ فرمایا قبر کے عذاب سے پناہ مانگو پھر فرمایا۔۔ جب کافر دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے کالے چہروں والے فرشتے آتے ہیں ان کے ہاتھ میں بدبودار بوری ہوتی ہے وہ حد نگاہ تک اس کے ؟ پاس بیٹھ جاتے ہیں، پھر اس کے پاس ملک الموت آتا ہے یہاں تک کہ اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے وہ کہتا ہے اے خبیث نفس ! اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کی طرف چل۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ اس کی روح کو اس طرح نکالتے ہیں جس طرح گرم سلائی کو روئی سے نکالا جاتا ہے وہ اس کی روح کو نکال کر جس تھیلے میں ڈالتے ہیں اس سے اتنی بدبو نکلتی ہے جس طرح لاش سے گندی بدبو زمین پر پھیلتی ہے وہ اس کو لے کر آسمانوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے بھی گزرتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ خبیث روح کون سی ہے۔ موت کے فرشتے کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے اس کے برے نام لے کر اس کو بلاتے ہیں یہاں تک کہ وہ آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں وہ اس کو کھلوانا چاہتے ہیں مگر اسے کھولا نہیں جاتا، پھر نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی : "ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ سوئی کے سوراخ میں اونٹ داخل ہو جائے" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے لیے زمین کی تہہ میں ٹھکانا بناؤ۔ پھر اس کی روح کو نیچے پھینک دیا جاتا ہے۔ نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی "جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا گویا کہ وہ آسمان سے گرا اور اسے پرندے اچک لیں یا اس کو ہوائیں کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں" پھر اس روح کو اس کے بدن میں لوٹا دیا جاتا ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو

بٹھاتے ہیں اور اس کو کہتے ہیں تیرا رب کون ہے ؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا، پھر فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے تو وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا، پھر فرشتے کہتے ہیں یہ شخص کون ہے جو تم لوگوں میں نبی مبعوث کیا گیا ؟ تو وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ آسمانوں سے آواز دینے والا آواز دیتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تم اس کا بچھونا آگ کا بنا دو اور آگ کا دروازہ اس کی طرف کھول دو۔ اس کے پاس اس آگ کی گرمی اور بدبو آتی ہے۔ اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور اس کے پاس بدصورت گندے کپڑے اور بدبودار جسم کے ساتھ آدمی آتا ہے تو وہ کہتا ہے آج خوش ہو جا تجھے ذلیل کیا جائے گا وہ کہتا ہے کہ تم کون ہو اس طرح کی شکل والے جو آتی بری بات کے ساتھ آئے ہو تو وہ کہے گا میں تیرا بد عمل ہوں وہ کہے گا اے میرے رب کبھی قیامت قائم نہ کرنا۔ ”
[مسند احمد] (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۙ 51

لغۃ القرآن: ذٰلِكَ : وہ] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [قَدَّمَتْ : آگے بھیجا] [اَيْدِيْكُمْ : تمہارے ہاتھوں نے] [وَاَنَّ : اور بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [لَيْسَ : "کہ "نہ ہو] [بِظَلَّامٍ : ظلم کرنے والا] [لِّلْعَبِيْدِ :" اپنے " بندوں پر] [

ترجمہ: یہ (عذاب) ان (اعمالِ بد) کے بدلہ میں ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور اللہ ہر گز بندوں پر ظلم فرمانے والا نہیں

تشریح:

یعنی جب کفار کو موت آتی ہے تو فرشتے ان کے چہروں اور ان کی پشتوں پر ضربیں لگاتے ہیں اور انھیں جھڑکتے ہوئے کہتے ہیں کہ چلو دائمی جہنم کی طرف۔ یہ تمہارے کفر کی سزا ہے اور اللہ کسی پر ظلم نہیں فرماتا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں یہ آیت بدر میں مارے جانے والے کفار کے لے ی اتری۔ فرشتے ان کے چہروں پر تلواروں سے ضربیں لگاتے تھے جب وہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے تو وہ ان کی پشتوں پر ضربیں لگاتے اور انھیں جہنم رسید کرتے (ابن جریر جلد 6 صفحہ 862) اگرچہ بقول حضرت عبداللہ بن عباس (رض) یہ آیت بدر میں مارے جانے والے کفار کے حق میں اتری مگر الفاظ کے لحاظ سے یہ سب کفار کو عام ہے جیسے کہ آگے کَدَاْبِ اٰلِ فرعون کے الفاظ بھی اسی عموم پر دال ہیں۔
(تفسیر برہان القرآن)

ذلک بما قدمت ایدیکم۔ یہ تمہارے ہی ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہاں ان آیات میں دو کیٹیگریز ہیں جو بیان کی گئیں۔ ایک تو منافق جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے یعنی نفاق وہ stege ہے جب دونوں کی یہ بیماری کھل کر سامنے آگئی۔ جان اور مال کو بچاتے ہوئے دین پر چلنے کی کوشش۔ یہ تو ہے نفاق۔ ایک ہے آیت۔ فی قلوبھم مرض۔ ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے۔ ابھی اظہار نہیں ہوا sing and stamp ظاہر نہیں ہوئے۔ کمزور ایمان والے لوگ۔ یعنی ابھی ان کا رویہ یہ ہے کہ ٹھیک ہے دین نافذ ہو لیکن ہم پر آزمائش نہ آئے۔ ابھی دین والوں سے چڑ نہیں ہے ان کو۔ قربانی دینے سے بہت زیادہ گھبراتے نہیں لیکن ذرا سی کمزوری ہے چاہتے

ہیں کہ ابھی ہم پر یہ مرحلہ نہ ہی آئے تو اچھا ہے تو جس کا اپنا ایمان ابھی کمزور ہو۔ بیمار ہو اور وہ نفاق والوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہے۔ تو نفاق کی بیماری تو اس کو بھی لگے گی۔ جیسے ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کسی کی Resistance power کمزور ہے immune سسٹم کمزور ہوا ہوا ہے قوت مدافعت اس میں نہیں ہے اور وہ کسی متعدی مریض کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے تو وہ مرض اس کو بھی لگ جائے گا تو دنیا میں بھی جیسے مرض دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے کہ پہلے تو بیماری اندر ہی اندر پکتی ہے اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اس اظہار ہو جاتا ہے اسی طرح ان لوگوں کے اندر اندر نفاق کا مرض پک رہا تھا۔ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ فی قلوبھم مرض کی بات کی گئی۔ اور منافقوں کا مرض ظاہر ہو گیا تھا۔ تو یہ ان کا قول ہے انھوں نے کہا کہ یہ جو مومن مسلمان ہیں ان کو تو ان کے دین نے confuse کر دیا ہے اب دین کا مطلب بھی سمجھیں۔ آیت ھولآء دینھم۔ ان کے دین نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا۔ دین سے کیا مراد۔ نماز روزے کے ارکان کی بات نہیں ہے۔ نماز روزے پر تو کبھی کبھی منافق نے اعتراض نہیں کیا۔ دین کا definition ذہن میں کبھی complete way of life اس پر ان کو اعتراض تھا کہ یہ تو دین کا غلط مطلب نکال رہے ہیں دین کا مسلمان ہونے کا مطلب کوئی یہ تھوڑی ہے کہ جو سیدنا محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمادیں۔ سوچے سمجھے بغیر اس کی Logic تلاش کئے بغیر بس عمل پر چل پڑو۔ کمزور ایمان والوں کا اور منافقوں کا رویہ یہ تھا کہ ٹھیک ہے اسلام میں داخل ہو مگر اپنی حفاظت کے ساتھ۔ عقل سے پوچھو پہلے۔ اپنا تحفظ دیکھو۔ اپنے تحفظ کے ساتھ دین میں آؤ قربانی دینے کی فرصت نہیں ہے تو دراصل منافقوں کو اور کمزور ایمان والوں کو بغیر قربانی بغیر ہجرت والا دین چاہیے ہوتا ہے یہ چیزیں minus کر دیں دین میں سے وہ خوش ہیں۔ تو فرمایا ان کے بارے میں کہ اس وقت تو یہ بہت خوش ہو رہے ہیں بہت اپنے آپ کو شاباش دے رہے ہیں کہ ان کی عقلمندی ان کی دور اندیشی ان کی دیناوی نقصان سے بچا گئی، اس وقت ان کو کون بچائے گا جس وقت فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے آئیں گے۔ تو کیا ان کا حال ہو گا۔ حدیث میں ان کا حال بیان کیا گیا ہے جب منافق یا کافر مرتا ہے تو قبر میں اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس سے اللہ کے بارے میں ، اسلام کے بارے میں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں سوالات پوچھتے ہیں یہ سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے لاادری۔ لا ادری۔ ہائے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ تو اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ دوزخ کا اس کے لیے فرش کر دو۔ دوزخ کا لباس پہناؤ۔ اور دوزخ کا دروازہ کھول دو۔ پھر قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے۔ اور ایک عذاب دینے والا فرشتے اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے لوہے کا ایک گرز اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس سے وہ اس کو مارتا رہتا ہے۔ اب یہ سب عالم الغیب کی باتیں ہیں، برزخ کی باتیں ہیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تو دعا ہمیں سکھا دی ہے کہ تم دعا کیا کرو۔ اللھم انی اعوذ بک من عذاب جھنم واعوذ بک من عذاب القبر ۔ اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں جن ہم کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس چیز سے محفوظ رکھے۔ اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا و عذاب الاخرۃ۔ اللہ ارزقنا الجنۃ بغیر حساب۔ (تفسیر تنویر)

دعا میں اصولی طور پر دو چیزیں طلب کی جاتی ہیں

مضر چیزوں سے نجات اور مفید چیزوں کا حصول یعنی دفع ضرر اور جلب منفعت۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا میں پہلے یہ کہا کہ ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ دعا کے اس حصہ میں اپنی امت کے لیے ہلاکت اور عذاب سے نجات کو طلب کیا اور دعا کے دوسرے حصہ میں کہا

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں ' اور اس میں جلب منفعت کی اور مفید چیزوں کو طلب کیا اور دنیا اور آخرت کی خیر اور حسنہ کو طلب کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آیت میں تلقین فرمائی ہے :

ومنهم من يقول ربنا اتنا في الدنيا حسنة وفي الاخرة حسنة (البقرہ : ۲۰۱)

اور ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما۔

دنیا کی بھلائی کیا ہے اور آخرت کی بھلائی کیا ہے ؟

علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ نے لکھا ہے " دنیا کی بھلائی سے مراد ہے پاکیزہ حیات اور اعمال صالحہ اور آخرت کی بھلائی سے مراد ہے۔ جنت ' اللہ تعالیٰ کا دیدار اور دنیا کی نیکیوں پر ثواب " اور زیادہ عمدہ بات یہ ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد نعمت اور عبادت ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے اور اس کے علاوہ اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے ! (البحر المحیط ج ۵ 'ص ۱۹۰) علامہ بیضادی متوفی ۶۸۲ھ نے لکھا ہے " دنیا کی بھلائی سے مراد اچھی زندگی اور عبادت کی توفیق ہے اور آخرت کی ھلائی سے مراد جنت ہے "۔ (الکازرونی مع البیضاوی ج ۳ 'ص ۶۴) علامہ ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد گناہوں کی بخشش ہے۔ (جامع البیان جز ۹ 'ص ۱۰۵) علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد مغفرت اور جنت ہے۔ علامہ قرطبی متوفی ۵۹۷ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد اس کی جزا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷ 'ص ۱۵۷) باقی مفسرین نے بھی تقریباً اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جو یہ دعا کی تھی کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں یہ بھلائی ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو رسول امی کی پیروی کریں گے جن کا ذکر توراۃ اور انجیل میں ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جو دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگی تھی وہ اللہ تعالیٰ نے سید محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کی عطا کر دی۔

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم اپنی سندوں کے ساتھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عباس (رض) عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جو سوال کیا تھا کہ ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لے منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو عطا کروں گا۔

(جامع البیان جز ۹ 'ص ۱۰۹ ' تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵ 'ص ۱۵۸۰) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ 52○

لغۃ القرآن: كَدَاْبِ : جیسے حال " ہوا "] [اٰلِ : آل] [فِرْعَوْنَ : فرعون کا] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [نْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے تھے] [كَفَرُوْا : سب نے کفر کیا] [بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : اللہ کی آیات کا] [فَاَخَذَهُمُ : تو پکڑ لیا انہیں] [اللّٰهُ : اللہ] [بِذُنُوْبِهِمْ : انکے گناہوں کے سبب] [نَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [قَوِيٌّ : نہایت طاقتور] [شَدِيْدُ : سخت] [الْعِقَابِ : عذاب والا ہے] [

ترجمہ: (ان کافروں کا حال بھی) قوم فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں کے حال کی مانند ہے۔ انھوں نے (بھی) اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا، سو اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کے باعث (عذاب میں) پکڑ لیا۔ بیشک اللہ قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے

تشریح:

یعنی جس طرح قوم فرعون اور متعدد دوسری قوموں پر ان کی مسلسل نافرمانی اور پیہم ایذا رسانی کے باعث عذاب آیا اسی طرح ان کا بھی انجام ہونے والا ہے۔

پہلی آیت میں تو یہ بتایا کہ ظلم و ستم سے ذات الٰہی پاک اور بالا ہے۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ بے بس اور کمزور بھی نہیں کہ کوئی اس کی نافرمانی کرتا رہے اس کے رسولوں کو ستاتا ہے تو وہ کچھ نہ کر سکے۔ بلکہ اگر اس کی رحمت کسی کو ڈھیل دیئے رکھے تو اس کی مہربانی اور اگر وہ ناراض ہو کر پکڑ لے تو پھر کوئی فرعون ہو یا نمرود، جمشید ہو یا فریدوں وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اور جب وہ پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے تو پھر ماؤشما کا تو کیا کہنا رستم و سہراب کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

علامہ سدی (رح) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس ہے اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو بھوک سے نجات دی۔ امن دیا اور ان کی طرف نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا اور متنبہ کر دیا کہ یہ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لیکن انھوں نے نعمت کا شکر ادا کرنے کی بجائے سرکشی کی اس پر مثال فرعونیوں اور اگلوں کی دی گئی۔ (الذین من قبلھم سے مراد قوم عاد و ثمود وغیرہ ہیں۔

حضرت سید المفسرین ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ یہ مثال اس لیے دی گئی کہ فرعون بھی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کی تکذیب کرتا تھا باوجویکہ اسے آپ کی نبوت پر یقین تھا یہی حال کفار مکہ کا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر انھیں یقین بھی ہے لیکن صد و عناد میں جان بوجھ کر اپنی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے تکذیب کرتے تھے۔

كداب ال فرعون والذين من قبلهم، كذبوا بآيت ربهم فاهلكنهم بذنوبهم واغرقنا ال فرعون، وكل كانو ظلمين۔
ان کی حالت فرعون والوں اور ان سے پہلے والے کافروں کی سی ہے کہ انھوں نے پانے رب کی آیات کو جھٹلایا اس پر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا اور فرعون والوں کو غرق کر دیا اور وہ سب ظالم تھے۔ (تفسیر الحسنات)

"دأبٌ "کا معنی ہوتا ہے (حال یا عادت)

آیت سے پہلے دأبھم کا لفظ محذوف ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ قریش مکہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ انبیاء کی تاریخ دعوت اور اللہ کی سنت کے خلاف نہیں ہے۔ اس کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ وہ انسانوں کو فہم و شعور عطا فرماتا ہے نعمتوں سے نوازتا ہے ہر طرح کے وسائل سے بہرور کرتا ہے اور جب وہ لوگ فہم و شعور سے کام لینے سے عاجز رہتے ہیں تو اللہ ان پر مزید احسان یہ کرتا ہے کہ اپنے رسول بھیجتا ہے اور اپنی کتابیں اتارتا ہے اور افہام و تفہیم کے تمام ذرائع سے کام لے کر ان پر حجت تمام کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ، رسول کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے مخالفت پر تل جاتے ہیں اور راہ راست اختیار کرنے کی بجائے ہدایت کے راستے پر چلنا مشکل بنا دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں تنبیہ کرنے اور متوجہ کرنے کے لیے آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ کبھی کوئی وبا ان پر بھیجتا ہے کبھی کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے اور اللہ کا نبی انھیں بار بار آگاہ کرتا ہے کہ یہ مصائب کے جھٹکے دے کر تمہیں جگانے کی کوشش کی جارہی ہے اور ساتھ ساتھ وارننگ بھی دی جارہی ہے کہ اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گے تو تم پر اللہ کا عذب بھی نازل ہو سکتا ہے۔ یہ اس کی چھوٹی چھوٹی تنبیہات جن کی برداشت کی تم میں طاقت نہیں اور اگر اس کا عذاب آگیا تو پھر سوچو تمہارا کیا بنے گا؟ تمہاری بستیاں تباہ ہو جائیں گی، تمہارا وجود ختم ہو جائے گا۔ اس آیت کریمہ میں خاص طور پر آل فرعون کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ان سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں ان کا حال بھی ان سے مختلف نہ تھا۔ آل فرعون سے مراد صرف فرعون کے اہل و عیال اور اس کا خاندان نہیں بلکہ اس کی پوری قوم ہے۔ ان کی طرف اللہ نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو رسول بنا کر بھیجا۔ انھوں نے سالوں تک مصر میں تبلیغ کا فرض انجام دیا جب آل فرعون نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے مختلف مصائب میں انہین مبتلا کیا۔ کبھی زلزلہ آیا، کبھی قحط سالی آئی، کبھی ٹڈیوں اور مینڈکوں کی وبا پھیلی، کبھی دریاؤں کا پانی خون میں بدل دیا گیا، ہر تنبیہ کے بعد فرعون اور آل فرعون وعدہ کرتے کہ اس تکلیف کو واپس لے لیا جائے تو ہم راہ راست اختیار کر لیں گے۔ لیکن جب تکلیف ہٹا دی جاتی تو وہ پھر اپنی ڈگر پر چل پڑتے۔ ان کی اس تاریخ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن کریم قریش مکہ سے کہہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ بدر کے میدان میں جو کچھ گزری ہے اور تم جس عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوئے ہو یہ اللہ کی اسی سنت کا تسلسل ہے۔ جس میں آل فرعون اور دوسری قومیں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ لیکن آپ غور فرمایئے! اس آیت کریمہ میں یہ تو فرمایا کہ اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں پکڑا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ پکڑنے سے مراد وہی تنبیہات ہیں جن سے مقصود قوموں کو جگانا اور ہوشیار کرنا ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ تصور دینا ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے ان تنبیہات کی گرفت اور وسعت کا یہ عالم ہے تو خود اندازہ کرو اس کا عذاب کتنا شدید ہوگا اس لیے اس کے عذاب آنے سے پہلے اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کرو۔

اللہ تعالیٰ نعمت سے محروم کیوں کرتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں وہ تو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ کبھی اپنے بندوں پر ظلم تو دور کی بات ہے معمولی تکلیف کا بھی روادار نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ عادل بھی ہے، بندوں کے اعمال کی جزا اور سزا اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ تمہیں اس نے وجود بخشا، تمہاری نمود وپرداخت کے انتظامات کیے، تمہاری ضرورتوں کے لیے غذا کا دستر خوان بچھایا۔ زندگی کے راستوں پر چلنے کے لیے حواس اور عقل کے چراغ بخشے۔ وہ وہ نعمتیں عطا فرمائیں جس کا شمار تو دور کی بات ہے ان کا ادراک کرنا بھی مشکل ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرم فرمایا تاکہ تم اس کو پہچانو، اس کا شکر ادا کرو، اپنے آپ کو پہچانو اور اپنی بندگی کا حق ادا کرو۔ لیکن جب تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کرتے ہو اور تمہارے دل و دماغ میں اس کے شکر کی بجائے ناشکری پلنے لگتی ہے اور اس کے اعتراف کی بجائے تم اس کا انکار کرنے لگتے ہو اس کے سامنے جھکنے کی بجائے اکڑنے لگتے ہو، اسی کا کھا کر اور اسی کی عطا کردہ زندگی سے مستفید ہو کر اسی کے دشمنوں کا دم بھرتے ہو اور اس کی مخلوقات میں سے نہ جانے کس کس کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون حرکت میں آتا ہے تو وہ ان نعمتوں کو واپس لے لیتا ہے جو نعمتیں اس نے محض اس لیے عطا کی تھیں تاکہ ان کے ذریعے سے انسان اپنے منعم اور محسن کو پہچانے۔ وہ اپنے وجود کو دیکھے اور خالق تک پہنچے۔ ربوبیت کے فیضان کو دیکھ کر رب کو پہچانے، رزق کی ہمہ گیری کو دیکھ کر رازق کو دیکھنے کی کوشش کرے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی نعمتوں کو دیکھ کر نعمتوں کے دینے والے کا ادراک کرے۔ لیکن جب اس کی بجائے انسان الٹے راستے پر چل پڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کسی قوم کو نعمت دے کر کبھی نہیں چھینتے لیکن جب وہ قوم اپنا طرزِ عمل بدل دیتی ہے اپنے اندر کی دنیا بدل دیتی ہے ان کے نفسوں میں اللہ کی جگہ طاغوت اتر آتا ہے اور وہ اپنے اندر بندگی کی پرورش کی بجائے سرکشی اور بغاوت کو پالتی ہے تو پھر ہم ان سے اپنی نعمتیں چھین لیتے ہیں۔ شروع میں کچھ نعمتیں چھین کر تنبیہ کرتے ہیں اور اگر وہ قوم اس تنبیہ کو سمجھ کر اللہ کے سامنے جھک جاتی ہے اور پیغمبر پر ایمان لے آتی ہے تو ہم اس کی نعمتوں کو بحال کر دیتے ہیں بلکہ اپنی طرف سے مزید بھی عطا کرتے ہیں اور وہ عزت اور سرافرازی ان کا مقدر بنا دیتے ہیں جس سے وہ ساری دنیا کے لیے ایک نمونہ بن جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ آلِ فرعون اور دوسری معذب قوموں کی طرح پلٹنے کی بجائے کفر اور سرکشی کے راستے پر بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنی تکذیب پر مزید اڑ جاتی ہے تو پھر ہمارے عذاب کا کوڑا حرکت میں آتا ہے۔ اور ہم انھیں ان کی تکذیب کی پاداش میں ایسا پکڑتے ہیں کہ انھیں ہلاکت کی نذر کر دیتے ہیں۔ کبھی ان کی دھرتی الٹ دیتے ہیں، کبھی ان پر پتھروں کی بارش کرتے ہیں، کبھی ان کے لیے زمین کا سینہ شق کر دیتے ہیں اور کبھی آلِ فرعون کی طرح انھیں بحرِ قلزم میں غرق کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح ظالم ثابت کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر چیز کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں اور اللہ کی تنبیہات کو پلے باندھنے کی تیار نہیں ہوتے۔

جنگ بدر پہلی آیت کے مصداق ایک بہت بڑی تنبیہ کی صورت تھی

اس طرح قریش کو ایک جھٹکا دیا گیا کہ وہ اب بھی اپنے طرزِ عمل کو بدلنے کی کوشش کریں تو وہ از سر نو اللہ کی رحمت کے مستحق بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا اور یہ ثابت کر دیا کہ معذب قوموں کی طرح وہ ہر طرح کے خیر کی صلاحیت سے محروم ہوگئے ہیں اور

ان کے اندر قبولیت حق کے سوتے بالکل خشک ہوگئے ہیں تو پھر انھیں انتظار کرنا چاہیے آل فرعون کی طرح بالآخر انھیں بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ تیسری آیت کریمہ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہا ھلکنٰھم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی آل فرعون جب تنبیہ کے مرحلے میں ناکام ہوگئے تو پھر اللہ کی سنت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا کہ اللہ نے انھیں ہلاک کر دیا۔ لیکن قریش اس لحاظ سے خوش قسمت نکلے انھوں نے اگرچہ اسلام اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی لیکن ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قبولیت اسلام کا سلسلہ یکسر ختم نہیں ہوا اندر ہی اندر حق کی رو بہتی رہی اور اس سے سیراب ہونے والے خاموشی سے سیراب ہوتے رہے۔ ایک وقت آیا کہ چپکے چپکے ستر (۷۰) نوجوان ساحل سمندر پر بسیرا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ جس کی وجہ سے قریش مکہ کے قافلوں کا گزر ناخطرے سے خالی نہ رہا۔ انھوں نے خود ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گزارش کی کہ آپ ان سر پھروں کو اپنے پاس بلا لیجئے۔ یہ انہی سر پھروں کا فیض تھا کہ مختصر سی مدت کے بعد مکہ سرنگوں ہوگیا اور قریش کو اپنی قسمت بدلنے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ گنتی کے چند افراد کو چھوڑ کر سب لوگ ایمان لے آئے اس طرح یہ لوگ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ (تفسیر روح القرآن)

مشرکین مکہ کا انجام

جس طرح فرعون اور اس کے ساتھی تکبر اور غرور کی وجہ سے دنیا میں ذلیل اور آخرت میں اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوئے اسی طرح مشرکین مکہ دنیا میں خوار ہوئے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ مزمل میں اہل مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تمہاری طرف ایسا رسول بھیجا ہے جس طرح کا رسول فرعون کے پاس بھیجا تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی قوم کے انکار اور کردار میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی بناپر بدر کے واقعات، اہل مکہ اور منافقین کا کردار اور انجام بیان کرنے کے دوران فرعون اور آل فرعون کا ذکر ضروری سمجھا گیا ہے۔ جس طرح فرعون اپنے آپ کو رب اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام اور موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کا مسلسل انکار کر کے اپنے انجام کو پہنچا اسی طرح ابو جہل اور اس کے ساتھی (اَنَاوَلَا غَيْرِیْ) کا دعویٰ کرتے ہوئے اللہ کی آیات کے منکر ٹھہرے اور رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات کا متواتر انکار کرتے رہے۔ جس طرح فرعون اور اس کے ساتھی موسیٰ (علیہ السلام) کے تعاقب میں اندھے ہوئے تھے اسی طرح ابو جہل اور اس کے ساتھی اپنے غرور و تکبر اور طاقت کے زعم میں اندھے ہو کر بدر کی طرف نکلے تھے۔ چنانچہ ان کا انجام بھی آل فرعون کی طرح دنیا نے دیکھا فرعون نے ڈبکیاں لیتے ہوئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) کے رب پر ایمان لانے کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ابو جہل نے مرتے وقت بھی یہ کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ مجھے مارنے والے قریشی جوانوں کے بجائے انصار کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں گویا کہ یہ آخری وقت فرعون سے بڑھ کر فرعون نکلا اس لیے اس کی لاش کو بدر کے ویران کنویں میں ڈالتے ہوئے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ یہ میری امت کا فرعون تھا۔ (البدایہ والنھایہ)

جس طرح آل فرعون اپنے گناہوں کی وجہ سے پکڑے گئے اسی طرح ابو جہل اور اس کی ساتھی اپنے جرائم کی بناپر اللہ کی گرفت میں آئے۔ اللہ تعالیٰ سخت ترین گرفت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر کیے ہوئے اپنے انعام کو نہیں بدلتا جب وہ قوم اپنی بد کردار کے ذریعے اسے بدل نہ دے اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے والا اور کام کو جاننے والا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ 53○

لغۃ القرآن: ذٰلِكَ : وہ] [بِاَنَّ : اس وجہ سے کہ بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [لَمْ يَكُ : نہیں ہے] [مُغَيِّرًا : بدلنے والا] [نِّعْمَةً : کسی نعمت کو] [اَنْعَمَهَا :" جو " اس نے انعام کیا ہو اسے] [عَلٰي : پر] [قَوْمٍ : کسی قوم کی] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [يُغَيِّرُوْا : وہ سب بدل دیں] [مَا : نہیں] [بِاَنْفُسِهِمْ : ان کے دلوں کی] [وَاَنَّ : اور بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [سَمِيْعٌ : خوب سننے والا ہے] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے] [

ترجمہ: یہ (عذاب) اس وجہ سے ہے کہ اللہ کسی نعمت کو ہر گز بدلنے والا نہیں جو اس نے کسی قوم پر ارزانی فرمائی ہو یہاں تک کہ وہ لوگ از خود اپنی حالت نعمت کو بدل دیں (یعنی کفران نعمت اور معصیت و نافرمانی کے مرتکب ہوں اور پھر ان میں احساس زیاں بھی باقی نہ رہے تب وہ قوم ہلاکت و بربادی کی زد میں آجاتی ہے)، بیشک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے

تشریح:

یہ آیت کریمہ اتنی واضح اور وشن ہے کہ کسی مزید تشریح کی گنجائش نہیں۔ گزری ہوئی اور موجودہ قوموں کے عروج وزوال کے لیے یہی اٹل قانون ہے۔ جو چاہے اس کو گوش ہوش سے سنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

{ ذٰلِکَ : یہ۔} یعنی کافروں کو عذاب دینے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو جو نعمت عطا فرمائی ہے اسے ہر گز نہیں بدلتا جب تک وہ خود ہی اپنی حالت کو نہ بدلیں اور زیادہ بدتر حال میں مبتلا نہ ہوں جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو روزی دے کر بھوک کی تکلیف دور کی، امن دے کر خوف سے نجات دی اور ان کی طرف اپنے حبیب سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی بنا کر مبعوث کیا، انھوں نے ان نعمتوں پر شکر کرنے کی بجائے یہ سرکشی کی کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جھٹلایا اور ان کی خوں ریزی کے درپے ہوئے اور لوگوں کو راہ حق سے روکا۔ سُدِّی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت حضرت سید انبیاء محمد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

قوموں کے عروج وزوال سے متعلق قانون الٰہی

قدرت کا یہ قانون ہے کہ کسی قوم کو نعمت دے کر اس وقت تک اس نعمت کو عذاب سے تبدیل نہیں کیا جاتا جب تک وہ قوم خود اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو اس نعمت کا نااہل ثابت نہیں کرتی۔ گزری ہوئی اور موجودہ قوموں کے عروج وزوال کیلئے یہی اٹل قانون ہے

کہ نعمت کا شکر اور حق ادا کرنے پر نعمت بڑھ جاتی ہے اور ناشکری کرنے پر سزا دی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ قدرت کا یہ قانون صرف کافر قوموں کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ مسلمان بھی اگر اسی روش پر چلیں تو اللہ تعالیٰ ان سے بھی اپنی دی ہوئی نعمتیں واپس لے لیتا ہے اور انھیں بھی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کی معرفت رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک مسلمان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر اور ان کا حق ادا کرتے رہے تب تک عروج کی ان منازل پر فائز رہے کہ دنیا کی بڑی بڑی سپر پاورز ان کے زیرِ نگیں رہیں اور کفار مسلمانوں کا نام سن کر لرزتے رہے اور جب سے مسلمانوں نے نعمت کے شکر اور اس کے حق کی ادائیگی سے منہ موڑا تب سے ان کی طاقت اور کافروں پر تَسلُّط ختم ہونا شروع ہو گیا اور آج مسلمانوں کا دنیا بھر میں حال یہ ہے کا فرانھیں برے سے برے نام سے یاد کرتے ہیں اور دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مسلم ملک ہو جو کافروں کا دست نگر نہ ہو۔ (تفسیر صراط الجنان)

امتِ مسلمہ کی زبوں حالی اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سر تابی کے سبب سے ہے

آج ہمارا حال قریش مکہ سے کسی قدر ملتا جلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے حبیب لبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دامن عطا فرمایا اور قرآن جیسی کتاب عطا فرمائی۔ جب تک ہم اس نعمت کی قدر کرتے رہے۔ دنیا پر غالب رہے۔ دوسری قومیں ہماری کے مطابق جیتی تھیں پھر ہم نے اس نعمت کبریٰ کی ناقدری کی اور اطاعت رسول سے منہ موڑ لیا تو اللہ نے ہماری عزت کو ذلت سے بدل دیا۔ ہم پر لازم ہے کہ واپس مدینہ طیبہ کی طرف رخ کریں اور اپنے آقا کے حکم کے مطابق باہم متحد ہوں اور سچے مسلمان بنیں۔ اللہ رب العزت اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ناراض کرنے والے کام چھوڑ دیں۔

آج ہم میں سے ہر کوئی زیادہ سے زیادہ دنیا سمیٹنے میں جتا ہوا ہے، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، ہر طرف جھوٹ اور دھوکا دہی کا بازار گرم ہے۔ امت مسلمہ میں اجتماعی سوچ ختم ہو چکی ہے، حکمران عیاش ہیں، امریکی غلامی میں ایک دوسرے سبقت دکھاتے ہیں اور اپنی کرسیوں کے لیے امت کو کفار کی چراگاہ بناتے ہیں۔ اگر آج بھی ہم اپنے گناہوں سے باز آ جائیں تو ہم دنیا کی غالب قوم بن سکتے ہیں۔

دو جہاں میں مومنو مقصود گر آرام ہے	ان کا دامن تھام لو جن کا محمد نام ہے
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں	یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی نعمت کبریٰ ہیں

حضرت سدی نے فرمایا اس آیت میں نعمت سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات ہے۔ اور بلا شبہ آپ کی سعد اہل ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولاتم نعمتی علیکم و لعلکم تھتدون۔ کما ارسلنا فیکم رسولا۔ اور تا کہ میں تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دو اور تا کہ تم شکر کرو جیسا کہ میں نے تم میں عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا (بقرہ: 151) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا : (آل عمران : 164) اور اسی نعمت کبریٰ کا شکر بجالانے کے لئے محافل میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انعقاد کیا جاتا ہے سرکار کا ذکر خیر کیا جاتا ہے آپ سے عہد غلامی باندھا جاتا ہے اور آپ کی اطاعت کا درس دیا جاتا ہے امت کو آپ کے اخلاق حسنہ سے روشناس کیا جاتا ہے تاکہ اپنے اخلاق کو آپ اخلاق نبویہ کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ

54○

لغۃ القرآن: كَدَاْبِ : جیسے حال " ہوا "] [اٰلِ : آل] [فِرْعَوْنَ : فرعون کا] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [مِنْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے تھے] [كَذَّبُوْا : انھوں نے جھٹلایا] [بِاٰيٰتِ : آیات کو] [رَبِّهِمْ : اپنے رب کو] [فَاَهْلَكْنٰهُمْ : پھر ہم نے ہلاک کردیا انہیں] [بِذُنُوْبِهِمْ : انکے گناہوں کے سبب] [وَاَغْرَقْنَآ : اور ہم نے غرق کردیا] [اٰلَ فِرْعَوْنَ : آل فرعون کو] [وَكُلٌّ : تمام] [كَانُوْا : تھے سب] [ظٰلِمِيْنَ : سب ظالم] [

ترجمہ: یہ (عذاب بھی) قوم فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں کے دستور کی مانند ہے، انھوں نے (بھی) اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا تھا سو ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں ہلاک کر ڈالا اور ہم نے فرعون والوں کو (دریا میں) غرق کر دیا اور وہ سب کے سب ظالم تھے

تشریح:

آل فرعون کی طرح اہل مکہ کی تباہی ان کے گناہوں کی وجہ سے ہوئی ورنہ اللہ تعالیٰ کسی کو بے وجہ نہ تباہ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے انعام کو عتاب میں تبدیل کرتا ہے۔

قرآن مجید اپنے طے شدہ اسلوب کے مطابق وضاحت کرتا ہے کہ آل فرعون کی اقتدار اور اختیار سے محرومی، مصر جیسے سبز وشاداب ملک سے بے دخلی اور انواع واقسام کی نعمتوں کے بدلے مختلف قسم کی تنگیوں اور مصائب میں مبتلا ہونے کا سبب یہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بلاوجہ انھیں اپنی نعمتوں سے محروم کر دیا۔ یہ تو کسی قوم کا مسلسل منفی کردار ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کے انعام وکرام سے محروم ہو کر مصائب وآلام میں گھر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ انھیں آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں آل فرعون کا جرم یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کی آیات یعنی اس کے احکام کا انکار کرنے والے تھے۔ یہاں آل فرعون اور اس سے پہلی اقوام کا

حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ اپنے رب کی آیات کا انکار کرنے والے تھے جس کی وجہ سے ہم نے انھیں غرق کر دیا اور وہ سب کے سب ظالم تھے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانوروں سے بدترین ہیں۔ لفظ رب کا ایک معنی ہے پالنے اور مختلف قسم کی نعمتوں سے نوازنے والا۔ یہاں رب کا لفظ استعمال فرما کر اپنی قربت کا احساس دلاتے ہوئے اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کروائی ہے۔ یاد رہے اللہ کے نام میں جلال اور اسم رب میں محبت و قربت کا احساس پایا جاتا ہے۔

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ (رض) قَالَ کَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُولِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيعِ سَخَطِكَ) [رواہ مسلم : کتاب الذکر والدعاء]

” حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعاؤں میں سے یہ ایک دعا ہے۔ ”اللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيعِ سَخَطِكَ

” (اے اللہ میں تیری نعمتوں کے زوال، تیری عافیت کے پھرنے، اور تیرے اچانک عذاب اور ہر طرح کے غصے سے پناہ مانگتا ہوں۔“ (تفسیر فہم القرآن)

جو کفار مکہ بدر میں قتل ہوئے ان کا اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی نعمت کو بدلنا ویسا ہی ہے جیسا فرعونیوں اور ان سے پہلوں کا طریقہ تھا، انھوں نے اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی آیتوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کے سبب بعض کو زلزلے سے ہلاک کر دیا، بعض کو زمین میں دھنسا دیا، بعض پر پتھروں کی بارش برسائی، بعض کو تیز آندھی سے اور بعض کی شکلیں بگاڑ کر ہلاک کر دیا جبکہ فرعونیوں کو غرق کر دیا اسی طرح ہم نے کفار قریش کو تلوار سے ہلاک کر دیا۔

مردودوں اور مقبولوں کے واقعات پڑھنے کی ترغیب

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عبرت کیلئے مردودوں کے تاریخی حالات پڑھنا ضروری ہے اسی طرح عبادت کا شوق پیدا کرنے کے لیے اولیاء کرام اور صالحین و مُتَّقین (رض) کے واقعات کا مطالعہ کرنا بہت اچھا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

گزشتہ آیات کے مفہوم کو برائے تنقید دہرایا گیا ہے۔ صرف چند الفاظ کا فرق ہے مضمون وہی ہے۔ یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے۔

1۔ وقت کے فرعون کو پچھلے فرعونوں کا انجام یاد رکھنا چاہیے۔

دور حاضر میں امریکی گورنمنٹ فرعون کا کردار ادا کر رہی ہے یا یہود اس سے یہ کردار لے رہے ہیں اور اسی کے اشارے پر افغانستان عراق فلسطین اور کشمیر میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ مگر اسے گزشتہ فرعونوں کا انجام یاد رکھنا چاہیے کیونکہ ظلم ہمیشہ نہیں چلتا۔ اسی لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : **و کل کانو ظلمین۔**

2۔ درود شریف میں لفظ آل محمد سب مسلمانوں کو شامل ہے :

یہاں دو بار کدابِ الِ فرعون۔ فرمایا گیا اور یہاں آل فرعون سے مراد فرعون کے تمام پیروکار ہیں کیونکہ وہ سب تکذیب کرنے والے تھے اور ہلاک ہونے والے تھے معلوم ہوا کہ کسی کے پیروکاروں کو اس کی آل کہا جاتا ہے۔ اور امام راغب فرماتے ہیں یاد رہے کہ کسی شخص کے تعلق داروں کو اس کیا لکھا جاتا ہے فوعہ و تعلق نسبی ہو یا محبت کا (مفردات القرآن للاصفہانی صفحہ 62 مطبوعہ تہران)

اور حضرت انس (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا یارسول اللہ آپ کی آل کون ہیں؟ فرمایا: کل تقی، یعنی "ہر پرہیزگار میری آل ہے" (در منثور جلد 2 صفحہ 251 کتاب الصلوۃ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

لہٰذا اللھم صل علی محمد و علیٰ آل محمد میں جہاں حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نسبی اولاد امجاد یعنی سادات کرام کو نسبی تعلق کے سبب درود شریف سے حصہ ملتا ہے۔ وہاں آپ کی ساری امت کو ایمانی تعلق کی بنیاد پر حصہ ملتا ہے البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ درود شریف میں سادات کرام کا دوہرا حصہ ہے کیونکہ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جسمانی وایمانی دونوں تعلق رکھتے ہیں۔

مگر اس سے عقائد صحیحہ کے حامل سادات مراد ہیں۔ صحابہ کرام کو گالیاں بکنے اور خلفاء راشدین وامہات المؤمنین پہ (معاذ اللہ) لعنتی بھیجنے والوں کی نسبت سادات ختم ہو چکی ہے۔ اگر نبی کا سگا بیٹا بھی کافرانہ عقائد کا حامل ہو تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ انہ لیس من اھلک۔ اے پیغمبر یہ تمہارے اہل بیت سے خارج ہے۔ "(ھود۔ 46) (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝55

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [شَرَّ : برے] [الدَّوَآبِّ : سب جانداروں سے] [عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے نزدیک] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [كَفَرُوْا : سب نے کفر کیا] [فَهُمْ : پس وہ سب] [لَا : نہیں] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں] [

ترجمہ: بیشک اللہ کے نزدیک سب جانوروں سے (بھی) بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے

تشریح: اس سے مراد بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودی قبائل ہیں جن سے حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلے صلح کا معاہدہ فرمایا تو انھوں نے کفار کو اسلحہ مہیا کر کے عہد شکنی کی۔ پھر تائب ہوئے اور دوبارہ معاہدہ کیا لیکن جب غزوہ خندق میں سارا عرب مدینہ پر حملہ آور ہوا تو کفار کا پلہ بھاری دیکھ کر پھر یہ یہودی ان کی طرف جھک گئے اور عین حالت جنگ میں مسلمانوں سے دغا کی۔ والمعنی بھم قریظۃ والنضیر نقضوا العھد فاعانوا مشرکی مکۃ بالسلاح ثم اعتذروا فقالوا نسینا فعاھدھم (علیہ السلام) ثانیۃ فنقضوا العھد یوم الخندق (قرطبی)، (تفسیر ضیاء القرآن)

کافر جانوروں سے بھی بدتر ہیں

قرآن پاک میں اس کے علاوہ اور مقامات پر بھی کفار کو جانوروں سے زیادہ بھٹکے ہوئے، جانوروں سے بدتر گمراہ بلکہ تمام مخلوق سے بدتر فرمایا گیا، چنانچہ

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

"اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ "(1)

ترجمہ کنزالعرفان: یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعٰمِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا "(2)

ترجمہ کنزالعرفان: یہ تو صرف جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر گمراہ ہیں۔

اور ارشاد فرمایا

"اُولٰٓئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِيَّةِ "(3)

ترجمہ کنزالعرفان: وہی تمام مخلوق میں سب سے بدتر ہیں۔

کافروں کے جانوروں سے بدتر ہونے کی وجوہات

کفار کو جانوروں سے بھی بدتر فرمائے جانے کی مفسرین نے کئی وجوہات بیان فرمائی ہیں، ان کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ جانور اللہ تعالیٰ کی آیات سننے، سمجھنے اور دیکھنے کی قوت سے خالی ہیں، اپنا نفع و نقصان پہچانتے ہیں اور اپنے مالک کی اطاعت کرتے ہیں جبکہ کفار اپنے اعضاء میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی آیات سننے، سمجھنے اور دیکھنے کی قوت رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے، کفر اختیار کر کے خود اپنا نقصان کرتے ہیں اور اپنے مالک و مولیٰ عَزَّوَجَلَّ کے نافرمان ہیں اس لیے سب جانوروں سے بدتر ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

شَرَّ الدَّوَآبِّ کا مفہوم

دَوَآبٌّ، دابۃٌ کی جمع ہے۔ اس کا لغوی معنی "زمین پر چلنے پھرنے والا جاندار" ہے۔ اس لحاظ سے اس میں حیوانات بھی شامل ہیں اور انسان بھی۔ لیکن بالعموم اس کا اطلاق حیوانات پر ہوتا ہے۔ اللہ کی مخلوق ہونے کے اعتبار سے تمام جاندار برابر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی صلاحیتوں اور ان کی زندگی کے مقاصد کے حوالے سے بعض مخلوقات کو دوسری مخلوقات پر فوقیت دی ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اسے سوچنے سمجھنے، غور و فکر کرنے اور اس کے نتیجے میں صحیح بات تک پہنچنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے جبکہ حیوانات اور حشرات الارض وغیرہ اس صلاحیت سے محروم ہیں۔ حیوانات کو جن مقاصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے حواس کی راہنمائی کافی ہے۔ انھیں غور و فکر کرنے اور سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تمام حیوانات کو انسان کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ وہ اپنی اپنی حیثیت میں انسان کی چاکری کر رہے ہیں اور اس چاکری کے لیے غور و فکر کی نہیں مکمل اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہر حیوان کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زود یا بدیر اپنے مالک کی اطاعت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان کو جس قسم کی زندگی اور زندگی کے مقاصد عطا کیے گئے ہیں، ان کی قبولیت اور ادائیگی کے لیے انسان کو غور و فکر کی صلاحیت یعنی عقل اور ضمیر کا نور عطا کیا گیا ہے۔

حیوان سے اس کا مالک جو کام بھی لینا چاہتا ہے، وہ بالجبر اور طاقت کے زور سے لے لیتا ہے۔ لیکن انسان کو فی الجملہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے آزادی سے اور سوچ سمجھ کر کرے۔ اس لحاظ سے آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق سوچنے اور غور وفکر کرنے کا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اپنی زندگی کا مقصد کھانا، پینا اور اپنی خواہشات کو پورا کرنا بنالے اور انسانی اقدار اور انسانی مقاصد پر غور وفکر کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہو تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ زندگی کی بقا کے لیے جس طرح کی ضرورتیں انسان کو لاحق ہیں یعنی اسے غذا چاہیے، آرام چاہیے، گھر کی چھت چاہیے اور اپنے ارادے کے مطابق زندگی گزارنے کی صلاحیت چاہیے۔ یہی بنیادی چیزیں کم وبیش معیار کے فرق کے ساتھ حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، موسم کی شدت سے بچتے ہیں، مکان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک بھٹ بنالیتے ہیں۔ انسان اپنی ضرورتیں بہتر اور خوبصورت انداز میں پوری کرتا ہے اور حیوان نہائیت سادگی کے ساتھ۔ انسان ایک سادہ چیز کو اپنی ذہانت سے کچھ سے کچھ شکل دے لیتا ہے اور لطف ولذت میں اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ حیوان ان باتوں سے محروم ہے، لیکن بنیادی ضرورتیں وہ بھی بہر حال پوری کرتا ہے۔ اگر انسان اسی حد تک محدود رہتا تو یقیناً حیوان میں اور اس میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ وہ انسانیت کی صف میں اس وقت شامل ہوتا ہے جب وہ اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے اور عقل سے کام لے کر ان صداقتوں کو قبول کرلیتا ہے جن کا عقل سلیم مطالبہ کرتی ہے اور زندگی کی ان وادیوں میں جہاں عقل کام نہیں دیتی وہ وحی الٰہی کو قبول کرلیتا ہے کیونکہ اس کی عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ ہماری زندگی جن دوائر میں پھیلی ہوئی ہے ان کا تعلق صرف محسوسات اور معقولات تک ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہماری زندگی کے رشتے مابعد الطبیعات سے بھی ہیں اور عالم غیب سے بھی۔ اس آیت میں پروردگار اس بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ کافر جب پیغمبر کی دعوت پر کان نہیں دھرتا جبکہ پیغمبر کی دعوت عقل کا تقاضا ہے اور اس کی دعوت کی ہر بات عقل اور فطرت کے ترازو میں تل کر نکلتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے سے انکار کردیا ہے اور یہ ایک ایسا رویہ ہے جو حیوان کا تو ہو سکتا ہے انسان کا نہیں ہو سکتا۔ اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ایک قدم آگے ہے۔ حیوان کا مالک انسان ہے اور جس انسان کے تصرف میں جس حیوان کو بھی دیا گیا ہے، آپ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ اس حیوان نے اپنے مالک کو پہچاننے میں غلطی کی ہو یا اس کی اطاعت کرنے سے اس نے انکار کیا ہو۔ باربرداری کے جانور اپنے مالک کے لیے باربرداری کا فرض انجام دیتے ہیں۔ سواری کے جانور اپنے مالک کا بوجھ اٹھانے سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ ہل جوتنے والے اور فصل کاشت کرنے والے بیل کبھی اس خدمت سے پہلو تہی نہیں کرتے۔ لیکن انسان کو جن مقاصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، ان مقاصد سے اس کا انحراف جب خطرناک حدود کو چھونے لگتا ہے تو تب اللہ کے نبی تشریف لاتے ہیں اور اللہ کی جانب سے کتابیں اترتی ہیں۔ لیکن جو شخص اللہ کے نبی کی بات کو سننے اور اللہ کی کتاب کو پڑھنے سے انکار کردے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حیوانیت کی سطح سے بھی گر گیا ہے کیونکہ اگر اس میں حیوانیت بھی بدرجہ کمال ہوتی تو وہ اپنے مالک، محسن اور مربی کی پہچان میں کبھی غلطی نہ کرتا۔ وہ اپنے رزق دینے والے کو ضرور پہچانتا اور یہی بنیادی باتیں اسے اللہ کے نبی کے دین کو قبول کرنے پر آمادہ کردیتیں۔ لیکن جو شخص ان باتوں کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے اللہ کے نبی کی دشمنی پر تل جاتا ہے اور وہ ہر قیمت پر اس کی دعوت کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ایسا شخص بدترین خلائق ہے کیونکہ انسان کا اشرف المخلوقات ہونا اس سبب سے نہیں ہے کہ اسے کوئی سرخاب کے پر لگے ہیں یا وہ بڑی سے بڑی مخلوق سے زیادہ طاقتور ہے یا اس کے جسم میں دوسری مخلوقات کی نسبت کوئی غیر معمولی چیز پائی جاتی ہے۔ اس کے اشرف ہونے کی تو ایک

ہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد حیات کی بجاآوری اور اس کے لیے محنت اور قربانی کرنے میں سب سے عظیم واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ پست ترین مقاصد کا شکار ہو کر حیوانیت کی سطح پر اتر جاتا ہے تو وہ یقینا اپنی شرافت کھو دیتا ہے۔
جگر نے بالکل ٹھیک کہا:

گرے اگر تو بس ایک مشت خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

انسان جب راہ راست اختیار کرتا ہے تو وہ اقدار انسانی اور مکارم اخلاق کو اپنے عمل کی صورت میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ فرشتے اس کے دامن میں نماز پڑھنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ ظلم کا راستہ روکنے کے لیے بڑے سے بڑے ظالم سے ٹکرا جاتا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ خود چیتھڑوں میں لپٹ کر دوسروں کی تن پوشی کا سامان کرتا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے سر کٹوانا اور خون بہانا اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہ بگڑتا ہے اور حیوانیت کی سطح پر اترتا ہے تو اس کا ظلم درندوں کی درندگی کو شکست دے دیتا ہے۔ اس کا دجل و فریب لومڑی کی مکاری کو ماند کر دیتا ہے۔ بھیڑیا ظلم کی ایک مثال سمجھا جاتا ہے، لیکن آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ بھیڑیوں نے مل کر کوئی فوج تیار کی ہو تاکہ وہ انسانوں کی بستیاں اجاڑیں۔ چیتا بڑا ظالم جانور ہے لیکن اس کا ظلم ایک انسان کا خون پی کر اپنی نیند سو جاتا ہے۔ لیکن انسان جب درندگی پر اترتا ہے تو وہ ایسے تباہ کن آلات تیار کرتا ہے جن سے وہ ایک لمحے میں آباد اور بستے ہوئے شہروں کو جہنم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ایک بم ایک لمحے میں شہروں کو صفحہ ہستی سے غائب کر سکتا ہے۔ کل تک ہیروشیما اور ناگاساکی ایسے ہی انسانی کمالات کی بولتی ہوئی مثالیں تھیں لیکن آج کے مہذب انسان کو اگر اس کے اصل روپ میں دیکھنا ہو تو عراق، افغانستان، چیچینیا، کشمیر اور فلسطین میں دیکھ لیجئے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو لوگ اللہ کو اپنا خالق و مالک ماننے اور نبی کی دعوت پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں وہ صرف حیوان ہی نہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں"۔

شَرَّ الدَّوَآبِّ کی ایک مثال

دوسری آیت کریمہ میں ایسے انسان جو حیوانوں سے بھی بدتر ہیں ان کی ایک مثال دی ہے۔ نام اگرچہ نہیں لیا گیا لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معاصر تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے مراد مدینہ کے یہود اور گردوپیش کے وہ قبائل ہیں جن سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بقائے باہمی کے معاہدے کیے تھے۔ آپ نے مدینہ طیبہ پہنچ کر مسلمانوں کی معاشرت کی ابتدا کرتے ہوئے ان میں مواخات قائم فرمائی اور مدینہ کے ماحول کو پرامن رکھنے کے لیے آپ نے یہود اور باہر کے قبیلوں سے ایک معاہدہ کیا جسے " میثاقِ مدینہ " کہتے تھے۔ اس میثاق کی رو سے یہود اور پڑوسی قبائل اس بات کے پابند تھے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن کی مدد نہ کریں اور مدینہ پر حملہ کی صورت میں مدینہ کے دفاع کے لیے مسلمانوں کی مدد کریں۔ لیکن ان کی حیوانیت کا عالم یہ ہے کہ جب بھی انھیں موقعہ ملتا تو وہ معاہدے کی پروا کیے بغیر قریش کی درپردہ مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ قریش کو مسلمانوں کے حالات کے بارے میں اطلاعات دیتے رہتے بلکہ بنو نضیر کا سردار کعب بن اشرف تو وقتاً فوقتاً قریش کو اکساتا رہتا۔ جنگ بدر میں جب قریش کو رسوا کن ہزیمت سے رسوا ہونا پڑا تو قریش پر جو مصیبت گزری سو گزری کعب بن اشرف نے ان سے بڑھ کر محسوس کیا اور بے ساختہ پکار اٹھا کہ "اب زمین کی سطح سے زمین کا پیٹ ہمارے

لیے بہتر ہے "یعنی اب زندگی میں کوئی مزہ نہیں اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ معظّمہ گیا وہاں قریش کے مقتولین کے مرثیے کہے اور ان کو اپنے مقتولین کا قصاص لینے کے لیے بہت شدت سے اکسایا۔ ان کی اس معاہدہ شکنی کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یوں تو تمام کافر بھی اپنے رویے کی وجہ سے بدترین خلائق ہیں لیکن خصوصاً یہود اور وہ قبائل جو عہد شکنی میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے وہ تو یقیناً حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں کیونکہ کافروں میں بھی کچھ نہ کچھ اخلاقی اصول تھے۔ انھیں میں سے یہ بات عربوں میں ہمیشہ مسلّم رہی کہ وہ عہد شکنی کو بہت بڑا عیب سمجھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قبائل کی زندگی میں عہد کی پابندی ایک بہت بڑا سہارا ہے اور اگر یہ سہارا ٹوٹ گیا تو اس کا انجام بہت خطرناک ہوگا۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہوئے انھیں کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اہل کتاب ہونے کے باجود نہ آخرت کا خوف تھا اور عرب میں رہنے کے باوجود نہ عہد شکنی کے انجام کی پروا تھی۔ ایسے لوگ ظاہر ہے اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کوئی بھی رعایت کی جائے اس لیے تیسری آیت کریمہ میں ان کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا گیا۔

یہود کی تاریخ یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر سازشی قوم روئے زمین پر کوئی نہیں۔ کہیں بھی حق اور صداقت کے خلاف کوئی سازش ہو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس کے پیچھے ڈور ہلانے والے یہود تھے۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے فتنے اٹھے ہیں آپ تحقیق کرکے دیکھ لیجئے ہر جگہ آپ کو فتنے کا تانا بانا تیار کرنے والا ہمیشہ یہودی ذہن نظر آئے گا۔ فتنے اٹھانا اور سازش کرنا اس میں کوئی قوم ان کی ہمسر نہیں لیکن جہاں تک میدان میں آکر جرأت اور بہادری سے مقابلہ کرنے کا تعلق ہے اس لحاظ سے وہ نہایت بزدل واقع ہوئے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں یہی فرمایا جارہا ہے کہ یہود خود کھل کر تمہارے مقابلے میں نہیں آئیں گے۔ البتہ ! یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے گروہ کے ساتھ مل کر یا اس کے پردے میں مسلمانوں سے دشمنی کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ہو تو پھر آپ لوگوں کو بھی اس بات کی ہرگز پروا نہیں کرنی چاہیے کہ آپ کے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہے کیونکہ معاہدے کی پابندی اس وقت ضروری ہوتی ہے، جب دونوں فریق اس کی پابندی کریں اور اگر ایک فریق معاہدے کی پروا نہیں کرتا تو دوسرے فریق کو بھی اجازت ہے کہ وہ اس معاہدہ شکنی کی دوسرے فریق کو سزا دے۔ چنانچہ یہاں یہی فرمایا جارہا ہے کہ اگر آپ یہود کے کچھ افراد کو دوسروں کی مدد کرتے ہوئے ان کی تائید میں لڑتا ہوا پالیں تو آپ ان کا وہ حشر کریں اور ایسی مار ماریں کہ نہ صرف ان کا دماغ درست ہوجائے بلکہ جو ان کے پشت پناہ ہیں اور پیچھے بیٹھ کر ڈوریاں ہلارہے ہیں ان کے حواس بھی ٹھکانے لگ جائیں۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝٥٦

لغۃ القرآن: الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [عٰهَدْتَّ : آپ نے " صلح کا " عہد لیا ہے] [مِنْهُمْ : ان سے] [ثُمَّ : پھر] [يَنْقُضُوْنَ : وہ سب توڑتے ہیں] [عَهْدَهُمْ : اپنے عہد کو] [فِيْ :

میں] [كُلِّ : ہر طرح] [مَرَّةٍ : مرتبہ] [وَهُمْ : اور وہ] [لَا : نہیں] [يَتَّقُوْنَ : سب بچے رہیں] [

ترجمہ: یہ (وہ) لوگ ہیں جن سے آپ نے (بارہا) عہد لیا پھر وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں اور وہ (اللہ سے) نہیں ڈرتے

تشریح:

شان نزول

اِنَّ شَرَّالدَّوَآبِّ "اور اس کے بعد کی آیتیں بنی قریظہ کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بنو قریظہ کے یہودیوں سے یہ معاہدہ تھا کہ وہ آپ سے لڑیں گے، نہ آپ کے دشمنوں کی مدد کریں گے۔ مشرکینِ مکہ نے جب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کی تو اس وقت بنو قریظہ نے یہ عہد توڑا اور ہتھیاروں سے ان مشرکین کی مدد کی، پھر انھوں نے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معذرت کی کہ ہم بھول گئے تھے اور ہم سے قصور ہوا اور دوبارہ عہد کیا، غزوہ خندق کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کفار کا ساتھ دے کر انھوں نے اس عہد کو بھی توڑ دیا۔

{ وَہُمۡ لَایَتَّقُوۡنَ : اور (اللہ سے) ڈرتے نہیں۔ } یعنی وہ نہ خدا سے ڈرتے ہیں نہ عہد شکنی کے خراب نتیجے سے اور نہ اس سے شرماتے ہیں حالانکہ عہد شکنی ہر عقلمند کے نزدیک شرمناک جرم ہے اور عہد شکنی کرنے والا سب کے نزدیک بے اعتبار ہو جاتا ہے جب اس کی بے غیرتی اس درجہ تک پہنچ گئی تو یقیناً وہ جانوروں سے بدتر ہیں۔

عہد شکنی کی مذمت

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ بندوں سے کیا ہوا جائز عہد توڑا جائے یا اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کی جائے دونوں انتہائی مذموم ہیں اور احادیث میں بھی عہد شکنی کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، چنانچہ اَحادیث ملاحظہ ہوں

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قیامت کے دن تین شخصوں کا مدِّمقابل ہوں گا، ایک وہ شخص جو میرے نام پر وعدہ دے پھر عہد شکنی کرے۔ دوسرا وہ شخص جو آزاد کو بیچے پھر اس کی قیمت کھائے۔ تیسرا وہ شخص جو مزدور سے کام پورا لے اور اس کی مزدوری نہ دے۔

(2)۔۔ حضرت علی المرتضیٰ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، جو کسی مسلمان کا عہد توڑے تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عہد کی پاسداری کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (تفسیر صراط الجنان)

(عَنۡ أَبِي هُرَيۡرَةَ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ آيَةُ الۡمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخۡلَفَ وَإِذَا اؤۡتُمِنَ خَانَ) [رواہ البخاری : کتاب الایمان، باب علامۃ المنافق]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ 1 جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ 2 جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔ 3 جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔"

(عَنۡ ابۡنِ عُمَرَ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَثَلُ الۡمُنَافِقِ كَمَثَلِ الشَّاةِ الۡعَاءِرَةِ بَيۡنَ الۡغَنَمَيۡنِ تَعِيرُ إِلَى هَذِهِ مَرَّةً وَإِلَى هَذِهِ مَرَّةً) [رواہ مسلم : کتاب صفات المنافقین]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بیان نقل کرتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق کی مثال دو ریوڑوں کے درمیان بکری کی ہے کبھی ایک طرف جاتی ہے اور کبھی دوسری جانب۔" (تفسیر فہم القرآن)

مورخین نے یہاں عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت معاویہ (رض) نے اہل روم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جب معاہدہ ختم ہونے کے قریب آیا تو انھوں نے عساکر اسلام کو رومیوں کی سرحد کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا جونہی فوج حرکت میں آئی حضرت امیر معاویہ (رض) کو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان سنایا گیا کہ یہ دشمن سے بھی عہد شکنی جائز نہیں اخلاقی خیانت ہے جس سے منع کیا گیا ہے امیر المومنین معاویہ (رض) نے یہ حدیث سنتے ہی فوجوں کو واپس بلالیا۔ (تفسیر فہم القرآن)

کافر لوگ اگر معاہدہ کے بعد غدر کریں تو سخت سزا کے مستحق ہوں گے

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ پہلی آیت "الذین عھدت منھم" میں یہود بنی قریظہ کا تذکرہ ہے ان لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے مقابلہ میں کسی کی مدد نہیں کریں گے پھر انہوں نے ہتھیار دے کر مشرکین کی مدد کی جب ان سے سوال کیا گیا تو کہنے لگے ہم بھول گئے تھے اس کے بعد پھر معاہدہ کیا تو اسے بھی توڑ دیا اور غزوہ خندق میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دشمنوں مشرکین مکہ کے مددگار بن گئے اور کھلم کھلا ابو سفیان کے ساتھ ساز باز کر کے کہنے لگے کہ تم ادھر سے مدینہ پر حملہ کرو ہم پیچھے سے حملہ کریں گے۔ ان کا سردار کعب بن اشرف مکہ معظّمہ گیا اور مشرکین مکہ سے معاہدہ کیا کہ ہم تمہارے ساتھ مل کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کریں گے یہاں تک کہ اس نے مشرکین کا حوصلہ بڑھا کر ان کے بتوں کو سجدہ بھی کیا جس سے مشرکین بڑے خوش ہوئے اور اس کی دوستی پر اعتماد کیا (سورۃ نساء میں دیکھیں) اسی کو فرمایا "ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم" پھر وہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔ "لایتقون" اور وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے ہیں۔

صاحب مظہری نے لکھا ہے کہ عبد بن حمید ابن جریر اور ابو نعیم نے بیان کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور داؤد اور حضرت داؤد بن سلمہ نے یہودیوں سے فرمایا کہ اگروہ یہود تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو مسلمان ہو جاؤ ہم جب مشرک تھے تو تم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لے کر ہم پر فتح یاب ہونے کی دعاء کرتے تھے اور ہم سے کہا کرتے تھے کہ ان کی بعثت ہونے والی ہے اور تم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف جمیلہ بھی بیان کیا کرتے تھے (تفصیل سورۃ بقرہ میں گذر چکی)۔

فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ ۔ سو اگر آپ انہیں جنگ میں پالے تو ان کے ذریعے ان لوگوں کو منتشر کر دی جو ان کے پیچھے ہیں یعنی لڑائی کے موقع پر آپ ان پر ایسا مضبوط حملہ کریں کہ یہ ناکام ہو جائیں ان کی ناکامی اور آپ کی کامیابی کا جب شور ہو گا تو ان کے پیچھے یعنی ان کے علاوہ جو بہت سے قبائل ہیں وہ بھی منتشر ہو جائیں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کریں گے "لعلھم یذکرون "تا کہ ان کو عبرت حاصل ہو اور وہ جان لے کے عہد شکنی کرنے والوں کا اور کفر سے چمٹنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

اہل ایمان عہد شکنی اور نفاق سے اور خیانت سے دور رہیں

اہل ایمان کو کبھی نہ کبھی عہد کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور یہ جب ہوتا ہے جب دشمن سے خطرہ ہو کہ وہ اپنا عہد توڑنے والا ہے اگر ہم نے اپنے عہد کی پاسداری کی اور انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا اور اچانک غفلت میں انہوں نے حملہ کر دیا تو ہمیں تکلیف پہنچے گی ایسے موقع پر طریقہ کار یہ ہے کہ خود ان پر غفلت میں حملہ نہ کریہاں ایسا کریں گے پہلے اعلان کریں اطلاع دی اور ان کو بتادیں کہ ہمارا تمہارا جو معاہدہ تھا ہم اسے ختم کر رہے ہیں اسی کو فرمایا وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو جو عہد اپنے ان سے کیا ہوا ہے وہ ان کی طرف پھینک دیجئے تا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور وہ اس بات کے جاننے میں برابر ہو جائیں گے اب معاہدہ باقی نہیں رہا اگر معاہدہ کیا اور ان کا معاہدہ واپس نہ کیا اور معاہدہ ختم کرنے کی اطلاع کے بغیر ان پر حملہ کیا تو یہ غدر ہو گا اور خیانت ہو گی جس کی اسلام میں ہر گز اجازت نہیں ہے اسی کو واضح کیا کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ۔ بلاشبہ حق سبحانہ وتعالی خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہو سکتا ہے کہ بعد مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ چونکہ دشمن تو دشمن ہیں ہے کچھ بھروسہ نہیں کہ وہ اپنا عہد توڑ دے اس لیے ہم اپنی حفاظت کے لئے پہلے حملہ کر دیں تو ہماری حفاظت ہو جائے گی یا یہ کہ کفار و مشرکین خدا کے باقی نافرمان ہیں ہمیں کیا ضرورت کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کریں اس خیال کو دفع کرنے کے لئے یہ نصیحت فرمائی کہ وہ کافر تمہارے رب کے اور تمہارے دشمن ہیں لیکن جب معاہدہ ہو گیا تو اب تمہارے لیے معاہدہ کی خلاف ورزی کبھی جائز نہیں اگر ان سے عہد کی خلاف ورزی کا ڈر ہے تو تم پہلے انہیں بتادو کہ ہمارا عہد ختم ہے اس کے بعد تمہیں حملہ کرنا جائز ہو جائے گا۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ عہد کی پاسداری کا شریعت اسلامیہ میں کتنا ہی اہتمام ہے مسلمان کے ساتھ یہ رواداری تو درکنار غیر مسلم کو فار کے ساتھ بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہے اسی بنیاد پر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام دین رحمت ہے اور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رحمۃ للعالمین ہیں کیا کوئی مذہب وملت ایسے انصاف اور ایسی بے مثال رواداری کا کوئی ثبوت پیش کر سکتا ہے۔

یہودیوں کی عہد شکنی

حافظ محمد یوسف الصالحہ نے سبیل الرشاد فی ھدی خیر العباد میں لکھا ہے کہ بنی قینقاع کے یہودیوں نے عہد شکنی کی تھی سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا تھا اور بغاوت وخیانت کا مظاہرہ کیا تھا وہ یہ کہ ایک برقع پوش عربی عورت بنوں کا نکاح کے بازار میں آئیں

اور زیور خریدنے کے لئے ایک یہودی سنار کے پاس بیٹھ گئی لوگوں نے اس کا نقاب اتروانا چاہا لیکن اس نے نقاب کھولنے سے انکار کیا سنار نے اس کے کپڑے کا کنارہ کسی کانٹے میں الجھادیا عورت جو نادانستگی میں اٹھی تو ننگی ہوگئی لوگ اس پر ہنس پڑے اور عورت چیخنے لگی اس کی چیخ سن کر وہاں موجود ایک مسلمان نے سنار پر حملہ کردیا اور اس کو قتل کردیا یہودیوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا شہید کردیا اور مسلمانوں سے کیا ہوا عہد توڑدیا مقتول مسلمان کے رشتہ داروں نے مسلمانوں سے فریاد کی مسلمان غضب ناک ہوگئے اس طرح مسلمانوں اور بنی قینقاع کہ یہودیوں میں جھگڑا ہوگیا اس پر وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ آیت نازل ہوئی اور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) کا لشکر لے کر یہودیوں کا محاصرہ فرمایا اور پندرہ روز تک محاصرہ جاری رکھنے کے بعد تین روز کے اندر اندر انہیں مدینہ طیبہ سے جلاوطن فرمادیا وہ وہاں سے نکل کر خیبر چلے گئے۔

ایک روایت میں

منافق کی 4 علامات کا بیان

سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس میں یہ چار چیزیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور ان چار میں سے جس میں ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کا ایک حصہ مانا جائے گا جب تک کے اسے چھوڑ نہ دے۔

1۔ پھر جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

2۔ اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

3۔ اور جب معاہدہ کرے تو دھوکا دے (نقض عہد کرے)

4۔ اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے (بدزبانی کرے) (رواہ البخاری)

لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ ان چیزوں سے اجتناب کرے اور اگر کسی سے معاہدہ کرے تو اس کی پاسداری کرے حکومت سے معاہدہ ہو یا کسی جماعت سے یا کسی فرد سے اس کی خلاف ورزی گناہ کبیرہ اور حرام ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝57

لغۃ القرآن: فَاِمَّا : پس اگر] [تَثْقَفَنَّهُمْ : ضرور تم پاؤ انہیں] [فِي : میں] [الْحَرْبِ : جنگ] [فَشَرِّدْ : تو بھگا دو] [بِهِمْ : ان سب کا] [مَنْ : جس پر] [خَلْفَهُمْ : ان کے پیچھے ہیں] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [يَذَّكَّرُوْنَ : سب نصیحت حاصل کریں] [

ترجمہ: سو اگر آپ انھیں (میدانِ) جنگ میں پالیں تو ان کے عبرت ناک قتل کے ذریعے ان کے پچھلوں کو (بھی) بھگا دیں تاکہ انھیں نصیحت حاصل ہو

تشریح:

یہ ایک عجیب انداز کلام ہے۔ اس میں ایک خوفناک گرفت اور ہول ناک رعب و دبدبہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے سنتے ہی انسان بھاگنے اور اپنا مقام چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ حال تو ان لوگوں کا ہو جائے گا جو سنیں اور دیکھیں۔ رہے وہ لوگ جن کو یہ سزا دی جائے تو ان کی حالت تو معلوم ہے کہ کیا ہو گی؟ یہ وہ ضرب ہے جس کا حکم اللہ نے اپنے رسول کو دیا ہے اور خوفناک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کے لیے عبرتناک بھی ہے جنہوں نے نقص عہد کی تیاری کر رکھی ہو، جنہوں نے انسانی قواعد و ضوابط کو چھوڑ دیا ہو۔ یہ ہدایات اس لیے دی گئیں تاکہ اسلامی محاذ امن کا سانس لے اور اس کی ہیبت کی وجہ سے خارجی قوتیں، جو بھی ہوں، اس قدر سہم جائیں کہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں خواہ وہ قریب کی ہوں یا دور کی ہوں۔

اسلامی نظام حیات کا یہ مزاج ہے اور اسلامی تحریک کے ذہن میں اسے اچھی طرح بیٹھ جانا چاہیے کہ اس دین کے لیے ہیبت اور رعب ضروری ہے، اس کے لیے قوت ضروری ہے۔ اس کے لیے خوفناک شان لازمی ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان طاغوتی قوتوں کو مرعوب کر دیا جائے تاکہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں، اس لیے کہ اسلام پورے کرہ ارض پر انسانوں کی آزادی کا علمبردار ہے اور وہ انسان کو ہر طاغوتی قوت سے نجات دینا چاہتا ہے، جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس دین کا طریق کار یہ ہے کہ محض دعوت و تبلیغ سے کام لیا جائے اور ان مادی رکاوٹوں کو نہ چھیڑا جائے جو طاغوت نے کھڑی کر دی ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس دین کے مزاج کو بالکل نہیں سمجھا ہے۔

یہ تو تھا پہلا حکم ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے عملاً نقص عہد کا ارتکاب کر لیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ان کی ایسی خبر لی جائے اور ان پر ایسی فیصلہ کن ضرب لگائی جائے کہ ان کے لیے اور کے بعد دوسرے دیکھنے سننے والوں کے لیے عبرت ہو اور ان کے کیمپوں میں خوف طاری کر دے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

سزاؤں کی حکمت

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں ہر وہ جائز طریقہ استعمال کرنا درست ہے جو کفار کی ہمت توڑ دے۔ سزاؤں کے پیچھے اکثر و بیشتر یہی عوامل کار فرما ہوتے ہیں کہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ ایسی حرکتیں نہ کریں۔ (تفسیر صراط الجنان)
یعنی اگر ایسے عہد شکن کافر جنگ میں سامنے آجائیں تو انھیں ایسی مار مارو کے دوسروں کو بھی نصیحت ہو جائے اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو وہ عہد شکنی کو وطیرہ بنالیں گے اور تمھیں ہر موقع پر نقصان دیتے رہیں گے اور تم ان کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جاؤ گے۔

دور حاضر کے کفار کی مسلمانوں سے بدعہدیاں

آج مسلمانوں کی یہی حالت ہے اقوام متحدہ پچاس سے زائد بار یہ قرارداد پاس کر چکی ہے کہ کشمیر میں استصواب رائے کرایا جائے اور کشمیریوں کی اکثریت جو رائے دی اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے مگر ہندو قوم نے آج تک کسی قرارداد کا نوٹس نہیں لیا، تو اقوام متحدہ اس بارے میں بھارت سے باز پرس کیوں نہیں کرتی؟ وجہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ امریکہ کی ایک لونڈی ہے۔
اقوام متحدہ کے تحت سب اقوام یہ معاہدہ کر چکی ہیں کہ کوئی ملک دوسرے ملک کی زمین پر قبضہ نہیں کرے گا مگر اس کے بعد اسرائیل نے شام، اردن اور لبنان کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا مگر کیا کسی نے بڑھ کر اسرائیل کا راستہ روکنے کی کوشش کی؟ کیا یہ بدعہدی نہیں؟ یوں لگتا ہے کہ اقوام متحدہ کا ادارہ صرف مسلمانوں کو باندھ کر مارنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ مسلم ممالک سے کہا جاتا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے ہر فیصلہ کی پاسداری کریں مگر مسلمانوں سے روا رکھے جانے والے مظالم کی کسی کو پروا نہیں ہے۔
2007 میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا الزام یہ رکھا کہ عراق ایٹمی اسلحہ بنا رہا ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ کے تحقیق کاروں کی ایک فوج عراق میں آئی، انھوں نے پورے ملک کا چپہ چپہ چھان مارا ان کو کہیں سے کوئی ثبوت نہ ملا کہ عراق میں کسی جگہ ایٹمی اسلحہ بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے سربراہ نے کہہ دیا کہ عراق کے پاس ایٹمی اسلحہ بنانے کی کوئی ابتدائی طاقت بھی نہیں ہے، للذا عراق پر حملہ کرنے سے باز رہا جائے۔ مگر اس کی کسی نے نہ سنی اور امریکہ نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ عراق پر حملہ کر دیا۔ پانچ ہزار سے زائد عراقی مسلمانوں کا خون بہہ گیا اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی مگر کسی کو امریکہ کے سامنے اف کہنے کی جرات نہ ہوئی۔
اسی طرح جب امریکہ میں گیارہ ستمبر کا واقعہ ہوا تو امریکہ نے کسی حتمی ثبوت کے بغیر کہ افغانی حکومت اس کی ذمہ دار ہے صرف بدمعاشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان پر حلہ کر دیا اور وہاں سب کچھ تہس نہس کر دیا۔
پھر مسلمان ممالک خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ قرآن تو حکم دیتا ہے بدادی کرنے والے کافروں کو وہ مار مارو کہ ان کے پچھلوں کو بھی نصیحت ہو جائے۔
نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے ہی کیا جب غزوہ احزاب کے موقع پر یہود بنی قریظہ نے بدعہدی کر کے قریش مکہ کا ساتھ دیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں 10 دنوں میں مدینہ طیبہ سے نکل جانے کا حکم دیا جب وہ نہ نکلے تو ان کے سب مردوں کو ایک ہی رات میں تہہ تیغ کر دیا گیا جن کی تعداد چار سو اور ایک روایت میں 900 تھی۔ یوں ہی جب یہود بنو نضیر نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سازش سے شہید کرنا چاہا اور ان کی سازش ثابت ہو گئی تو ان کی اس بدعہدی اور دیگر بدعہدیوں کے سبب مدینہ طیبہ سے نکال دیا۔ اسی طرح جب کفار نے

معاہدہ حدیبیہ کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر شب خون مارا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی وقت معاہدہ حدیبیہ کے ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد حملہ کر کے مکہ کو فتح کر لیا۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ ۞ 58

لغۃ القرآن: وَاِمَّا : اور اگر] [تَخَافَنَّ : آپ واقعتا ڈریں] [مِّنْ : سے] [قَوْمٍ : کسی قوم کی] [خِيَانَةً : خیانت " بدعہدی " پر] [فَانْۢبِذْ : تو آپ پھینک دیں] [اِلَيْهِمْ : انکی طرف] [عَلٰي : پر] [سَوَآءٍ : مساوی طور] [نَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [لَا : نہیں] [يُحِبُّ : پسند کرتا ہے] [الْخَآئِنِيْنَ : سب خیانت کرنے والوں کو] [

ترجمہ: اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو ان کا عہد ان کی طرف برابری کی بنیاد پر پھینک دیں۔ بیشک اللہ دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا

تشریح:

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ جب معاہد قوم سے ایسے آثار ظاہر ہوں جن سے ان کی غداری اور خیانت کا پتہ چلتا ہو تو پہلے ان کا معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کر دو تاکہ تمہاری طرح ان کو بھی علم ہو جائے کہ اب معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ان کے خلاف کارروائی کرو لیکن اگر انھوں نے کھلم کھلا عہد شکنی کر دی تو پھر کسی تکلف کی ضرورت نہیں اور بغیر بتائے مناسب قدم اٹھا سکتے ہو۔ (تفسیر قرطبیؒ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح اعلان کر دیا کہ وہ عہد شکنی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اس لیے کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ عہد شکنی کی ابتداء کرے، ہاں اگر دوسری قوم سے عہد شکنی کے آثار ظاہر ہوں تو ان کو اعلانیہ بتا دیا جائے کہ تمہارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں اس لیے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے تاکہ مسلمانوں پر عہد شکنی کی ابتداء کا الزام نہ آئے۔ یہ اسلامی تعلیم کا کمال ہے کہ ایک خائن قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دی بلکہ حکم دیا کہ پہلے اس خائن قوم کو معاہدہ ختم ہونے کی واضح خبر دو اور اس کے بعد اس کے خلاف عملی کارروائی کرو۔ (تفسیر امداد الکرم)

اسلام خیانت کے سخت خلاف ہے

اور وہ ان لوگوں کو بہت ہی حقیر سمجھتا ہے جو نقص عہد کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا اسلام اپنے پیروکاروں کو عہد میں خیانت کی اجازت نہیں دیتا۔ اگرچہ جن اہداف وغآیات کے لیے یہ حرکت کی جارہی ہو، وہ بہت ہی بلند ہوں۔ نفس انسانی کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔ ایک بار انسان حقیر اور خسیس طریقے کرنا شروع کردے وہ کبھی بھی اعلی اور شریفانہ طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اچھے مقاصد کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کو جائز سمجھتا ہو۔ لہٰذا یہ اصول اسلامی سوچ اور اسلامی شعور کے لیے بالکل اجنبی ہے کیونکہ اسلامی ذہنیت میں مقاصد اور وسائل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ ایک مسلمان اگر پاک وصاف جگہ پر پہنچنا چاہتا ہے تو وہ گندے کیچڑ سے ہو کر نہ گزرے گا کیونکہ ان کے گندے پاؤں صاف جگہ کو بھی گندا کر دیں گے۔ اگر کوئی اسے جائز سمجھتا ہے تو وہ خائن ہے اور اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان اللہ لایحب الخائنین ہمیں یہاں ذرا یہ غور کرنا چاہیے کہ جن حالات میں یہ احکام نازل ہو رہے تھے۔ ان حالات میں انسانیت کا مقام کیا تھا۔ ان میں انسانیت کے سامنے اس قدر بلند نصب العین نہ تھا۔ اس دور میں باہم لڑنے والے جنگل کے قانون پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس وقت ڈنڈے کا قانون چل رہا تھا اور ڈنڈے اور لوٹ پر کوئی قید وبند نہ تھا اور اس وقت سے لے کر اٹھارہویں صدی تک دنیا میں یہی جنگل کا قانون مروج رہا ہے اور یورپ تو خصوصاً اس قدر اندھیرے میں تھا کہ اسے اس وقت تک قانون بین الاقوام کا علم ہی نہ تھا۔ یہ روشنی اس نے اس وقت حاصل کی تھی جب اس کا واسطہ اسلامی ممالک سے بڑا اور آج تک بین الاقوامی معاملات میں یورپ اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جس تک اسلامی نظام ایک جست میں پہنچا۔ حالانکہ یورپ نے کم از کم بین الاقوامی قانون کا نام سن لیا تھا۔ جو لوگ آج یورپ کی صنعتی ترقی سے مرعوب ہیں ان کو اس موضوع پر غور کرنا چاہیے اور اسلام کے بین الاقوامی قانون اور دور جدید کے قانون نظاموں کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

سوال: خیانت کے خطرہ سے عہد کو توڑنا کیسے درست ہے جبکہ خطرہ محض گمان ہے نہ کہ یقین

الجواب: بات وہ نہیں جو تم نے سمجھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے دشمن کی جانب سے خیانت کی علامات ظاہر ہو جائیں اور تم پر ان کے حملے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں صلح کی چابیاں پھینک کر ان سے لڑائی کا اعلان کر دو۔ یہ اسی طرح ہے جیسا بنو قریظہ نے کیا جبکہ انہوں نے ابوسفیان اور ان کے ساتھ والے لوگوں سے ساز باز کی اور آپ کے خلاف لڑائی میں ان کا ساتھ دیا جب کہ ان کا آپ کے ساتھ عہد و پیمان صلح تھا کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قتال نہ کریں گے ان کا اس بات کو قبول کر لینا وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے دھوکہ کے خوف کو لازم کرنے والا تھا اسی طرح ہر اس قوم کا حکم ہے جو مومنوں کو چھوڑنے والی ہو اور امام المسلمین کے ساتھ اس کی دھوکہ بازی کے دلائل اس طرح ظاہر ہو جائیں جیسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے بنو قریظہ سے متعلق ظاہر ہوئے تو اس وقت خلیفہ اسلام پر لازم ہے کہ ان کا عہد برابری میں اس کی طرف واپس کر دے اور ان کے ساتھ اعلان جنگ کر دے۔

" علی سواء " کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور انکا علم اس سلسلہ میں برابر ہو جائے کہ ہر ایک فریق دوسرے کا مخالف ہے اس کے ساتھ مصالحت کرنے والا نہیں۔ (تفسیر طبری)

اما تخافن

یہ تخافن میں جن کو مخاطب کیا جارہا ہے وہ مسلمانوں کے سیاسی راہ نما ہیں۔ مسلمانوں کے سیاسی راہ نماؤں سے دراصل بات کی جارہی ہے۔ Context یہ ہے۔اس کے بعد ظاہر ہے اس کو پیچھے لے کر آگے جائیں کہ افراد بھی افراد سے معاہدہ کریں۔ تب بھی اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس میں خیانت کرے۔ لیکن یہاں جو مخاطب ہیں وہ مسلمانوں کے سیاسی راہ نماؤں سے بات کی جارہی ہے۔ یوں سمجھیں کہ یہاں پر سیاسی تقوی ہے جو کہ سکھایا جارہاہے۔ تقوی کا تعلق صرف نماز روزے۔ حج۔ زکوۃ سے نہیں ہے۔ اور صرف مسلمانوں کے آپس کے معاملات سے نہیں ہے بلکہ تقوی تو Political level پر بھی ہے انٹرینشنل لیول پر بھی ہے۔ کفار سے معاملہ کرتے ہو کے بھی تقوی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا۔ تو سیاسی تقوی ہے جس کی یہاں پر تاکید کی جارہی ہے۔ یعنی جس قوم کے ساتھ ڈپلومٹیک Ties ہوں سفارتی تعلقات ہوں ان کے معاملے میں سفارتی تعلقات رکھتے ہوئے۔ اندر ہی اندر چپکے چپکے جنگی تیاریاں کرنا اس کو دراصل خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جنگ کا ذکر چل رہا ہے Context کو دیکھیں۔ یہ ایک پنسل کی یا ایک کپڑے کی خیانت کی بات نہیں ہے یہ معاہدوں کے اندر خیانت کی بات کی جارہی ہے۔ ہم نے پڑھا تھا سورۃ المائدہ میں آیت۔ یا ایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے معاہدے پورے کرو۔ تو یہ ان ہی معاہدوں کی خلاف ورزی سے بچنے کی یہاں تاکید کی جارہی ہے۔ اور معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کو خیانت سے تعبیر کیا جا رہاہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں نصیحت فرمائی ہے۔ جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر۔ اپنے خطبوں میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ۔ لا ایمان لمن لا امانۃ لہ۔ اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت نہیں۔ لا دین لمن لا عہد لہ۔ اور اس شخص میں کوئی دین نہیں جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا۔ لا دین۔ کوئی دین نہیں۔ جو اپنے عہد کو نہیں نبھاتا۔ تو اگر کسی ملک سے کوئی معاہدہ ہو۔ اور اس ملک سے کوئی شکایت پیدا ہو جائے۔ کوئی شخص ہے اگر انفرادی سطح پر بھی ہم دیکھیں۔ یا کوئی ملک ہے۔ اس سے معاہدہ ہے۔ اور کوئی اس شخص سے یا اس ملک سے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے یا یہ Feel ہونے لگ جائے کہ یہ موقع پاتے ہی معاہدے کی خلاف ورزی کریں گے یا جس کو ہم کہیں کہ ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپیں گے۔ سازشیں کر کے یہ ہمیں نقصان پہنچائیں گے، تو دوسرے فریق کو صاف بتادیں کہ ہمارا تمہارا اب کوئی معاہدہ نہیں۔ یہ جو فرمایا۔ تو پھینک دو ان کی طرف برابری سے۔ کیا پھینک دو۔ معاہدہ یعنی کہ تم Openly اس معاہدہ کو ان کے علم میں لا کر بتادو کہ ہم اب اس معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ ہم معاہدے توڑ رہے ہیں۔ Opposite پارٹی کو صاف بتادو کہ ہمارا تمہارا کوئی معاہدہ نہیں۔ یہ ان کو بتانے کے بعد۔ ان کے علم میں لانے کے بعد ان کے خلاف اب کوئی Offensive تیار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے خلاف اب کسی کارروائی کی شروعات کی جاسکتی ہیں۔

بڑے اعلی اخلاق کی تعلیم دی جارہی ہے لیکن جب اللہ نے فرمادیا کہ میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ دین influent نہ ہوتا ہو۔ قرآن کے یہ جو قوانین ہیں نافذ نہ ہوئے ہوں۔ یہ الحمد للہ نافذ ہوئے۔ یہی رومی علاقے پر حملہ کر دیا جائے گا۔ اس زمانے میں ایک صحابی موجود تھے۔ امر بن عنبشہ (رض) ان کا نام آتا ہے جب ان کو یہ پتہ چلا تو انھوں نے یہ حدیث سنائی کہ تم معاشرے کا بند

نہیں کھول سکتے۔ ان کو بتائے بغیر جو نہی حدیث امیر معاویہ کے سامنے پیش کی گئی انھوں نے فورا بات مانی اور سر حد پر سے فوجیں جو جمع کی تھیں ان کو وہاں سے اٹھالیا۔ بھی ایک حدیث پر وہ اس طرح سے اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیا کرتے تھے تو پتہ یہ چلا کہ اسلام قطعی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی ملک سے تجارت ہو رہی ہو۔ ایمبسنیز قائم ہوں۔ ان سے کرکٹ میچز ہو رہے ہوں۔ ان کے فلمی ستاروں کو تمغے مل رہے ہو ان کے وفد آ رہے ہوں۔ ان کی پکچریں دکھائی جارہی ہوں۔ اپنے ملک میں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ملک میں گوریلا warfare چل رہی ہو Underground موومنٹ کوئی چل رہی ہو۔ یہ چیز بالکل اسلام میں پسندیدہ نہیں۔ کہ اوپر اوپر تو ہاتھ ملا رہے ہیں اور میز کے نیچے سے ٹانگ گھسیٹ رہے ہیں اس کی تعلیم اسلام نہیں دیتا ہم کو، ہاں اگر کوئی دو دوسری پارٹی یہ کام کرے کہ جس سے صاف ظاہر ہو کہ ان کی طرف سے معاہدہ ٹوٹ گیا جیسے کہ قریش نے صلح حدیبیہ میں کیا تھا انھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی تو Opposite پارٹی وہ اگر معاہدے کی خلاف ورزی ک کرتی ہے تو اس کو معاہدہ ٹوٹنے سے تعبیر کیا جائے گا۔ اب تم کو ان کو انفارم کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب انھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کر لی تو معاہدہ تو انھوں نے خود توڑ دیا۔ جیسے کہ صلح حدیبیہ کے ساتھ قریش نے معاملہ کیا تھا، تو اب تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یا مسلمانوں پر کچھ بھی لازم نہ تھا کہ وہ ان کو بتائے کہ ہم نے تم سے معاہدہ ختم کر دیا۔ وہ تو Understood چیز ہے۔ اب طاقت کا استعمال ان کے خلاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ دونوں فریقوں کے علم میں یہ بات موجود ہے کہ اب کوئی معاہدہ باقی نہیں ہے۔ (تفسیر تنویر)

آج مسلمانوں پر لازم ہے کہ اقوام متحدہ سے باہر نکل آئیں

اس حکم کی روشنی میں آج مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ موجودہ اقوام متحدہ سے باہر نکل آئیں اور مسلم اقوام متحدہ (Muslim United Nations) کا قیام عمل میں لائیں۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے معاہدوں کو امریکہ اسرائیل اور بھارت مسلسل توڑ رہے ہیں اور انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں اور اللہ کا حکم ہے کہ خیانت کرنے والوں کا معاہدہ ان کے منہ پر مار دو۔ (فانبذ الیھم علی سواء) قریش مکہ نے جب معاہدہ حدیبیہ کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں فوراً پیغام بھجوایا کہ ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہے۔ اس کے بعد آپ نے قریش پر حملہ کر کے مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا۔ اس موضوع پر ہم پیچھے سورۃ نساء آیت 91 کے تحت بھی کلام کر آئے ہیں وہاں دیکھ لیں، مگر یہ ایسا قدم اٹھانے سے قبل ممالک اسلامیہ کے مابین گہرا اتحاد و اتفاق ضروری ہے اس کے بغیر یہ قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنی مادی مالی اور عسکری و جنگی قوت کو یکجا مجتمع کریں۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ○59

لغۃ القرآن: وَلَا : اور نہ] [يَحْسَبَنَّ : وہ ہرگز خیال کریں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [كَفَرُوْا : سب نے کفر کیا] [سَبَقُوْا :" کہ بچ کر " وہ سب نکل گئے] [اِنَّهُمْ : بیشک وہ] [لَا : نہیں] [يُعْجِزُوْنَ : وہ سب عاجز کرسکتے " اللہ کو "] [

ترجمہ: اور کافر لوگ اس گمان میں ہر گز نہ رہیں کہ وہ (بچ کر) نکل گئے۔ بیشک وہ (ہمیں) عاجز نہیں کر سکتے

تشریح: یعنی جو کفار جنگ بدر سے بھاگ کر قتل اور قید سے بچ گئے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے وہ اپنے آپ کو ہماری قدرت اور پکڑ سے باہر نہ سمجھیں ہم ہر طرح پکڑنے پر قادر ہیں۔

کوئی خود کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے باہر نہ جانے

اس آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو بیماری، مصیبت اور کوئی آفت آنے کی صورت میں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی توبہ کرتے اور ساری زندگی گناہوں سے دور رہنے اور اطاعت و فرماں برداری میں مصروف رہنے کا عہد کرتے ہیں لیکن جب تندرست ہو جاتے اور مصیبت و آفت سے باہر نکل آتے ہیں تو ان کے دوبارہ وہی پرانے لچھن شروع ہو جاتے ہیں۔ انھیں یہ بات اچھی طرح یاد رکھ لینی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پکڑ سے کسی صورت باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں ہر حال میں اور ہر طرح سے پکڑنے پر قادر ہے۔ مسلمان ایسا اعتقاد تو یقیناً نہیں رکھتا لیکن عمل کے معاملے میں بہر حال حالت بہتر نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

دشمنانِ اسلام کو وارننگ

جنگ بدر میں جو لوگ بچ کر نکل گئے وہ بجائے نصیحت حاصل کرنے کے آئندہ کے لیے اسلام کے خلاف مزید منصوبہ بندیوں میں مصروف ہوگئے۔ قافلہ تجارت کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کے استیصال میں صرف کرنے کے فیصلے ہونے لگے۔ یہود نے اس آگ میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے قریش کے حوصلے بڑھائے اور انھیں یقین دلایا کہ تم نے جلد بازی میں مکمل تیاری کیے بغیر لڑائی کا ڈول ڈال دیا۔ لیکن اس لڑائی کو آخری لڑائی مت سمجھو۔ ابھی تو آغاز ہوا ہے مستقبل تمہارا ہے۔ جو لوگ بچ کر آ گئے ہیں وہ مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ قریش اور دوسرے دشمنان دین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ (یہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ وہ ہم سے بچ کر نکل گئے ہیں اور آئندہ وہ ہمارے قابو میں نہیں آئیں گے) انھیں اللہ کی بے پناہ قدرتوں کا علم نہیں۔ انھیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اب وہ ہماری گرفت میں نہیں آ سکتے۔ جو لوگ جنگ بدر میں بچ کر نکلے تھے انھیں بچ نکلنے کا موقع اس لیے دیا گیا تاکہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر راہ ہدایت اختیار کریں۔ یہ

مہلت ان کے لیے رحمت ثابت ہو سکتی ہے بشر طیکہ اسلام کی آغوش میں آ جائیں ورنہ یہی مہلت ان کے جرائم کو بڑھانے اور فائل کو موٹا کرنے میں موثر ہو گی اس کے بعد جب اللہ کی گرفت آئے گی تو پھر ان کے لیے بھاگ نکلنے کا کوئی موقع نہیں ہو گا۔
انهم لایعجزون ۔۔اعجزہ الصید کے معنی ہیں فاتہ ولم یقدر علیہ "شکار قابو سے باہر نکل گیا، پکڑا نہ جا سکا"۔ یہ لوگ ایسا شکار نہیں جو اللہ کے ہاتھ سے نکل گیا ہو اور اب وہ قابو میں نہیں آ سکتا کیونکہ اللہ کی قدرت اور طاقت اس قدر عظیم ہے کہ وہ جب کسی کو پکڑنے پر آتا ہے تو اس کے بچ نکلنے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور جب اسے بچ نکلنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ابھی مزید سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے۔ پکڑنے میں جلد بازی کرنا کمزور حکمرانوں کا کام ہے۔ وہ اپنی کمزوری کے باعث خدشات کا شکار رہتے ہیں، لیکن طاقتور حکمران مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتے انھیں یقین ہوتا ہے کہ جب چاہیں گے پکڑ لیں گے۔ (تفسیر روح القرآن)
کوئی انسان کتنا ہی طاقتور اور محفوظ ہو وہ اللہ تعالیٰ سے اور اس کی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتا اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قوت کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہے۔

جس طرح جہاد فرض ہے اسی طرح اس کے لئے سامان حرب کی پوری تیاری بھی فرض ہے

اس کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم سے جو بھی کچھ ہو سکے دشمنوں سے لڑنے اور ان کا دفاع کرنے کے لئے ہر طرح کی قوت واسلحہ سامان حرب اسباب جنگ تیار رکھو جب کفر قیامت تک رہے تو تمہارا جہاد و قتال بھی قیامت تک رہے گا کفر کی دشمنی اور تمہارے خلاف یلغار جب دائمی اور ہر زمانہ میں جاری ہے تو تمہاری طرف سے بھی اسی طرح اسباب وآلات حرب کی تیاری بھی ضروری ہے جیسا مرض ویسا علاج پھر فرمایا "ما استطعتم " یہ لفظ بہت عام ہے ہر زمانے کی ضرورت کے مطابق تیاری کرنے کو شامل ہے اور "من قوة " کا لفظ بھی نکلا ہے اور عام ہے ہر قسم کی قوت جمع کرنے کو اس کا عموم شامل ہے جس طرح کی تدبیروں کی جس طرح کے ہتھیاروں کی جس زمانہ میں ضرورت ہو ان سب کا بنانا جمع کرنا خرید نا سیکھنا سکھانا فراہم کرنا اور دوسری ہر طرح کی قوتیں اتحاد اتحاد مشورہ ایفائے عہد تقوی امانت دیانت یہ سب لفظ "من قوة "میں داخل ہیں اور یاد رہے کہ سارے ظاہری اسباب پر جو قوت اور اثر روحانی تقوی اور اخلاص کا ہے وہ مسلم اور یقینی ہے مسلمانوں نے اسی کی بنیاد پر بڑی بڑی عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل کیا اور کرہ ارض پر چھا گئے "نیز من رباط الخیل " پلے ہوئے باندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھنے کا بھی حکم فرمایا اس میں کوئی تخصیص نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ سواری کے تمام اسباب کو مہیا کیا جائے جیسے کہ آج کی دنیا میں کاروں گاڑیوں اور ٹرکوں بسوں کا زمانہ ہے تو بکثرت ان چیزوں کی فراہمی اسی طرح ضروری ہے جس طرح سے زمانہ میں گھوڑے گدھے خچروں اور اونٹوں کا ہوتا تھا پھر آج کی ترقی یافتہ زمانہ میں بھی اونچے اونچے اور ناہموار پہاڑی دروں میں جہاں جیپ ور ٹرکوں سے کام لینا مشکل ہے وہاں یہی گھوڑے گدھے اور خچر وسے باآسانی ہر طرح کا کام لیا جا سکتا ہے بہر حال حکم یہ ہے کہ زمانہ کی ترقی اور رفتار کے ساتھ ہر قسم کی جو تیاری ممکن ہو دسترس میں تیار رکھو اور مہیا کرو اسی نقطہ کے پیش نظر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "الا ان القوة

الرمی، الا ان القوۃ الرمی، الا ان القوۃ الرمی "(رواہ مسلم) یعنی قوت تیر پھینکنا ہے یہ حسن مراد نہیں بلکہ اس زمانے میں سب سے بڑی قوت جو ہوتی تھی اس کی نشاندہی ہے کہ تلوار صرف آمنے سامنے پر کارآمد ہے جبکہ تیراندازی دور اور نزدیک ہر وقت کارآمد ہے حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) کو خطاب فرماکر کہا "ارم یا سعد فداک ابی وامی "(رواہ البخار) اس عظیم خطاب کے بعد جہاد کی اہمیت منقبت پر روشنی پڑتی ہے کہ اس کا بہت اونچا مقام ہے اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) سے فرمایا کہ اپنے تیروں کو بچہ ہو اندھا دھند تیر باری نہ کرو جب دشمن کثرت کے ساتھ نزدیک ہو تو تیر مارو۔((رواہ البخاری)

زمانہ بدلنے کے ساتھ طریقہ جنگ اور آلات جنگ بدل گئے

سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان گرامی "الا ان القوۃ الرمی "یہ حصر کے لئے نہیں اس کا عموم دور حاضر کے راکٹ بم اور ہر طرح کے سامان جنگ ہو شامل ہے کیونکہ لفظ الرمی کا مفعول ذکر نہیں فرمایا تو اس نے اس طرف اشارہ ہے کہ پھینکنے کی جب کوئی چیز ایجاد ہو جائے وہ سب "قوۃ "اور "الرمی "کے مفہوم میں داخل ہو جائے گی اور مسلمانوں کو اس کے حاصل کرنے کا اہتمام بھی لازم ہو گا جدید ہتھیار راکٹ میزائل بم وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہو جائیں گے اور آیت کریمہ کا عمومی معنی سب پر حاوی رہے گا۔

پس مسلمانوں کو چاہیے کہ یہ ہتھیار خود بنائے بصورت دیگر دوسروں سے خرید کرلے جدید ہتھیار بنانے کے اسباب قوت عقلیہ مادی اشیا اور محنت وجفاکشی اور سرمایہ اقتصادی قوت سب ضروری ہے آج مسلمانوں کے پاس بڑی کثرت کے ساتھ یہ سارے وسائل موجود ہیں سوائے محنت اور جفاکشی کے جو کہ عیاشی خوشحالی تن آسانی کی وجہ سے مسلمان پسماندہ بھی ہیں نہاتے اور دست نگر اور خوار بھی ہیں آج ہتھیار اور ہر قسم کی ٹکنالوجی بنانے والے اہل کفر ہی ہیں اور کفر ملت واحدہ ہیں وہ اپنے کافروں کو پہلے دیں گے اور زیادہ دیں گے اور اصلی کارآمد ہتھیار انہی کو دیں گے جو اور جب کہ مسلمانوں کو کم اور ناکارہ محض برائے نام دفاعی ہتھیار دے کر انہیں مروائیں گے۔ 1967 کی عرب اسرائیل جنگ میں سارے کفار نے مل کر اسرائیل کو اعلی پیمانہ کے ہتھیاروں سے مسلح کیا اور 11 عربی ممالک کو جان بوجھ کر روس کے کھاتے میں ڈال دیا اور روس نے انہیں کمزور اور ناکارہ ہتھیار دے کر عربوں کو مروایا اور اسرائیل کو جتوایا اس طرح کفار نے مل کر اسرائیل کو پورے خطے پر مسلط کیا اور بیت المقدس اور دیگر بہت سے علاقوں پر اسرائیلی قابض ہو گیا جس کی سزا آج تک عرب حضرات بھگت رہی ہیں اور اسرائیل کے امریکہ اور روس سمیت غلام بنے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ اپنی عیاشی اور تن آسانی اور غفلت کی وجہ سے اور فریضہ جہاد سے دوری اور بھاگنے کی وجہ سے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ناز پروردہ تنعّم نہ برد راہ بدوست

عاشقی شیوۂ رندان جفاکش باشد

(ناز پروردہ نازک مزاجی نہ کرے دوست کے راستے میں۔ عاشقی رندوں کا طریقۂ جفاکشی ہے۔)

اسلام نے ہمیں برتر ہو کر اور سربلند ہو کر زندہ رہنا بتایا ہے کافروں کے سامنے جھکنے اور انھیں اپنا رازدار اور وفادار بنانے کی اجازت نہیں دی ہے اگر آج ہم مسلمان اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے ہوتے صلاح الدین ایوبی کے جہادی کارناموں پر عمل ہوتے تو دنیا کا یہ موجودہ

نقشہ نہیں ہوتا جسے ہم اپنا رہے ہیں اور برداشت کر رہے ہیں اسی جہاد کی خاطر فرمایا وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ جب تم ہر قسم کے سامان جنگ سے لیس رہو اور ہر قسم کی خیانت سے پرہیز کرو اور تقوی اور اخلاص کو اپنا شعار بنالوں تو تمہارا رب ایک ماہ کی مسافت سے تمہارے دشمن کے قلوب پر بڑھ جائے گا وہ تمہاری سمت آئے گا اور تم سے مرعوب ہو گا پھر فرمایا "واخرین منھم لا تعلمونھم" یہ کون لوگ ہیں جنہیں اس وقت تو نہیں جانتے یہ فارس اور روم کے مضبوط طاقتور لوگ ہیں جن کے پاس افرادی قوت بھی ہے اور ہر قسم کے ہتھیاروں سامان بھی جزیرہ عرب پر بسنے والے تمہارے دشمن مٹھی بھر یہود اور مشرکین یہ کچھ بھی نہیں یہ مختصر مدت میں ختم ہو جائیں گے اور تمہارے تسلط میں آجائیں گے جبکہ فارس اور روم کی ٹڈی دل افواج بھی تمہارے دست نگر اور تابع بن جائیں گے اور تمہاری کاری ضرب سے نیست و نابود ہو جائیں گے مگر اس شرط پر "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" دیکھو یہ پیشنگوئی مختصر وقت میں خلافت فاروقی میں کیسے باہر اور اور پوری ہوئی البتہ تم یہ کام بھی کرو گے جانی قربانیوں کے ساتھ مالی قربانیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھوں ایک روپے کے عوض تمہیں 700 کا بدلہ ملے گا فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ ۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا "وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ سورۃ صف میں فرمایا: ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم۔ تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم۔

سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ

عام صدقہ وخیرات کا اجر دس گناہ ہے جبکہ جہاد کے راستے میں خرچ کئے ہوئے مال اجر کی ابتدا سات سو گنا سے شروع ہوتی ہے

پھر یہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے حدیث ابوہریرہ (رض) کے مطابق بیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے (در منثور)

سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک شخص نے ایک اونٹنی پیش کی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہیں قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں بما فعل ان ملیں گی اس حدیث کو امام مسلم نے ابو مسعود انصاری (رض) سے روایت کیا "وانتم لا تظلمون" جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہ ہو گا کیونکہ ہتھیار تیار کرنے میں اور ہتھیار خریدنے میں اور گھوڑے پالنے میں بھی مال خرچ ہوتا ہے اسی طرح جہاد میں شریک ہونے کے لیے بھی مال کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا ثواب اور بدلہ ایک سات سو تک اللہ تعالیٰ فرمائیں گے پس تم ہر حال اللہ تعالیٰ کی رضا میں مال خرچ کر کے درجات علیہ کے مستحق بنوں۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○60

لغۃ القرآن: وَاَعِدُّوْا : اور تم سب تیار کرو] [لَهُمْ : ان کے لیے] [مَا : نہیں] [اسْتَطَعْتُمْ : تم استطاعت رکھتے ہو] [مِّنْ : سے] [قُوَّةٍ : قوت] [وَّ مِّنْ : سے] [رِّبَاطِ : بندھے ہوئے] [الْخَيْلِ : گھوڑوں] [تُرْهِبُوْنَ :" کہ " تم سب ڈراتے رہو] [بِهٖ : اس کو] [عَدُوَّ : دشمن کو] [اللّٰهِ : اللہ] [وَعَدُوَّكُمْ : اور اپنے دشمن کو] [وَاٰخَرِيْنَ : اور کچھ دوسروں کو] [مِّنْ : سے] [دُوْنِهِمْ : ان کے علاوہ] [لَا : نہیں] [تَعْلَمُوْنَهُمْ : تم سب جانتے انہیں] [اللّٰهُ : اللہ] [يَعْلَمُهُمْ : جانتا ہے انہیں] [وَمَا : اور جو] [تُنْفِقُوْا : تم سب خرچ کروگے] [ِنْ : سے] [شَيْءٍ : چیز کو] [فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کے راستے میں] [يُوَفَّ :" تو " پورا لوٹا دیا جائے گا] [اِلَيْكُمْ : تمہاری طرف] [وَ : اور] [نْتُمْ : تم سب] [لَا : نہیں] [تُظْلَمُوْنَ : تم سب پر ظلم کیا جائے گا] [

ترجمہ: اور (اے مسلمانو !) ان کے (مقابلے کے) لیے تم سے جس قدر ہو سکے (ہتھیاروں اور آلات جنگ کی) قوت مہیا کر رکھو اور بندھے ہوئے گھوڑوں کی (کھیپ بھی) اس (دفاعی تیاری) سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراتے رہو اور ان کے سوا دوسروں کو بھی جن (کی چھپی دشمنی) کو تم نہیں جانتے، اللہ انھیں جانتا ہے، اور تم جو کچھ (بھی) اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم سے ناانصافی نہ کی جائے گی

تشریح: اس آیت میں قوت سے مراد یہ ہے کہ اسلحے اور آلات کی وہ تمام اقسام کہ جن کے ذریعے دشمن سے جنگ کے دوران قوت حاصل ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قلعے اور پناہ گاہیں ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد رمی یعنی تیر اندازی ہے۔

جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کی تفسیر میں قوت کے معنی رمی یعنی تیر اندازی بتائے۔ (2) فی زمانہ میزائل وغیرہ بھی اسی میں داخل ہوں گے۔

آیت "وَاَعِدُّوا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ" سے حاصل ہونے والی معلومات

اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں

(1)۔۔ جہاد کی تیاری بھی عبادت ہے اور جہاد کی طرح حسب موقع یہ تیاری بھی فرض ہے جیسے نماز کے لیے وضو ضروری ہے۔

(2)۔۔ عبادت کے اسباب جمع کرنا عبادت ہیں اور گناہ کے اسباب جمع کرنا گناہ ہے جیسے حج فرض کیلئے سفر کرنا فرض ہے اور چوری کے لیے سفر کرنا حرام ہے۔

(3)۔۔ کفار کو ڈرانا دھمکانا اپنی قوت دکھانا بہادری کی باتیں کرنا جائز ہیں حتّٰی کہ کافروں کے دل میں رعب ڈالنے کیلئے غازی اپنی سفید داڑھی کو سیاہ کر سکتا ہے ورنہ ویسے سیاہ خضاب ناجائز وگناہ ہے۔

فتح ونصرت کی عظیم تدبیر

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ فتح ونصرت اور غلبہ وعظمت کی عظیم تدبیر پر مشتمل ہے اور اس آیت کی حقانیت سورج کی طرح روشن ہے جیسے آج کے دور میں دیکھ لیں کہ جس ملک کے پاس طاقت وقوت اور اسلحہ وجنگی سازوسامان کی کثرت ہے اس کا بدترین دشمن بھی اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا جبکہ کمزور ملک پر سب مل کر چڑھ دوڑنے کو تیار بیٹھے ہوتے ہیں، جیسے ایک بڑی طاقت اپنا سب سے بڑا دشمن دوسری بڑی طاقتوں کو سمجھتی ہے لیکن آج تک اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی کیونکہ ان کے پاس پہلی کا دماغ ٹھیک کرنے کے نسخے موجود ہیں لیکن وہی بڑی طاقتیں اور عالمی امن کے جھوٹے دعویدار کمزور ممالک کو طاقت دکھانے میں شیر ہیں اور ان ممالک میں ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ اسی آیت پر کچھ عمل کی برکت ہے کہ پاکستان پر کھلم کھلا حملہ کرنے کی جسارت کسی کو نہیں ہو رہی کیونکہ پاکستان ایٹمی طاقت ہے۔ اگر مسلمان مل کر اس آیت پر عمل کریں تو کیا مجال کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت مسلمانوں کو تنگ کر سکے۔

{وَاٰخَرِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ : اور جو ان کے علاوہ ہیں۔}

یہاں دوسرے لوگوں سے کون مراد ہیں ان کے بارے میں مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد بنو قریظہ کے یہودی ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد فارس کے مجوسی ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ" تم انھیں نہیں جانتے کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور اپنی زبانوں سے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہتے ہیں جبکہ "اَللّٰهُ یَعۡلَمُهُمۡ" اللہ انھیں جانتا ہے کہ وہ منافق ہیں۔ حضرت حسن بصری (رح) فرماتے ہیں "اس سے مراد کافر جنّات ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

ہر موقع پر مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم دینے والا قرآن مسلمانوں کو ہر طرح کے سامان جنگ سے لیس ہونے کی تاکید کر رہا ہے

تاکہ کوئی کوتاہ اندیش توکل کو بے عملی کا مترادف نہ سمجھ لے۔ اسباب بھی اسی نے بنائے ہیں۔ ان میں حیرت زا تاثیرات اسی کی حکمت نے رکھ دی ہیں اور ان سے کام لینے کا اسی نے حکم فرمایا ہے۔ قوۃ سے یہاں کسی خاص ہتھیار کی تخصیص مقصود نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے جنگ میں طاقت حاصل ہو۔ کل مایتقوی بہ فی الحرب (بیضاوی) امام ابو بکر جصاص (رح) اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں: عموم اللفظ شامل لجمیع مایستعان بہ علی العدو من سائر انواع السلاح والات الحرب (احکام القرآن)۔ یعنی لفظ کا عموماً بتارہا ہے کہ اس سے مراد وہ اسلحہ ہے (جدید ہو یا قدیم، جس سے جنگ میں قوت و طاقت میسر ہو سکے۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے لفظ قوت کی تفسیر ان الفاظ میں منقول ہے۔ الا ان القوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی۔ خبردار! قوت رمی ہے (تین بار)۔ کلام رسالت کی گہرائی ملاحظہ ہو، سہم اور قوس (تیر وکمان) نہیں فرمایا بلکہ رمی کا عام لفظ استعمال فرمایا تاکہ دور سے نشانہ پر پھینکے جانے والے تمام ہتھیار جو اس وقت موجود تھے اور جو قیامت تک ایجاد ہونے والے تھے سب کو شامل ہو۔

رباط مصدر ہے اور اسم مفعول مربوط کے معنی میں ہے یعنی وہ گھوڑے جو جہاد کی نیت سے بندھے ہوئے ہوں۔ تاکہ جب ضرورت پڑے ان پر سوار ہو کر غازی میدان جنگ کی راہ لیں۔ حضور رحمت عالمیاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عمدہ گھوڑوں سے بہت انس تھا۔ حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک روز حضور کو دیکھا کہ گھوڑے کی پیشانی پر اپنی انگشت مبارک پھیر رہے ہیں اور زبان پاک سے فرمارہے ہیں۔ الخیل معقود فی نواصیھا الخیر الیٰ یوم القیامۃ الاجر والغنیمہ (رواہ مسلم): گھوڑوں کی پیشانیوں میں تاقیامت خیر وبرکت رکھ دی گئی ہے اجر بھی اور غنیمت بھی۔

اسلام کے بعض دشمن تو وہ تھے جن کی دشمنی عیاں تھی۔ اور مسلمانوں کو ان کا علم تھا۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی کئی بد باطن تھے جو مسلمانوں کی نگاہوں سے پنہاں سہی لیکن اللہ عزوجل کے علم سے تو پوشیدہ نہ تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ بعض نے روم وایران کا نام لیا ہے۔ بعض نے یہود اور منافقین کا۔ لیکن اس تعیین کی کیا ضرورت؟ قیامت تک اس شمع حق کو بجھانے کی کوشش کرنے والی خدا معلوم کتنی قومیں کس کس علاقہ سے اٹھیں گی۔ سب کی سازشوں کو ناکام بنانا، سب کے منصوبوں کو خاک میں ملانا امت مسلمہ کا فرض اولین ہے۔

جان ومال، وقت اور کوشش کی جو قربانی تم دو گے وہ رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ دین ودنیا میں تمہیں اس کا وہ معاوضہ دیا جائے گا جو اس مولائے کریم کی شان وود وکرم کے شایاں ہے۔ حضرت ابن ابی مسعود انصاری (رض) فرماتے ہیں ایک آدمی ایک اونٹنی کو نکیل ڈالئے ہوئے بارگاہ رسالت پناہ میں حاضر ہوا اور عرض کی ھذہ فی سبیل اللہ کہ یہ اللہ کی راہ میں میں نے دی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لك بھا یوم القیامۃ سبع ماءۃ ناقۃ کلھا مخطومۃ (مسلم) یعنی اس کے بدل قیامت کے دن تمہیں سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔ ہر ایک کی ناک میں نکیل پڑی ہو گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

نیز جان ومال کی صورت میں جو کچھ بھی تم اللہ تعالیٰ کی راہ (جہاد) میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا اجر دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

بیشک اللہ تعالیٰ ایک تیر کے باعث تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا

۱۔ ثواب کی نیت سیے تیر بنانے والا۔
۲۔ تیر اندازی کرنے والا۔
۳۔ تیر اندازی میں مدد کرنے والا۔ (ابن ماجۃ: ابواب الجہاد: باب ۱۹)

اس دور میں سب سے مہلک ہتھیار تیر تھا، اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیر اندازی کی مشقوں میں خود بھی حصہ لیا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ترغیب دی۔ (بخاری: کتاب الجہاد: باب ۷۸)

مذکورہ قرآن و حدیث کے حوالہ جات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملک و ملت کی حفاظت کے لیے اسلحہ بنانا، اس کی ترتیب حاصل کرنا اور اس کے جملہ لوازمات میں مالی یا عملی حصہ لینا جنت کا باعث اور فرض کفایہ ہے اور زیادہ ضرورت کے وقت یہ فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم آج تک اپنے وعظوں میں مسلمانوں کو یہ تو بتاتے رہے کہ جس کے پاس طاقت ہو وہ حج کرے کیونکہ کعبہ تین اشخاص کی سفارش کر کے انھیں جنت میں لے جائے گا یعنی جس نے حج کیا، حج کے لیے نکلا مگر کعبہ تک نہ پہنچ سکا، حج کی خواہش تھی مگر وسائل نے ساتھ نہ دیا۔ (نزہۃ المجالس: جلد اول: ص ۱۵۳)

مگر ہم نے ارباب اقتدار کو یہ بتانے کی زحمت گوارا نہ کی کہ دشمن کو ناکام مرعوب کرنے کے لیے جدید ترین اسلحہ بنانا بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ہے اور جدید اسلحہ بنانے کی وجہ سے بھی تین اشخاص جنت کے مستحق ٹھہریں گے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمن اسلحہ کی دوڑ میں اتنا آگے نکل گیا کہ ہمارے پاس ان کا جواب دینے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

آج مسلمانوں پہ ایٹمی پاور کا حصول فرض ہے

آج گھوڑوں کی جگہ ٹینک، توپ، بکتر بند گاڑیاں اور فائٹر ہوائی جہاز آگئے ہیں اور تیر و تلوار کی جگہ رائفل، مارٹر میزائل اور بم آگئے ہیں، تو ضروری ہے کہ مسلمان جہاد کے لیے وہی اسلحہ تیار کریں جو کفار کے پاس ہے۔ تاکہ اپنا دفاع کر سکیں۔ آج اسلام دشمن طاقتوں امریکہ و اسرائیل بھارت کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے تو مسلمانوں کے لیے ایٹمی اسلحہ (Nuclear Powre) کا حصول لازم ہے۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکتے ہیں۔

آج مسلمان اس لئے بھی مار کھا رہے ہیں کہ ان کے پاس قوت ایمان کے فقدان کے علاوہ ظاہری قوت کا بھی فقدان ہے۔ واخرین من دونھم۔ سے منافقین یا وہ اسلام دشمن قوتیں مراد ہیں جو دور نزول قرآن کے بعد دنیا میں نمودار ہوئیں جیسے دور حاضر میں امریکہ و اسرائیل۔ یعنی ان سب کو خوفزدہ رکھنے کے لیے ضرورت کے مطابق اسلحہ تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

جہاد بالسیف تا قیامت جاری ہے

وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد تا قیامت جاری ہے کیونکہ جب تک قرآن ہے یہ یہ حکم باقی ہے اور جب تک مسلمانوں کے خلاف کفار کی دہشت گردی جاری ہے یہ حکم نافذ ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "گھوڑوں کی پیشانی سے تا قیامت خیر وابستہ کر دی گئی ہے اور وہ جہاد کا اجر یا مال غنیمت ہے۔ " (بخاری کتاب الجہاد باب 43) مگر مرزا قادیانی نے کفار کی خوشنودی کے لیے جہاد کی منسوخی کا اعلان کیا جو صریح کفر اور اس آیت کی واضح مخالفت ہے۔

یعنی جہاد کے لے ی مال خرچ کرنے والوں کو پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ حضرت مولا علی بن ابی طالب، ابوہریرہ، ابودرداء، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر، ابوامام باہلی اور عمران بن حصین (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جس نے جہاد کے لیے مال بھیجا اور خود نہ گیا اسے ہر درہم پر سات درہم کا اجر ہے اور جو خود بھی جہاد پر گیا اسے ہر درہم پر سات ہزار درہم کا اجر ہے۔ " (ابن ماجہ کتاب الجہاد باب 4) (تفسیر برہان القرآن)

دفاع کے لیے نقل و حمل کے ذرائع اور اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے جن کا حصول مال کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا۔ یہ اتنا اہم عنصر ہے کہ قرآن مجید نے جہاد فی سبیل اللہ کے تذکرہ میں اکثر مقامات پر جہاد بالنفس سے پہلے جہاد بالمال کا حکم آیا ہے۔ یہاں دفاعی فنڈ میں حصہ لینے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہیں اس کے بدلے پورا پورا صلہ دیا جائے گا اور تم پر کوئی زیادتی نہیں ہونے پائے گی۔ زیادتی سے مراد اجر و ثواب میں کمی ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جب تم دل کھول کر اپنے دفاع میں خرچ کرو گے تو دشمن کے ظلم سے محفوظ رہو گے۔ دشمن کی جارحیت سے بچنے کے لیے حربی قوت بڑھانے اور کھلے عام جنگی گھوڑے باندھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قوت سے مراد ہر قسم کی طاقت اور جدید سے جدید ٹیکنالوجی کا حصول ہے۔ پرانے زمانے میں نقل و حمل کے لیے گھوڑا مضبوط اور تیز رفتار سواری تھی لیکن آج اس کی جگہ ٹینک اور بمبار طیاروں نے لے لی ہے۔ تاہم گھوڑے کی اہمیت اپنی جگہ پر قائم ہے اور قیامت تک باقی رہے گی۔ کیونکہ پہاڑی علاقے میں جیپ، ٹینک یہاں تک کہ بلند پہاڑوں میں جہاز اور ہیلی کاپٹر بھی کام نہیں دیتے۔ جس کی بنا پر دنیا میں کوئی ایسی فوج نہیں جن کے پاس جنگی گھوڑے موجود نہ ہوں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دور میں تیر، تلوار اور گھوڑے جنگی ضروریات میں سب سے اہم تھے۔ اس وجہ سے آپ نے ان چیزوں کی اہمیت اور فضیلت بیان کی ہے۔

تاہم ان کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دور کی جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے بارے میں پوری توجہ فرمائی۔

(عن عُقْبَةَ بن عامِرٍ (رض) يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُولُ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ)

[رواہ مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی]

"حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر تشریف فرما رہے تھے کافروں کے لیے حسب استطاعت طاقت تیار رکھو۔ آگاہ ہو جاؤ بلاشبہ قوت تیر پھینکنے میں ہے۔ آگاہ رہو بلاشبہ قوت تیر اندازی میں ہے۔"

(عن سَلَمَةَ بن الْأَكْوَعِ (رض) قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ (صلى الله عليه وآله وسلم) عَلَى نَفَرٍ مِنْ أَسْلَمَ يَنْتَضِلُونَ فَقَالَ النَّبِيُّ (صلى الله عليه وآله وسلم) ارْمُوا بَنِي إِسْمَاعِيلَ فَإِنَّ أَبَاكُمْ كَانَ رَامِيًا ارْمُوا وَأَنَا مَعَ بَنِي فُلَانٍ قَالَ فَأَمْسَكَ أَحَدُ الْفَرِيقَيْنِ بِأَيْدِيهِمْ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) مَا لَكُمْ لَا تَرْمُونَ قَالُوا كَيْفَ نَرْمِي وَأَنْتَ مَعَهُمْ قَالَ النَّبِيُّ (صلى الله عليه وآله وسلم) ارْمُوا فَأَنَا مَعَكُمْ كُلِّكُمْ)

[رواہ البخاری : کتاب الجہاد، باب التحریض علی الرمی]

”حضرت سلمہ بن اکوع (رض) بیان کرتے ہیں نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسلم قبیلہ کے لوگوں کے پاس سے گزرے جو تیر ٹھیک کر رہے تھے نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے بنو اسماعیل تیر اندازی کرو بلاشبہ تمہارے والد تیر انداز تھے اور میں فلاں قبیلہ کے ساتھ ہوں۔ صحابی فرماتے ہیں مقابل فریق نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آپ کو کیا ہوا کہ آپ نے تیر اندازی چھوڑ دی ہے؟ انھوں نے عرض کی ہم آپ کے مد مقابل کس طرح تیر اندازی کریں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تیر اندازی کرو میں تم سب کے ساتھ ہوں۔“

(عن عُقْبَةَ بن عامِرٍ الْجُهَنِي (رض) يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) يَقُولُ مَنْ تَعَلَّمَ الرَّمْيَ ثُمَّ تَرَكَهُ فَقَدْ عَصَانِي) [رواہ ابن ماجۃ : کتاب الجہاد، باب الرمی فی سبیل اللہ]

”حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے سنا جس نے نشانہ بازی سیکھی پھر اس کو چھوڑ دیا اس نے میری نافرمانی کی۔“

(عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الْجَعْدِ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلى الله عليه وآله وسلم) قَالَ الْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِي نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)

[رواہ البخاری : کتاب الجہاد، باب الخیل معقود فی نواصیہا الخیر]

”حضرت عروہ بن جعد (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانی میں قیامت تک خیر رکھ دی گئی ہے۔“

(عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ (رض) قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) يَلْوِي نَاصِيَةَ فَرَسٍ بِإِصْبَعِهِ وَهُوَ يَقُولُ الْخَيْلُ مَعْقُودٌ بِنَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ الْأَجْرُ وَالْغَنِيمَةُ)

[رواہ مسلم : کتاب الامارۃ، باب الخیل معقود فی نواصیہا الخیر]

”حضرت جریر بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں میں نے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا آپ نے اپنی انگلی سے گھوڑے کی پیشانی چھوتے ہوئے فرمایا گھوڑے کی پیشانی میں قیامت تک کے لیے بھلائی رکھ دی گئی ہے۔ وہ ثواب اور مال غنیمت ہے۔“ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝61

لغۃ القرآن: وَاِنْ : اور اگر] [جَنَحُوْا : وہ سب جھکیں] [لِلسَّلْمِ : صلح کے لیے] [فَاجْنَحْ : تو آپ " بھی " جھکیں] [لَهَا : اس کیلیے] [وَتَوَكَّلْ : اور بھروسہ کریں] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [هُوَ : وہ] [السَّمِيْعُ : خوب سننے والا ہے] [الْعَلِيْمُ : خوب جاننے والا ہے] [

ترجمہ: اور اگر وہ (کفار) صلح کے لیے جھکیں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ بیشک وہی خوب سننے والا جاننے والا ہے

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو دشمنوں کے مقابلے میں قوت کی تیاری اور انھیں خوفزدہ کرنے کا سامان کرنے کا حکم دیا اور اس آیت میں یہ حکم دیا کہ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں اور صلح کی درخواست کریں تو ان کی صلح قبول کرلو۔

کفار سے صلح سے متعلق 3 مسائل

اس آیت میں کفار سے صلح کا ذکر ہوا اس مناسبت سے یہاں ہم صلح سے متعلق تین مسائل ذکر کرتے ہیں :

(1)۔۔اگر صلح مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو تو صلح کرنا جائز ہے اگرچہ کچھ مال لے کر یا دے کر صلح کی جائے اور صلح کے بعد اگر مصلحت صلح توڑنے میں ہو تو توڑ دیں مگر یہ ضروری ہے کہ پہلے انھیں اس کی اطلاع کر دیں اور اطلاع کے بعد فوراً جنگ شروع نہ کریں بلکہ اتنی مہلت دیں کہ کافر بادشاہ اپنے تمام ممالک میں اس خبر کو پہنچا سکے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ صلح میں کوئی مدت مُعَیَّن نہ کی گئی ہو اور اگر مدت معین کی گئی ہو تو مدت پوری ہونے پر اطلاع دینے کی کچھ حاجت نہیں۔

(2)۔۔جس مشرک سے معاہدہ کیا جائے وہ مشرکین عرب میں سے نہ ہو کیونکہ عرب کے مشرکین سے صرف اسلام قبول کیا جائے گا یا جنگ۔

(3)۔۔مرتد ہونے والوں سے صرف اسلام قبول کیا جائے یا ان سے جنگ کی جائے گی، ان سے نہ صلح جائز ہے اور نہ جزیہ لینا جائز ہے۔
(تفسیر صراط الجنان)

معلوم ہوا اسلام میں جنگ کا مقصد قیام امن ہے نہ کہ خون ریزی۔ لہٰذا اسلام کو دہشت گردی کا طعنہ دینے والے جھوٹے مکار ہیں۔ وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ کفار ان سے صلح کی درخواست کریں۔ مگر افسوس صد افسوس ! نااہل، جاہ پسند، اقتدار پرست مسلم حکمرانوں کی وجہ سے آج مسلمان کفار سے زندگی کی بھیک مانگ کر جی رہے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے رو کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ امت مسلمہ میں سے کوئی غلام فاروق اعظم پیدا کرے، کوئی دوسرا صلاح الدین ایوبی یا کوئی دوسرا محمود غزنوی پیدا کرے۔ کوئی نیا موسیٰ بن نصیر آئے، کوئی دوسرا محمد بن قاسم آئے، یا اور کوئی سلطان محمد فاتح اٹھے۔

اسی مفہوم کو قرآن مجید میں دوسری جگہ یوں بیان فرمایا گیا ہے : فَلَا تَهِنُوۡا وَتَدۡعُوۡۤا اِلَى السَّلۡمِ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمۡ وَلَنۡ يَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ ۔ "تو تم کمزور نہ پڑو اور صلح کی درخواست نہ کرو اور تم ہی غالب ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا۔ " (محمد : 35) یعنی مسلمانوں کی یہ حالت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ صلح کی درخواستیں کرتے پھریں، جیسے آج کر رہے ہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی اقتداء اور پیروی اسی میں ہے، کہ جنگ (اور) صلح دونوں حال میں (اللہ تعالیٰ) (پر بھروسہ رکھو) اور یہ فکر نہ کرو، کہ ان کی صلح ان کا ایک مکر و حیلہ بھی ہو سکتا ہے۔ تم بالکل مطمئن رہو، اس لیے کہ جس خدا پر تمہیں بھروسہ ہے (بے شک وہی سننے والا) ہے ان کی باتوں کا، اور (علم والا ہے) ان کے کذب و مکر کا۔ اگر وہ مکر کریں گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ رکھے گا اور ان کے مکر کا وبال انھیں پر ڈالے گا، (تفسیر اشرفی)

مسلمانوں کی غیر مسلموں سے لڑائی، قتال فی سبیل النفس یا فی سبیل البلاد نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہے۔ اس کا مقصد دنیا سے فتنہ ختم کرنا اور اللہ کے دین اور اس کی حاکمیت کو غالب کرنا ہے۔ ظاہر ہے یہ مقصد کفر کو ختم کیے یا مغلوب کیے بغیر ممکن نہیں لیکن یہ حیرانی کی بات ہے کہ ایسا واضح مقصد رکھنے والی قوم کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر تمہارا دشمن تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھائے تو تم ان کے مظالم اور زیادتیوں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اس کا ہاتھ تھام لو اور تم بھی صلح کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ مقصد دنیا میں خون بہانا نہیں بلکہ فساد فی الارض کو ختم کرنا ہے۔ غلبہ دین کی ضرورت کے لیے بعض دفعہ لڑائی لڑنی پڑتی ہے لیکن درحقیقت اس کا مقصد دنیا سے خون ریزی اور فساد کے تمام امکانات کو ختم کرنا ہے۔ یہ امکانات جس طرح غلبہ سے ختم ہوتے ہیں اسی طرح دعوت الی اللہ کے امکانات پیدا ہونے سے بھی ختم ہوتے ہیں۔ اگر دشمن اس شرط پر صلح کر لیتا ہے کہ مجھے مسلمانوں کی تبلیغ و دعوت پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا تو مسلمانوں کو اپنا ہدف حاصل کرنے میں ایک ایسا موثر ذریعہ مل جاتا ہے جس کے نتیجے میں دلوں کی دنیا بدل جاتی ہے۔ نیا انسان پیدا ہوتا ہے نئی سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ معاہدہ حدیبیہ جو صرف دو سال تک چل سکا لیکن اس کے نتائج دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حدیبیہ میں پندرہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر آئے تھے اور اس وقت تک آپ کی نبوت کو انیس سال گزر چکے تھے۔ لیکن دو سال کے بعد آپ جب فتح مکہ کے لیے نکلے تو آپ کے ساتھ دس ہزار قدوسیوں کا لشکر تھا۔ یہ حیران کن اضافہ دو سالوں میں مسلمانوں کی دعوت و تبلیغ، مسلمانوں کے اخلاق اور معاملات میں مسلمانوں کی صفائی اور دیانت و امانت کا نتیجہ تھا۔ اس لیے یہاں بھی حکم دیا گیا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں مسلمانوں کا رویہ صلح جویانہ لیکن جسورانہ ہونا چاہیے۔

اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے بظاہر یہ ایک رسک معلوم ہوتا ہے کیونکہ قریش سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ کسی وقت بھی مسلمانوں کو دھوکہ دے سکتے تھے۔ لیکن جس قوم کو اپنے نظریے اور اپنے اخلاق سے تاریخ بنانا ہوتی ہے وہ ایسے خطرات سے کھیلے بغیر نہیں رہ

سکتی۔ لیکن اللہ کا یہ بے حد کرم ہے کہ ان خطرات کو دیکھتے ہوئے پروردگار نے اللہ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلایا کہ وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ دشمن جو کچھ کر رہا ہے یا کرے گا اللہ ہر وقت اسے سنتا ہے اور ان کی درپردہ سازشوں کو جانتا بھی ہے۔ تم اللہ کے بھروسے پر ان خطرات کو انگیجنت کرو۔ اللہ اس کے برے نتائج سے تمہاری حفاظت کرے گا کیونکہ دنیا میں لوگوں سے تمہاری دشمنی کسی ذاتی مفاد کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اللہ کی خاطر ہے۔ تم آج اللہ سے اپنا رشتہ توڑ لو تمہارے آج کے دشمن تمہارے دوست بن جائیں گے۔ تمہاری دوستی اور دشمنی جب صرف اللہ کی رضا کے لیے ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے وفاداروں کو لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اس کا اصول ہی یہ ہے کہ جو اس کا ہو جاتا ہے اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔ سچ کہا ظفر علی خاں نے۔

یثرب سے اب بھی گونجتی ہے یہ صدا سنو!

وہ جو خدا کے ہو گئے ان کا خدا ہوا

رہی یہ فکر کہ وہ آپ کو دھوکہ دیں گے تو آپ کو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ جسے اللہ اپنی حفاظت میں لے لے اسے دنیا کی کوئی قوت گزند نہیں پہنچا سکتی۔ بڑی سے بڑی قوت کسی کے لیے کفائت نہیں کر سکتی لیکن اللہ آپ کی مدد کے لیے کافی ہے۔ اس کی تائید و نصرت کا مشاہدہ کرنا ہو تو قریبی تاریخ میں جنگ بدر کا واقعہ پیش آیا ہے اس کے واقعات میں غور کر کے دیکھ لو کس طرح اس نے اپنی نصرت سے تمہاری مدد کی اور کس طرح مٹھی بھر مسلمانوں سے آپ کی فتح کا سامان کیا اور کس طرح مسلمانوں کو آپ کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔ غور کیجئے! ان لوگوں کی اپنی تاریخ کیا ہے مکہ کے مہاجرین مختلف قبائلی تعصّبات میں بٹے ہوئے اور کبر و نخوت میں گرفتار تھے۔ اسی طرح اوس و خزرج کے لوگ جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے۔ جنھوں نے سالہا سال تک "حربِ بسوس" لڑی جس میں ہزاروں آدمی کام آئے ان کے اختلافات، تعصّبات، مفادات اور رسوم و آداب کو دیکھتے ہوئے کوئی آدمی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چل سکتے ہیں۔ جو لوگ ایک دوسرے کے دیوتا کو برداشت نہیں کرتے تھے، جنھوں نے پوجا پاٹ کے لیے الگ الگ بت بنا رکھے تھے، جو قبیلے کی عصبیت کی دیواروں سے کبھی باہر جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، ان کے دلوں کو جس طرح جوڑا گیا، جس طرح وہ ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جس طرح باہمی اخوت میں پروئے گئے، جس طرح وہ ایک دوسرے کی ضرورت کی خاطر جان دینے کے لیے بھی تیار ہو گئے، یہ ایک ایسی حیرت انگیز تبدیلی ہے جس کو ممکن بنانے والی اللہ کی ذات کے سوا دنیا میں کوئی اور قوت نہیں اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ اگر آپ زمین بھر کے خزانے ان کے اختلافات دور کرنے کے لیے خرچ کر ڈالتے تو بھی آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سراسر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور ان کے دلوں میں محبت پیدا کر دی۔

بیشک وہ عزیز اور حکیم ہے۔ وہ جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو کوئی رکاوٹ اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی اور ساتھ ہی ساتھ وہ حکمت والا بھی ہے اس لیے وہ جو کام بھی کرتا ہے وہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

صلح کی اہمیت کے پیشِ نظر مومنوں کو مخاطب کرنے کی بجائے واحد حاضر کی ضمیر لا کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب فرمایا گیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ صلح اور جنگ کا فیصلہ کرنا قیادت کا کام ہوتا ہے اس لیے قیادت کو اللہ تعالیٰ اور اپنے مخلص ساتھیوں پر اعتماد کرتے ہوئے صلح کر لینی چاہیے۔ کیونکہ مسلمانوں کو ہر حال میں اپنی دفاعی قوت بڑھانے کا حکم ہے لہٰذا صلح کرنے سے انھیں تیاری کا مزید موقع ملے گا۔ صلح کے اقدام سے دشمن کو وسعت ظرفی اعلیٰ اخلاق اور دلیری کا پیغام ملنے کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق اور کردار دیکھنے کا موقعہ ملے گا۔

اسی حکمت کے تحت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ والوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین کا نام دیا۔ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ 62

لغۃ القرآن: وَاِنْ : اور اگر] [يُّرِيْدُوْٓا : وہ سب ارادہ کریں] [اَنْ : کہ] [يَّخْدَعُوْكَ : وہ سب دھوکہ دیں آپ کو] [فَاِنَّ : تو بیشک] [حَسْبَكَ : کافی ہے تجھے] [اللّٰهُ : اللہ] [هُوَ : وہ] [الَّذِيْٓ :" وہ ہے " جو] [اَيَّدَكَ : آپ کو قوت بخشی] [بِنَصْرِهٖ : اپنی مدد سے] [وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ : اور سب مومنوں سے] [

ترجمہ: اور اگر وہ چاہیں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بیشک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وہی ہے جس نے آپ کو اپنی مدد کے ذریعے اور اہل ایمان کے ذریعے طاقت بخشی

تشریح:

اگر وہ بظاہر صلح پر آمادہ ہوں اور اندر ہی اندر تمہیں زک پہنچانے کی تیاریاں کر رہے ہوں تب بھی تم صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کو جھٹک نہ دو بلکہ اسے گرم جوشی سے تھام لو۔ اللہ تعالیٰ جس نے پہلے بھی ہر مشکل میں تمہاری اعانت کی ہے وہ اب بھی قادر ہے کہ تمہارے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دے اور تمہیں کامیاب کر دے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ اسلام صلح، امن اور سلامتی کا دین ہے، وہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت صرف اسی وقت دیتا ہے جب انسانیت کے امن و سکون کو خطرہ لاحق ہوا اور جنگ کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو۔ آیت نمبر ۵۸ میں حکم ہوا تھا کہ دشمن سے خیانت کا خطرہ ہو تو معاہدہ توڑ دو یعنی جب قومی قرائن اور ان کے اعمال سے ظاہر ہو کہ وہ عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو ان کا معاہدہ توڑنے کا اعلان کر دو، اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ان کے دل میں خیانت کا ارادہ تو ہے مگر ان کے اعمال سے خیانت کے نشانات ظاہر نہیں ہوئے تو ان سے صلح کر لو ہو سکتا ہے کہ عملی خیانت کی جرأت نہ کر سکیں اور اگر عملی خیانت کی جرأت کریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے ان کا معاہدہ بھی توڑ دیا جائے گا۔ (تفسیر امداد الکرم)

مددِ الٰہی کی صورتیں

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد فرشتوں کے ذریعے بھی ہوتی ہے اور نیک بندوں کے ذریعے بھی، نیز ظاہری اسباب کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور ظاہری اسباب سے ہٹ کر بھی۔ (تفسیر صراط الجنان)

پچھلی آیت میں کہا گیا کہ مخالف اگر صلح کی درخواست کریں تو تم بھی صلح پر راضی ہو جاؤ۔ صلح کرتے وقت یہ مت سوچو کے ممکن ہے کہ مخالفوں کے دل میں دغا بازی ہو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ اور سوچو کہ جب اس نے ہماری ان کے مقابلے میں ایسے آڑے وقت میں مدد کی جب ہمارے مٹانے میں فسادی لوگوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی تو اب بھی وہ ہماری مدد کرے گا اور ان کی چالیں، تدبیریں، بڑھ بڑھ کے بولنا اور خفیہ سازشیں جب پہلے ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور اللہ نے ان کو نیچا دکھایا اور ہم کو اونچا کیا تو آئندہ بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ پھر بتایا کہ تم لوگ آپس میں لڑنے بھڑنے میں مصروف تھے اللہ نے اپنی رحمت سے تمہارے اندر امن قائم کیا اور تم ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو گئے۔ اس نعمت کو یاد دلا کر اس آیت میں بیان کیا ہے کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا۔ جیسے اللہ کے فضل سے وہ آسان ہو گیا ایسے ہی ساری مشکلیں آئندہ بھی آسان ہو جائیں گی۔ (تفسیر درس آسٹریلیا)

آیت مبارکہ:

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○63

لغۃ القرآن: وَاَلَّفَ : اور اس نے الفت ڈال دی] [بَیْنَ : کے درمیان] [قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں] [لَوْ : کاش کہ] [اَنْفَقْتَ : آپ خرچ کرتے] [مَا : نہیں] [فِی الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [جَمِیْعًا : سب کو] [مَآ : نہیں] [اَلَّفْتَ : الفت پیدا کرسکتے تھے آپ] [بَیْنَ : کے درمیان] [قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں] [وَلٰكِنَّ : اور لیکن] [اللّٰهَ : اللہ] [اَلَّفَ : الفت ڈال دی] [بَیْنَهُمْ : انکے درمیان] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [عَزِیْزٌ : غالب] [حَكِیْمٌ : حکمت والا ہے] [

ترجمہ: اور (اسی نے) ان (مسلمانوں) کے دلوں میں باہمی الفت پیدا فرما دی۔ اگر آپ وہ سب کچھ جو زمین میں ہے خرچ کر ڈالتے تو (ان تمام مادی وسائل سے) بھی آپ ان کے دلوں میں (یہ) الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ نے ان کے درمیان (ایک روحانی رشتے سے) محبت پیدا فرما دی۔ بیشک وہ بڑے غلبہ والا حکمت والا ہے

تشریح:

عرب کے سارے جزیرہ میں ہر طرف نفرت اور عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مزاج اتنے آوارہ اور جذبات اتنے مشتعل تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی ٹھن جاتی اور صدیوں قتل و غارت کا بازار گرم رہتا۔ خصوصاً اوس و خزرج کی دشمنی نے تو اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ ان کی مصالحت کا امکان تک نہ تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدینہ میں آمد سے دو سال پہلے ان کے درمیان خون ریز معرکہ ہوا تھا۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو بالکل نیست و نابود کرنے کا عزم کر کے میدان میں نکلے تھے۔ تاریخ میں یہ جنگ بعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس طرح ہر طرف نفرت و عداوت کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ہر سمت بغض و کینہ کے انگارے دہک رہے تھے۔ جب صلح و محبت کا پیامبر تشریف لایا۔ تھوڑے عرصہ میں ہی دلوں کی دنیا میں انقلاب آگیا۔ بعض و عناد کی جگہ محبت و اخلاص نے لے لی۔ مولانا عثمانی نے کیا خوب لکھا ہے۔ "خدا نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک کی الفت دوسرے کے دل میں ڈال دی اور پھر سب کی الفتوں کی اجتماعی مرکز حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات منبع البرکات کو بنا دیا"۔

وہ دل جو نفرت سے بھرے ہوئے تھے ان میں الفت پیدا کر دینا اور ایک دوسرے کا جاں نثار بنا دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دنیا بھر کے خزانے بھی اگر اس مقصد کے حصول کے لیے خرچ کر دیئے جاتے تب بھی یہ چاک رفو نہیں ہو سکتے تھے یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے عداوت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا دیا۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

مسلمانوں کی اجتماعیت کا سب سے بڑا ذریعہ

یاد رہے کہ سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت مسلمانوں کی اِجتِماعیَّت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دیکھ لیں کہ مشرق و مغرب کے دو لوگ جن کے رنگ، زبان، نسل، معیار زندگی سب کچھ ایک دوسرے سے جدا ہو لیکن جب ایک کو یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسرا شخص بھی سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا غلام ہے تو فوراً دل میں نرمی و محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس سے معلوم ہوا کہ آپس میں محبت اور اتفاق کو نہ تو دولت سے خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی طاقت کے زور پر پیدا کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ مخلص لوگوں پر لوگوں کا کرم ہوتا ہے، لہٰذا آج مسلمانوں کو چاہیے کہ خلوص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے باہمی محبت اور اتفاق کی دعا مانگا کریں اور آپس میں برداشت اور محبت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ یا اللہ تعالیٰ! تو کریم ہے مسلمانوں پر کرم فرما اور ان کو آپس میں اتحاد اور محبت کی نعمت عطا فرما۔ آمین! (تفسیر امداد الکرم)

دریا کا رخ پھیر دینا پہاڑ جگہ سے ہٹا دینا آسان ہے۔ مگر بگڑی قوم کو بنانا، بچھڑوں کو ملانا بہت مشکل ہے، یہ کام حضور ﷺ نے مدینہ منورہ آتے ہی کر دکھایا، اور صرف دس سال کی تھوڑی مدت میں عرب جیسے بگڑوں کو بنا دیا۔ (تفسیر نور العرفان)

شعر

بد خلق جو تھے وہ نیک ہوئے، لڑتے تھے وہ یک ہوئے
جھگڑے تو نے اک کر میٹ دیئے تیری فہم و ذکا کا کیا کہنا

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو محبت کے رشتے سے باندھ دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر کام کرنے پر غالب اور اس کے ہر قول و عمل میں حکمتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ وہ غالب حکمت والا تمہارے اور تمہارے دشمن کے درمیان بھی محبت پیدا کر سکتا ہے۔ یہ الفت جس کی بنا پر حبشہ کے حضرت بلال (رض) فارس کے حضرت سلمان (رض) اور غفار قبیلے کے جناب ابوذر (رض) ایک دوسرے کے اس طرح بھائی بنے کہ حقیقی رشتے بھی پیچھے رہ گئے۔ اسی طرح مدینہ کے اوس اور خزرج کے قبائل شیر و شکر ہوئے جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدینہ آمد سے تھوڑی ہی مدت پہلے جنگ بعاث میں ایک دوسرے کے سینکڑوں لوگوں کو قتل کر چکے تھے۔ ان کے درمیان صلح کی دور دور تک گنجائش نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان بھی حقیقی بھائیوں جیسی محبت پیدا فرما دی غزوہ بدر کے تذکرہ اور جہادی تیاریوں کے ضمن میں صحابہ (رض) کی باہمی محبت کا حوالہ دینے کا یہ مقصد بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اشارہ ہے جب تک مسلمان آپس میں اتفاق اور اتحاد قائم رکھیں گے اس وقت تک ہی دشمن پر غالب آسکیں گے کیونکہ جو قوم آپس میں مختلف اور منتشر ہو وہ اسلحہ اور حربی قوت کی بنیاد پر دشمن پر غالب نہیں آسکتی۔ امام رازی اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حمایت کا کلی وعدہ فرمایا ہے۔

(عَنْ عَبْدِ اللہ (رض) .. قَالَ وَكَانَ يُعَلِّمُنَا كَلِمَاتٍ وَلَمْ يَكُنْ يُعَلِّمُنَاهُنَّ كَمَا يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ اللّٰهُمَّ أَلِّفْ بَيْنَ قُلُوبِنَا وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَبَارِكْ لَنَا فِي أَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُلُوبِنَا وَأَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ وَاجْعَلْنَا شَاكِرِينَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِينَ بِهَا قَابِلِيهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا)

[رواہ ابوداؤد، کتاب الصلاۃ باب التشہد]

"حضرت عبداللہ (رض) سے روایت ہے۔۔ فرماتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں کلمات اس طرح سکھایا کرتے تھے جس طرح وہ ہمیں تشہد سکھاتے تھے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں میں الفت ڈال دے اور ہمارے درمیان اصلاح فرما دے۔ اور ہمیں سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت دے۔ ہمیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نجات دے۔ اور ہمیں پوشیدہ اور ظاہری فحاشی سے بچا۔ ہماری قوت سماعت، بصارت، ازواج اور اولاد میں برکت نصیب فرما۔ اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بلاشبہ تو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گزار اور ان کے قابل بنا۔ اور انھیں ہم پر پورا فرما۔ (تفسیر فہم القرآن)

امام طبریؒ فرماتے ہیں:

ہمیں ابوکریب مجاہد سے نقل کیا کہ جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں پھر مصافحہ کرتے ہیں تو انکی بخشش کر دی جاتی ہے ولید نے کہا کہ میں نے مجاہد سے کہا: مصافحہ کے سبب ان کی بخشش کر دی جاتی ہے؟ مجاہد نے کہا کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ" ولید نے مجاہد سے کہا کہ تم مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہو۔

ہمیں عبدالکریم بن ابی عمیر نے عبدہ بن ابی لبابہ سے نقل کیا۔ میں مجاہد سے ملا اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ جب دو اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے والے ایک دوسرے کو دیکھیں ان میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہنسے تو ان کے گناہ اس طرح گرتے ہیں جیسے درخت کے پتے

گرتے ہیں۔ عبدہ نے کہا: یہ معمولی بات ہے۔ اس نے کہا: تم ایسا نہ کہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ "۔ عبدہ کہتے ہیں: میں نے سمجھا کہ وہ مجھ سے بڑے فقیہ ہیں۔

مجھے محمد بن خلف نے فضیل بن غزوان سے نقل کیا کہ ابواسحاق کی خدمت میں آیا اور میں نے ان کو سلام کیا اور میں نے پوچھا کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ فضیل نے کہا: جی ہاں! اگر تجھ سے حیاء مانع نہ ہوتا تو میں تمہیں بوسہ دیتا۔ پھر وہ مجھے کہنے لگے، مجھے حضرت عبداللہ نے بیان کیا کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے والوں کے متعلق اتری۔ "لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا"۔

مجھے یعقوب نے عمیر بن اسحاق سے نقل کیا کہ ہم بیان کیا کرتے تھے کہ سب سے اول چیز جو لوگوں کے مابین سے اٹھے گی وہ "الفت" ہو گی۔ انہوں نے " عن الناس " یا " من الناس " کہا۔

مجھے محمد بن عبداللہ نے بعدہ سے انہوں نے مجاہد سے پھر عبدالکریم جیسی روایت کی جو ولید سے گزری۔

ہمیں ابن وکیع نے ابوالاحوص سے انہوں نے حضرت عبداللہ (رض) سے سنا کہ آیت "لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" سے مراد اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے والے ہیں۔

إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے اوس اور خزرج کے ترفرق وتشتت کے بعد ان میں الفت پیدا کر کے ان کو تمہارا مددگار بنایا اللہ تعالیٰ عزیز ہیں کہ کوئی شخص اسے مغلوب نہیں کر سکتی اور اس کے فیصلے کو کوئی ردّ نہیں کر سکتا مگر وہ اپنی مخلوق میں اپنے فیصلے کو نافذ کرتا ہے اسی ہی کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کرو وہ مخلوق کی تدبیر میں حکمت والا ہے۔ (تفسیر طبری)

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا اصحاب رسول اور اہل بیت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مابین گہری محبت تھی۔ اہل تشیع سمجھتے ہیں کہ ابوبکر وعمر وعثمان (رض) اور مولا علی (رض) کے مابین شروع سے نفرت وعداوت تھی اس لئے جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے **من کنت مولاہ** کہہ کر امامت علی کا اعلان کیا تو ان لوگوں نے اسے تسلیم نہ کیا اور وصال نبوی کے بعد خلافت خود سنبھال لی۔ مگر یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں، دیکھو یہ سب مہاجرین ہیں جو ابتداء اسلام سے دامن رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے وابستہ ہوئے، اس کے مقابلہ میں انصار مدینہ کو صحبت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کم تر حصہ ملا۔ کیونکہ سورۃ انفال ہجری دو میں نازل ہوئی اور اس میں غزوہ بدر کی تفصیل بیان کی گئی جو ہجری دو میں واقع ہوا اور انصار مدینہ کو اس اسلام میں آئے ابھی دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ ان کے بارہ میں فرمایا گیا: **والف بین قلوبھم**۔ جب انصار کو بقول قرآن صحبت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فیض ملا کہ ان کے دل پاک ہو گئے اور ان کی دشمنیاں دوستیوں سے بدل گئیں اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے تو مہاجرین صحابہ کرام کی تطہیر قلبی کا کیا عالم ہو گا جنہوں نے پورے 23 برس صحبت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں گزارے۔ تو جو لوگ صحابہ واھل بیت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مابین نفرت ڈھونڈتے ہیں ان کے اپنے دلوں میں مرض ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝64

لغۃ القرآن: يَاَيُّهَا : اے] [النَّبِيُّ : نبی !] [حَسْبُكَ : کافی ہے آپ کو] [اللّٰهُ : اللہ] [وَمَنِ : اور " انہیں بھی " جو] [اتَّبَعَكَ : آپ کے پیچھے چلے] [مِنَ : سے] [الْمُؤْمِنِيْنَ : سب مومنوں کو] [

ترجمہ: اے نبی (معظم !) آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور وہ مسلمان جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کرلی

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے دھوکا دینے کی صورت میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنی مدد و نصرت کا وعدہ فرمایا تھااور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً ہر حال میں اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدد و نصرت اور کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے۔

شان نزول

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر میں جنگ سے پہلے نازل ہوئی اور مومنین سے انصار صحابہ کرام یا انصار و مہاجرین دونوں مراد ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت عمر فاروق (رض) کے اسلام قبول کرنے سے متعلق نازل ہوئی۔ اس قول کے مطابق یہ آیت مکی ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے مدنی سورت میں لکھی گئی ہے۔ اس آیت کا ایک معنی یہ ہے کہ اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اللہ عَزَّوَجَلَّ آپ کو کافی ہے اور ان مسلمانوں کو بھی کافی ہے جنہوں نے آپ کی پیروی کی۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اللہ آپ کو کافی ہے اور آپ کی پیروی کرنے والے مسلمان آپ کو کافی ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

اصل مدد اور ہر معاملہ میں کامیابی تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے تمام ظاہری اسباب خواہ کچھ بھی ہوں سب اسی واحد لاشریک کے قبضہ قدرت میں ہیں جو حقیقی مدد ہے اور ظاہری اسباب کے طور پر مسلمانوں کی جماعت اور جمعیت بھی آپ کے ساتھ ہیں کہ حضرات آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کرنے والے ہیں جہاں دیگر مسائل معاد اور اسباب معاش میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم بجالاتے ہیں وہاں جہاد میں بھی بدل سے اور جان و مال سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کرنے والے ہیں اہل ایمان کی جماعت مخلص ہو اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سرشار ہو آپس میں یکجان اور متحد ہو تو پھر ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ یہ آیت بالاتفاق مدنی ہے کہ جن حضرات نے اس کے نزول کا سبب حضرت عمر (رض) کے اسلام کو بتایا ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ (یہ مصنف عبدالستار شاہ صاحب کا مؤقف ہے) واللہ اعلم۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مومنین کو جہاد کی ترغیب دی اور جہاد کے فضائل و فوائد سے انہیں مطلع کریں تاکہ وہ ذوق و شوق کے ساتھ رضائے الٰہی کے خاطر ثابت قدمی کے ساتھ فریضہ جہاد میں حصہ لیں۔

امتحان کے انداز امتحان صرف ثابت قدمی کے لیے ہے

جہاد کوئی آسان کام نہیں جسے خوشی کے ساتھ ہر شخص انجام دینے پر مستعد ہو یہ بہت سخت کٹھن کام ہے اور اس میں ثابت رہنا اور پورا پورا صبر کرنا مزید امتحان امتحان ہے اور پھر یہ حکم کے تمہارے 20 افراد کفار کے 200 سے نبرد آزما ہو اور تمہارے 100 افراد دشمن کے ایک ہزار کے مقابلہ میں ثابت قدم ہو یہ مزید بہت بڑا نا قابل برداشت امتحان ہو گا۔ ابتدا میں یہی حکم تھا کہ ڈٹ کر مقابلہ کروں راہ فرار اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ سورۃ انفال کے دوسرے رکوع کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے وہاں تفصیل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس انی فرمائی جس کی تفصیل یہ ہے کہ فرمایا کافروں سے صلح کی جو اجازت دی گئی ہے وہ محض وقتی طور پر اور وہ بھی جواب کے درجے میں ہیں۔ اصلی حکم جہاد اور قتال کا ہے کیونکہ مقصد اعلاء کلمتہ اللہ ہے اور وہ اس پر موقوف ہے کہ کفر و شرک کا مکمل خاتمہ ہوا اور یہ چیز صلح سے حاصل نہیں ہو سکتی البتہ اس کا حصول جہاد ہی سے ہو گا۔

اسی بنا پر فرمایا کہ اے نبی آپ اہل ایمان کو جہاد و قتال کی ترغیب اور شوق دلائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور اس کا بول بالا ہو اور کفر کی شوکت مکمل ختم ہو اور یہ بات جہاد سے حاصل ہوتی ہے صلہ سے نہیں اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے اگر بیس افراد کی تعداد ہو گی اور وہ جم کر ثابت قدمی سے لڑیں گے تو اپنے مقابل کافروں کے 200 افراد پر غالب آئیں گے اور اگر وہ مسلمان ہونگے تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی تھا اور اس وعدہ میں یہ حکم بھی مضمر ہے کہ مسلمان اپنے سے 10 گناہ تعداد کے مقابلہ میں راہ فرار اختیار نہ کریں اور جم کر قوت سے لڑیں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس گناہ تعداد کے مقابلہ میں غلبہ پانے کا وعدہ ہو گیا تو اب راہ فرار اختیار کرنے کا کوئی موقع نہ رہا یہ جملہ لفظی طور پر خبریہ ہے اور معنوی طور پر انشائیہ ہے پھر فرمایا "**بانهم لا يفقهون** " یہ اس لئے کہ کفار ثواب آخرت کو سمجھتے نہیں یعنی اس لیے وہ تم پر غالب نہیں آئیں گے کہ وہ آخرت کو نہیں جانتے ہیں ان کی نظر صرف دنیوی زندگی پر مرکوز ہے بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ آخرت اور جنت کے ایسے مشتاق اور دلدادہ ہیں جیسے کہ پیاسا شخص پانی کا مشتاق ہوں وہ آخرت کے شوق میں اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے منتظر رہتے ہیں۔ پس جو صرف نفس و شیطان اور عصبیت و جاہلیت کے لیے لڑتا ہوں وہ مسلمانوں پر کیوں اور کیسے غلبہ پائے گا جن کا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا اور لڑنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کا مطلب اور مقصد صرف **العليمة الله** ہو وہ اگر بلند و بالا پہاڑوں سے ٹکرائے تو یقین ہے کہ اس کی جیت ہو گی اور پہاڑ اس کی ہیبت سے ریزہ ریزہ ہو گے۔ (تفسیر منازل العرفان)

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (اقبال)

سربراہ کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اپنے ساتھیوں پر اعتماد کرتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کرنے کا حکم دینا چاہیے جب مسلمان کردار کے حوالے سے پختہ تھے تو اس وقت کفار کے خلاف تناسب یہ قائم کیا گیا کہ اگر کفار اپنی جارحیت سے باز نہ آئیں تو دس کفار کے مقابلے میں ایک مسلمان کافی ہے یہ تعداد اس لیے کافی ہے کہ کافر موت کی حقیقت سے واقف نہیں وہ قتال اور موت سے اس لیے ڈرتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی مقصد اور منزل نہیں ہوتی۔ جس وجہ سے اس میں وہ جوش اور ولولہ پیدا نہیں ہوتا جو مجاہد کے سینے میں موجزن ہوتا ہے مجاہد موت سے ٹکرانے کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے مولا کی رضا کی خاطر اس کے دین کی سربلندی کے لیے میدان کارزار میں اترتا ہے وہ اپنے خالق ومالک سے ملاقات کی تمنا اور اس کی جنت کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے اسی بناء پر غزوہ احد کے موقع پر ایک صحابی کھجوریں کھا رہے تھے جونہی اس نے قتال فی سبیل اللہ کی آواز سنی تو یہ کہتے ہوئے کھجوریں پھینک دیں کہ اللہ کی قسم مجھے احد پہاڑ کی طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے ایسا ہی خوبصورت منظر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ نے اس وقت دیکھا۔ جب توحید کی پاداش میں اس کے نازک جسم پر میخیں ٹھونکی جارہی تھیں۔ (قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ) [التحریم: ۱۱]

”اس نے دعا کی: ”اے میرے رب! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا اور ان ظالموں سے بھی نجات دے۔“

مفسرین نے لکھا کہ حضرت آسیہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی موت سے پہلے جنت میں اس کا گھر دکھلا دیا تھا۔ یہی وہ فرق ہے جو مجاہد اور کافر کے درمیان ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ کافر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ پہلے حکم کے بعد دوسرا حکم نازل ہوا۔ جس میں تخفیف کر دی گئی جسے مضمون میں تسلسل کی خاطر یہاں رکھا گیا ہے۔ آج اس کی صورت یہ ہوگی کہ اگر کفار مسلمانوں پر جنگ مسلط کریں اور جنگی تناسب ایک کے مقابلے میں دس کا ہو تو پھر مسلمانوں پر قتال فرض ہو جائے گا۔ اگر تناسب میں اس سے زیادہ فرق ہو تو پھر مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ کفار کے ساتھ اپنے وقار سے کم درجہ شرائط پر صلح کر سکتے ہیں۔ لیکن جب جنگی تناسب ایک اور دو کا ہو اور کافر تبلیغ اسلام میں رکاوٹ یا مسلمانوں پر جارحیت کرنے لگیں تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو اللہ کا حکم سمجھ کر کفار کے خلاف ڈٹ جانا چاہیے کیونکہ فتح اور شکست اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اگر مسلمان ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ انھیں ضرور فتح سے سرفراز فرمائے گا۔

(عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَغَدْوَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا) [رواہ البخاری: کتاب الجہاد، باب الغدوۃ والروحۃ]

”حضرت انس بن مالک (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا اللہ کے راستے میں صبح یا شام کو نکلنا دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔“

(عن ابی هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ أَعْلَمُ بِمَنْ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِهِ كَمَثَلِ الصَّاءِمِ الْقَاءِمِ وَتَوَكَّلَ اللّٰہُ لِلْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِهِ بِأَنْ يَتَوَفَّاهُ أَنْ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ أَوْ يَرْجِعَهُ سَالِمًا مَعَ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ) [رواہ البخاری : کتاب الجہاد، باب اِفضل المومنین]

" حضرت ابوہریرہ (رض) بیان فرماتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی مثال اور اللہ تعالیٰ اس شخص کو بہتر جانتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے روزے رکھنے والے اور راتوں کو قیام کرنے والے کی طرح۔ اللہ تعالیٰ اپنے راستے میں جہاد کرنے والے کو یہ بدلہ دے گا کہ اسے جنت میں داخل کرے یا صحیح سلامت واپسی کی صورت میں ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ لوٹائے گا۔" (تفسیر فہم القرآن)

حضرت عمر فاروق (رض) عنہٗ کے ایمان لانے پر خصوصی آیت کا نزول

امام ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تینتیس (۳۳) مرد اور چھ عورتیں ایمان لا چکیں تو عمر بن خطاب (رض) ایمان لائے (اور چالیس کا عدد پورا کیا) تب یہ آیت نازل ہوئی: يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 1728 حدیث 5319 مطبوعہ مکہ) یہی حدیث امام طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت کی ہے (طبرانی کبیر جلد 21 صفحہ 74 حدیث 12470 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) حد یہ ہے کہ اس آیت کا ایمان عمر فاروق (رض) عنہٗ کے موقع پر نازل ہونا اہل تشیع کے ہاں معتبر کتاب تاریخ روضہ الصفا جلد 2 صفحہ 284 مطبوعہ لکھنؤ میں بھی مذکور ہے)

گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جب آپ کو عمر فاروق (رض) جیسا مومن ساتھی مل گیا ہے تو اب آپ کو غلبہ دین کے بارے میں کوئی فکر نہیں رکھنی چاہیے آپ کو اللہ اور آپ کے مخلص مومن ساتھی کافی ہیں۔ حضرت عمر فاروق (رض) عنہٗ کے اسلام لانے کے لئے حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود دعا فرمائی۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عمر فاروق (رض) عنہٗ کے اسلام کے لئے دعا فرمانا

مشہور معتزلی شیعہ مورخ علامہ ابن ابی الحدید نے بھی لکھا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی: **اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب**۔ "اے اللہ! عمر بن خطاب کے ذریعے اسلام کو عزت عطا فرما۔" (شرح نہج البلاغہ علی ابن ابی الحدید جلد 3 صفحہ 43 مطبوعہ بیروت)

یہ دعاء رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ترمذی کتاب المناقب باب 17، ابن ماجہ مقدمہ باب فضل عمر بن الخطاب اور مسند احمد جلد 2 صفحہ 59 میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: **اللھم اعز الاسلام بابی جھل بن ھشام او بعمر بن الخطاب۔** "اے اللہ! ابو جہل بن ہشام یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ اسلام کو عزت عطافرما۔"

اور سنن ابن ماجہ میں سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعافرمائی:

اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب خاصۃ "اے اللہ! خصوصاً عمر بن الخطاب کے ذریعہ اسلام کو عزت عطافرما۔" اسی لئے یہ کہنا بجاہے کہ دیگر صحابہ کرام حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مرید ہیں اور عمر فاروق (رض) عنہٗ آپ کی مراد ہیں۔ جب انھیں رسول نے اللہ تعالیٰ سے طلب کیا اور اللہ تعالیٰ نے عطافرمایا تو ان کو برا کہنے والا اپنا ایمان ضائع کرتا ہے۔

حضرت عمر فاروق (رض) عنہٗ کا اسلام لانا سنی و شیعہ کتب سے

اس جگہ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی یہ حدیث بھی یاد رہے کہ جب عمر بن الخطاب (رض) اسلام لائے تو جبرائیل (علیہ السلام) نازل ہوئے اور فرمایا:

یا محمد قد استبشر اھل السماء باسلام عمر۔ یعنی "اے محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آج آسمانی مخلوق (فرشتے اور حوران و غلمان جنت) عمر بن خطاب (رض) کے اسلام لانے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہیں۔" (سنن ابن ماجہ مقدمہ حدیث 102)

اور اہل آسمان ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہ دیں، حضرت عمر فاروق (رض) کے اسلام لانے سے اسلام کو وہ عزت ملی کے پہلے مسلمان دار ارقم میں چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ آپ کے اسلام لانے پر پہلی بار مسلمانوں نے حرم کعبہ میں جاکر عبادت کی اور کسی کافر کو ان کے قریب آنے کی جرات نہ ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں: "مسلمانوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ کعبۃ اللہ میں جاکر عبادت کر سکیں، حضرت عمر فاروق (رض) کے اسلام لانے پر مسلمانوں کو یہ موقع ملا اور کفار نے مسلمانوں کا تعاقب کرنا چھوڑ دیا۔" تاریخ الخلفاء علامہ سیوطی صفحۃ 87 مطبوعہ دار النادر مصر)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) ہی فرماتے ہیں:

ما زلنا اعزۃ منذ اسلم عمر۔ یعنی "جب سے عمر فاروق اسلام لائے ہم مسلمانوں کو عزت و وقار مل گیا"۔ (بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باب 6 حدیث 3684)

حضرت عمر فاروق (رض) عنہٗ کے اسلام لانے کا پورا واقعہ فارسی کے شیعہ شاعر مرزا رفیع مشہدی کی طویل فارسی نظم حملہ حیدری (جو فارسی شاہنامہ اسلام ہے) میں مذکور ہے جو بہت ایمان افروز ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چو در باز کردند بر روئے او در آمد عمر با نبی عذر گو
گرفتش ببر سید انبیاء نشاندش بجائے کہ بدوش سزا

بگفتند اصحاب ہم تہنئت وزاں بیشتر یافت دیں تقویت
پس اصحاب دیں راشد ایں مدعا کہ در خدمت سرور انبیاء
بسوئے حرم آشکار اروند نماز جماعت بجاآورند

ترجمہ: جب صحابہ نے عمر بن خطاب پر دروازہ کھولا تو اندر آئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاضر ہو کر معذرت طلبی کی۔ تب سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمر کو اپنی بانہوں میں لے لیااور انھیں مناسب جگہ پر بٹھایا صحابہ کرام ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے اور دین کو بہت زیادہ تقویت مل گئی۔ تب صحابہ کا طریقہ یہ ہوا کہ سرور انبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ سے نکلیں۔ حرم کعبہ میں کھلے عام جائیں اور نماز باجماعت بجالائیں۔ (حملہ حیدری صفحہ 13 مطبوعہ کتاب فروشی اسلامیہ بازار شیرازی تہران)

اس جگہ یہ شبہ وارد کیا جاتا ہے کہ عمر بن خطاب (رض) کا اسلام لانا دور مکی میں تھااور سورۃ انفال مدنی سورت ہے پھر اس آیت کا نزول ان کے حق میں کیسے ممکن ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سی مکی سورتوں میں مدنی آیات اور مدنی سورتوں میں مکی آیات ہیں امام سیوطی نے تفسیر اتقان میں اس پر مفصل کلام کیا ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جب کوئی آیت مبارکہ اترتی تو آپ فرماتے اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ لو تو ممکن ہے اس آیت کا بھی یہی حال ہو۔

بہر حال حضرت عمر (رض) کے اسلام لانے نے کفار مکہ کو لرزہ براندام کر دیا۔ بقول حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کفار مکہ نے اس دن کہا آج ہمارا نصف طاقت جاتی رہی۔ (در منثور جلد 4 صفحہ 110) اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **یاایھا النبی حسبك الله و من اتبعك من المومنین**۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت فاروق (رض) کی شان میں مفسر کی لکھی ہوئی منقبت

پیے توقیر دین حق کی عطا فاروق اعظم ہیں
رسول پاک کا ایک معجزہ فاروق اعظم ہیں
خدا سے مانگ کر ان کو پیمبر نے کیا حاصل
عطاء حق مر دار مصطفیٰ فاروق اعظم ہیں
تلاوت سن کے دل روشن ہوا آنسو ہوئے جاری
کتابِ حق کی ایک روشن ضیاء فاروق اعظم ہیں
جو سر لینے کو نکلا تھا وہ سر قدموں میں رکھتا ہے
خدا کی قدرتوں کی اک ادا فاروق اعظم ہیں
عمر کے دیں میں آنے پر فرشتے جشن کرتے تھے

خدا کی اور محمد کی رضا فاروق اعظم ہیں
نماز اولیں قائم ہوئی تھی صحن کعبہ میں
نبی کے دین کی عز و علا فاروق اعظم ہیں
کئی آیات اتری ہیں عمر کی رائے پر یارو
زبان وحی حق قرآن نما فاروق اعظم ہیں
نبی داماد ہو جس کا شرف اس کا بیاں کیا ہو
وقارِ دین و سسر مصطفیٰ فاروق اعظم ہیں
دنیائے خلافت کے ہیں وہ مہتاب درخشندہ
رسول حق کے دیں کے راہ نما فاروق اعظم ہیں
وہ کفر و شرک کے قاطع وہ عرب و عجم کے فاتح
پئے کفار شمشیر قضا فاروق اعظم ہیں
فرشتوں کی سلامی ان پہ طیبؔ جاری ہے ہر دم
نبی کے پہلو میں جلوہ نما فاروق اعظم ہیں

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝65

لغۃ القرآن: يٰٓاَيُّهَا : اے] [النَّبِيُّ : نبی !] [حَرِّضِ : ابھار یے] [الْمُؤْمِنِيْنَ : سب مومنوں کو] [عَلَي : پر] [الْقِتَالِ : لڑائی] [اِنْ : اگر] [يَكُنْ : ہو] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [عِشْرُوْنَ : بیس] [صٰبِرُوْنَ : سب صبر کرنے والے] [يَغْلِبُوْا :" تو " وہ سب

غالب آئیں گے] [مِائَتَیْنِ : دو سو پر] [وَاِنْ : اور اگر] [یَکُنْ : ہو] [مِنْکُمْ : تم میں سے] [مِّائَۃٌ : ایک سو " تو "] [یَّغْلِبُوْٓا : وہ سب غالب آئیں گے] [اَلْفًا : ایک ہزار پر] [مِّنَ الَّذِیْنَ : ان لوگوں کی طرف سے جو] [کَفَرُوْا : سب نے کفر کیا] [بِاَنَّهُمْ : اس وجہ سے کہ بیشک وہ] [قَوْمٌ : ایک قوم نے] [لَا : نہیں] [یَفْقَهُوْنَ : سب سمجھ جائیں] [

ترجمہ: اے نبی (مکرّم !) آپ ایمان والوں کو جہاد کی ترغیب دیں (یعنی حق کی خاطر لڑنے پر آمادہ کریں)، اگر تم میں سے (جنگ میں) بیس ( ) ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو ( ) (کفار) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے (ایک) سو (ثابت قدم) ہوں گے تو کافروں میں سے (ایک) ہزار پر غالب آئیں گے اس وجہ سے کہ وہ (آخرت اور اس کے اجر عظیم کی) سمجھ نہیں رکھتے (سو وہ اس قدر جذبہ و شوق سے نہیں لڑ سکتے جس قدر وہ مومن جو اپنی جانوں کا جنت اور اللہ کی رضا کے عوض سودا کر چکے ہیں)

تشریح:

یعنی اگر مسلمان صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہیں گے تو اپنے سے دس گنا لشکر کفار پر غالب آئیں گے۔ یہ جملہ اگرچہ خبر یہ ہے لیکن معنوی لحاظ سے امر ہے کہ مسلمان دس گنا طاقت کے سامنے ڈٹ جائیں۔ اور قدم پیچھے نہ ہٹائیں۔ کافر اپنی تعداد کی کثرت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو مغلوب نہیں کر سکیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ایسے بلند مقصد کے لیے جنگ کر رہے ہیں جو انھیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دین الٰہی کے نفاذ سے مظلوم انسانیت کی داد رسی ہو گی۔ باطل خداؤں کی عظمت کا تخت الٹ دینے سے مساوات کا پرچم لہرائے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ اور بشارت ہے کہ مسلمانوں کی جماعت صابر رہے تو مددِ الٰہی سے دس گنا کافروں پر غالب رہے گی کیونکہ کفار جاہل ہیں اور ان کی جنگ سے غرض نہ حصول ثواب ہے نہ خوف عذاب، جانوروں کی طرح لڑتے بھڑتے ہیں تو وہ للّٰہیت کے ساتھ لڑنے والوں کے مقابل کیا ٹھہر سکیں گے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر فرض کر دیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک فرد دس افراد کے مقابلہ سے نہ بھاگے، پھر آیت "اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ" نازل ہوئی تو یہ لازم کیا گیا کہ ایک سو مجاہدین دو سو 200 لوگوں کے مقابلے میں قائم رہیں۔

یعنی دس گنا سے مقابلہ کی فرضیت منسوخ ہوئی اور دو گنا کے مقابلہ سے بھاگنا ممنوع رکھا گیا۔

جہاد کی ترغیب

اس آیت میں مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کے حکم سے معلوم ہوا کہ جہاد بہت اعلیٰ عبادت ہے جس کی رغبت دلانے کا حضور پُر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد کی ہر جائز طریقہ سے رغبت دینا جائز ہے۔ غازی کی تنخواہ مقرر کرنا، اس کے بیوی بچوں کی پرورش کرنا، بہادروں کی قدر دانی کرنا سب اس میں داخل ہیں۔

اس آیت کے علاوہ قرآن پاک کی اور کئی آیات میں کفار سے جہاد کرنے کی ترغیب بیان کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱)"

ترجمہ کنزالعرفان: اے ایمان والو! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتادوں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم (اپنا حقیقی نفع) جانتے ہو۔

ایک مقام پر ارشاد فرمایا

"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ"

ترجمہ کنزالعرفان: بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بدلے میں خرید لیے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو (کافروں کو) قتل کرتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْــٴًـاؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۹)"

ترجمہ کنزالعرفان: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا؟ جب تم سے کہا جائے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو زمین کے ساتھ لگ جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کی بجائے دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے؟ تو آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا سازوسامان بہت ہی تھوڑا ہے۔ اگر تم (اللہ کی راہ میں) کوچ نہیں کرو گے تو وہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اسی طرح کثیر احادیث میں بھی جہاد کی ترغیب دی گئی ہے، ان میں سے 5 اَحادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "سب سے بہتر اس کی زندگی ہے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے ہے، جب کوئی خوفناک آواز سنتا ہے یا خوف میں اسے کوئی بلاتا ہے تو اُڑ کر (یعنی بہت جلد) پہنچ جاتا ہے۔ قتل و موت کو اس کی جگہوں میں تلاش کرتا ہے (یعنی مرنے کی جگہ سے ڈرتا نہیں ہے) یا اس کی زندگی بہتر ہے جو چند بکریاں لے کر پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی وادی میں رہتا ہے، وہاں نماز پڑھتا ہے اور زکوۃ دیتا ہے اور مرتے دم تک اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی عبادت کرتا ہے۔

(2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "مشرکین سے اپنے مال، جان اور زبان سے جہاد کرو۔ یعنی دین حق کی اشاعت میں ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو مر جائے اور نہ تو جہاد کرے اور نہ اپنے دل میں اس کا خیال کرے تو وہ نفاق کے ایک حصے پر مرے گا۔

(4)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ غازی (مجاہد) کے لیے اس کا ثواب ہے اور غازی کے مددگار کے لیے اپنا ثواب ہے اور غازی کا ثواب۔

(5)۔۔ حضرت زید بن خالد (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو سامان دیا تو اس نے جہاد کیا-اور جو کسی غازی کے گھر بار میں بھلائی کے ساتھ اس کا نائب بن کر رہا اس نے جہاد کیا۔ {عَلِمَ اَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا: اسے علم ہے کہ تم کمزور ہو۔} اس سے ایمان کی کمزوری نہیں بلکہ ابدان کی کمزوری مراد ہے۔ یعنی پہلے تو سو کے مقابلہ میں دس مسلمانوں کو ڈٹ جانا فرض تھا اب سو کافروں کے مقابلے میں پچاس کو ڈٹ جانا فرض رہ گیا۔ (تفسیر صراط الجنان)

چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مومنوں کو راہ خدا میں قتال پر خوب رغبت دلائی بلکہ آپ کی مدنی زندگی کا اکثر حصہ راہ خدا میں جہاد کرتے گزر گیا حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ کی قسم! مجھے یہ پسند ہے کہ اللہ کی راہ میں مجھے قتل کیا جائے پھر زندہ کر کے قتل کیا جائے پھر زندہ کر کے قتل کیا جائے"۔ (بخاری کتاب الجہاد باب 7) آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی راہ میں زخمی ہونے والے کا زخم روز قیامت تازہ ہو گا۔ اسے خون بہتا ہو گا جس سے کستوری کی خوشبو آئے گی۔

یاد رہے یہاں قتال کا لفظ بولا گیا ہے جہاد کا نہیں، کیونکہ جہاد کا مفہوم بہت وسیع ہے تبلیغ دین بھی جہاد ہے، غرباء و مساکین کی مدد بھی جہاد ہے، مگر کتاب صرف دشمنان اسلام سے

تلوار یا بندوق کے ساتھ لڑائی کرنے کا نام ہے اور اسی کی فضیلت یہاں بتائی جا رہی ہے۔

جہاد تا قیامت جاری ہے اور اس سے انکار کفر ہے

یہ بھی یاد رہے کہ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ کا حکم تا قیامت ہے۔ کیونکہ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ حکم میں عام ہے جس میں کسی زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں، جب بھی جہاد کی ضرورت پڑے اس کا کرنا فرض ہے۔

اسی لئے حضرت عروہ بارقی (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

الخیل معقد بنواصیها الخیر الی یوم القیامة الاجر والمغنم، "گھوڑوں کی پیشانیوں سے تا روز قیامت بھلائی باندھ دی گئی ہے، اجر اور مال غنیمت۔ " (بخاری کتاب الجہاد حدیث 2852، مسلم کتاب الامارۃ حدیث 98) گھوڑوں کا نام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بطور آلہ َ جہاد لیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جہاد تا قیامت جاری ہے خواہ وہ گھوڑوں بھی کیا جائے یا ٹینکوں اور توپوں سے۔ لہٰذا مرزا قادیانی کا یہ اشعار کفریہ ہیں:

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

اب آسمان سے نور خدا کا نزول ہے اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد منکر نبی کا ہے یوں یہ رکھتا ہے اعتقاد
(یہ کہنا اسلام سے بغاوت و تحریف ہے۔ اللہ کریم مسلمانوں کو ان خبیثوں سے محفوظ رکھے آمین)
(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 77 مطبوعہ لندن) (تفسیر برہان القرآن)

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ جہاد بہت اعلیٰ عبادت ہے جس کی رغبت دلانے کا حضور کو حکم دیا گیا۔ جو جہاد سے روکے وہ شیطان ہے جیسے مرزا قادیانی۔ دوسرے یہ کہ جہاد کی ہر جائز طریقہ سے رغبت دینا جائز ہے، غازی کی تنخواہ مقرر کرنا، اس کے بیوی بچوں کی پرورش کرنا، بہادروں کی قدر دانی کرنا سب اس میں داخل ہیں۔ (تفسیر نور العرفان)

کافر جنگ میں افرادی قوت، اسلحہ اور مادی چیزوں پر اعتماد کرتا ہے اور مومن کا اعتماد صرف اللہ عزوجل کی اعانت اور نصرت پر ہوتا ہے۔ اس لیے جب کافر اور مومن جنگ میں اترتے ہیں، تو مومن کی فتح، کامیابی اور کامرانی کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ کافر کا دل چونکہ اللہ کے نور، اس کی معرفت اور اس پر ایمان سے خالی ہوتا ہے، اس لیے وہ لڑائی کے وقت کمزور اور بزدل ہوتا ہے، اور مسلمان کا دل اللہ کے نور اور اس کی معرفت سے معمور ہوتا ہے، اور وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے باعث جہاد میں شریک ہوتا ہے، اس لیے وہ خوش دلی اور شرح صدر کے ساتھ جنگ کرتا ہے*۔ (تفسیر الحسنات)

مسلمان کافر پر بھاری کیوں ہوتا ہے؟

آیت کے آخر میں اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ ایک مومن دس کافروں پر بھاری کیوں ہوتا ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ کافر یہ تو جانتا ہے کہ لڑنے کے لیے افرادی قوت درکار ہے اور اسلحہ کی قوت کے بغیر کوئی لڑائی جیتی نہیں جاسکتی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ حق اور باطل میں فرق کیا ہے۔ حق کی طاقتوں کا سررشتہ اللہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ شیطانی سہاروں سے کھڑا ہوتا ہے۔ کافر چاہے کیسی بہادری دکھائے مگر اس کے پیش نظر اپنی جان بچانا اور فتح حاصل کرنے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ امکانات کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ وہ زندگی سے پیار کرتا اور موت سے ڈرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے چند لاشے گرجائیں تو وہ اپنی موت کا تصور کر کے حوصلہ چھوڑ دیتا ہے۔ اسے اس بات کا بالکل شعور نہیں ہے کہ کسی مقصد کی خاطر خون دینا اور بدرجہ آخر جان دے دینے میں کیا مزہ ہے؟ اس کے نزدیک انسانی منزل دنیوی نعمتیں ہیں اس کے ادراک سے یہ بات کوسوں دور ہے کہ موت کے بعد بھی ایسی نعمتیں میسر آسکتی ہیں جن کا خیال نہ کبھی کسی دل میں آیا، نہ کسی آنکھ نے انھیں دیکھا اور نہ کبھی کسی کان نے اس کی خوبصورتی کے متعلق کچھ سنا اور جسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ اللہ کے راستے میں زندہ رہنا امانت کی ادائیگی ہے اور اس کے راستے میں مرجانا ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔ دنیا میں قیام کی مدت گنے چنے چند سال ہیں اور آخرت کے قیام کی مدت ہمارے پیمانوں میں نہیں آسکتی۔ جس شخص کو موت کے بعد کی زندگی اور وہاں ملنے والی آسائشوں اور نعمتوں کا یقین آجائے وہ زندہ رہنے کے لیے نہیں مرنے کے لیے جیتا ہے۔ زندگی کا حریص ہمیشہ کمزوری کا شکار ہوتا ہے اور موت سے کھیلنے والا زندگی سے بے نیاز ہو کر جب آگے بڑھتا ہے تو موت اس سے خائف ہو جاتی ہے۔ کافر چونکہ ان تصورات سے

بالکل بے خبر ہے اور مومن کا اصل اسلحہ یہی تصورات ہیں اس لیے ایک مومن دس کے مقابلے میں بھی کیا سو کے مقابلے میں بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری میں تخفیف

اس کے بعد تیسری آیت کریمہ میں فرمایا کہ مومن اور کافر کے اصل مقابلے کا معیار تو یہی ہے اور جب بھی مومن صبر کی ایسی قوت سے میدان میں اترے گا تو اللہ کا یہ وعدہ کہ وہ دس پر ایک مومن کو بھاری رکھے گا ضرور پورا ہو گا لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ جیسے جیسے نظریاتی قوت میں وسعت آتی ہے اور حق کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے تو ان میں ایسے مخلصین بھی ہوتے ہیں جو اپنے اخلاص کے باجود سابقون الاولون کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکتے کبھی نہ کبھی چھوٹی موٹی انسانی کمزوریاں مسلمانوں میں در آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان انسانی کمزوریوں کا لحاظ فرماتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اب تمہاری ذمہ داریوں میں کمی فرمادی ہے کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بات کو بہت گراں سمجھتے ہیں کہ ایک شخص دس کے مقابلے میں کیسے پورا اتر سکتا ہے ؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس تناسب کو کم فرماتے ہوئے اور ان کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اب ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اب اگر تمہاری تعداد ایک سو ہو گی تو اسے دو سو کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا ہو گا اور اگر وہ ایک ہزار ہوں گے تو انھیں دو ہزار سے بے ساختہ ٹکرا جانا ہو گا۔ اب یہ قیامت تک کے لیے مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ تمہارا اصل معیار تو وہی ہے کہ تم اسے دس گنا دشمن سے بھی خوف نہ کھاؤ لیکن قیامت تک مسلمانوں کا معیار یکساں نہیں رہ سکتا اس لیے آخری معیار یہ ہے کہ اپنے دگنے دشمن کے مقابلے سے کبھی پسپائی اختیار نہ کرنا۔ کوشش کرنا کہ سیرت و کردار اور اللہ پر اعتماد اور ثابت قدمی اور جاں نثاری میں روز بروز اضافہ ہو اور تم اپنے سے دس گنا دشمن کے سامنے ٹھہرنے کا اپنے اندر حوصلہ پاؤ۔ لیکن تمہارا معیار اس سے فروتر تو کبھی نہ ہونا چاہیے کہ تم اپنے دوگنا دشمن کے سامنے سے بھی فرار کا راستہ اختیار کرو اور اس بات کو ہمیشہ کے لیے یاد رکھو کہ حق و باطل کی کشمکش یا قوموں کے تصادم میں خوفزدگی ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور ایسی احتیاط جو بزدلی کو بھی شرمادے وہ تاریخ کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ جس قوم کے سربراہ اپنے سے بڑے دشمن کے مقابلے میں ہمیشہ وسائل اور اسباب کو سامنے رکھ کر سوچتے ہوں اور دشمن کے وسائل کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے خوف زدگی کی بنیاد پر منصوبہ بندی کرتے ہوں ان سے زیادہ اپنی قوم کا دشمن اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جو قوم مرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے اسے دنیا میں کوئی نہیں مار سکتا اور جو قوم بہر صورت زندہ رہنا چاہتی ہے وہ صرف ذلیل ہو کر زندہ رہ سکتی ہے عزت کی زندگی کا راستہ خطرات سے گزرتا ہے۔ آزادی اور سرافرازی کے نخلستان، اس سرزمین پر لہلہاتے ہیں جو شہیدوں کے خون سے سیراب ہوتی ہے۔ جو قوم حبِّ دنیا میں مبتلا ہو کر یا موت سے ڈر کر خون دینے میں کوتاہی کرتی ہے وہ پھر ندامت کے آنسوؤں سے اپنی تاریخ لکھتی ہے جس کا کوئی عنوان عزت اور سربلند نہیں ہوتا۔

جو دیکھی ہسٹری تو دل کو پھر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کا یہی مفہوم ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ 66○

لغۃ القرآن: اَلْـٰٔنَ : اب] [خَفَّفَ : ہلکا کردیا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَنْكُمْ : تم سے] [وَعَلِمَ : اور اس نے جان لیا ہے] [اَنَّ : کہ بیشک] [فِيْكُمْ : تم میں "سے"] [ضَعْفًا :] [فَاِنْ : پھر اگر] [يَكُنْ : ہو] [مِّنْكُمْ : تم میں سے] [مِّائَةٌ : ایک سو] [صَابِرَةٌ : صبر کرنے والے] [يَّغْلِبُوْا :" تو " وہ سب غالب آئیں گے] [مِائَتَيْنِ : دو سو پر] [وَاِنْ : اور اگر] [يَكُنْ : ہو] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [اَلْفٌ : ایک ہزار] [يَّغْلِبُوْٓا :" تو وہ سب غالب آئیں] [اَلْفَيْنِ : دو ہزار پر] [بِاِذْنِ اللّٰهِ : اللہ کے حکم سے] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [مَعَ : ساتھ] [الصّٰبِرِيْنَ : صبر کرنے والوں کے] [

ترجمہ: اب اللہ نے تم سے (اپنے حکم کا بوجھ) ہلکا کردیا اسے معلوم ہے کہ تم میں (کسی قدر) کمزوری ہے سو (اب تخفیف کے بعد حکم یہ ہے کہ) اگر تم میں سے (ایک) سو (آدمی) ثابت قدم رہنے والے ہوں (تو) وہ دو سو (کفار) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے (ایک) ہزار ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار (کافروں) پر غالب آئیں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (یہ مومنوں کے لیے ہدف ہے کہ میدان جہاد میں ان کے جذبہ ایمانی کا اثر کم سے کم یہ ہونا چاہیئے)

تشریح:

ابتداء میں مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنے سے دس گنا بڑے لشکر کفار کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں

اور میدان چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ اب حالات کے پیش نظر اس تعداد میں تخفیف کر دی گئی ہے یعنی اپنے سے دوگنا لشکر کفار کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح و نصرت عطا فرمائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کیونکہ کفار صرف ظاہری کامیابی کے لیے لڑتے ہیں اور اپنی زندگی پر حریص ہوتے ہیں اور جب بظاہر فتح کے امکانات نہ ہوں تو وہ بزدلی دکھاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں مگر مسلمان صرف دنیاوی فتح و نصرت کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لڑتے ہیں اور آخرت میں اجر عظیم کی امید رکھتے ہیں اسی لیے وہ ثابت قدم اور پوری سر گرمی سے لڑتے ہیں۔ نیز کافروں کو صرف ظاہری اسباب پر بھروسہ ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں کو ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ اصل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ تو مسلمانوں پر یہ حکم بھاری گزرا، کیونکہ ان پر یہ ضروری قرار دیا گیا کہ دس کفار کے مقابلہ میں ایک مسلمان فرار نہ ہو، تب اللہ نے ان پر تخفیف کر دی اور فرمایا: اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ الخ، تو جس قدر ان پر تخفیف کی گئی اسی قدر ان کا صبر بھی کم ہو گیا۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ انفال حدیث 4652)

جب کفار کی طاقت دوگنا ہو تو مقابلہ سے بھاگنا حرام ہے

یعنی پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرض کیا کہ اگر 200 کفار کے مقابلہ میں 20 مومنین اور ہزار کے مقابلہ میں سو مومنین ہوں میں ایک مومن ہو تو اس پر لازم ہے کہ جب کفار حملہ آور ہوں تو وہ مقابلہ کے لئے تلوار لے کر نکلے اور ہر گز نہ بھاگے اور ڈٹ جائے اللہ غالب کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں نرمی کر دی اور فرمایا کہ تم میں کچھ کمزور لوگ بھی ہوتے ہیں لہٰذا 200 کفار کے مقابلہ میں 100 مومنین اور 2000 کے مقابلہ میں 1000 مومنین ہوں یعنی دو کے مقابلہ میں ایک ہو تو اس پر کفار کا مقابلہ لازم ہے یعنی اگر کفار حملہ کریں اور ان کی طاقت مومنوں سے دوگنا ہو تو مومنوں پر جہاد فرض ہے اور مقابلہ سے بھاگنا حرام۔ ہاں اگر کفار اس سے زیادہ ہوں تو پھر جہاد کے لیے نکلنا مومنوں پر لازم نہیں۔ اگر نہ نکلے تو گناہگار نہ ہوں گے (ہاں اس صورت میں آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی مدد کے لئے نکلنا فرض ہے) پھر بھی اگر وہ نکل پڑے ہیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں تو اللہ مدد فرمائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

کَم مِن فِئَۃٍ قلیلۃ غلبت فئَۃ کثیرۃ باذن اللہ۔ "بہت سے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہوں پر غالب آ جاتے ہیں"۔ (بقرہ: 249) چنانچہ جنگ موتہ میں عیسائیوں کی تعداد 3 لاکھ تھی اور صحابہ کرام کی 3 ہزار یعنی ہر سو کفار کے مقابلہ میں ایک مومن تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں غلبہ دیا۔ بدر میں ہر دس کفار کے مقابلہ میں 3 مومنین تھے اور انھیں عظیم الشان غلبہ حاصل ہوا۔ (تفسیر برہان القرآن)

غزوہ بدر میں رؤسائے قریش میں سے جو نامور قریش کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔ ان میں شیبہ، عتبہ، ابو جہل، ابوالبختری، زمعہ بن اسود، عاص بن ہشام اور امیہ بن خلف وغیرہ ہم کفار قریش، جو جنگی طاقت میں ریڑھ کی ہڈی تھے، مارے گئے۔ ان لوگوں کے مارے جانے سے کفار قریش کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔۔ لہٰذا۔۔ کفار قریش کے صنادید سمیت ستر 70 کافروں کا خون بہانے کے بعد ستر 70 کافروں کو قیدی بنالینا، کوئی نامناسب عمل نہیں تھا۔ یہ عمل زمین جنگ میں خوں ریزی کی دھوم مچادینے والا ہی قرار پائے گا۔ اور چونکہ مذکورہ صورت حال میں قیدی بنالینے سے منع بھی نہیں فرمایا گیا تھا۔۔ لہٰذا۔۔ یہ کوئی گناہ کا کام بھی نہیں ہوا۔ (تفسیر اشرفی)

۔۔ ہاں۔۔ قیدی بنالینے کے بعد، اب یہ مسئلہ سامنے آیا، کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ انھیں قتل کر دیا جائے۔ یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے؟ جب جنگ بدر میں ستر کافر قید کر کے بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں پیش کئے گئے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے متعلق صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ (تفسیر الحسنات)

بدر میں جو ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھ قید ہو کر آئے ان کے متعلق دو رائے تھیں ایک یہ کہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے کہ اس وقت مسلمانوں کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ اس وقت یہ اجازت تھی کہ کافروں کی طاقت توڑنے کے بعد پھر فدیہ لیا جاسکتا ہے۔ (تفسیر فیوض القرآن)

توسب سے پہلے حضرت صدیق اکبر (رض) نے اپنی رائے عرض کی کہ حضور یہ حضور کی قوم و قبیلے کے لوگ ہیں میری رائے میں ان سے فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے اس سے مسلمانوں کو مالی قوت بھی حاصل ہو جائے گی اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پیشانی پر آفتاب ہدایت چمکا کر انھیں اسلام قبول کرنے کی بھی توفیق دے دے اس کے بعد حضرت فاروق اعظم (رض) کھڑے ہوئے اور عرض کیا میری رائے میں ان لوگوں نے چونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب، توہین اور تحقیر کی ہے حتیٰ کہ انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مکہ میں رہنا بھی گوارا نہ کیا یہ کفر کے سردار اور کافروں کے سرغنے ہیں ان کی گردنیں قلم کی جائیں اللہ تعالیٰ آپ کی ذات مقدس کو فدیہ سے مستغنی کر دے گا۔ علی المرتضیٰ اپنے بھائی عقیل کو قتل کریں اور حمزہ عباس کو اور میں اپنی قرابت والوں کو ماروں اور ہمیشہ کے لیے انھیں ختم کروں۔ لیکن آخر امر اکثریت اسی طرف رہی کہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور فاروق رائے کی موافقت میں حکم آیا۔ (تفسیر الحسنات)

بخاری میں ابن عباس سے منقول ہے کہ گزشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا، جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری۔ (اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ) یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھالیا۔ اب صرف اپنے سے دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے یہ کمزوری یا سستی جس کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوئی، کئی وجوہ سے ہوسکتی ہے۔ ابتدائے ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کی قوت و جلادت معلوم تھی، کچھ مدت کے بعد ان میں سے بہت افراد بوڑھے اور کمزور ہوگئے اور جو نئی پود آئی ان میں پرانے مہاجرین و انصار جیسی بصیرت، استقامت اور تسلیم و تفویض نہ تھی، اور تعداد بڑھ جانے سے کسی درجہ میں اپنی کثرت پر نظر اور توکل علی اللہ میں قدرے کمی ہوئی ہوگی۔ اور ویسے بھی طبیعت انسانی کا خاصہ

ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوش عمل زیادہ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آخر کچھ میں ہی تنہا تو اس کا ذمہ دار نہیں۔ اسی قدر جوش، حرارت اور ہمت میں کمی ہو جاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے، تب یہی حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دگنے سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت عمر کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد اللہ بھری پڑی ہے۔ (تفسیر گلدستہ)

قرآن میں نسخ ثابت ہے

اس جگہ یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں نسخ ثابت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک سخت حکم جاری کیا پھر اس کو منسوخ کر کے اس سے نرم تر نیا حکم جاری کر دیا، اسی کو نسخ کہتے ہیں۔

اسی طرح پہلے بیوہ عورت پر ایک برس عدت گزارنا لازم ہوا ارشاد ہوا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ (بقرہ: 240) پھر نرمی کر کے چار ماہ دس دن عدت لازم کر دی، تو فرمایا گیا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ (بقرہ: 234)

اسی طرح پہلے فرض کیا گیا کہ مرنے والا مرنے سے قبل اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرے (بقرہ: 180) پھر اس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے مرنے والے کی میراث میں سے حصہ مقرر فرما دیئے اور اس بارہ میں سورۃ نساء کا دوسرا رکوع مکمل طور پر اتارا گیا۔

اس کے باوجود آج مرزائی اور چکڑالوی گروہ قرآن میں کسی نسخ کا قائل نہیں، انھیں چاہیے کہ میراث کا کوئی حکم نہ مانیں، نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کیا کریں، بیوہ کی عدت ایک سال رکھیں، وغیرہ۔ حیرت یہ ہے کہ وہ بزعم خود نسخ سے انکار کرتے قرآن کی حفاظت کر رہے ہیں اور قائلین نسخ کا مذاق اڑاتے ہیں، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○67

لغۃ القرآن: مَا : نہیں] [كَانَ : ہے] [لِنَبِيٍّ : نبی کے لیے] [اَنْ يَّكُوْنَ : کہ ہو] [لَهٗٓ : اس کیلیے] [اَسْرٰي : قیدی] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [يُثْخِنَ : وہ خون بہا لے] [فِي

الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [تُرِیْدُوْنَ : تم سب چاہتے ہو] [عَرَضَ : سامان] [الدُّنْيَا : دنیا کا] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [يُرِيْدُ : وہ چاہتا ہے] [الْاٰخِرَةَ : آخرت] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [عَزِيْزٌ : غالب] [حَكِيْمٌ : حکمت والا ہے] [

ترجمہ: کسی نبی کو یہ سزاوار نہیں کہ اس کے لیے (کافر) قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں ان (فتنہ پرور اور دہشت گرد محاربین) کا اچھی طرح خون نہ بہالے۔ تم لوگ دنیا کا مال واسباب چاہتے ہو، اور اللہ آخرت کی (بھلائی) چاہتا ہے، اور اللہ خوب غالب حکمت والا ہے

تشریح:

شان نزول

مسلم شریف وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ جنگ بدر میں ستر کافر قید کر کے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں لائے گئے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے متعلق صحابہ کرام (رض) سے مشورہ طلب فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے عرض کیا کہ یہ آپ کی قوم و قبیلے کے لوگ ہیں، میری رائے میں انھیں فِدیَہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اس سے مسلمانوں کو قوت بھی پہنچے گی اور کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اسلام نصیب کرے۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا کہ ان لوگوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کی، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مکہ مکرمہ میں نہ رہنے دیا نیز یہ کفر کے سردار اور سرپرست ہیں ان کی گردنیں اڑادی جائیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فدیہ سے غنی کیا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ (رض) کو عقیل پر اور مجھے میرے رشتے دار پر مقرر کیجئے کہ ان کی گردنیں ماردیں۔ لیکن بِالآخر فدیہ ہی لینے کی رائے قرار پائی اور جب فدیہ لیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

{ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا : تم لوگ دنیا کا مال واسباب چاہتے ہو۔ } اس آیت میں خطاب مومنین سے ہے اور مال سے فدیہ مراد ہے۔ یعنی تم لوگ دنیا کا مال واسباب چاہتے ہو اور اللہ تمہارے لیے آخرت کا ثواب چاہتا ہے جو کفار کے قتل اور اسلام کے غلبے کی صورت میں تمہیں ملے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ یہ حکم بدر میں تھا جبکہ مسلمان تھوڑے تھے پھر جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور وہ فضل الٰہی سے قوی ہوئے تو قیدیوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی "فَإِمَّا مَنًّۢ وَسَلَّمَ کے ابَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً "

(پھر اس کے بعد احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے لو) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مومنین کو اختیار دیا کہ چاہے کافروں کو قتل کریں، چاہے انھیں غلام بنائیں، چاہے فدیہ لیں، چاہے آزاد کریں۔ بدر کے قیدیوں کا فدیہ چالیس اوقیہ سونا فی کس تھا جس کے سولہ سو درہم ہوئے۔ (تفسیر صراط الجنان)

سیرت و کردار کا اعلیٰ ترین معیار

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے اعلیٰ ترین معیار مسلمانوں کے سامنے رکھا جارہا ہے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ مسلمان دنیا میں واحد گروہ ہیں جو اللہ کے لیے جیتے اور اللہ کے لیے مرتے ہیں۔ وہ نفع و ضرر کے تمام پیمانوں کو توڑ کو اور خواہشات دنیا سے منہ موڑ کر ایک ایسے راستے پر چل نکلے ہیں جس میں قدم قدم پر قیامت یں ہیں لیکن اس کی منزل اور انجام اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی ہے۔ وہ اسلام کا ایسا ہر اول ہیں جس سے تاریخ وجود میں آئے گی اور دنیا ایسے انسانوں کو دیکھے گی جس کی نظیر اس سے پہلے چشم فلک نے نہیں دیکھی۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم پیش نظر آیت کریمہ کو دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سیرت و کردار کا بلند معیار اللہ کو ایسا عزیز ہے کہ وہ اس میں معمولی کمی بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ مسلمان جب جنگ میں اترتے ہیں تو ان کے پیش نظر اعلائے کلمتہ الحق اور اللہ کی خوشنودی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ فتح عطا فرماتے ہیں تو لوگوں کو قیدی بنانا اور مال غنیمت کا ہاتھ آنا یہ جنگ کے معمولات میں سے ہے اور کسی قوم کو بھی اس سے گریز نہیں۔ لیکن اس سے فی الجملہ چونکہ دنیا اور دولت دنیا کی طرف رغبت معلوم ہوتی ہے اور بلند معیار سے زوال کے سفر کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اس لیے پروردگار نے ایسی بات پر بھی سخت سرزنش فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہی باتیں کسی اور گروہ میں ہوتیں تو قابل قدر سمجھی جاتیں، لیکن مسلمانوں کی فکری اور عملی پاکیزگی کو دیکھتے ہوئے اسے بھی قابل گرفت سمجھا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کی سطح کبھی یکساں نہیں ہوتی، راہنماؤں اور پیچھے چلنے والوں سے ایک جیسے معیار کا تقاضا نہیں کیا جاتا۔ علماء اور مشائخ اور سیاسی لیڈروں کو کبھی ایک ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ اسی طرح وہ امت جو دنیا کی سیادت کے لیے اٹھائی جارہی ہے اسے چونکہ مینارہ نور بن کر زندگی گزارنی ہے اور امتوں کے لیے سنگ ہائے میل چھوڑنے ہیں۔ ان کی معمولی فرو گزاشت بھی دوررس اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان پر گرفت فرمائی اور سخت گرفت فرمائی حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ جب جنگ بدر ختم ہوئی تو مسلمانوں نے اگرچہ بھاگنے والوں کا تعاقب بھی کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ توجہ تعاقب کی بجائے مال غنیمت اکٹھا کرنا اور دشمن کے افراد کو گرفتار کرنے کی طرف رہی۔ بجائے اس کے کہ وہ قتل عام کے ذریعے ان کی طاقت ہمیشہ کے لیے توڑ دیتے انھوں نے گرفتار کر کے ان کی زندگیاں محفوظ کر دیں اور مال غنیمت سمیٹ لینے میں اس لیے بھی زیادہ دلچسپی لی کیونکہ مسلمان بری طرح وسائل کی کمیابی کا شکار تھے اور جب ان گرفتار قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو بجائے ان کی طاقت کچلنے کے فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا گیا۔ پروردگار نے ان پر گرفت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

مسلمان اپنی انتہائی ذہانت و فراست اور تقویٰ اور للّٰہیت کے باوجود ابھی تک نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصل ہدف کو سمجھ نہیں سکے

ان کا گمان یہ ہے کہ ہم مال اس لیے لے رہے ہیں تاکہ آئندہ دشمنوں سے جنگوں کی تیاری کر سکیں اور قیدیوں سے حسن سلوک اس لیے کر رہے ہیں ممکن ہے وہ اسلام کی آغوش میں آ جائیں۔ لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکے کہ اللہ کا نبی دنیا میں نہ قیدیوں کو گرفتار کرنے کے

لیے آتا ہے اور نہ مال و دولت کو جمع کرنے کے لیے۔ اس کے پیش نظر دشمن کی قوت کو توڑ کر اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ وہ تخت و تاج کا طلب گار نہیں بلکہ وہ جھونپڑے میں رہ کر زمین پر اللہ کے نام کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو خوب معلوم ہے کہ قیدیوں کا ایک ایک فرد واپس جا کر کفر کی طاقت ثابت ہوگا اور کفر از سر نو شیرازہ بندی بھی کرے گا اور منصوبہ بندی بھی۔ اگر ان کی طاقت کو کچل دیا جاتا تو پہلی ہی جنگ ان کی طاقت توڑنے کے لیے کافی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی ساری للّٰہیت کے باوجود ابھی تک دنیا کی طلب اور دنیا کی محبت سے کنارہ کش نہیں ہوسکے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی فطری طلب ہے جس سے مکمل کنارہ کشی ممکن ہی نہیں۔ لیکن جس قدر کنارہ کشی ہوسکے اس کی اگر امید کی جاسکتی ہے تو مسلمانوں ہی سے کی جاسکتی ہے کیونکہ : (تفسیر روح القرآن)

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انھیں کے جگر میں

آیت مبارکہ:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

68○

لغۃ القرآن: لَوْلَا : کیوں نہیں] [كِتٰبٌ : کتاب] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ " کی طرف " سے] [سَبَقَ :" جو " پہلے طے ہوچکی] [لَمَسَّكُمْ :" تو " یقینا پہنچتا تمہیں] [فِيْمَآ : میں جو] [اَخَذْتُمْ : تم نے لیا] [عَذَابٌ عَظِيْمٌ : بڑا عذاب ہے] [

ترجمہ: اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (معافی کا حکم) لکھا ہوا نہ ہوتا تو یقیناً تم کو اس (مال فدیہ کے بارے) میں جو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) حاصل کیا تھا بڑا عذاب پہنچتا

تشریح:

اس آیت میں " كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ " کے بارے میں مفسرین نے مختلف اقوال ذکر کئے ہیں، ان میں سے 3 درج ذیل ہیں۔

(1)۔۔ اس لکھے ہوئے سے مراد یہ ہے کہ اجتہاد پر عمل کرنے والے سے مواخذہ نہ فرمائے گا اور یہاں صحابہ کرام (رض) نے اجتہاد ہی کیا تھا اور ان کی فکر میں یہی بات آئی تھی کہ کافروں کو زندہ چھوڑ دینے میں ان کے اسلام لانے کی امید ہے اور فدیہ لینے میں دین کو تَقْوِیَت ہوتی ہے اور اس پر نظر نہیں کی گئی کہ قتل میں اسلام کا غلبہ اور کفار کی تہدید ہے۔ یہاں ایک مسئلہ یاد رکھیں کہ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اس دینی معاملہ میں صحابہ (رض) کی رائے دریافت فرمانا مشروعیت اجتہاد کی دلیل ہے۔

(2)۔۔ یا " كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ " سے وہ مراد ہے جو اس نے لوح محفوظ میں لکھا کہ اہل بدر پر عذاب نہ کیا جائے گا۔

(3)۔۔ یا اس سے وہ مراد ہے جو اس نے لوح محفوظ میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے غنیمتیں حلال فرمائے گا۔

یاد رہے کہ آیت کے اگلے حصے "لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ" میں ان صحابہ کرام (رض) سے خطاب ہے جو فدیہ لینے پر راضی تھے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس خطاب میں داخل نہیں۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اگر آسمان سے عذاب نازل ہوتا تو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ (رض) بچ جاتے کیونکہ ان کی رائے عالی فدیہ لینے کے خلاف تھی۔

شانِ فاروق اعظم (رض)

اس شان نزول سے حضرت عمر فاروق (رض) کی عظمت و شان ظاہر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ (رض) کا مقام ایسا بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ (رض) کی رائے کے مطابق قرآن مجید کی آیات نازل فرماتا ہے، ((کی بجائے یہ بہتر ہوتا کہ جو نزول قرآن ہوا وہی بات سیدنا عمر فاروقؓ کو القا کر دی گئی) ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ عَزَّوَجَلَّ نے عمر (رض) کی زبان اور دل پر حق جاری فرما دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں: جب کبھی لوگوں میں کوئی معاملہ در پیش ہوا اور اس کے بارے میں لوگوں نے کچھ کہا اور حضرت عمر فاروق (رض) نے بھی کچھ کہا تو حضرت عمر فاروق (رض) کی رائے کے مطابق قرآن نازل ہوا۔ (1)

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ 20 سے زائد آیات ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق (رض) کی رائے کے مطابق نازل فرمایا، ان میں سے پانچ آیات درج ذیل ہیں

(1)۔۔ مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنانے کی آیت، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق (رض) نے عرض کی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کاش ہم مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا

"وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰهِمَ مُصَلًّى "(2)

ترجمہ کنزالعرفان: اور (اے مسلمانو!) تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ۔

(2)۔۔ پردے کی آیت، چنانچہ ایک مرتبہ آپ (رض) نے عرض کی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کاش آپ ازواج مُطَهَّرات کو پردے کا حکم فرمائیں کیونکہ ان سے نیک اور بد ہر قسم کے لوگ کلام کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

"يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّاَزْوٰجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا "(3)

(3)۔۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہرات باہمی کسی اختلاف کے سبب سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جمع ہوئیں (جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مزاج کے برخلاف تھا) تو حضرت عمر فاروق (رض) نے ازواج مطہرات سے فرمایا کہ یا تو تم اس سے باز آجاؤ ورنہ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں طلاق دے دیں تو قریب ہے کہ ان کا رب عَزَّوَجَلَّ انھیں تم سے اچھی بیویاں عطا فرما دے، تو آیت بھی اسی طرح اتری اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

"عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا "(1)

ترجمہ کنزالعرفان : اگر وہ (حبیب) تمہیں طلاق دے دیں تو قریب ہے کہ ان کا رب انھیں تم سے بہتر بیویاں بدل دے جو اطاعت والیاں، ایمان والیاں، ادب والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ دار، بیاہیاں اور کنواریاں ہوں۔

(4)۔۔ایک موقع پر آپ (رض) کے دِل میں خیال پیدا ہوا کہ کاش غلاموں کو اجازت لے کر مکانوں میں داخل ہونے کا حکم ہوتا۔اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ۫ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَ لَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ "(2)

ترجمہ کنزالعرفان : اے ایمان والو ! تمہارے غلام اور تم میں سے جو بالغ عمر کو نہیں پہنچے انھیں چاہیے کہ تین اوقات میں فجر کی نماز سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور نماز عشاء کے بعد (گھر میں داخلے سے پہلے) اجازت لیں۔ یہ تین اوقات تمہاری شرم کے ہیں۔ان تین اوقات کے بعد تم پر اور ان پر کچھ گناہ نہیں۔ وہ تمہارے ہاں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنے والے ہیں۔اللہ تمہارے لیے یونہی آیات بیان کرتا ہے اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔

(5)۔۔منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ (رض) چاہتے تھے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں اور اس کے لیے آپ (رض) نے کوشش بھی کی، جب حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی نماز جنازہ پڑھا کر واپس ہوئے تو یہ آیت نازل ہو گئی

"وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ "

ترجمہ کنزالعرفان : اور ان میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ بیشک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور نافرمانی کی حالت میں مر گئے۔(تفسیر صراط الجنان)

مسلمانوں کو تنبیہ

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب تو پچھلی آیت کریمہ میں موجود ہے اس میں صاف فرمایا گیا ہے کہ تم دنیا کا سامان چاہتے ہو حالانکہ اللہ آخرت چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جو کسی اور قوم سے ہو تو شاید قابل معافی ہو، لیکن مسلمانوں سے اس کا صدور قیامت سے کم نہیں کیونکہ دنیا کا ہر فرد اور ہر قوم دنیا کی مسافر ہے۔ ہر مسافر کے پیش نظر ضروریات زندگی ہی نہیں بلکہ دولت دنیا کا حصول ہے۔ دنیا کی محبت سے آزاد ہو جانا دنیا میں رہ کر ممکن دکھائی نہیں دیتا، اس لیے لوگوں نے ترک دنیا یعنی رہبانیت کا راستہ اختیار کیا۔ جو سراسر انسانی فطرت اور اللہ کی مشیت کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے خطرناک نتائج سے کسی کو انکار نہیں اگر دنیا اور آخرت کی طلب میں توازن باقی نہ رہے تو دنیا طلبی انسانی زندگی کا مقصد تبدیل کر دیتی ہے۔ اس لیے از بس ضروری ہے کہ کوئی قوم ایسی اٹھائی جائے جو دنیا سے تعلق کو ضبط میں رکھے۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ ضرورت کا درجہ دے، لیکن ہدف اور منزل آخرت ہو۔ مسلمان اسی کار عظیم کے لیے اٹھائے گئے ہیں، اگر وہ بھی اس صراط مستقیم پر نہ چل سکیں تو پھر ہدایت کا نور بجھ جائے گا۔ انسانی راہنمائی کے لیے کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا۔ اس لیے اس پر سخت تنبیہ فرمائی گئی۔ البتہ ! یہ بات دیکھنے کی ہے کہ مسلمانوں نے جنگ بدر میں کس چیز کو ترجیح دی تھی جسے دنیا طلبی کہا گیا ہے ؟ ہمارے محترم مفسرین نے بعض روایات کے حوالے سے لکھا ہے کہ مال غنیمت تم سے پہلے

کسی قوم اور کسی امت کے لیے حلال نہیں تھا۔ بدر کے موقعہ میں جب مسلمان مال غنیمت اکٹھا کرنے میں لگ گئے حالانکہ ابھی تک ان کے لیے مال غنیمت حلال نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مال غنیمت کے حلال ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا یہ اقدام ایسا گناہ تھا کہ اس پر عذاب آ جانا چاہیے اسی طرح ابھی تک فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے قیدیوں سے فدیہ لینا ایک طرح سے حدود سے تجاوز کرنا تھا۔ لیکن اس بات پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ اگر مال غنیمت یا فدیہ لینا حلال نہیں تھا یا اس کی حلّت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جلیل القدر صحابہ (رض) نے اس کا فیصلہ کیسے فرمالیا؟

نوشتہ سے مراد

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ وہ نوشتہ کیا تھا جس کی وجہ سے عذاب ٹل گیا؟ ہمارے قدیم مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے کہ اس امت کے لیے مال غنیمت حلال کیا جائے گا اور وہ حکم عنقریب نازل ہونے ہی والا تھا۔ اس حکم کی وجہ سے مسلمانوں سے عذاب ٹال دیا گیا۔

ایک دوسری تحقیق صاحب تفہیم القرآن کی ہے وہ لکھتے ہیں :

(میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگ بدر سے پہلے سورۃ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات دی گئی تھیں ان میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ :

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتّٰٓي اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ قلا فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۵ ج (محمد : ۴)

اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دے دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے۔ اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد جو ان سے فدیہ وصول کیا وہ تھا تو اجازت کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ "دشمن کی طاقت کو کچل دینے" کی جو شرط مقدم رکھی گئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت کو لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا تعاقب کیا حالانکہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے اور یہ عتاب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر ہے۔ فرمانِ مبارک کا منشا یہ ہے کہ "تم لوگ ابھی نبی کے مشن کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہو نبی کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ فدیے اور غنائم وصول کر کے خزانے بھرے بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہ راست تعلق رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے۔ مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب ہو جاتا ہے پہلے دشمن کی اصل طاقت کے بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا پھر دشمن کا سر کچلنے کے بجائے غنیمت لوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے پھر غنیمت پر جھگڑنے لگے۔ اگر ہم پہلے فدیہ وصول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو اس پر تمہیں سخت سزا دیتے۔ خیر اب جو کچھ تم نے لیا ہے وہ کھالو مگر آئندہ ایسی روش سے بچتے رہو جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے"۔ میں اس رائے پر پہنچ چکا تھا کہ امام جصاص کی کتاب احکام القرآن میں یہ دیکھ کر مجھے مزید اطمینان حاصل ہوا کہ امام موصوف بھی اس تاویل کو کم از کم قابل لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں پھر سیرت ابن ہشام میں یہ روایت نظر سے گزری کہ جس وقت مجاہدین اسلام مال غنیمت لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگے ہوئے تھے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

نے دیکھا کہ حضرت سعد بن معاذ (رض) کے چہرے پر کچھ کراہت کے آثار ہیں۔ حضور نے ان سے دریافت فرمایا کہ "اسے سعد ! معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمہیں پسند نہیں آرہی ہے۔" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں یارسول اللہ ! یہ پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل شرک کو شکست دلوائی ہے "اس موقع پر انھیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچالینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا۔ (جلد ۲۔ صفحہ ۲۸۔۱۸۲)

اس ناچیز کے خیال میں دونوں تحقیقات میں کوئی بنیادی فرق نہیں صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ صاحب تفہیم القرآن اصل کوتاہی اثخان فی الارض میں کوتاہی کو قرار دیتے ہیں اور جمہور مفسرین مال غنیمت اور فدیہ یعنی دنیا کا مال لینے کو اصل غلطی سمجھتے ہیں اور دوسری یہ بات کہ صاحب تفہیم القرآن کی تحقیق کا دارومدار "سورۃ محمد" کی آیت پر ہے۔ لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ "سورۃ محمد" کو "سورۃ الانفال" پر مقدم مانا جائے جبکہ اہل علم میں اس معاملے میں اختلاف ہے کہ دونوں سورتوں میں نزول کے اعتبار سے تقدم کسے حاصل ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ 69ۧ

لغۃ القرآن: فَكُلُوْا : تو تم سب کھاؤ] [مِمَّا : "اس" سے جو] [غَنِمْتُمْ : تم نے غنیمت حاصل کی] [حَلٰلًا : حلال] [طَيِّبًا : پاکیزہ] [وَ : اور] [اتَّقُوا : تم سب ڈر جاؤ] [اللّٰهَ : اللہ تعالیٰ سے] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [غَفُوْرٌ : بہت بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ : بہت مہربان ہے] [

ترجمہ: سو تم اس میں سے کھاؤ جو حلال، پاکیزہ مال غنیمت تم نے پایا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے

تشریح: جب اوپر کی آیت نازل ہوئی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ (رض) نے جو فدیئے لیے تھے ان سے ہاتھ روک لئے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور بیان فرمایا گیا کہ تمہاری غنیمتیں حلال کی گئیں، انھیں کھاؤ۔
صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا جبکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے بھی حلال نہیں کیا گیا۔ (تفسیر صراط الجنان)
اللہ تعالیٰ نے پہلے سے فیصلہ فرما دیا تھا کہ بدر میں شرکت والے سب جنتی ہیں چنانچہ یہاں شیعہ مفسر علامہ ابو علی فضل بن حسن طبرسی نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: لعل اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت

لکھہ۔ "اللہ نے اہل بدر کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا تم جو چاہو عمل کرو اللہ نے تمہیں بخش دیا ہے"۔ (تفسیر مجمع البیان جلد 5 صفحہ 229 مطبوعہ تہران)

یہ حدیث بخاری کتاب المغازی باب 9 اور مسلم کتاب الفضائل حدیث 161 میں بھی مذکور ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر پہلے سے اہل بدر کی بخشش کا یہ فیصلہ نہ ہوا ہوتا تو انھوں نے قیدیوں سے جو فدیہ لیا اس پر انھیں سخت عذاب آ پکڑتا۔ حضرت زید بن اسلم (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس موقع پر فرمایا اگر آج اللہ کا عذاب آ جاتا تو اے عمر بن خطاب! تمہارے سوا کوئی نہ بچتا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 1735 حدیث 9168 مطبوعہ مکہ)

اہل تشیع کے ہاں معتبر مفسر ابو علی فضل بن حسن طبرسی لکھتا ہے

حضرت عمر بن خطاب نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا اور مکہ سے نکالا اس لیے ان کی گردن اڑا دیں بلکہ آپ حضرت علی کو حکم دیا کہ وہ عقیل کی گردن ماریں مجھے حکم دیا کہ میں اپنے فلاں قریبی رشتے دار کی گردن اڑاؤں، کیونکہ یہ سرداران کفر ہیں، جبکہ حضرت ابو بکر نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ آپ کے قریبی رشتہ دار اور آپ کی قوم ہیں ان سے رعایت فرمائیں اور ان سے فدیہ لیں تاکہ اس سے ہمیں کفار پر قوت حاصل ہو۔ ابن زید کہتے ہیں اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

لو نزل عذاب من السماء ما نجا منکم غیر عمر و سعد بن معاذ "اگر آسمان سے عذاب اترتا تو تم میں سے عمر اور سعد بن معاذ کے سوا کوئی نجات نہ پا سکتا۔" (تفسیر مجمع البیان جلد 4 صفحہ 495 مطبوعہ موسسۃ الاعلی بیروت)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ** الخ۔

یعنی اے مسلمانو! اب تم نے اسیران بدر سے جو فدیہ لے لیا ہے وہ تمہارے لیے حلال پاک ہے اسے کھاؤ۔ یاد رہے یہ اظہار ناراضگی صرف صحابہ کرام سے ہوا نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نہیں کیونکہ آپ نے ذاتی رائے کا اظہار نہ فرمایا تھا صرف اکثریت کی رائے پر فیصلہ فرمایا تھا تو اللہ نے اسی اکثریت سے اظہار ناراضگی فرمایا۔ اسی لیے تریدون اور لمسکم فیما اخذ تم جیسے صیغہ ہائے جمع لائے گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطاب نہ فرمایا گیا اور صحابہ کرام کا فدیہ لینے کو پسند کرنا بھی چونکہ بہتر مقصد کے لیے تھا تاکہ مسلمانوں کو اس مال سے جہاد کی تیاری میں مدد مل جائے اور ممکن ہے یہ قیدی بعد میں اسلام لے آئیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام پر کوئی پکڑ نہ فرمائی بلکہ فدیہ کو ان کے لیے حلال طیب قرار دیا۔

یاد رہے ستر اسیران بدر میں سے نضر بن حارث، طعیمہ بن عدی اور عقبہ بن ابی معیط کو قتل کیا گیا۔ باقی سب سے فدیہ قبول کر لیا گیا اور ہر قیدی سے چار سو درہم وصول کیے گئے۔ البتہ بعض قیدیوں سے کہا گیا کہ اگر وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو ان کا فدیہ ادا ہو گیا۔ (برہان القرآن))

الحاصل جب یہ بات طے ہو گئی، کہ قیدیوں سے فدیہ لے کر انھیں آزاد کر دیا جائے، تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عباس کو، جو قیدیوں میں تھے، حکم فرمایا، کہ اپنی ذات کا فدیہ دو، اور اپنے دونوں بھتیجے عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کی طرف سے

بھی فدیہ دو، ساتھ ہی اپنے حلیف عتبہ بن جحدم کا بھی فدیہ ادا کرو۔ اس پر حضرت عباس بولے، کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا تم چاہتے ہو، کہ تمہارا چچا فقیر کی طرح اپنے پرائے کے سامنے مانگنے کو ہاتھ پھیلائے۔ میں اتنا مال کہاں سے لاؤں؟ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، کہ وہ روپے کی تھیلیاں جو مکہ سے نکلتے وقت، ام فضل کو دے کر، یہ یہ باتیں تم نے ان سے کہی تھیں، کہاں ہیں؟ حضرت عباس بولے، اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں نے تو یہ باتیں چھپا کر کی تھیں، تجھ سے کس نے کہہ دیں۔ آپ نے فرمایا، میرے رب نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے۔ نبی کریم کی غیب دانی کی اس شان کو دیکھ کر، بے ساختہ حضرت عباس کہہ پڑے، کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، گواہ رہو، کہ میں حق تعالیٰ کی وحدانیت اور تمہاری رسالت کی گواہی دیتا ہوں۔ پھر اپنا فدیہ اور ان تینوں آدمیوں کا فدیہ حضرت عباس نے ادا کیا۔۔۔ (تفسیر اشرفی)

حضرت عمر (رض) کی اصابت رائے

یہاں سے حضرت عمر بن خطاب (رض) کی اصابت رائے معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارہ میں ان کی رائے بہتر قرار دی اور قرآن کریم کی متعدد آیات ان کی رائے پر نازل ہوئیں جیسے واتخذوا من مقام ابراھم مصلی (بقرہ : 125)۔ **واذا سالتموھن متاعاً فسئلوھن من وراء حجاب**۔ (احزاب : 53) وغیرہ اسی طرح شراب کی برائی بتانے والی آیات بھی حضرت عمر کی رائے پر اتریں۔ اسی لیے حدیث ہے کہ ان الحق ینزل علی لسان عمر و قلبہ۔ "عمر کی زبان اور دل پر حق اترتا ہے۔"

(الموسوعہ لاطراف الحدیث النبوی الشریف جلد 3 سفحہ 61 بروایت تاریخ اصفہان لابی نعیم مطبوعہ دار الفکر بیروت) (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○70

لغۃ القرآن:

يٰٓاَيُّهَا : اے] [النَّبِيُّ : نبی !] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [لِمَنْ : جس کو] [فِيْٓ : میں] [اَيْدِيْكُمْ : تمہارے ہاتھوں نے] [مِّنَ : میں سے] [لْاَسْرٰٓي : قیدیوں] [اِنْ : اگر] [يَعْلَمِ : معلوم کیا] [اللّٰهُ : اللہ] [فِي : میں] [قُلُوْبِكُمْ : تمہارے دلوں میں] [خَيْرًا :

کوئی بھلائی] [يُّؤْتِكُمْ : وہ دے گا تمہیں] [خَيْرًا : کوئی بھلائی] [مِّمَّآ : "اس "سے جو] [اُخِذَ : لیا گیا] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [وَيَغْفِرْ : اور وہ معاف کردے گا] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [غَفُوْرٌ : بہت بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ : بہت مہربان ہے] [

ترجمہ: اے نبی ! آپ ان سے جو آپ کے ہاتھوں میں قیدی ہیں فرمادیجئے : اگر اللہ نے تمہارے دلوں میں بھلائی جان لی تو تمہیں اس (مال) سے بہتر عطافرمائے گا جو (فدیہ میں) تم سے لیا جاچکا ہے اور تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے

تشریح:

شان نزول

یہ آیت حضرت عباس بن عبد المطلب (رض) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا ہیں۔ یہ کفار قریش کے ان دس سرداروں میں سے تھے جنہوں نے جنگ بدر میں لشکر کفار کے کھانے کی ذمہ داری لی تھی اور یہ اس خرچ کے لیے بیس اوقیہ سونا ساتھ لے کر چلے تھے لیکن ان کے ذمے جس دن کھلانا تجویز ہوا تھا خاص اسی روز جنگ کا واقعہ پیش آیا اور قتال میں کھانے کھلانے کی فرصت ومہلت نہ ملی تو یہ بیس اوقیہ سونا ان کے پاس بچ رہا، جب وہ گرفتار ہوئے اور یہ سونا ان سے لے لیا گیا تو انھوں نے درخواست کی کہ یہ سونا ان کے فدیہ میں شمار کرلیا جائے مگر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انکار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو چیز ہماری مخالفت میں صرف کرنے کے لیے لائے تھے وہ نہ چھوڑی جائے گی اور حضرت عباس (رض) پر ان کے دونوں بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کے فدیئے کا بار بھی ڈالا گیا تو حضرت عباس (رض) نے عرض کیا : یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم مجھے اس حال میں چھوڑو گے کہ میں باقی عمر قریش سے مانگ مانگ کر بسر کیا کروں تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ پھر وہ سونا کہاں ہے جس کو تمہارے مکہ مکرمہ سے چلتے وقت تمہاری بیوی ام الفضل نے دفن کیا تھا اور تم ان سے کہہ کر آئے ہو کہ خبر نہیں ہے مجھے کیا حادثہ پیش آئے، اگر میں جنگ میں کام آجاؤں تو یہ تیرا ہے اور عبداللہ اور عبید اللہ کا اور فضل اور قثم کا (سب ان کے بیٹے تھے) حضرت عباس (رض) نے عرض کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے میرے رب عَزَّوَجَلَّ نے خبردار کیا ہے۔ اس پر حضرت عباس (رض) نے عرض کیا کہ میں گواہی دیتا ہوں بیشک آپ سچے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک آپ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میرے اس راز پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کوئی مُطَّلع نہ تھا اور حضرت عباس (رض) نے اپنے بھتیجوں عقیل و نوفل کو حکم دیا وہ بھی اسلام لائے۔

{ يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ : جو (مال) تم سے لیا گیا اس سے بہتر تمہیں عطافرمائے گا۔ } جب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بَحرَین کا مال آیا جس کی مقدار اسی ہزار تھی تو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز ظہر کے لیے وضو کیا اور نماز سے پہلے ہی کل مال تقسیم کر دیا اور حضرت عباس (رض) کو حکم دیا کہ اس میں سے لے لو تو جتنا ان سے اٹھ سکا، اتنا انھوں نے لے لیا۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ

اس سے بہتر ہے کہ جو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے مجھ سے لیااور میں اس کی مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ اپنے مال و دولت کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت عباس (رض) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بیس اوقیہ سونے کے بدلے بیس غلام عطا کئے، وہ سب کے سب تاجر تھے اور بہت سارا مال کما کر دیتے تھے، ان میں سے جو غلام سب سے کم کما کر دیتا تھا اس کی مقدار بیس ہزار درہم تھی۔ (تفسیر صراط الجنان)

حضرت عباس نے جو فدیہ دیا اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے انھیں بحرین کے مال غنیمت میں سے اتنا دیا کہ وہ ان سے اٹھایا نہ جا سکا تو انھیں دوبارہ اس میں سے کچھ نکالنا پڑا (بخاری کتاب الصلاۃ باب 24) اسے حضرت عباس بن عبدالمطلب (رض) عنہٗ کی فضیلت معلوم ہوئی اور ان پر ہونے والے دنیوی واخروی انعامات کا تپ چلا۔ اسی لیے خلفاء راشدین ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کے وسیلہ سے بارش طلب کی تو خوب بارش ہوئی۔ (بخاری کتاب الاستسقاء باب 3) اس واقعہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (تفسیر برہان القرآن)

کی شان علم غیب بھی ظاہر ہوئی۔

یہ سن کر حضرت عباس پر رعشہ ہوا طاری
کہ پیغمبر تو رکھتا ہے دلوں کی بھی خبر داری
خیال آیا مسلمان نیک و بد پہچان جاتے ہیں
محمد آدمی کے دل کی باتیں جان جاتے ہیں

لطف و عطا کا ایک عجیب واقعہ

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا حضرت عباس (رض) کی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے داماد ابوالعاص (یعنی حضرت زینب (رض) کے شوہر جو اس وقت تک مکہ میں مقیم تھیں) وہ بھی اسیران جنگ میں شامل تھے چونکہ یہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے تو ان کے پاس بھی فدیہ کیلئے مال نہ تھا۔ اس لیے ان کی زوجہ یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینب (رض) کو جو مکہ میں مقیم تھیں کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں۔ جب ان کے پاس یہ مطالبہ پہنچا تو ان کے گلے میں ایک ہار تھا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہ (رض) نے ان کو جہیز میں دیا تھا وہی گلے سے اتار کر بھیج دیا چنانچہ جب یہ ہار مدینہ پہنچا تو اس کو دیکھ کر بے اختیار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور صحابہ (رض) سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اگر تم سب راضی ہو تو زینب (رض) کے پاس یہ اس کی والدہ کی یادگار ہے اس کو واپس کر دیا جائے۔ صحابہ کرام (رض) تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اشاروں پر مر مٹنے والے تھے وہ پھر اس کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ چنانچہ صحابہ (رض) نے بخوشی قبول کر کے اس کو واپس کر دیا اور ابوالعاص (رض) سے کہہ دیا کہ حضرت زینب (رض) کو مدینہ بھیج دیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ بھی مشرف نہ اسلام ہو گئے تھے۔

حضرت عباس (رض) پر اسلام کی برکتیں

حضرت عباس (رض) فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت میرے ہی حق میں نازل ہوئی ہے اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ۲۰ اوقیہ سونے کی بجائے حالت اسلام میں اللہ نے مجھے ۲۰ غلام عطا کئے جو خود بھی بہت قیمتی ہیں۔ گھٹیا غلام کی قیمت تقریبا ۲۰ ہزار درہم ہے اور پھر ہر غلام میرے لیے کثیر مال تجارت لگا کر بیوپار کرتا ہے۔ یہ تو بدلہ دنیا میں عطا فرمایا گیا اور دوسرے وعدہ مغفرت کی آخرت میں امید رکھتا ہوں۔ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد حضرت عباس (رض) بہت مالدار ہوئے تھے۔ بخاری میں حضرت انس بن مالک (رض) کی ایک روایت ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس صوبہ بحرین سے کثیر مال آیا اتنا کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد اتنا مال کبھی نہیں آیا۔ حکم دیا کہ مسجد میں پھیلا دو۔ نماز کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو تقسیم کرنا شروع کیا جو سامنے آتا اس کو دیتے اتنے میں حضرت عباس (رض) بھی آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بھی۔ میں نے اپنا اور عقیل کا فدیہ دیا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنے ہاتھ سے لے لو۔ انھوں نے چادر میں گٹھڑی باندھی لیکن وزنی ہونے کے باعث اٹھا نہ سکے تو کہا یا رسول اللہ کسی کو حکم دیجئے کہ میرے کاندھے پر چڑھا دے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسکرا کر فرمایا میں تو کسی سے نہیں کہتا کہا اچھا پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ذرا اٹھوا دیجئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا بھی انکار کیا۔ آخر حضرت عباس (رض) نے اس میں سے کچھ کم کر دیا اور بمشکل اٹھا کر لے چلے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو تعجب کی نظر سے دیکھتے رہے جب تک کہ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نگاہ سے اوجھل نہ ہو گئے اس کے بعد سب مال بانٹ چکے ایک کوڑی بھی باقی نہ بچی تب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہاں سے اٹھے اور اپنے گھر ایک درہم بھی نہ بھیجوایا تھا۔

اسیران بدر کو نصیحت و تسلی

الغرض ان آیات کا حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ بدر کے بدر کے ان قیدیوں سے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قبضہ میں ہیں کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم سے فدیہ کی شکل میں لیا گیا ہے اس پر تم افسوس نہ کرو اگر تمہارے دل میں نیکی ہو گی اور ایمان لے آؤ گے اور سچے دل سے اسلام کے مقابلہ میں تلوار نہ اٹھانے کا عہد کرو گے تو کو کچھ تم سے لیا گیا ہے اللہ اس سے بہتر تم کو عنایت کر دے گا اور تمہارے قصور معاف کر دے گا اور اگر وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھوکا دینا چاہیں گے اور پھر شرارت کرنے کا ان کا ارادہ ہو گا وہ عہد و پیمان کے خلاد ان کے دلوں میں مکاری چھپی ہو گی تو وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ خود ذلیل ہوں گے پہلے بھی شرارت کر چکے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا اس کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہوتھوں گرفتار ہوئے دوبارہ ایسی حرکت کریں گے تو پھر ایسی سزا پائیں گے خدا کے علم سے کوئی چیز خارج نہیں۔ اس کو ان کی نیتوں اور آئندہ ارادوں کا اب بھی علم ہے لیکن اس کی حکمت و مصلحت ہے کہ ظاہر نہیں فرماتا اور کسی کا پردہ فاش نہیں کرتا

خلاصہ یہ کہ اسیران بدر کو نصیحت اور تسلی آمیز ہدایت کی جا رہی ہے کہ سچے دل سے مسلمان ہو جاؤ آئندہ زندگی درست رکھو تو تمک کو اس سے بہتر مال ملے گا جو تم اپنی قید چھڑانے میں خرچ کر چکے ہو اور آخرت میں بھی مغفرت ہو جائے گی۔

ورنہ مکاری کروگے تو خود تباہ ہو جاؤ گے۔

دعاء کیجئے: یا اللہ: آپ علام الغیوب ہیں دلوں کے بھید اور راز سے بھی واقف ہیں۔

یا اللہ: ہم کو دیانت اومانت کے اوصاف عطافرمایئے اور ہمارے اعضاء وجوارح اور وقلب کو ہر طرح کی خیانت سے پاک رکھئے

یا اللہ آپ علیم وخبیر ہیں ہم سے گزشتہ زندگی میں آپ کے حقوق یا بندوں کے حقوق میں کو کوتاہی وخیانت سرزد ہوئی ہو اس کی تلافی کی توفیق مرحمت فرمایئے اور اس پر ہم سے مواخذہ نہ فرمایئے آمین۔

یا اللہ: بہت سے گناہ اس طرح کئے ہیں کہ جانتا تھا کہ آپ کے سامنے ہوں مگر خیال کیا توبہ کرلوں گا، معافی چاہ لوں گا الہٰ العالمین !گناہ کرلیا اور نفس و شیطان نے توبہ او ستغفار سے باز رکھا، گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا رہا۔ الہٰی میری اس جرأت پر نظر نہ فرمانا، اپنی شان کریمی کے صدقے مجھے معاف فرمادے میں توبہ کرتا ہوں معافی چاہتا ہوں۔ اے اللہ ! مجھے معاف کردے۔ آپ کے سوااور کون معاف کرنے والا ہے۔

ایسا بھی ہوا کہ گناہ کر کے میں نے آپ سے حسن ظن رکھا کہ آپ عذاب نہ دیں گے۔ آپ معاف کردیں گے اس وقت میرے نفس نے یہی پٹی پڑھائی کہ اللہ کا کرم ورحمت تو بہت وسیع ہے اور آپ پردہ ڈالتے رہے بس میں سمجھا کہ جب وہ پردہ پوشی فرمارہے ہیں تو عذاب بھی نہ دیں گے۔ بس ایسی خیال میں آکر بہت سے گناہ کرلئے۔ اے اللہ ! مجھے معاف فرمادے۔

ان گناہوں کی بھی معافی چاہتا ہوں جن کی وجہ سے دعا کے قبول ہونے سے محروم ہو گیا، روزی کی برکت اور خیر نہ رہی ان گناہوں کو بھی معاف فرمادے۔

جن گناہوں کے سبب لاغری آتی ہے اور نقاہت چھا جاتی ہے. بروز قیامت حسرت وندامت ہو گی ان گناہوں کو بھی معاف فرمادے جو گناہ باعث تنگی، روزق ہوں، باعث خیر وبرکت ہوں، باعث محرومی حلاوت عبادت ہوں سب معاف فرمادے

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین (تفسیر درس قرآن۔ محمد اسحاق)

آیت مبارکہ:

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡا خِيَانَتَكَ فَقَدۡ خَانُوا اللّٰهَ مِنۡ قَبۡلُ فَاَمۡكَنَ مِنۡهُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ○71

لغۃ القرآن: وَاِنْ : اور اگر] [يُّرِيْدُوْا : وہ سب ارادہ کریں] [خِيَانَتَكَ : آپ سے خیانت کا] [فَقَدْ : تو تحقیق] [خَانُوا : وہ سب خیانت کرچکے ہیں] [اللّٰهَ : اللہ] [مِنْ قَبْلُ : اس سے قبل] [فَاَمْكَنَ : تو اس نے گرفتار کرا دیا] [مِنْهُمْ : ان سے] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے] [حَكِيْمٌ : حکمت والا] [

ترجمہ: اور (اے محبوب !) اگر وہ آپ سے خیانت کرنا چاہیں تو یقیناً وہ اس سے قبل (بھی) اللہ سے خیانت کر چکے ہیں سو (اسی وجہ سے) اس نے ان میں سے بعض کو (آپ کی) قدرت میں دے دیا، اور اللہ خوب جاننے والا حکمت والا ہے

تشریح:

وہ خالق کائنات جل شانہ جو کچھ کرتا ہے کمال علم و حکمت ہی کی بناء پر کرتا ہے

اور یہ شان اس وحدہ لاشریک کے سوا اور کسی کی نہ ہے نہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کے کسی بھی حکم وارشاد کا کوئی متبادل ممکن نہیں، پس اس کا ہر حکم وارشاد بندوں کیلئے دارین کی سعادت و سرخروئی کا کفیل وضامن ہے، سو اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کیلئے تسکین وتسلیہ کا سامان ہے، اور اساریٰ بدر کیلئے تہدید اور دھمکی، سو نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا کہ اگر ان لوگوں نے اس احسان کی قدر نہ پہچانی جو آپ نے ان پر کیا، اور یہ اس کے بعد بھی اپنے کفر وانکار ہی پر اڑے اور لڑنے بھڑنے پر ہی آمادہ رہے، تو یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ خود اپنا ہی نقصان کریں گے، جیسا کہ انھوں نے اس سے پہلے خدا سے خیانت اور بدعہدی کی تھی، جسکے نتیجے میں اللہ نے ان کو آپ کے قابو میں دے دیا تھا۔ اسی طرح اگر انھوں نے آئندہ بھی ایسی حرکت کی تو ان کو اپنی خیانت اور بدعہدی کی سزا بھگتنا پڑیگی، ان کو اللہ تعالیٰ نے حرم کا پاسباں اور ملت ابراہیم کا نگہبان بنایا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی خیانت اور بدعہدی کی بناء پر حرم کی حرمت کو برباد کیا، اور ملت ابراہیم کو انھوں نے مسخ کر کے رکھ دیا۔ جسکے نتائج ان کے سامنے آرہے ہیں، اگر یہ آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے تو اس کے نتائج بھی اسی طرح ان کے سامنے آجائیں گے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ (تفسیر مدنی تعلیق)

اللہ تعالیٰ سے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کفار کی خیانت کا بیان

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ عباس اور ان کے اصحاب نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا تھا کہ آپ جو کچھ اللہ کے پاس سے لے کر آئے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور ہم آپ کے متعلق اپنی قوم کو نصیحت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر انھوں نے اس عہد کو پورا نہیں کیا، آپ سے خیانت کی اور اس قول کے مطابق عمل نہیں کیا تو آپ افسوس نہ کریں یہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے بھی خیانت کر چکے ہیں۔ انھوں نے کفر کیا، آپ سے قتال کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر غلبہ عطا فرمایا۔ (جامع البیان جز10، ص66، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خیانت کرنے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ جس کو ہم نے حضرت ابن عباس (رض) کی روایت سے ذکر کیا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر انھوں نے آپ کی نبوت کا انکار کیا تو یہ آپ سے خیانت کی اور اس سے پہلے یہ اللہ کی وحدانیت کا انکار کر کے

اللہ کے ساتھ کفر کر چکے ہیں۔ تیسری خیانت یہ ہے کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فدیہ لے کر ان کو آزا کیا تو ان سے یہہ عہد لیا تھا کہ دوبارہ آپ کے خلاف جنگ نہیں کریں گے اور مشرکین سے معاہدہ نہیں کریں گے۔ اگر انھوں نے اس عہد کی خلاف ورزی کی اور آپ سے خیانت کی تو آپ افسوس نہ کریں یہ پہلے اللہ سے بھی عہد کر کے توڑ چکے ہیں اور اللہ سے عہد کر کے اس کو توڑنے کی مثال ان آیتوں میں ہے : " قل من ینجیکم من ظلمت البر والبحر تدعونہ تضرعا وخفیۃ لئن انجانا من ھذہ لنکونن من الشکرین۔ قل اللہ ینجیکم منہا ومن کل کرب ثم انتم تشرکون : آپ کہیے کہ تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے، جس کو تم گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو کہ اگر اس نے ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دی تو ہم ضرور شکر ادا کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ آ کہیے کہ اس (مصیبت) سے اور ہر سختی سے تمہیں اللہ ہی نجات دیتا ہے پھر بھی تم شرک کرتے ہو "

" واذا مس الانسان ضر دعا ربہ منیبا الیہ ثم اذا خولہ نعمۃ منہ نسی ماکان یدعوا الیہ من قبل وجعل للہ اندادا لیضل عن سبیلہ۔ قل تمتع بکفرک قلیلا انک من اصحاب النار (الزمر : 8) " اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہوا اسی کو پکارتا ہے پھر جب اللہ اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرما دیتا ہے تو وہ اس (مصیبت) کو بھول جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کو پکارتا تھا، اور اللہ کے شریک بنالیتا ہے تاکہ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے بہکائے، آپ کہئے کہ تم اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالو، بیشک تم دوزخ والوں میں سے ہو۔

(تفسیر تبیان القرآن)

دراصل غزوہ بدر کے قیدیوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے تھے مگر ان کے بارے میں یہ کھٹک لوگوں کے دل میں تھی کہ شاید یہ لوگ مکہ پہنچ کر اسلام سے پھر جائیں اور پھر ہمیں کوئی نقصان پہنچائیں۔ حق تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں اس خطرہ کو اس طرح دور فرما دیا (آیت) وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ یعنی اگر یہ لوگ آپ کے ساتھ خیانت ہی کا ارادہ کر لیں تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا یہ تو وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں یعنی میثاق ازل میں جو اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا اقرار کیا تھا اس کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی یہ خیانت خود انھیں کے لیے مضر ثابت ہوئی کہ انجام کار ذلیل و خوار اور گرفتار ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ تو دلوں کے رازوں کو جاننے والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اب بھی آپ کی مخالفت کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ سے باہر کہاں چلے جائیں گے وہ پھر ان کو اسی طرح پکڑ لے گا۔ پچھلی آیت میں آزاد ہونے والے قیدیوں کو اسلام کی طرف دعوت ترغیبی انداز میں دی گئی تھی اس آیت میں ترہیب کے ذریعہ ان کو آگاہ کر دیا کہ تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی اسلام و ایمان میں منحصر ہے۔ (تفسیر معارف القرآن)

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ابن عربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب مشرکین قید ہوئے تو ان میں سے بعض لوگوں نے اسلام کے متعلق بات کی۔ لیکن وہ دل سے مسلمان نہ تھے۔ اسلام کے بارے میں انھوں نے جو بات کی، وہ بھی دوٹوک نہ تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے قریب آجائیں لیکن مشرکین سے بھی دور نہ ہوں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر کوئی کافر ایمان کی بات کرے، زبان سے اقرار بھی کرے لیکن وہ اس میں صاحب عزیمت نہ ہو تو وہ مومن تصور نہ ہوگا، لیکن اگر مومنین میں سے کوئی اس قسم کی مذبذب بات کرے تو وہ کافر ہوگا۔ الا یہ کہ دل میں کوئی ایسا وسوسہ آجائے جو انسان کی قدرت سے ابہر ہوتا ہے، کیونکہ اسے تو خود اللہ نے معاف کر دیا ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کے سامنے یہ حقیقت کھول دی ہے۔ وان یریدوا خیانتک یعنی یہ بات اگر ان کی جانب سے بطور مکر وفریب اور خیانت ہے تو انھوں نے اس سے قبل بھی اللہ کی خیانت کا ارتکاب کیا ہے کہ انھوں نے کفر کو اپنایا، اسلام کے خلاف سازشیں کیں اور آپ کے خلاف آمادہ جنگ ہوگئے۔

اگرچہ ان کی یہ بات برائے ظاہر داری اچھی ہے اور اللہ بھی جانتا ہے کہ اس کی پشت پر کوئی بھلائی موجود ہے تو اللہ ان کو معاف کردے گا اور ان کے سابقہ کرتوتوں کو ساقط کردے گا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ 72○

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : سب ایمان لائے] [وَهَاجَرُوْا : اور ان سب نے ہجرت کی] [وَجٰهَدُوْا : اور سب نے جہاد کیا] [بِاَمْوَالِهِمْ : اپنے مالوں سے] [وَ اَنْفُسِهِمْ : ان کے دلوں کی] [فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کے راستے میں] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰوَوْا : سب نے جگہ دی] [وَّنَصَرُوْٓا : اور ان سب نے مدد کی] [أُولٰٓئِكَ : وہی لوگ] [بَعْضُهُمْ : ان میں سے بعض] [اَوْلِيَآءُ : دوست ہیں] [بَعْضٍ : بعض کے] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : سب ایمان لائے] [وَلَمْ : اور نہیں] [يُهَاجِرُوْا : ان سب نے ہجرت کی] [مَا : نہیں] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [مِّنْ : سے] [وَّلَايَتِهِمْ :" کوئی تعلق " ان کی دوستی] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : چیز کو] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [يُهَاجِرُوْا : ان سب نے ہجرت کی] [وَاِنِ : اور اگر] [اسْتَنْصَرُوْكُمْ : مدد طلب کریں وہ سب تم سے] [فِي : میں] [الدِّيْنِ : دین] [فَعَلَيْكُمُ : تو " لازم ہے " تم پر] [النَّصْرُ : ہوتی مدد] [اِلَّا : مگر] [عَلٰي : پر] [قَوْمٍ : ایسی قوم] [بَيْنَكُمْ : اپنے درمیان] [وَبَيْنَهُمْ : اور ان کے درمیان] [مِّيْثَاقٌ : کوئی عہد ہو] [وَاللّٰهُ : اور اللہ

] [بِمَا :" اس " سے جو] [تَعْمَلُوْنَ : تم سب عمل کرتے ہو] [بَصِيْرٌ : خوب دیکھ رہا ہے] [

ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے (اللہ کے لئے) وطن چھوڑ دیئے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی وہی لوگ ایک دوسرے کے حقیقی دوست ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے (مگر) انھوں نے (اللہ کے لئے) گھر بار نہ چھوڑے تو تمہیں ان کی دوستی سے کوئی سروکار نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ دین (کے معاملات) میں تم سے مدد چاہیں تو تم پر (ان کی) مدد کرنا واجب ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں (مدد نہ کرنا) کہ تمہارے اور ان کے درمیان (صلح وامن کا) معاہدہ ہو، اور اللہ ان کاموں کو جو تم کر رہے ہو خوب دیکھنے والا ہے

تشریح:

اس آیت میں ملت اسلامیہ کے مختلف گروہوں کا ان کی اپنی الگ نوعیت کے لحاظ سے ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے باہمی دینی، سیاسی تعلقات اور حقوق وفرائض کی نوعیت بیان کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت اسلام کی عادلانہ خارجہ پالیسی کا ستون قرار دی گئی ہے۔ وھذا الحکم من ارکان سیاسة الاسلام الخارجیة العادلة (المنار)

اس وقت اسلامی معاشرہ مختلف عناصر پر مشتمل تھا

(۱) مہاجرین (۲) انصار (۳) وہ لوگ جو اسلام تو قبول کر چکے تھے لیکن دار کفر میں رہائش پر رضامند تھے۔ ان کی بھی دو قسمیں تھیں۔ ایک تو وہ مسلمان جو ایسی کافر حکومت کی رعایا ہوں جس کے درمیان اور حکومت اسلامیہ کے درمیان دوستی اور صلح کا کوئی معاہدہ نہ ہو۔ دوسرے وہ مسلمان جو ایسی کافر حکومت کی رعایا ہوں جس کا اسلامی حکومت کے ساتھ دوستی کا معاہدہ ہو چکا ہو۔ اب ان مختلف عناصر کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی اس کا بھی تفصیلاً ذکر کر دیا کہ مہاجرین اور انصار میں تو کامل موالات ہو گی۔ ایک دوسرے کی ہر طرح اعانت اور ہر خطرہ سے ایک دوسرے کی حفاظت لازمی ہو گی۔ اولئک بعضھم اولیاء بعض۔ لیکن وہ مسلمان جو کافر حکومت کی رعایا ہیں ان کے درمیان اور دار السلام کے اہل اسلام کے درمیان اسلامی اور دینی اخوت تو ہو گی لیکن سیاسی بھائی چارہ نہ ہو گا۔ ان کی حفاظت اور اعانت کی کوئی ذمہ داری خلیفہ وقت پر نہ ہو گی کیونکہ انھوں نے دار حرب کو اپنا وطن بنا کر یہ حق بخوشی ضائع کر دیا ہے۔ مالکم من ولایتھم من شیء۔ لیکن اگر دینی لحاظ سے انھیں کوئی تکلیف پہنچے مثلاً انھیں ترک اسلام پر یا شعائر اسلام کی توہین پر مجبور کیا جائے تو پھر اگر اس کافر حکومت کا اسلامی حکومت سے کوئی معاہدہ نہیں تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد کریں۔ وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر۔ لیکن اگر اس کافر حکومت سے دوستی کا معاہدہ ہو چکا ہے تو پھر اس معاہدہ کا احترام ضروری ہے۔ لیکن مسلمان قیدی یا کمزور اور ضعیف لوگ جو دار کفر میں مجبوراً اقامت گزین ہیں ان کی رہائی بالاتفاق تمام اہل اسلام پر فرض ہے۔ قال ابن العربی الا ان یکونوا اسراء مستضعفین فان الولایة معھم قائمة والنصرة لھم واجبة حتی لا تبقی منا عین تطوف الخ (قرطبیؒ)۔ ترجمہ: امام ابن عربی فرماتے ہیں اگر مسلمان دار کفر میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہوں، کمزور اور ضعیف ہوں۔ اپنا بچاؤ کرنے سے عاجز ہوں تو پھر موالاة باقی رہے گی۔ اور جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی جھپک رہی ہو ان کی اعانت اور نصرت ہم پر فرض ہو گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اگر اس کافر حکومت کے ساتھ دوستی اور امن کا معاہدہ ہو تو پھر معاہدہ کا احترام ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔ (قرآن: ۱۷: ۳۴) نیز حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص کسی معاہد (جس سے معاہدہ ہو) کو قتل کرے وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔ "(بخاری: کتاب الجزیہ: باب ۵) "اور جو اپنے عہد کی پاسداری کی مدد نہیں فرمائی: "حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حدیبیہ کے دن مشرکین سے تین شرائط پر صلح کی: مشرکین میں سے جو شخص مسلمانوں کی طرف مدینہ آئے گا وہ اس کو واپس کر دیں گے اور مسلمانوں کی طرف سے جو مشرکین کے پاس مکہ آئے گا وہ اس کو واپس نہیں کریں گے اور یہ کہ مسلمان آئندہ سال (عمرہ کے لیے مکہ) آئیں گے اور صرف تین دن مکہ میں ٹھہریں گے اور اپنے ہتھیار یعنی تلوار اور تیر وغیرہ میان میں رکھ کر آئیں گے۔ اس دوران حضرت ابو جندل (رض) (جو کہ مسلمان ہو چکے تھے) بیڑیوں میں چلتے ہوئے مسلمانوں کی طرف آئے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں مشرکین کی طرف واپس کر دیا"۔ (بخاری: کتاب الصلح: باب ۷) ''جس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سہیل بن عمرو صلح نامہ لکھ رہے تھے اس وقت سہیل کے بیٹے ابو جندل بیڑیوں میں گھسٹتے ہوئے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آئے۔۔ جب سہیل نے اپنے بیٹے ابو جندل کو دیکھا تو وہ ابو جندل کے پاس گیا اور ان کے منہ پر تھپڑ مارا اور ان کو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے اور آپ کے درمیان اس کے آنے سے پہلے معاہدہ ہو چکا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم نے سچ کہا، پھر وہ حضرت ابو جندل (رض) کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا تاکہ قریش کی طرف لے جائے اور حضرت ابو جندل (رض) بلند آواز سے فریاد کرنے لگے: اے مسلمانو! کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا، یہ مجھے میرے دین کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔ مسلمانوں کو ان کی فریاد کی وجہ سے اور زیادہ تکلیف ہوئی۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے ابو جندل! صبر کرو اور اجر و ثواب کی نیت کرو۔ تمہیں اور تمہارے دوسرے کمزور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نجات دینے والا ہے اور ان کے لیے کشادگی کرنے والا ہے اور میں ان لوگوں سے صلح کا معاہدہ کر چکا ہوں اور میں ان سے عہد شکنی نہیں کروں گا، پھر حضرت ابو جندل (رض) دل شکستہ ہو کر اپنے باپ کے ساتھ چلے گئے اور معاہدہ پورا ہو گیا"۔ (سیرت ابن ہشام: جلد ۳: ص ۲۰۴)

۳۔ حضرت حذیفہ بن یمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں میرے شامل نہ ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اور میرے والد حسیل دونوں (مکہ سے) نکلے تو ہمیں کفار قریش نے پکڑ لیا اور کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جانا چاہتے ہو؟ ہم نے کہا: ہم ان کے پاس نہیں جانا چاہتے، ہم تو صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہم سے یہ عہد اور میثاق لیا کہ ہم مدینہ جائیں گے اور آپ کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کریں گے۔ ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: تم لوٹ جاؤ، ہم ان سے کیا ہوا عہد پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں گے۔

(مسلم: حدیث نمبر ۱۷۸۷: کتاب الجہاد: باب ۳۵) (تفسیر امداد الکرم)

عہد رسالت میں مومنین کی چار قسمیں

اس آیت (الانفال: 72) میں اور اس سورت کی آخری آیت (الانفال: 75) میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں ایمان لانے والوں کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں

(1) مہاجرین اولین، ان کا ذکر آیت 72 کے اس حصہ میں ہے۔ (1)۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(2) انصار، ان کا ذکر آیت مذکورہ کے اس حصہ میں ہے، وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا۔

(3) جن مومنین نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی ان کا ذکر الانفال: 75 کے اس حصہ میں ہے والذین امنوا من بعد وھاجروا وجاھدوا معکم۔

(4)۔ وہ مومنین جنہوں فتح مکہ تک ہجرت نہیں کی ان کا ذکر (الانفال: 72) کے اس حصہ میں ہے، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا۔

مہاجرین اولین کی دیگر مہاجرین اور انصار پر فضیلت

مہاجرین اولین نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے جہاد کیا۔ کیونکہ جب وہ اپنے وطن کو چھوڑ آئے تو ان کے تمام مال و دولت اور ان کے مکانوں اور تجارت پر کفار مکہ نے قبضہ کر لیا۔ پھر انھوں نے مکہ سے مدینہ آنے کے لیے اور غزوات میں شرکت کرنے کے لیے اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور انھوں نے اپنی جانوں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کیا، کیونکہ انھوں نے بغیر ہتھیاروں اور بغیر عددی قوت اور بغیر تیاری کے غزوہ بدر میں کفار کے خلاف جہاد کیا۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے مقابلہ میں ان کو اپنا مال عزیز تھا نہ جان، اور چونکہ وہ ہجرت کرنے میں اور اللہ کی راہ میں مال اور جان کرچ کرنے میں بعد کے مسلمانوں پر سابق او اول تھے اس لیے ہجرت اور جہاد میں وہ بعد کے مسلمانوں کے لیے امام، پیشوا اور مقتدا بن گئے اس لیے ان کا مرتبہ اور اجر وثواب بعد میں ہجرت کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان (رض) ورضوعنه (التوبہ: 100)

مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے، سب سے پہلے ایمان لانے والے، اور جن لوگوں نے نیک کاموں میں ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔

لا يستوي منكم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئك اعظم درجة من الذين انفقو من بعد وقاتلو و كلا وعد الله الحسنى (الحدید: 10)

جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور جہاد کیا ان کے برابر وہ لوگ نہیں ہو سکتے جنہوں نے (فتح مکہ کے) بعد خرچ کیا اور جہاد کیا، ان لوگوں کا بہت بڑا درجہ ہے اور اللہ نے ان سب سے اچھے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔

السابقون السابقون۔ اولئك المقربون (الواقعہ: 10-11)

سبقت کرنے والے، سبقت کرنے والے ہیں وہی (اللہ کے مقرب ہیں

مہاجرین اولین سابقین نے سب مسلمانوں سے پہلے ہجرت کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اور اس کی راہ میں جہاد کر کے بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے اس نیک عمل کی راہ دکھائی اس لیے قیامت تک کے مسلمانوں کی ان نیکیوں کا اجر ان کے نامہ اعمال کی زینت ہوگا، حدیث شریف میں ہے :

حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں کسی نیک کام کی ابتداء کی اس کو اپنا اجر بھی ملے گا اور بعد میں اس پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملے گا، اور بعد والوں کے اپنے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں کسی برے کام کی ابتداء کی اس کو اپنے کام کا گناہ بھی ہوگا اور بعد میں عمل کرنے والوں کے اعمال کا گناہ بھی ہوگا اور ان کے اپنے کاموں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (صحیح مسلم الزکوۃ 69 (1017) 2313۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 2554۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 203۔ مسند احمد ج 4، ص 359، 357۔ المعجم الکبیر، ج 2، رقم الحدیث : 2445، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث : 21025۔ سنن کبری للبیہقی، ج 4، ص 175، کنزالعمال رقم الحدیث : 43078)

لوگوں کی عادت ہے کہ جب وہ اپنی نوع کے لوگوں کو کوئی نیک کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں بھی اس نیک کام کرنے کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کام کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ اور لوگوں پر کوئی مشکل کام اس وقت آسان ہو جاتا ہے جب وہ اور لوگوں کو بھی وہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ سو اس اعتبار سے مہاجرین اولین کو بعد کے مسلمانوں پر بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔

مومنین انصار کو بھی بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب کے ساتھ ان کی طرف ہجرت کی تھی تو اگر وہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مدینہ میں جگہ نہ دیتے اور آپ کی مدد نہ کرتے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں اپنی جان اور اپنے مال کے نذرانے پیش نہ کرتے اور مشکل مہمات میں اصحاب رسول کا ساتھ نہ دیتے تو ہجرت کے مقاصد پورے نہ ہوتے۔ اس کے باوجود مہاجرین اولین کا مرتبہ انصار مدینہ سے کئی وجہ سے افضل ہے۔

1۔ مہاجرین سابقین اولین ایمان لانے میں انصار اور باقی سب مسلمانوں سے افضل ہیں۔ اور ایمان لانا ہی تمام فضیلتوں کا مبدء اور منشاء ہے۔

2۔ مہاجرین اولین مسلسل تیرہ سال کفار قریش کی زیادتیوں اور ظلم و ستم کا شکار ہوتے رہے اور تمام سختیوں پر صبر کرتے رہے۔

3۔ انھوں نے اسلام اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خاطر اپنا وطن چھوڑا، عزیز و اقارب کو چھوڑا، گھر، تجارت اور باغات کو چھوڑا اور اسلام کی خاطر یہ تمام مصائب مہاجرین نے برداشت کیے۔

4۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام اور آپ کے دین اور آپ کی شریعت کو قبول کرنے کا دروازہ مہاجرین اولین نے کھولا۔ انصار نے ان کی اقتداء کی اور ان کی مشابہت اختیار کی اور مقتدیٰ مقتدی سے افضل ہوتا ہے۔

مہاجرین اور انصار کے درمیان پہلے وراثت کا مشروع پھر منسوخ ہونا

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا یہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اس جگہ مفسرین کا اختلاف ہے کہ ولایت سے مراد وراثت ہے یا ولایت سے مراد ایک دوسرے کی نصرت اور معاونت ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس ولایت سے مراد وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے کا وارث کر دیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی، وہ اس وقت تک تمہاری ولایت میں نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کرلیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں ان کو وراثت نہیں ملے گی اور جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آخرت میں فرمایا اور اللہ کی کتاب میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں تو اس آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔ اور اب قرابت وراثت کا سبب ہے اور ہجرت وراثت کا سبب نہیں ہے۔ مجاہد، ابن جریج، قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، سدی اور زہری سے بھی اسی قسم کے اقوال مروی ہیں۔ (جامع البیان جز 10، ص 69،67۔ مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں پر نسخ نہیں ہے اور ولایت کا معنی نصرت اور اعانت ہے، اور یہی تفسیر راجح ہے۔

ولایت کا معنی بیان کرتے ہوئے علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں:

ولایت کا معنی

ولاء اور توالی کا معنی یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایسا حصول ہو جو پہلے حاصل نہ تھا۔

اور اس کا قرب کے لیے استعارہ کیا جاتا ہے۔ خواہ قرب بہ حیثیت مکان ہو یا قرب بہ حیثیت نسب ہو یا قرب بہ حیثیت دین ہو یا بہ حیثیت دوستی قرب ہو یا بہ حیثیت نصرت اور اعتقاد قرب ہو۔

اور ولایت (واؤ کی زیر کے ساتھ) کا معنی نصرت ہے اور ولایت (واؤ کی زبر کے ساتھ) کا معنی ہے کسی امر کا والی ہونا اور اس میں تصرف کرنا۔ اور ولی اور مولی ان میں سے ہر معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسم فاعل کے معنی میں یعنی ناصر، اور کارساز اور اسم مفعول کے معنی میں یعنی منصور واللہ والی المومنین (آل عمران: 68) اس کا معنی ہے اللہ مومنین کا ناصر اور کارساز ہے اور مومنین اللہ کے ولی ہیں یعنی اللہ کے منصور ہیں اللہ ان کی نصرت اور مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان ولایت کی نفی کر دی ہے یاایہاالذین امنوالاتتخذوا الیہود والنصارا اولیاء (المائدۃ: 51) یعنی یہود اور نصاری کو اپنا ناصر اور مددگار نہ بناؤ۔ اسی طرح طرح فرمایا مالکم من ولایتہم من شیء (الانفال: 72) یعنی تم ان کی مطلقاً نصرت نہ کرو (المفردات، ج 2، ص 692۔963، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، 1418ھ۔)

علامہ مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد بن الاثیر جزری المتوفی 606ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں ولی سے اس کا معنی ہے ناصر اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے تمام عالم اور مخلوقات کا مربی اور منتظم، اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے والی ہے اس کا معنی ہے تمام اشیاء کا مالک اور ان میں تصرف کرنے والا اور ولایت کا لفظ تدبیر، قدرت اور فعل کی خبر دیتا ہے اور جب تک کسی چیز میں یہ معانی جمع نہ ہوں اس پر والی کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ حدیث میں لفظ مولی بہ کثرت استعمال ہوا ہے اور یہ ان معانی میں

ہے: رب، مالک، سید، منعم، معتق (آزاد کرنے والا) ناصر، محبت، تابع، پڑوسی، عم زاد، حلیف، عقید (جس سے معاہدہ کیا ہو) سسرالی رشتہ دار، غلام، آزاد کردہ، ان میں سے اکثر معنی میں مولی کا لفظ حدیث میں وارد ہے، اور حدیث کا سیاق وسباق جس معنی کا مقتضی ہو مولی کا لفظ اسی معنی پر محمول کیا جاتا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی چیز کا مالک ہو یا اس کا انتظام کرے وہ اس کا مولی اور ولی ہے، اور کبھی ان اسماء کے مصادر مختلف المعنی ہوتے ہیں۔ پس ولایت (زبر کے ساتھ) کا معنی نسب میں قریب اور نصر اور آزاد کرنے والا ہے اور ولایت (زیر کے ساتھ) کا معنی امارت ہے اور ولاء کا معنی آزاد شدہ ہے۔ (النہایہ ج 5، ص 197-198، دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ)

چونکہ ولایت کا معنی نسبی قرابت بھی ہے اس لیے اس آیت میں وراثت کے معنی کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن قرآن مجید میں کم سے کم نسخ کو ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو نصرت کے معنی پر محمول کیا جائے اور سیاق وسباق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

کفار سے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے دار الحرب کے مسلمانوں کی مدد نہ کرنا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے۔ ماسوا اس قوم کے جس کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہو۔

یعنی جن مسلمانوں نے دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی، پھر انھوں نے دار الحرب سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں سے ان کی فوجی قوت یا مال سے مدد طلب کی تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کو ناامید اور نامراد نہ کریں۔ ہاں اگر وہ کسی ایسی کافر قوم کے خلاف تم سے مدد طلب کریں جس قوم کے ساتھ ایک مدت معین تک کا تمہارا معاہدہ ہو تو پھر تم اس معاہدہ کو نہ توڑو، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حدیبیہ کے دن مشرکین سے تین شرائط پر صلح کی۔ مشرکین میں سے جو شخص مسلمانوں کی طرف آئے گا وہ اس کو انھیں واپس کردیں گے، اور مسلمانوں کی طرف سے جو مشرکین کے پاس جائے گا وہ اس کو واپس نہیں کریں گے، اور یہ کہ اگلے سال مسلمان عمرہ کے لیے آئیں گے اور صرف تین دن مکہ مکرمہ میں ٹھہریں گے اور اپنے ہتھیاروں کو میان میں رکھ کر آئیں گے مثلاً تلوار اور تیر کمان وغیرہ۔ پھر حضرت ابوجندل بیڑیوں میں چلتے ہوئے مسلمانوں کی طرف آئے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں مشرکین کی طرف واپس کردیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2700، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

امام ابن ہشام متوفی 218ھ لکھتے ہیں:

جس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سہیل بن عمرو صلح نامہ لکھ رہے تھے اس وقت سہیل کے بیٹے حضرت ابوجندل بن سہیل بن عمرو (رض) اپنی بیڑیوں میں گھسیٹتے ہوئے آئے اور اچانک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آگئے اور رسول للہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کو انی فتح کے متعلق کوئی شک نہیں تھا اور اس کا سبب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خواب تھا۔ اور جب انھوں نے صلح اور رجوع کا معاملہ دیکھا اور یہ دیکھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی شرائط مان لی ہیں تو ان کو اتنا زیادہ رنج اور قلق ہوا کہ لگتا تھا وہ شدت غم سے ہلاک ہوجائیں گے جب سہیل نے اپنے بیٹے ابوجندل کو دیکھا تو ان کے پاس گیا اور ان کے منہ پر تھپڑ

مارے، اور ان کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگا اور اس نے کہا یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے اور آپ کے درمیان اس کے آنے سے پہلے معاہدہ مکمل ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا۔ پھر وہ حضرت ابو جندل کو گریبان سے پکڑ گھسیٹنے لگا تاکہ ان کو قریش کی طرف لے جائے اور حضرت ابو جندل بلند آواز سے فریاد کرنے لگے اے مسلمانو! کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا، یہ مجھے میرے دین کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کریں گے۔ مسلمانوں کو ان کی فریاد کی وجہ سے اور زیادہ قلق ہوا تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابو جندل! صبر کرو اور اجر وثواب کی نیت کرو، تمہیں اور دوسرے کمزور مسلمانوں کو اللہ نجات دینے والا ہے اور ان کے لیے کشادگی کرنے والا ہے، اور میں ان لوگوں سے صلح کا معاہدہ کر چکا ہوں اور میں ان سے عہد شکنی نہیں کروں گا۔ پھر حضرت ابو جندل دل شکستہ ہو کر اپنے باپ کے ساتھ چلے گئے اور معاہدہ پورا ہو گیا۔ (سیرت ابن ہشام ج 3، ص 347، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

نیز امام ابن ہشام لکھتے ہیں:

جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ پہنچے تو آپ کے پیچھے ابو بصیر عتبہ بن اسید بھی مدینہ پہنچ گئے یہ ان مسلمانوں میں سے تھے جن کو مکہ میں قید کر کے رکھا گیا تھا۔ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ پہنچے تو ان کی بازیابی کے لیے ازہر بن عبد عوف اور اخنس بن شریق نے آپ کو خط لکھا اور بنو عامر بن لوی کے ایک شخص اور ان کے آزاد کردہ غلام کو انھیں لینے کے لیے مدینہ منورہ بھیجا۔ وہ دونوں ازہر اور اخنس کا خط لے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابو بصیر! ہم نے ان لوگوں سے جو معاہدہ کیا ہے وہ تم کو معلوم ہے اور ہمارے دین میں عہد شکنی کی گنجائش نہیں ہے اور اللہ تمہارے لیے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے نجات اور کشادگی کی صورت پیدا کرنے والا ہے، تم اپنی قوم کے پاس واپس چلے جاؤ۔ حضرت ابو بصیر نے کہا یا رسول اللہ! آپ مجھے مشرکین کی طرف لوٹا رہے ہیں وہ مجھے میرے دین کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کر دیں گے! آپ نے فرمایا اے ابو بصیر! تم واپس جاؤ عنقریب اللہ تمہاری رہائی کی صورت پیدا کر دے گا۔ (سیرت ابن ہشام ج 3، ص 352، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

امام محمد بن سعد متوفی 230ھ لکھتے ہیں:

ابو جندل بن سہیل بن عمرو مکہ میں بہت پہلے اسلام لا چکے تھے ان کے باپ سہیل نے ان کو زنجیروں سے باندھ کر مکہ میں قید کیا ہوا تھا اور ان کو ہجرت کرنے سے روک دیا تھا۔ حدیبیہ کی صلح کے بعد یہ رہا ہو کر مقام العیص میں پہنچ گئے اور حضرت ابو بصیر سے مل گئے۔ (حضرت ابو بصیر کو جو دو آدمی لینے آئے تھے، انھوں نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا مکہ بھاگ گیا تھا۔ وہ پھر مدینہ گئے لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معاہدہ کی پاسداری کی وجہ سے ان کو قبول نہیں کیا۔ پھر یہ مدینہ سے نکل کر مقام العیص پہنچ گئے حضرت ابو جندل بھی ان سے آملے۔ اس طرح وہاں تقریباً ستر مسلمان مکہ سے بھاگ کر ان کے پاس آ گئے ان کو مکہ سے آنے والا جو کافر ملتا یہ اس کو قتل کر دیتے اور کفار کے جو قافلے وہاں سے گزرتے ان کو لوٹ لیتے۔ حتیٰ کہ قریش نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خط لکھا کہ وہ مکہ سے آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنے کی شرط سے دست بردار ہوتے ہیں تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو مدینہ آنے کی اجازت دے دی اور یہ لوگ مدینہ آ گئے۔ (سیرت ابن ہشام، ج 3، ص 352،353)۔ پھر حضرت ابو جندل، حضرت ابو بصیر کے پاس رہے حتیٰ کہ حضرت ابو بصیر وہاں وفات پا گئے اور حضرت ابو جندل دیگر مسلمانوں کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مدینہ پہنچ گئے۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد بھی

مسلمانوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے اور حضرت عمر بن خطاب کے دور خلاف میں 18ھ کو شام میں فوت ہوگئے۔ (الطبقات الکبری ج 7، ص 284، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۭ 73؀

لغۃ القرآن: وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [كَفَرُوْا : سب نے کفر کیا] [بَعْضُهُمْ : ان میں سے بعض] [اَوْلِيَاۗءُ : دوست ہیں] [بَعْضٍ : بعض کے] [اِلَّا : مگر] [تَفْعَلُوْهُ : تم سب کرو گے اسے " یہ کام "] [تَكُنْ : ہونا] [فِتْنَةٌ : کوئی آزمائش] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [وَفَسَادٌ : اور فساد ہوگا] [كَبِيْرٌ : بڑا " گناہ " ہے] [

ترجمہ: اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، (اے مسلمانو!) اگر تم (ایک دوسرے کے ساتھ) ایسا (تعاون اور مدد و نصرت) نہیں کرو گے تو زمین میں (غلبہ کفر و باطل کا) فتنہ اور بڑا فساد بپا ہو جائے گا

تشریح:

قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کو نسل، زبان، دولت اور منصب کی بنیادوں پر تقسیم نہیں کیا۔ یہاں معاشرہ کی تقسیم کا دار و مدار ایمان اور کفر پر ہے۔ مومنین بلاامتیاز نسل، زبان، ملک ایک طبقہ ہیں اور کفار اسی طرح ایک الگ طبقہ ہیں۔ یہی انسانی معاشرہ کی صحیح تقسیم ہے جسے عقل سلیم تسلیم کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو یہاں وضاحت سے بیان فرما دیا۔

اس جملہ سے مذکورہ احکام الٰہیہ کی حکمت بیان فرمادی کہ اگر تم امن و سلامتی کی آرزو رکھتے ہو تو ان ارشادات ربانی پر شرح صدر سے عمل کرو۔ ورنہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی اور تمہاری ترقی اور خوشحالی کے سارے منصوبوں کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ تمہارا ذہنی سکون بھی تم سے چھن جائے گا اور مسرت و شادمانی کی جملہ پروگرام بھی تلپٹ ہو جائیں گے۔ ان احکام کی بجاآوری سے تم اپنے خداوند کریم کو بھی راضی کرلو گے اور اپنی دنیوی زندگی کو بھی ہر قسم کی کامیابیوں سے ہمکنار کرلو گے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت کی حقانیت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ مسلمانوں کو آپس کے عدم اتحاد پر فرمایا گیا تھا کہ اس سے فتنہ اور فساد کبیر ہوگا اور اب ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ آج مسلمانوں کے خلاف فتنہ اور فساد کبیر ہے یا نہیں اور اس کی وجہ بھی مسلمانوں کا عدم اتحاد ہے یا نہیں؟

مسلمانوں میں باہمی تعاون اور مدد کی ضرورت

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کافروں کی دوستی اور ان کا وارث بننے سے منع کیا ہے، ان سے جدا رہنے، مسلمانوں کو آپس میں میل جول رکھنے اور ایک دوسرے کا معاون و مددگار بن کر مضبوط طاقت بننے کا حکم دیا ہے۔ لیکن افسوس! فی زمانہ ایک گھر سے لے کر عالمی سطح تک اس معاملے میں مسلمانوں کا حال اس کے الٹ ہی نظر آ رہا ہے کہ مسلمان اپنے گھر میں اپنے ہی بہن بھائیوں کے ساتھ میل جول رکھنے، مشکل حالات میں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے سے بیزار ہو چکے ہیں اور یہی حال پڑوسیوں اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ ہے، اسی طرح ایک علاقے کے مسلمان دوسرے علاقے کے مسلمانوں سے، ایک شہر کے مسلمان دوسرے شہر کے مسلمانوں سے، ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں سے باہمی الفت و محبت اور تعاون و مدد کو تیار نہیں بلکہ عمومی طور پر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی بجائے کفار سے بہر صورت دوستی کرنا چاہتے ہیں اور ہر طرح کی قربانی دے کر ان سے بنائی ہوئی دوستی کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور اگر کسی کافر ملک کی کسی مسلم ملک کے ساتھ جنگ شروع ہو جائے تو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کرنے اور کفار کے خلاف ان کی مدد کرنے کی بجائے کافروں کا ساتھ دیتے ہیں اور مسلمان بھائیوں کو تباہ و برباد کرنے میں کافروں کو ہر طرح کی مدد دیتے اور ان کی تھپکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کی اپنی حکمرانی قائم رہے اور ان کی عیش و مستی میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے اور اپنے دین و مذہب کی تعلیمات کو سمجھنے، ان پر عمل کرنے اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (تفسیر صراط الجنان)

ذہن نشین رکھو! کہ (جنھوں نے کفر کیا، ان میں ایک دوسرے کے وارث ہیں) یعنی آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے میں دوست ہیں۔ ان میں آپس میں کتنی ہی ذاتی رنجش کیوں نہ ہو، لیکن اہل حق کے مقابلے میں سب کے سب اپنی رنجشوں کو بھلا کر، متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر آجاتے ہیں*۔ عہد حاضر میں یہود و نصاریٰ اس کی واضح مثال ہیں۔ اس لیے کہ عیسائیوں کو اپنے طور پر اس بات کا یقین ہے، کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر لٹکا دینے والے یہودی ہی ہیں اور۔ یونہی یہودی بھی بخوبی جانتے ہیں، کہ حضرت عیسیٰ کے عہد سے آج تک، ان کے اصل حریف عیسائی ہی رہے ہیں، جن کے ظلم و ستم کا وہ ہمیشہ شکار ہوتے رہے، اور جنھوں نے پوری دنیا میں ان کا ناطقہ بند کر کے رکھا تھا۔ باایں ہمہ۔۔ اسلام کے مقابلے میں دونوں ایسے مل گئے ہیں اور ایسے شیر و شکر نظر آ رہے ہیں، گویا ان میں کبھی کوئی اختلاف ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا نقطہ اتحاد صرف ان کا کفر ہے، خواہ ان میں ہر ایک کے کفر کی نوعیت الگ الگ ہی ہو، لیکن 'الکفر ملۃ واحدۃ' کے قول کی روشنی میں، الگ الگ ہو کر بھی وہ ایک ہی ہیں۔ تو مسلمانوں! تم بھی سوچو۔۔۔

(اگر تم نے یہ نہ کیا) یعنی تم کو آپس میں ملنے اور مدد و محبت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس پر عمل نہیں کیا، (تو ہو گا فتنہ زمین میں اور بڑا فساد) دین میں۔ یعنی اگر مسلمان ایک دوسرے کے دوست نہ ہوں گے اور باہم ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے تو ان کے کام خراب ہو جائیں گے اور کافر ظہور کریں گے اور اس سے بڑا فتنہ و فساد ہو سکتا ہے۔ اس سے تمہاری دنیا بھی خطرے میں آسکتی ہے، اور تمہارا دین بھی آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔۔۔ (تفسیر اشرفی)

یاد رہے مسلمان جب اندلس میں داخل ہوئے تو صرف مسلمان تھے ان میں عربی، عجمی اور کالے، گورے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قلّت تعداد کے باوجود چند دنوں میں پورے اندلس کے حاکم ہو گئے۔ پھر جب تک اسلام ہی ان کی اصل قوت رہا اسی کی راہنمائی میں انفرادی اور

اجتماعی زندگی گزرتی رہی تو عیسائی اپنی ساری کوششوں کے باوجود اندلس کے مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ لیکن جب مسلمانوں میں عربی اور اندلسی کا سوال پیدا ہوا، بربر اور غیر بربر کے امتیاز نے سر اٹھایا۔ اسلام کی بجائے دوسرے امتیازات مرغوب ہوتے گئے، حبِّ دنیا دین کی محبت پر غالب آگئی، نتیجہ معلوم ہے کہ آٹھ سو سال تک اندلس پر حکمرانی کرنے والی قوم اس طرح وہاں سے نکالی گئی کہ ایک فرد بھی مسلمان نام کا وہاں باقی نہ رہا۔ مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے گئے ان کی یونیورسٹیاں اور ان کی دانش گاہیں جو کبھی پورے یورپ کے لیے علم و دانش کا سرچشمہ تھیں انھیں آگ لگادی گئی۔ مسلمانوں کے علمی مراکز جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ جو ترکی یا مراکش کی طرف ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئے وہ زندہ رہے اور جو نکل نہ سکے یا جن کو بہلاوے دے کر روک لیا گیا انھیں قتل کر دیا گیا یا عیسائی بنالیا گیا۔ آج بھی پوری دنیا میں جگہ جگہ اس حقیقت کو دہرایا جارہا ہے۔ اقوامِ متحدہ اسلام دشمنی کا مرکز بن چکی ہے ایک فتنے کی آگ ہے کہ پوری دنیائے اسلام اس کی لپیٹ میں ہے۔ لاکھوں مسلمان موت کی نیند سلائے جاچکے ہیں۔ کتنی مسلمان ریاستیں ہیں جو اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے ہر طرح کی اذیتوں کا شکار ہیں۔ جگہ جگہ فساد کی آگ بھڑک رہی ہے اور اس کا ایندھن صرف مسلمان ہیں۔ ہندوستان جہاں صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی وہاں مسلمان کا خون پانی سے ارزاں ہوگیا ہے۔ اس سے بڑھ کر فتنہ سامانی اور کیا ہوگی کہ خود مسلمان ملکوں میں اسلامی زندگی گزارنا ایک الزام بن گیا ہے۔ مختلف الزامات کے تحت احتسابی ادارے جس کو پکڑ لیتے ہیں اس کی کوئی داد ہے نہ فریاد۔ یوں تو تاریخ کے ہر دور میں یہ آیت مسلمانوں کو پکارتی رہی ہے لیکن آج تو مسلمانوں کا نوشتہ تقدیر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے مسلمان کب اس پر کان دھریں گے اور اس حقیقت کو سمجھ کر از سر نو اپنی عظمت رفتہ کے لیے کوشش کرنے کا عہد کریں گے۔ اپنی ناکامیوں کے اصل اسباب کو سمجھیں گے اور اس حقیقت کا پوری طرح ادراک کریں گے کہ امت مسلمہ کی کسی ایک نسل یا کسی ایک جغرافیے میں سمٹ کر رہنے والی امت کا نام نہیں۔ اس میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بیسیوں نسلوں کے لوگ ہیں جن کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہر براعظم میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔ کوئی محدود جغرافیہ انھیں اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتا۔ اس طرح تفرقات اور امتیازات میں بٹی ہوئی امت اگر کسی بنیاد پر اکٹھی ہوسکتی ہے اور ان کا شیرازہ کسی ایک رسی سے باندھا جاسکتا ہے اور ان کے جہاز کسی ایک لنگر سے باندھے جاسکتے ہیں اور ان کے اجزائے ہستی کو کسی ایک سریش سے جوڑا جاسکتا ہے تو وہ صرف "اسلام" ہے۔ صرف وہ نسخہ شفا ہے جسے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لے کر آئے تھے۔ وہ کل بھی ہماری قوت تھا آج بھی ہماری قوت ہے۔ یہی وہ تاریخی حقیقت ہے جو اس آیت کریمہ سے نمایاں ہو رہی ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

حق تعالیٰ جب مہاجر اور انصار کی مدد اور وراثت باہمی کی خبر دے چکا، اور اس کے ترک پر تہدید کر چکا، تو دوبارہ ان کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے، ان کی ہجرت اور مددگاری کی جزاء کی خبر دیتا ہے۔ یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ آیت 72 سے مقصود یہ تھا، کہ مہاجرین وانصار کے درمیان ولایت کو بیان کیا جائے اور آگے کی آیت 74 سے مقصود یہ ہے کہ مہاجرین وانصار کی تعریف و توصیف کی جائے، کیونکہ ان کا ایمان کامل ہے اور یہ برحق مومن ہیں۔ مہاجرین اولین نے ایمان کے تقاضوں پر عمل کیا، انھوں نے اسلام کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑا، عزیز و اقارب کو چھوڑا، مال و دولت اور مکانوں اور باغات کو چھوڑا۔ اسی طرح انصار نے بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کے لیے اپنے دیدہ و دل کو فرش راہ کیا۔ (تفسیر اشرفی)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ سے معلوم ہوا کافر اور مسلم کے مابین وراثت جاری نہیں ہوسکتی خواہ وہ آپس میں قریبی رشتہ دار ہوں۔

حضرت اسامہ بن زید (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "کوئی کافر کسی مسلمان کا اور کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث نہی ہو سکتا۔ " (بخاری کتاب الفرائض باب 26، ترمذی کتاب الفرائض باب 16) یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار آپس میں متحد ہیں سب مسلمانوں کو بھی ان کے مقابلہ میں باہم متحد ہونا چاہیے۔ (تفسیر برہان القرآن)

دو مختلف ملتوں کے ماننے والوں کے مابین دوستی اور وراثت جائز نہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان ولایت (نصرت اور وراثت) کو منقطع کر دیا ہے۔اور مومنوں کو مومنوں کا ولی بنایا اور کافروں کو کافروں کا ولی بنایا۔ کفار اپنے دین اور معتقدات کے اعتبار سے ایک دوسرے کی نصرت کرتے ہیں اگر کسی کافر عورت کا مسلمان بھائی ہو تو وہ اس کا ولی نہیں ہے اور وہ اس کا نکاح نہیں کر سکتا، کیونکہ ان کے درمیان ولایت نہیں۔اس کا نکاح اس کا ہم مذہب ولی کرے گا۔ جس طرح مسلمان عورت کا نکاح صرف مسلمان ولی ہی کر سکتا ہے، اگر اس کا باپ یا دادا کافر ہو تو وہ اس کا نکاح نہیں کر سکتا اسی طرح کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ حضرت سامہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نہ مسلمان کافر کا وارث ہو گا اور نہ کافر کا مسلمان کا وارث ہو گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 4282، 4283۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 2909۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2114۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2729)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔ (سنن ابو داؤد رقم الھدیث: 2901، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1414ھ)

حضرت ابو حاتم مزنی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تمہارے پاس ایسے رشتہ کا پیغام آئے جس کے دین اور خلق پر تم راضی ہو تو اس کے ساتھ نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بہت فتنہ اور فساد ہو گا، (سنن الترمذی رقم الحدیث: 1086، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1967) (تفسیر تبیان القرآن)

مسلمان کی جان کافر کے لیے نہیں دی جاسکتی

مسئلہ: مبسوط میں ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کچھ حربی کافر دار الحرب میں کسی کافر بستی پر حملہ کر دیں اور اس بستی کے باشندوں کو لوٹیں اور وہاں کافر بھی رہتے ہوں اور مستامن مسلمان بھی 'تو مسلمانوں کے لیے بستی والے کافروں کی مدد کرنی جائز نہیں 'ہاں اگر اپنی جان و مال کا اندیشہ ہو تو حملہ کرنے والوں سے مقابلہ کرنا جائز ہے کیونکہ لڑائی میں مقابلہ کرنے کا معنی ہے اپنی جان دینے کے لیے تیار ہو جانا اور مسلمان کی جان صرف اللہ کا بول بالا کرنے اور دین کی عزت کو قائم رکھنے کے لیے دی جاسکتی ہے۔

وطنی حربی کافروں کا مال

چونکہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حربی کافر 'مسلمانوں سے لوٹے ہوئے مال کے مالک بن جاتے ہیں اور بستی میں رہنے والے مسلمانوں نے ان سے معاہدہ کرلیا ہے کہ جس مال پر تم قابض ہو گے 'اس سے تعرض نہیں کریں گے 'اس لیے دار السلام سے لوٹے ہوئے مال کو چھڑانے کے لیے اپنے وطنی حربی کافروں سے جنگ جائز نہیں۔ (تفسیر مظہری) (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭلَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ

74○

لغۃ القرآن: وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : سب ایمان لائے] [وَهَاجَرُوْا : اور ان سب نے ہجرت کی] [وَجٰهَدُوْا : اور سب نے جہاد کیا] [فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کے راستے میں] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰوَوْا : سب نے جگہ دی " مہاجرین کو "] [وَّنَصَرُوْٓا : اور سب نے مدد کی] [أُولٰٓئِكَ : وہی لوگ] [هُمُ : وہ] [الْمُؤْمِنُوْنَ : سب ایمان لانے والے] [حَقًّا : سچا ہے] [لَهُمْ : ان کے لیے] [مَّغْفِرَةٌ : مغفرت ہے] [وَّرِزْقٌ : اور رزق ہے] [كَرِيْمٌ : باعزت] [

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (راہ خدا میں گھر بار اور وطن قربان کردینے والوں کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ حقیقت میں سچے مسلمان ہیں، ان ہی کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے

تشریح:

حبیب کبریا علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ افضل التحتیہ واجمل الثناء کے صحابہ کرام کو بارگاہ الٰہی سے اولئک ہم المؤمنون حقا کا جو لقب عطا کیا جارہا ہے یہ ان کی عمر بھر کی قربانیوں، دلسوزیوں اور نیاز مندیوں کا بہترین صلہ ہے جب اللہ تعالیٰ ان کے مومن برحق ہونے پر شاہد ہے تو پھر کیا انھیں کسی دوسرے گواہ کی گواہی کی بھی حاجت ہے؟ وہ اس لیے تو ایمان لائے ہی نہ تھے کہ چودھویں صدی کا بے عمل خود فراموش اور خدا فریب مسلمان انھیں ایمان کا سرٹیفکیٹ مرحمت فرمادے۔ اے شمع توحید کے پروانو! اے محبوب خدا کے عاشقان دلفگار! اور اے ناموس اسلام کے جوانمرد پاسبانو! مبارک!

صد مبارک ! اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تم جیسا دل اور تم جیسی نگاہ بخشے اور تمہارے نقوش کو خضر راہ بنانے کی سمجھ عطافرمائے آمین بجاہ حبیبہ الامین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

مغفرت اور رزق کریم کا وعدہ فرما کر انھیں دونوں جہانوں کی سعادتوں سے بہرہ مند فرمادیا۔ یعنی اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانباز صحابہ اور سرفروش ساتھیو ! قیصر وکسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دیئے جائیں گے اور اگر کوئی غلطی تم سے سرزد ہوگئی تو اسے بخش دیا جائے گا۔ اب ہم خود غور کریں جن کی لغزشوں کی بخشش کا رب کریم نے وعدہ فرمادیا ہے تو ہم میں سے کسی کو ان پر انگشت نمائی کا حق پہنچتا ہے ؟ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس سے پہلی آیت میں مہاجرین وانصار کے باہمی تعلّقات اور ان میں سے ہر ایک کا دوسرے کے معین ومددگار ہونے کا بیان تھا اور اس آیت میں ان دونوں کے ایمان کی تصدیق اور ان کے رحمت الٰہی کے مستحق ہونے کا ذکر ہے۔ اس آیت سے مہاجرین اور انصار کی عظمت وشان بیان کرنا مقصود ہے کہ مہاجرین نے اسلام کی خاطر اپنے آبائی وطن کو چھوڑ دیا، اپنے عزیز، رشتہ داروں سے جدائی گوارا کی، مال و دولت، مکانات اور باغات کو خاطر میں نہ لائے۔ اسی طرح انصار نے بھی مہاجرین کو مدینہ منورہ میں اس طرح ٹھہرایا کہ اپنے گھر اور مال و متاع میں برابر کا شریک کرلیا، یہ سچے اور کامل مومن ہیں، ان کے لیے گناہوں سے بخشش اور جنت میں عزت کی روزی ہے۔

انصار کے فضائل

اس آیت میں مہاجرین کے ساتھ ساتھ انصار کی بھی عظمت وشان بیان کی گئی، اسی طرح ایک اور مقام پر انصار کی عظمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

"وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"

ترجمہ کنزالعرفان : اور جنہوں نے پہلے اس شہر کو اور ایمان کو ٹھکانا بنالیا وہ اپنی طرف ہجرت کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور وہ اپنے دلوں میں اس کے متعلق کوئی حسد نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا گیا اور وہ (دوسروں کو) اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود (مال کی) حاجت ہو اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی کامیاب ہیں۔

اور حضرت براء (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "انصار سے محبت نہ کرے گا مگر مومن اور ان سے عداوت نہ کرے گا مگر منافق، تو جس نے ان سے محبت کی اللہ عَزَّوَجَلَّ اس سے محبت کرے اور جس نے ان سے بغض رکھا اللہ عَزَّوَجَلَّ اس سے ناراض ہو۔

حضرت انس (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "ایمان کی نشانی انصار سے محبت کرنا ہے اور منافقت کی نشانی انصار سے بغض رکھنا ہے۔

حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کچھ بچوں اور عورتوں کو ایک شادی سے آتے ہوئے دیکھا تو حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھڑے ہوگئے اور فرمایا "اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، تو جانتا ہے، اے انصار ! تم لوگ (مجموعی طور پر) مجھے تمام

لوگوں سے زیادہ پیارے ہو۔ اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، تو جانتا ہے، اے انصار ! تم لوگ (مجموعی طور پر) مجھے تمام لوگوں سے زیادہ پیارے ہو۔ (تفسیر صراط الجنان)

کفار کے مقابلہ میں مومنوں کا کردار اور ان کی آپس میں محبت

اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کا وارث اور دوست قرار دیا گیا ہے۔ کفار اور جان بوجھ کر ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں سے لاتعلّقی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر ان مسلمانوں کے ایمان کی تصدیق فرمائی جو اللہ تعالیٰ کی خاطر ہجرت کرنے والے اور اس کفار سے تعلقات توڑتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہتے ہوئے مہاجروں کی ہر قسم کی امداد کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے ہاں پکے اور سچے مومن ہیں۔ ان کے گناہ معاف کردیے جائیں گے اور انھیں بہترین رزق سے نوازا جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت اور یہ کام کیے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں بھی مال واسباب سے مالا مال فرمایا۔

(عَنْ أَنَسٍ (رض) قَالَ قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ الْمَدِينَةَ فَآخَى النَّبِيُّ بَيْنَهُ وَبَيْنَ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ الْأَنْصَارِيِّ وَكَانَ سَعْدٌ ذَا غِنًى فَقَالَ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ أُقَاسِمُكَ مَالِي نِصْفَيْنِ وَأُزَوِّجُكَ قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ دُلُّونِي عَلَى السُّوقِ فَمَا رَجَعَ حَتَّى اسْتَفْضَلَ أَقِطًا وَسَمْنًا فَأَتَى بِهِ أَهْلَ مَنْزِلِهِ فَمَكَثْنَا يَسِيرًا أَوْ مَا شَاءَ اللّٰهُ فَجَاءَ وَعَلَيْهِ وَضَرٌ مِنْ صُفْرَةٍ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَهْيَمْ قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً مِنَ الْأَنْصَارِ قَالَ مَا سُقْتَ إِلَيْهَا قَالَ نَوَاةً مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ وَزْنَ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ)

[رواہ البخاری، کتاب البیوع، باب قول اللہ تعالیٰ فإذا قضیت الصلاۃ]

”حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں عبدالرحمٰن بن عوف (رض) مدینہ منورہ آئے تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سعد بن ربیع انصاری (رض) اور ابن عوف (رض) کے درمیان مواخات قائم کی۔ سعد مالدار آدمی تھے۔ انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف (رض) سے کہا میں اپنے مال کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں اور آپ کے نکاح کا اہتمام کرتا ہوں عبدالرحمٰن بن عوف (رض) نے کہا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے مال اور اہل میں برکت کرے۔ مجھے بازار کے بارے میں معلومات دیجیے وہ بازار گئے اور وہاں سے گھی اور پنیر لے کر واپس آئے۔ ہمیں مدینہ میں ٹھہرے کچھ دیر گزری تھی تو وہ آئے اور ان پر زرد رنگ کے نشانات تھے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا یہ کیا ہے ؟ انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نے انصاری عورت سے شادی کی ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم نے کتنا مہر ادا کیا ہے ؟ عبدالرحمٰن نے کہا گٹھلی کے برابر سونا یا اس کے کم و بیش سونا ادا کیا ہے۔ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ولیمہ کیجیے خواہ ایک بکری ہی ذبح کرو۔“ (تفسیر فہم القرآن)

مہاجرین وانصار صحابہ کے لئے قرآن کا اعلان جنت

مہاجرین وانصار صحابہ کے سچے مومن ہونے کی گواہی اللہ تعالیٰ نے دے دی اور ان کی بخشش کا اعلان فرمادیا اب جو انھیں برا بھلا کہے وہ خود اپنی عاقبت تباہ کرتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاجرین انصار سے افضل ہیں اسی لیے ہمیشہ ان کا ذکر انصار سے پہلے کیا گیا کیونکہ انھوں نے دین کے لیے انصار سے کئی گنا زیادہ قربانی دی اور ابو بکر صدیق عمر فاروق عثمان غنی اور علی مرتضیٰ (رض) تو رؤوس المہاجرین ہیں۔ دیگر صحابہ نے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہجرت کی اور ابو بکر صدیق (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہجرت کی عمر فاروق (رض) عنہٗ نے ڈنکے کی چوٹ پر ہجرت کی اور کفار کو للکارا کے اگر کسی میں مجھے روکنے کی طاقت ہے تو روک کر دکھائے، اگر مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم ہجرت نہ دیا ہوتا میں کبھی ہجرت نہ کرتا، جبکہ باقی سب نے چھپ کر ہجرت کی۔ اور عثمان غنی (رض) نے حبشہ اور مدینہ کی طرف دوہری ہجرت کی اور علی المرتضی (رض) نے حکم رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر امانتیں دیں اور فواطن خواتین کے ساتھ ہجرت کی۔

لہٰذا بلا شبہ چاروں یاران نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مہاجرین کے سردار ہیں۔ ان کا جہاد فی سبیل اللہ بھی سب سے عظیم ہے تو جو لوگ ان یاران مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گالیاں دیتے ہیں ان کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ خود شیعہ کتب گواہ ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو مجھے گالی دے وہ کافر ہے جو میرے صحابہ کو گالی دے وہ بھی کافر ہے اور میرے صحابہ کو گالی دینے والے کو کوڑے لگاؤ۔" (جامع الاخبار صفحہ 821 فصل 125) (تفسیر برہان القرآن)

مندرجہ بالا صفات کے حامل ہی اسلام کی اصل قوت ہیں

اس آیت کریمہ میں باردگر اس حقیقت کا اظہار کیا جارہا ہے کہ امت مسلمہ کی اصل قوت مسلمان ہیں چونکہ یہ ایک نظریاتی گروہ ہے اس لیے کوئی دوسرا گروہ اولاً تو اس میں شامل نہیں ہوسکتا اور اگر ریاست کا شہری بن کر شامل ہو بھی جائے تو اصل قوت کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ نظریاتی تفاوت کبھی بھی اخلاص پیدا ہونے نہیں دیتا۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ مومن اور مسلمان کوئی ایسا گروہ نہیں جن کے لیے صرف نام اختیار کرلینا کافی ہو۔ مومن اور مسلم دراصل چند صفات کے حامل کو کہتے ہیں اگر امت کے افراد اپنے آپ کو مومن تو کہتے ہوں لیکن ان میں مومنانہ صفات نہ پائی جاتی ہوں تو ان کی تعداد چاہے ریت کے ذروں کی طرح کیوں نہ ہوں وہ امت اسلامیہ کی قوت میں اضافہ تو کیا کریں گے اسے باقی بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں زور دے کر فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سچے اور پکے مومن وہ ہیں جن کے اندر ایمان ہو، جنھوں نے ایمان کی خاطر ہجرت کی ہو، اپنا سب کچھ اللہ کی رضا اور دین کی خاطر قربان کرچکے ہوں اور انھوں نے ہجرت کرکے آنے والوں کو پناہ دی ہو اور نصرت کی ہو اور پھر دونوں کا اصل جوہر یہ کہ انھوں نے کفر کی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کرنے کا حوصلہ بھی کیا ہو۔ وہ تعداد اور اسلحہ جنگ سے بے نیاز ہوکر محض اللہ کی رضا کے لیے خلعت شہادت سے بہرہ ور ہونے کے لیے جنگ کی آگ میں کود چکے ہوں۔ وہ نفع وضرر سے بے نیاز اور سود و زیاں کے پیمانوں سے لاتعلق ہوکر صرف اسلام کو اپنا مستقبل قرار دے چکے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے یہاں حقیقی مومن ہیں کیونکہ عرصہ حیات اور کارزار حیات میں جو قوتیں کام آتی ہیں وہ محض نام کی قوتیں نہیں ہوتیں بلکہ

صفات کی قوتیں ہوتی ہیں۔ زندگی کا بوجھ زندگی کا جوہر اٹھاتا ہے۔ اس شخص سے زندگی پناہ مانگتی ہے جسے خود زندگی گزارتی ہے۔ جو شخص ایمان کا نام لیتا ہو لیکن اصول اسلام پر یقین نہ رکھتا ہو، جو اللہ کے راستے میں کوئی قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہو اور اگر کفر سے تصادم کا خطرہ پیدا ہو جائے تو مصلحت کا جال بننے لگے اور کوئی ایسا راستہ نکالنے کی تدبیر کرے جس میں کفر کے ساتھ سازگاری ہو سکے۔ ایسا شخص نام کا تو مومن ہو سکتا ہے لیکن اسے سچا اور پکا مومن نہیں کہا جا سکتا اور اسلام اپنے ترکش کا اسے تیر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کا وجود امت مسلمہ کے لیے ایک ایسے خطرے کی علامت ہے جس کے باقی رہنے سے کفر سرافراز ہوتا اور اسلام سرنگوں ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر امت مسلمہ کے افراد واقعی آیت میں بیان کردہ صفات کا حقیقی مرقع بن جاتے ہیں اور ان کا ایک ایک فرد ان کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے۔ تو ایسی امت جب اللہ کے پاس جائے گی تو مغفرت اور بخشش اس کے انتظار میں ہوگی اور جب تک وہ دنیا میں رہے گی عزت کی روزی اس کا مقدر ہوگی۔ روزی تو ہر جاندار کو ملتی ہے لیکن کرگس کی روزی اور شاہین کی روزی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عزت و افتخار سے صرف وہی قوم جیتی ہے جو ان صفات کی حامل بن کر غیرت سے زندگی گزارنا جانتی ہے کیونکہ یہی وہ وصف ہے جس کی موجودگی چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے اور جس سے محرومی بڑوں بڑوں کی گردنیں جھکا دیتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا: (تفسیر روح القرآن)

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ 75ۧ

لغۃ القرآن:

وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : سب ایمان لائے] [مِنْۢ : اسکے] [بَعْدُ : بعد] [وَهَاجَرُوْا : اور ان سب نے ہجرت کی] [وَجٰهَدُوْا : اور سب نے جہاد کیا] [مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہوں] [فَ اُولٰٓئِكَ : تو وہی لوگ] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [وَاُولُوا : اور تمام اہل] [الْاَرْحَامِ : رحموں] [بَعْضُهُمْ : ان میں سے بعض] [اَوْلٰى : زیادہ خیر

خواہ ہے] [بِبَعْضٍ : بعض کو] [فِي : میں] [كِتٰبِ : کتاب] [اللّٰهِ : اللہ] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [بِكُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز کو] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے] [

ترجمہ: اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور انھوں نے راہ حق میں (قربانی دیتے ہوئے) گھر بار چھوڑ دیئے اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ لوگ (بھی) تم ہی میں سے ہیں، اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں (صلہ رحمی اور وراثت کے لحاظ سے) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے

تشریح:

یعنی صلح حدیبیہ سے پہلے ہجرت کرنے والوں اور نصرت دین کے لیے سر بکف میدان میں آنے والوں کا مقام بیشک بہت بلند ہے لیکن اس کے بعد بھی جو ہجرت کر کے آیا اور اسلام کی سر بلندی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا وہ بھی احکام شرعیہ اور دیگر تمام سیاسی حقوق میں یکساں ہیں۔

ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی نصرت بھی ضروری ہو گی اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے۔

ہجرت کے بعد حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انصار اور مہاجرین میں جو بھائی چارہ اور مواخاۃ قائم کی تھی اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے تھے۔ اس آیت میں توراۃ کا یہ طریقہ منسوخ قرار دے دیا گیا اور صرف قریبی رشتہ داروں میں وراثت محدود کر دی گئی۔

(تفسیر ضیاء القرآن)

مہاجرین کے طبقات

مہاجرین کے کئی طبقے ہیں ایک وہ ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ مدینہ طیبہ کو ہجرت کی انھیں مہاجرین اولین کہتے ہیں۔ کچھ وہ حضرات ہیں جنہوں نے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ طیبہ کی طرف انھیں اصحاب الھجر تین کہتے ہیں۔ بعض حضرات وہ ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ سے قبل ہجرت کی یہ اصحاب ہجرت ثانیہ کہلاتے ہیں، پہلی آیت میں مہاجرین اولین کا ذکر ہے اور اس آیت میں اصحاب ہجرت ثانیہ کا ذکر ہے۔

{ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ : اور رشتے دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ } حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں "صحابہ کرام (رض) ہجرت اور اُخُوَّت کی بنا پر ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے حتّٰی کہ یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالی کے حکم میں ہجرت اور اخوت کے مقابلے میں (نسبی) رشتے دار وراثت میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں اور اس آیت کے ذریعے ہجرت اور اخوت کی وجہ سے وراثت میں حق داری منسوخ فرما دی گئی۔

آیت "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ" سے معلوم ہونے والے مسائل

اس آیت سے 3 مسئلے معلوم ہوئے:

(1)۔۔ ہجرت اور اخوت کی وجہ سے وراثت منسوخ ہو چکی ہے۔

(2)۔۔ اب وراثت کا دار و مدار نسبی قرابت داری پر ہے جیسا کہ آیت " وَاُولُوا الْاَرْحَامِ " سے واضح ہے۔ رضاعی رشتے کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے کا وارث نہیں اور سسرالی رشتے میں بھی صرف شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے وارث ہیں۔

(3)۔۔ ذوی الارحام جیسے ماموں خالہ وغیرہ بھی وارث ہیں جیسا کہ احناف کا مذہب ہے۔(تفسیر صراط الجنان)

دارالکفر کے مسلمانوں کو ترغیب اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تنبیہہ

ایک نوزائیدہ امت جو امت مسلمہ کے نام سے وجود میں آئی ہے اور جس کی تعمیر ایسی بنیادوں پر اور شیرازہ بندی ایسے وسائط سے کی جارہی ہے جس کی مثال اس وقت کی موجود دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔اس لیے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ ایک نیا تجربہ ہے اس لیے اس کے اندر کوئی سقم کوئی خرابی اور کوئی کمزوری نہیں رہنی چاہیے۔مکہ معظّمہ میں چونکہ دعوت صرف ایمان کی دی جارہی تھی تو جو لوگ ایمان لائے وہ یقینا ایمان ہی کو اسلامی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔لیکن جب ایمان ہی کی طرح ہجرت کو بھی فرض قرار دے دیا گیا تو اگرچہ مسلمانوں کی فیصلہ کن اکثریت نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا لیکن پھر بھی کچھ لوگ پیچھے رہ گئے۔ہجرت کی اہمیت کے پیش نظر انھیں دوسرے درجے کے مسلمان قرار دیا گیا۔یہ تو تسلیم کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایمانی اخوت میں شریک ہیں لیکن وہ ولایت اسلامی سے محروم کر دیئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ دوسرے مسلمانوں کے وارث ہوں گے اور نہ مسلمان ان کے وارث ہوں گے اور نہ مہاجرین کے ساتھ ان کے نکاح کا رشتہ قائم ہو سکے گا اور نہ اسلامی ریاست ان کے اجتماعی حقوق کی محافظ رہے گی۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اگر اپنے دل میں ایمان رکھتے ہیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی وقت بھی ہجرت کرنے کی کوشش کریں۔اس لیے پیش نظر آیت کریمہ میں انھیں ایک طرح سے شوق دلایا جارہا اور ترغیب دی جارہی ہے کہ تم اگر واقعی امت مسلمہ کا حصہ بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہو تو وہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ تمھیں ہجرت کر کے مرکز اسلام میں امت مسلمہ کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے اور ساتھ ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہیں وہ مسلسل مصائب کی چکی میں پس رہے ہیں۔ہر آنے والا دن ان کے لیے نئی آزمائشیں لے کر آتا ہے۔عرب کا کفر اور اہل کتاب کا حسد ان کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتا جارہا ہے۔لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ پوری توانائی جاں فروشی اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ ان مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔اب اگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے لوگ ہجرت کر کے ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور اس طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو جائیں کہ اب جبکہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی سرفروشیوں اور اللہ کی تائید و نصرت کے ساتھ حالات بدلنے لگے ہیں کافر طاقتیں اپنے زخم چاٹنے لگی ہیں اور مسلمانوں کو روز بروز قوت ملتی جارہی ہے تو ہجرت کرنے والے لوگ یہ سمجھ کر شاید آرہے ہیں کہ اب آسانیوں کا زمانہ شروع ہونے والا ہے ہمیں جا کر اس میں حصہ بٹانا چاہیے۔چنانچہ ایسے ہی اندیشہ ہائے دور دراز کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار نے حکم دیا کہ جس وقت بھی کوئی شخص ہجرت کر کے تمہارے ساتھ شامل ہو جاتا ہے اور نہایت اخلاص کے ساتھ جہاد میں تمہارا دست و بازو بنتا ہے تو تمھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تمہارا ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ ہی تمہارے ساتھ تھا۔اسے فیصلہ کرنے میں دیر ضرور لگی لیکن تمھیں انھیں قبول کرنے میں دیر نہیں لگنی چاہیے۔اپنے دلوں کے دروازے ان کے لیے کھلے رکھو وہ تمہارے ہی وجود ملی کے اجزا ہیں۔تمہارے اندر ان کے بارے میں کوئی احساس برتری پیدا ہونا نہیں چاہیے اور نہ انھیں قبول کرنے میں دلوں میں کوئی تنگی ہونی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ جن لوگوں نے حدیبیہ سے پہلے ہجرت کی وہ ان لوگوں سے مرتبہ و مقام میں یقینا بلند ہیں جنھوں نے حدیبیہ کے بعد ہجرت کی لیکن مقامات کی بلندی اللہ کی طرف سے انھیں عطا ہوتی ہے جو کبھی احساس برتری کا شکار نہیں ہوتے۔وہ تمام مراتب کے باوجود ہمیشہ تواضع کا

پیکر بنے رہتے ہیں۔ان کے لیے امت مسلمہ کا ایک ایک فرد جسم کے اعضاء کی طرح ہے۔جن کی افادیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے اور جن میں بعض کو بعض پر یقیناً ترجیح بھی حاصل ہے۔

اُولُوا الْاَرْحَامِ کے حقوق مقدم ہیں

والوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتب الله من المومنین والمهاجرین الا ان تفعلوا الی اولیاء کم معروفاً ط کان ذلك فی الکتب مسطوراً۔

(الاحزاب)

(اور مومنین اور مہاجرین میں رحمی رشتے والے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں اللہ کے قانون میں مگر یہ کہ تم اپنے اولیا کے ساتھ کوئی حسن سلوک کرو یہ چیز کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔)

اُولُوا الْاَرْحَامِ کی وضاحت

اُولُوا الْاَرْحَام کی کچھ تفصیل ہم معارف القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

(لفظ اولو عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے۔جس کا ترجمہ اردو میں "والے" سے کیا جاتا ہے جیسے اولوا العقل عقل والے، اولوالامر۔'امر والے'،اس لیے اولوالارحام کے معنی ہوئے 'ارحام والے'۔ارحام،رَحِم کی جمع ہے۔جو اصل میں اس عضو کا نام ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لیے اُولُوا الْاَرْحَام رشتہ داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ ایک ولایت عامہ سب مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے جس کے سبب بوقت ضرورت ایک دوسرے کی امداد واعانت بھی واجب ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں لیکن جو مسلمان آپس میں قرابت اور رشتہ کا تعلق رکھتے ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے مقدم ہیں۔فِی کِتٰبِ اللّٰہِ کے معنی اس جگہ فِی حُکْمِ اللّٰہِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم خاص سے یہ قانون بنادیا ہے۔

اس آیت نے یہ ضابطہ بتادیا کہ تقسیم وراثت رشتہ داری کے معیار پر ہونا چاہیے اور لفظ اُولُوا الْاَرْحَام مطلقاً اقرباء اور رشتہ داروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ان میں سے خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے سورۃ نساء میں متعین فرمادیئے جن کو علم میراث کی اصطلاح میں اہل فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے ان کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہیے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی مال کا تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں کیونکہ دور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلاشبہ موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی باپ اور ماں آدم وحواء (علیہما السلام) سے پیدا ہوئے ہیں۔اس لیے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔جس کا تفصیلی

بیان احادیث رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے باوجود جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔ اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کی جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علم میراث وفرائض کی خاص اصطلاح میں لفظ ذوی الارحام انھیں کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے ہے قرآن کریم میں اولوالارحام کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے جس میں ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں۔

پھر اس کی کچھ تفصیل سورۃ نساء کی آیات میں آگئی ہے جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیئے ہیں جن کو اصطلاح میراث میں ذوی الفروض کہتے ہیں اور باقی کے متعلق رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھولا ولی رجل ذکر۔ (بخاری)

یعنی جن کے حصے قرآن نے مقرر کردیئے ہیں وہ پورے ان کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میت سے قریب تر مرد ہوں۔

ان کو اصطلاح میراث میں عصبات کہا جاتا ہے۔ اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوی الارحام کہتے ہیں جیسے ماموں، خالہ وغیرہ)

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

(بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے)

امت کی تاسیس وتعمیر کے لیے کیسی بنیادیں ہونی چاہئیں، امت مسلمہ کے اہداف کیا ہونے چاہئیں، افراد امت کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، دینی اخوت وولایت کا دائرہ کیا ہونا چاہیے اور رحمی قربت وقرابت کے کیا حقوق ہونے چاہئیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز اللہ نے اپنے بے پایاں علم کے ذریعے امت کو جو عطا فرمائی ہے، اس میں کسی طرح بھی غلطی، کوتاہی اور نارسائی کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ کی ذات اور اس کا علم ایسے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر بات کے انجام سے باخبر ہے۔ اس لیے امت کے لیے لازم ہے کہ اس نے جس مقام کے لیے جو احکام دیئے ہیں اور جس بات کے لیے جو ہدایت عطا فرمائی ہے وہ اسے زندگی کا دستور بنالے اسی میں اس کی دنیا اور اسی میں اس کی عقبیٰ ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین کا درجہ بلند ہے، لیکن بعد میں آنے والے لوگ بھی انہی کے ساتھ اور ان کے حکم میں شامل ہیں اور یہ بعد میں آنے والے بھی ولایت اور اسلامی تحریکی معاشرے کی ممبری کے مستحق ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔ ہجرت کا یہ نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک مکہ فتح نہ ہو چکا۔ فتح مکہ کے بعد عرب کی سرزمین اسلامی قیادت کے زیر نگیں آگئی۔ اور لوگ سب کے سب اسلامی معاشرے میں منظ ہوگئے۔ لیکن فتح مکہ کے بعد ہجرت کا یہ حکم ختم کردیا گیا اور جہاد کو جاری رکھا گیا۔ جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ یہ پوزیشن 12 سو سال تک قائم رہی اور اسلام اس کرہ ارض پر حکمران رہا۔ اسلامی نظام قانون نافذ رہا اور اسلامی قیادت حاکم اور حکمران رہی۔ لیکن آج اس پوری دنیا پر جاہلیت

پھر سے غالب اور حکمران ہو گئی ہے اور اس وقت کرہ ارض کے کسی خطے میں بھی لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کی شریعت نافذ نہیں بلکہ اقتدار اور قانونی نظام پوری دنیا میں طاغوت کا چل رہا ہے۔ لوگ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی میں داخل ہو گئے ہیں جبکہ اسلام نے ان کو انسانوں کی غلامی سے نکال دیا تھا۔ لہٰذا اب تحریک اسلامی دوبارہ انہی ادوار سے گزرے گی جس طرح پہلے وہ گزری تھی۔ اس نے تنظیم شروع کی تھی، مرحلہ وار تحریک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دار الہجرت قائم ہو گا اور پھر وہ دار الاسلام اور دار الہجرت سے پھیلاؤ شروع کرے گی اور پھر ہجرت ختم ہو گی مگر جہاد جاری رہے گا جس طرح پہلی بار میں ہوا۔

پہلی بار جب تحریک اسلامی برپا ہوئی تو اس تحریکی عمل کے لیے کچھ مخصوص احکام تھے۔ اس تحریک پر مخصوص حالات کی وجہ سے کچھ مخصوص ذمہ داریاں تھیں۔ اس وقت اخوت اور برادری کے تعلقات کو خون اور نسب کی بنیادوں سے ہٹا کر اسلامی نظریات کی اساس پر رکھ دیا گیا تھا۔ مواخات کی تمام شکلوں، تمام ذمہ داریوں یعنی برائے اجتماعی تکافل دیت اور دوسرے معاہدات تاوان کو اسلامی اخوت پر قائم کر دیا گیا تھا لیکن جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا۔ اور جنگ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہو گیا تو بعض عبوری احکامات میں تبدیلی کر دی گئی کیونکہ یہ عبوری احکامات وقتی اور استثنائی حالات کے لیے تھے۔ اور ان میں سے اہم تبدیلیاں یہ تھیں کہ اجتماعی کفالت، دیت کی ادائیگی اور وراثت کے تعلقات کو لوٹا کر قرابت اور رشتہ داری کی بنیادوں پر قائم کر دیا لیکن اسلامی معاشرے کے اندر اور اسلامی خطوط کے اوپر۔

واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ " مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں "۔ لہٰذا اسلام کے عملاً قیام کے بعد، اسلام کے دائرے کے اندر اقربا کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔ یہ انسان کی فطری خواہش کا ایک پہلو ہے۔ اور اسلام اس بات پر پابندی عائد نہیں کرتا کہ انسان کی فطری خواہشات کو دبایا جائے بشرطیکہ انسان کے یہ فطری میلانات معاشرے کے اسلامی اور اجتماعی پہلو کو نقصان نہ پہنچاتے ہوں اور اسی طرح کے دوسرے فطری احساس و شعور کے لیے مضر نہ ہوں۔ اسلام فطری میلانات کو توڑتا نہیں بلکہ ان کو منضبط کرتا ہے اور منضبط اس طرح کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اعلی وجود کے لیے وہ مفید بن جائیں۔ وہ ان کو منضبط بھی اسلامی معاشرے کے اجتماعی وجود کے لیے کرتا ہے۔ اگر اسلامی معاشرے کے اجتماعی وجود کی ضروریات نہ ہوں تو پھر اسلام انسان کے فطری میلانات کو آزاد چھوڑتا ہے۔ اسلامی نظام کے عمومی دائرے کے اندر۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بعض احکامات عارضی اور عبوری ہوتے ہیں اور یہ اسلام کے تحریکی عمل کے ہوتے ہیں۔ ایسے احکام کو اسلام کے فائنل قانونی احکام تصور نہیں کیا جاتا جو اسلامی معاشرے کے قیام، جاری اور غالب وجود کو جاری رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہمیں ان احکام کو جو اسلام کے ابتدائی قیام کے مرحلے میں وارد ہوئے اور اس کے ان فائنل احکام کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے جو قائم معاشرے کو دائم رکھنے کے لیے دیے گئے ہیں۔

ان اللہ بکل شئ علیم۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ تبصرہ اور تعقیب ان احکام کے آخری میں نہایت ہی موزوں ہے کہ یہ مختلف احکام اور انتظامی ہدایات اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ نہایت ہی وسیع علم کا مالک ہے۔ وہ ہر حکم علم سے دیتا ہے۔ یہاں ضروری ہے کہ اس قسم کے اسلامی معاشرے کے قیام و نظام پر ایک نوٹ دے دیا جائے۔

اسلام، امت مسلمہ کو، بنیادی عقیدہ دے کر اپنے مخصوص طریق کار کے تحت، اجتماعی تحریک کے ذریعہ اسے خارجی وجود بخش کر اور اس اجتماعی تحریک کے لیے بنیادی عقیدہ کو اساس بنا کر اس لیے برپا کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ انسان کی انسانیت کو نمودار کر دے۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات کو نمودار کر دے۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات اپنی تعلیمات اور اپنے شرائع اور احکام میں انسانیت کی اسی نشوونما کو اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

چونکہ انسان تمام حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی وجود میں اشتراک رکھتا ہے۔ اس لیے سائنٹف جہالت کے علمبردار کبھی کہتے ہیں کہ انسان ایک حیوان ہی تو ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ اس کا وجود محض ایک مادی وجود ہے لیکن یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ حیوانات اور مادہ کے ساتھ وجود میں اشتراک کے باوجود انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو اسے عام مادیات اور حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے ایک مفرد وجود بخشتی ہیں۔ اب آکر کہیں اس سائنٹیفک جہالت علمبرداروں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے اور وہ واقعات حقائق اور مشاہدوں اور تجربوں نے ان کی گردن غرور کو توڑ دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اس بات پر مجبور ہو گئے ہی کہ اخلاص اور تصریح کے بغیر اشاروں اشاروں میں اس حقیقت کا اعتراف کریں۔

جن لوگوں نے اسلام تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا ہے۔ اور پھر پوری تاریخ انسانی پر بھی ان کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات اور اس کے قیام کے طریق کار کے نتائج کسی قدر شاندار رہے ہیں۔ اسلام نے جدید معاشرے کی تعمیر، رنگ، وطن، قومیت، ملکی مصالح اور علاقائی تعلقات جیسے کمزور رشتوں کے بجائے صرف ایمان و نظریات اور عقائد و تصورات پر کی ہے اور اس نقنہ نظر سے اس نے انسانی وجود کے حیوانی اور مادی پہلو کو نظر انداز کیا اور انسان کی انسانیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اسلامی سوسائٹی میں داخل ہونے کے دروازے ہر جنس اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لیے کھل گئے اور اس طرح محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور حیوانی بندشوں اور باہمی امتیازات میں سے کوئی بندش اور امتیاز درمیان میں نہ رہا۔ اس طرح اسلامی معاشرے کی کٹھالی میں بشریت کے مختلف اجناس کی خصوصیات اور قابلیتیں انڈیل دی گئیں اور کٹھالی میں ان تمام خصائص نے ایک حسین امتزاج کی شکل اختیار کی اور اس خام مواد سے ایک نیا وجود سامنے آیا۔ یہ سب کام ایک نہایت مختصر عرصہ میں ہوا اور اس سے انسانوں کا ایک عجیب یک رنگ و ہم آہنگ گروہ تیار ہو گیا۔ جس نے ایک تابندہ اور عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا۔ وہ تہذیب جو اپنے دور میں انسانیت کے استعداد جوہر کا خلاصہ تھی، حالانکہ اس زمانہ میں آبادیوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے تھے اور مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس اعلی ترین معاشرے میں بیک وقت عربی، فارسی، شامی، مصری، مغربی، ترکی، چینی ہندوستانی، رومی، یونانی، انڈونیشی اور افریقی اور بیشمار دوسری قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل ہو کر اس میں ضم ہو گئے تھے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرہ کی نشو و نما میں ان تمام لوگوں کی قابلیتیں اور ذہانتیں مل کر باہمی تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ مصروف عمل ہو گئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی وقت بھی یہ عظیم الشان تہذیب صرف عربی تہذیب نہیں رہی اور نہ ہی کبھی معروف معنوں میں قومی تہذیب رہی ہے بلکہ یہ ہمیشہ سے فکری تہذیب ہی رہی ہے۔

یہ سب لوگ اس تہذیب میں خالص مساوات کے اصولوں پر جمع ہوئے۔ باہمی مروت اور شفقت نے انھیں جوڑا، منزل مقصود کے اتحاد کی وجہ سے وہ باہم ملے اور اس مقصد اور نصب العین کے لیے انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا۔

انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا اور اپنے تمام قومی اور تاریخی خصائص کو ظاہر کیا اور اپنے ذاتی اور موروثی کمالات کو نئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا، مساوات و اتحاد کی بنیاد پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان سب کا رب حاکم مالک اور خالق ایک ہی ہے۔ اس عقیدہ کے پس منظر میں بلا روک ٹوک انسانیت ابھر آئی۔ وحدت الہ کا عقیدہ " وحدت انسان " کا عقیدہ رکھتی ہو۔

معاشرہ مشہور ترین معاشرہ رہا ہے لیکن اس میں بھی متعدد رنگ بیشمار زبانیں اور کئی قومیتیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا مزاج اور طرز فکر مختلف ہے۔ اس کے باوجود اس معاشرے کی اساس انسانیت یا بلند تر نظریات پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ یہ ایک قسم کا طبقاتی گٹھ جوڑ تھا جس میں ایک طرف اشراف کا طبقہ تھا اور ایک طرف غلاموں اور کمزوروں کا گروہ تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ روم امپائر میں فاتح اور مفتوح اقوام علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں۔ رومن فاتح ہر لحاظ سے بزرگ و برتر ہیں اور مفتوح اقوام غلام اور زیر دست ہیں۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے رومی معاشرہ ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا جہاں تک اسلامی معاشرہ پہنچا اور نہ ہی اس نے انسانی تاریخ میں وہ کارنامے سرانجام دیے جو صحت مند اسلامی معاشرہ کے شایان شان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی معاشرے عالم وجود میں آئے مثلاً انگریزی تہذیب کا قائم کردہ جدید معاشرہ، یہ معاشرہ بھی دراصل رومی معاشرے کا جانشین اور وارث تھا اور عملی میدان میں آ کر یہ بھی طبقاتی اور استحصالی معاشرہ ثابت ہوا اور اس کا اصل الاصول یہ رہا کہ انگریز قوم کو قیادت اور برتری کا مقام حاصل رہے۔ اس کا بین ثبوت ان نوآبادیوں کے معاشری اور معاشرتی جائزے سے ملتا ہے جو کسی وقت انگریزوں کے زیر نگیں رہے ہیں اور بعینہ یہی طرز عمل یورپ کی دوسری شہنشاہیتوں اور معاشروں کا رہا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے نوآبادیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہسپانوی، پرتگالی اور فرانسیسی معاشروں نے اپنی تمام کالونیوں میں وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا اور ان کے طرز عمل نے خود بتا دیا کہ یہ معاشرے کس قدر گھناؤنے، مہلک اور گرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے اشتراکی معاشرہ نمودار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے اساسی اصولوں میں سے رنگ و قوم و جنس اور زبان و وطن کو خارج کر دیا لیکن اس کی اساس بھی خالص انسانی بنیادوں پر نہ اٹھی بلکہ ان کی نئی طبقاتی کشمکش پر اٹھی۔ یہ معاشرہ بھی رومی طرز کا طبقاتی معاشرہ بن گیا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ رومی معاشرہ اشراف (Lords) کی حمایت پر سامنے آیا اور اشتراکی معاشرہ مساکین (Labours) کی حمایت میں نمودار ہوا۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ مزدوروں کے کام میں تمام دوسرے طبقات کے خلاف نفرت کے بیج بو دیے جائیں۔ چنانچہ خونی کشمکش کا ایک طویل دور شروع ہو گیا، اور اس میں انسانیت ایسے ایسے مصائب سے دوچار ہوئی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، کیونکہ اس کی بنیاد انسانیت کے بجائے خالص حیوانی زندگی پر تھی۔ اس نے یہ دعوی کیا کہ جنسی تعلقات خوراک اور مسکن ہی انسانیت کے بڑے مسائل ہیں اور انہی کے حل میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے تاریخ کا جدلی فلسفہ پیش کر کے اسے تاریخ تلاش معاش قرار دے دیا۔ لیکن دنیا پر اسلامی معاشرہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے نظام حیات میں انسان کی صرف ان خصوصیات کو اجاگر کیا جو خالص انسانی ہیں۔ اس طرح اس نے انسان کو محض ایک مادے اور ایک حیوان کی سطح سے بہت اونچا کر دیا اور پوری تاریخ انسانیت میں اس پہلو سے اسلامی نظام حیات بے مثال ہے۔ اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظام حیات کو چھوڑ کر دوسرے نظام اختیار کرتے ہیں، وہ دراصل انسانیت کے دشمن ہیں اور وہ اعلی انسانی قدروں کی جگہ قوم، وطن، جنس اور طبقات کی بنیاد پر انسانی زندگی کو منظم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان سے زیادہ کمزور اور گھناؤنی ذلیل چیز کوئی اور نہیں ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اور فطری اصولوں کے مطابق انسانی معاشرہ کی تعمیر، خالص انسانی بنیادوں پر نہیں چاہتے اور نہ ہی یہ انسانی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ تمام انسانی تجربوں اور تمام انسانی خصائص و کمالات سے فائدہ اٹھائے اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں باری تعالی فرماتے ہیں :

قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالا ۔ الذين ضل سعيهم في الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا ۔ اولئك الذين كفروبايات ربهم ولقاءه فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنا ۔ ذلك جزاءهم جهنم بما كفروا واتخذوا آياتي ورسلي هزوا ۔ "اے محمد ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ

کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہیں کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کی جزا جہنم ہے کہ اس کفر کے بدلے جو انھوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

کیونکہ یہ لوگ ترقی کے انسانی خطوط کے خلاف کام کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کو دوبارہ بہائم کے معاشرے کی صورت میں بدلنا چاہتے ہیں جس کا مقصد صرف گھاس اور دانے کی تلاش ہوتی ہے اور یہ لوگ ایسے حالات میں یہ کام کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب کے ذریعہ لوگوں کو ایسی ہدایات دے دی ہیں جن پر تمام انسان مجتمع ہو سکتے ہیں۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اعلی انسانی قدروں پر انسانی معاشرے کو استوار کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ لوگ جو خالص حیوانی نظریات پر معاشرے چلانا چاہتے ہیں، جامد رجعت پسند اور دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ تمام خوش نما باتیں اور تمام الزامات اس لیے ہیں کہ یہ اعلی انسانی قدروں سے بھاگنا چاہتے ہیں۔

لیکن اللہ اپنے امور پر خود اختیار رکھتا ہے۔ اس لیے یہ پستیاں جو انسانی معاشروں پر غالب آگئی ہیں اور انسان کو حیوان محض بنا دیا گیا ہے، ان کے لیے دوام مقدر نہیں ہے۔ عنقریب وہ روشنی پھیلے گی اور وہ معاشرے وجود میں آئیں گے جن کو اللہ پسند کرتا ہے۔ انسانیت عنقریب عزت کا مقام دوبارہ پالے گی جس طرح پہلی بار انسانیت انسانی قدروں پر اکٹھی ہوئی تھی اور تاریخ میں اس کی مثال نہیں ہے۔ وہ آج بھی تاریخ کے افق پر روشن ہے اور لوگوں کے لیے ایک مثال ہے اور دوبارہ وہ معاشرہ منظم ہو گا اور کسی نہ کسی دن ایک مثالی معاشرہ ہو گا۔ انشاء اللہ !

(تفسیر فی ظلال القرآن)

ہجرت کی تعریف اور ہجرت کے متعلق مختلف النوع احادیث

اس آیت سے وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان کے بعد ہجرت کی۔ اور اس ہجرت کا مرتبہ پہلی ہجرت سے کم ہے۔ حدیبیہ کے بعد دو سال تک صلح کا زمانہ رہا پھر مکہ فتح ہو گیا اور ہجرت بھی ختم ہو گئی۔ ہجرت کی تعریف یہ ہے دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف نکلنا یا دار الخوف سے دار الامن کی طرف نکلنا۔ جیسے مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ یا حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ایک قول یہ ہے کہ شہوات، منکرات، اخلاق ذمیمہ اور معاصی کو ترک کرنا ہجرت ہے۔ (المفردات، ج 2، ص 698)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے دن فرمایا اب ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 1834۔ صحیح مسلم الحج 445 (1453) 3244۔ سنن ابوداود رقم الحدیث: 2018۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 1596۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 2874۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث: 3857۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2773)

حضرت مجاشع بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے بھائی حضرت مجاہد کو لے کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یہ مجاہد ہیں جو آپ سے ہجرت پر بیعت کریں گے، آپ نے فرمایا فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن میں اس کو اسلام پر بیعت کروں گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3078-3079، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبید بن عمر لیثی کے ہمراہ حضرت عائشہ (رض) کی زیارت کی۔ ہم نے آپ سے ہجرت کے متعلق سوال کیا حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا اب ہجرت نہیں ہے، پہلے مسلمان اپنے دین کے سبب سے اللہ اور رسول کی طرف بھاگتے تھے، کیونکہ ان کو یہ خوف تھا کہ وہ اپنے دین کی وہ سے کسی آزمائش میں مبتلا نہ ہو جائیں، لیکن اب اللہ تعالیٰ اسلام کو غلبہ عطا فرما چکا ہے، اب مسلمان جہاں چاہیں اپنے رب کی عبادت کریں البتہ جہاد اور نیت باقی ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3900، مطبوعہ بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ اعرابی آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ آپ کی طرف ہجرت کرنے کی کون سی جگہ ہے؟ آپ جہاں کہیں ہوں یا کسی خاص جگہ پر؟ آیا کسی خاص قوم پر ہجرت فرض ہے؟ یا جب آپ رحلت فرما جائیں گے تو ہجرت منقطع ہو جائے گی؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ساعت خاموش رہے، پھر آپ نے فرمایا وہ سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا جب تم نماز پڑھو، اور زکوۃ ادا کرو تو تم مہاجر ہو خواہ تم ارض یمامہ میں فوت ہو، اور ایک روایت میں ہے کہ ہجرت یہ ہے کہ تم ظاہر اور باطن میں بے حیائی کے کام ترک کر دو اور نماز پڑھو اور زکوۃ ادا کرو تو پھر تم مہاجر ہو۔ (مسند البزار، رقم الحدیث: 1750)

حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہو گی جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو، اور توبہ اس وقت تک منقطع نہیں ہو گی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 2479، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1414ھ)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مہاجر وہ ہے جو اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں کو ترک کر دے (صحیح البخاری رقم الحدیث: 10)

حضرت خالد بن ولید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے ساتھ رہے، ان کے (چولہوں میں) ایک ساتھ آگ جلتی ہوئی نہ دیکھی جائے۔ (المعجم الکبیر ج 4، رقم الحدیث: 3836، حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد ج 5، ص 253)

حضرت زبیر بن عوام (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے یہ زمین اللہ کی زمین ہے اور یہ لوگ اللہ کے بندے ہیں، جس جگہ تم کو خیر ملے وہاں رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ (المعجم الکبیر ج 1، رقم الحدیث: 250، حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں بعض راویوں کو میں نہیں پہچانتا، مجمع الزوائد ج 5، ص 255)

ہجرت کے مختلف معانی

علامہ مجد الدین المبارک بن محمد بن اثیر الجزری المتوفی 606ھ لکھتے ہیں

حدیث میں ہجرت کا بہت زیادہ ذکر ہے، ایک حدیث میں ہے فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3079۔ صحیح مسلم رقم الحدیث: 1353۔ مسند احمد ج 1، ص 226)

اور ایک حدیث میں ہے: ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہوگی جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 226، مسند احمد ج 1، ص 192)

ہجر کا لغوی معنی وصل کی ضد ہے یعنی فراق، پھر اس کا غالب اطلاق ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف نکلنے اور دوسری زمین کی خاطر پہلی زمین کو ترک کرنے پر کیا جانے لگا۔

ہجرت کی دو قسمیں ہیں ایک ہجرت وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے:

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ: بیشک اللہ نے مسلمانوں کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت کے بدلہ خرید لیا (التوبہ: 111)

ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اپنے اہل و عیال اور مال چھوڑ کر آجاتا اور ان میں سے کسی چیز کی طرف رجوع نہ کرتا اور جس جگہ ہجرت کی تاحیات وہیں رہتا۔ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص اس جگہ مر جائے جہاں سے اس نے ہجرت کی تھی۔ اسی بنا پر آپ نے حضرت سعد بن خولہ کی مکہ میں موت پر افسوس کیا وہ حج کے لیے مدینہ سے مکہ آئے اور وہیں فوت ہو گئے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 1295)

اور جب آپ مکہ میں آئے تو آپ نے دعا کی اے اللہ! ہمیں مکہ میں موت نہ دینا۔ (مسند احمد ج 2 ص 25) اور جب مکہ دار الاسلام بن گیا تو وہ مدینہ کی طرح ہو گیا اور ہجرت منقطع ہو گئی۔

ہجرت کی دوسری قسم وہ ہے جو دیہاتیوں نے ہجرت کی اور مسلمانوں کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے لیکن انھوں نے اس طرح کے افعال نہیں کیے جس طرح پہلی ہجرت کرنے والوں نے کیے تھے، پس وہ مہاجر تو ہیں لیکن مہاجرین اولین کی فضیلت میں داخل نہیں ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو فرمایا ہے ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہوگی جب تک کہ توبہ سے منقطع نہ ہو اس سے یہی ہجرت مراد ہے۔

ان ہی احادیث میں سے ایک یہ حدیث ہے ہجرت کرو اور تکلف اور تصنع سے مہاجر نہ بنو۔ یعنی اللہ کے لیے اخلاص سے ہجرت کرو اور بغیر صحیح ہجرت کے مہاجرین کے ساتھ مشابہت نہ کرو۔ ان احادیث میں سے یہ حدیث بھی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ہجرت (ترک تعلق و ترک سلام و کلام) کرے۔ (صحیح مسلم البر والصلہ، 25، 2560، 6412۔ مسند احمد ج 2، ص 378)

اس ہجرت سے وصل کی ضد مراد ہے۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے کسی مسلمان کسی دنیاوی کوتاہی کی بناء پر اس سے ترک تعلق نہ کرے البتہ دین میں کسی بدعقیدگی کی بناء پر یا کسی غیر شرعی کام کی بناء پر ترک تعلق جائز ہے، کیونکہ اہل اھواء اور اھل بدعت سے دائمی ہجرت (ترک تعلق) رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص علانیہ معصیت سے توبہ نہ کرے اس سے ہجرت ضروری ہے، کیونکہ جب حضرت کعب بن مالک اور ان کے دیگر اصحاب نے بلا عذر غزوہ تبوک میں شرکت نہیں کی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سلمان کو حکم دیا کہ وہ ان سے ہجرت کرلیں یعنی ترک تعلق کریں حتی کہ ان کی ازواج کو بھی ان سے ترک تعلق کا حکم دیا، مسلمانوں نے پچاس دن تک ان سے

ترک تعلق رکھااور ان کی ازواج نے ان سے ایک ماہ تک، اور حضرت عائشہ نے ایک ماہ تک حضرت ابن الزبیر سے ترک تعلق رکھا۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے بعض لوگ اللہ کا ذکر صرف اس حال میں کرتے ہیں کہ وہ مہاجر ہوتے ہیں یعنی ان کے قلب نے زبان سے ہجرت کی ہوئی ہوتی زبان ذکر کرتی ہے اور دل غافل ہوتا ہے، یعنی وہ اخلاص سے اللہ کا ذکر نہیں کرتے۔ (النہایہ ج 5، ص 2111-213، مطبعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

ہجرت کی مختلف النوع احادیث میں تطبیق

ہجرت سے متعلق جن احادیث کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض احادیث میں یہ صراحت ہے کہ ہجرت کبھی منقطع نہیں ہو گی اور بعض میں یہ وضاحت ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منقطع ہو جائے گی، بعض احادیث میں ہے کہ مسلمان زمین پر کہیں بھی قیامت کر سکتا ہے اور بعض میں مشرکین کے ساتھ قیام کی ممانعت ہے اور بعض احادیث میں تصریح ہے کہ ہجرت تو صرف گناہوں کو ترک کرنا ہے۔ علامہ بدر الدین عینی نے ان متعارض احادیث کے حسب ذیل جوابات ذکر کیے ہیں :

1۔ جن احادیث میں فتح مکہ کے بعد ہجرت منقطع ہونے کا بیان ہے وہ صحاح کی احادیث ہیں اور جن احادیث میں قیامت تک ہجرت باقی رہنے کا ذکر ہے وہ سنن کی روایات ہیں اور صحاح کی احادیث کو سنن کی روایات پر ترجیح ہے۔

2 علامہ خطابی نے کہاہے کہ ابتداء اسلام میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض تھی، اب یہ فرضیت منسوخ ہو گئی اور جو ہجرت قیامت تک باقی رہے گی وہ مستحب ہے۔

3۔ علامہ ابن اثیر نے کہاہے کہ ہجرت کی دو قسمیں ہیں ایک قسم یہ ہے کہ ایک شخص اپنے وطن، اہل و عیال اور مال سے ہجرت کر کے مدینہ چلا جاتا اور کبھی ان چیزوں کی طرف واپس نہ لوٹا اس ہجرت پر اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ ہجرت مسنوخ ہو گئی۔
ہجرت کی دوسری قسم یہ ہے کہ کفار کے علاقہ سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے علاقہ میں آجائے اور میں ہجرت کی پہلی قسم کی طرح شدت نہیں ہے۔

4۔ کفار کے علاوہ سے مسلمانوں کے علاقہ کی طرف ہجرت منسوخ ہو گئی اور جو ہجرت باقی ہے وہ گناہوں سے ہجرت کرنا اور ان کو ترک کرنا ہے۔

5۔ جس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشرکین کے ساتھ رہنے سے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں رہنے سے مسلمانوں کو اپنے دین، جان، مال اور عزت وآبرو کی بربادی کا خطرہ ہو۔ جہاں اسلام شعائر، فرائض اور واجبات کی ادائیگی سے ممانعت ہو یا جہاں کی تہذیب، کلچر اور سوسائٹی کے برے اثرت سے مسلمانوں کے عقائد اور معمولات محفوظ نہ رہیں، اور زمین کے جس حصہ میں مسلمانوں کے عقائد کو خطرہ نہ ہو اور وہ آزدی کے ساتھ وہاں اپنی عبادات کو انجام دے سکیں وہاں مسلمانوں کے ہنے میں کوئی حرج نہیں (عمدۃ القاری ج 1، ص 35، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، 1348ھ)

فتح مکہ کے بعد ہجرت کے منسوخ ہونے کی وجوہات

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: علامہ خطابی وغیرہ نے کہا ہے کہ ابتداء اسلام میں مدینہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا کیونکہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور انھیں جمعیت کی ضرورت تھی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح کر دیا اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے تو مدینہ کی طرف ہجرت منسوخ ہو گئی اور تبلیغ اسلام اور دشمن سے مدافعت کے لیے جہاد کی فرضیت باقی رہی۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابتداء میں مدینہ منورہ ہجرت کرنا اس لیے بھی فرض تھا کہ جو شخص اسلام قبول کرتا تھا اس کو کفار ایذاء دیتے تھے اور اس وقت تک اس پر ظلم کرتے رہتے تھے جب تک کہ وہ (العیاذ باللہ) دین اسلام کو چھوڑ نہیں دیتا۔ اور انہی لوگوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی: "ان الذین توفاھم الملئکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم۔ قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا فاولئک ماروٰھم جھنم وساءت مصیرا۔ الا المستضعفین من الرجا والنساء الولدان لا یستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا فاولئک عسی اللہ ان یعفو عنھم و کان اللہ عفوا غفورا (النساء: 97-99) بیشک جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے تو فرشتے ان سے کہتے ہیں تم کیا کرتے رہے؟ وہ کہتے ہیں ہم زمین میں بے بس تھے! فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے، البتہ مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے جو (واقعی) بے بس (اور مجبور) ہیں، جو کسی تدبیر کی استطاعت رکھتے ہیں اور نہ کہیں جانے کا راستہ جانتے ہیں، تو قریب ہے کہ اللہ ان لوگوں سے در گزر فرمائے اور اللہ بہت معاف فرمانے والا اور بے حد بخشنے والا ہے"

جو شخص دار الکفر میں اسلام لائے اور اس سے نکلنے پر قادر ہو اس کے حق میں ہجرت اب بھی باقی ہے کیونکہ سنن نسائی میں حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ مشرک کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ مشرکین سے علیحدہ نہ ہو جائے اور سنن ابو داؤد میں حضرت سمرہ (رض) سے روایت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہے یہ حدیث ان لوگوں پر محمول ہے جن کو یہ خدشہ ہو کہ اگر وہ دار الکفر میں رہے تو ان کا دین خطرہ میں پڑ جائے گا۔ (فتح الباری، ج 6، ص 190، مطبوعہ لاہور، 1401ھ)

دار الکفر میں مسلمانوں کی سکونت کا حکم

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں لا ھجرۃ بعد الفتح فتح کے بعد ہجرت نہیں کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مطلقاً فتح کے بعد ہجرت نہیں ہے خواہ مکہ مکرمہ ہو یا کوئی اور شہر، لہٰذا اب اگر مسلمان کسی شہر کو فتح کر لیں تو ان پر ہجرت واجب نہیں ہے، لیکن اگر کسی شہر کو مسلمانوں نے فتح نہیں کیا تو وہاں کے رہنے والوں کے متعلق تین قول ہیں:

1۔ پہلا قول: جو شخص دار الکفر میں دین کا اظہار نہ کر سکتا ہو اور فرائض اور واجبات کو ادا نہ کر سکتا ہو اور وہ دار الکفر سے نکلنے کی استطاعت رکھتا ہو اس پر ہجرت کرنا واجب ہے۔

2۔ دوسرا قول: مسلمان دار الکفر میں فرائض اور واجبات کو آزادی سے ادا کر سکتے ہوں اور ہجرت کرنے کی بھی استطاعت رکھتے ہوں پھر بھی ان کے لیے دار الکفر سے ہجرت کرنا مستحب ہے تاکہ دار الاسلام میں مسلمانوں کی کثرت اور جمعیت ہو اور وہ بوقت ضرور مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شامل ہو سکیں اور دار الکفر میں کفار کی بدعدی اور فتنوں سے محفوظ رہیں اور کافروں کی تہذیب اور ثقافت اور ان کے معاشرے کی بے راہ روی، بد چلنی اور فحاشی کے برے اثرات سے مامون رہیں، اور کفار اپنے دین کی اشاعت اور مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں ان کے خطرات سے مسلمان محفوظ رہیں۔

3۔ تیسرا قول: جو مسلمان قید مرض یا کسی اور عذر کی بنا پر دار الکفر سے ہجرت نہ کر سکتا ہو اس کے لیے دار الکفر میں رہنا جائز ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ تکلیف اور مشقت اٹھا کر ہجرت کرے تو ماجور ہو گا۔ (فتح الباری ج 6، ص 38، مطبوعہ لاہور، 1401ھ)

ہجرت کی اقسام

علامہ بدر الدین عینی حنفی نے ہجرت کی حسب ذیل اقسام ذکر کی ہیں:

1۔ دار الخوف سے دار الامن کی طرف ہجرت، جیسا کہ مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی، یا اب ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آکر انگلینڈ، امریکہ یا مغربی جرمنی کی طرف ہجرت کر جائیں

2۔ دار الکفر سے در الاسلام کی طرف ہجرت کرنا، جیسا کہ فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، یا اب بھارت سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنا۔ اسی طرح جو شخص دار الکفر میں اظہار دین پر قادر نہ ہو اس کا در الاسلام کی طرف ہجرت کرنا۔

3۔ قرب قیامت میں فتنوں کے ظہور کے وقت مسلمانوں کا شام کی طرف ہجرت کرنا۔ چنانچہ سنن ابو داؤد میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عنقریب ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت ہو گی، سو روئے زمین کے اچھے لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت کی جگہ (شام میں چلے جائیں گے اور باقی زمین پر بدترین لوگ رہ جائیں گے۔

4۔ برائیوں اور گناہوں سے ہجرت کرنا۔ (عمدۃ القارج 1، ص 35، مطبوعہ ادارۃ المنیریہ مصر، 1348ھ)

ایک اور قسم کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے:

5۔ ماسوا اللہ کو ترک کر کے اللہ کی طرف ہجرت کرنا (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہی ہے۔ بخاری)

ہجرت الی اللہ کی توضیح

اللہ کی طرف ہجرت کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو رضائے الٰہی میں اس طرح ڈھال لے کہ اس کے دل میں ہر کام کا محرک اور داعی اللہ کا حکم ہو، اور طبعی تقاضے شرعی تقاضوں کے مظہر ہو جائیں حتی کہ وہ اس منزل پر آجائے کہ اس کا کھانا پینا بھی اس نیت سے ہو کہ چونکہ اللہ نے کھانے پینے کا حکم دیا ہے اس لیے وہ کھاتا پیتا ہے ورنہ اس کو لاکھ بھوک اور پیاس لگتی وہ کھانے پینے کی طرف التفات نہ کرتا۔ اس

مقام کاخلاصہ یہ ہے کہ بندے کے ہر کام کی نیت اور جذبہ یہ ہو کہ چونکہ یہ اللہ کا حکم ہے اس لیے وہ اس کام کو کر رہا ہے اور اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو خواہ کچھ ہوتا وہ اس کام کو نہ کرتا۔ اسی مرتبہ کو اللہ کے صبغۃ اللہ سے تعبیر فرمایا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی مقام کی طرف اس حدیث میں ہدایت دی ہے۔

اللہ کی صفات سے متصف ہو جاؤ اقبال نے اسی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

در دشت جنون من جبرائیل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!

یعنی انسان کے لیے ملکوتی صفات اپنانا حتی کہ مظہر جبرائیل ہونا بھی کمال نہیں ہے۔ اس کا مقام تو یہ ہے وہ الوہی صفات اپنا کر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے اور مظہر رب جبئیل ہو جائے۔ چنانچہ بندہ اگر کسی پر رحم کرے تو اس لیے کہ اس کا رب رحیم ہے اور اگر کسی پر غضب ناک ہو تو اس لیے کہ اس کا رب قہار ہے، اور انھیں پر رحم کرے جن پر اس کا رب رحم کرنا چاہتا ہے اور انھیں پر غضب ناک ہو تو اس لیے کہ اس کا رب قہار ہے، اور انھیں پر رحم کرے جن پر اس کا رب رحم کرنا چاہتا ہے اور انھیں پر غضب ناک ہو جن پر اس کا رب اس سے غضبن ناک ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی طرح ہجرت الی الرسول کا مطلب بھی یہ ہے کہ اپنی سیرت کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت کے تابع کرے اور چونکہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مرضی اور حکم الگ الگ اور مغائر نہیں ہیں اس لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو راضی کرنا اللہ کو راضی کرنا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہجرت کرنا ہی اللہ کی طرف ہجرت کرنا ہے۔

ذوالارحام کی تعریف، ان کے مصادیق اور ان کی وراثت کے ثبوت میں احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ کی کتاب میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 816ھ لکھتے ہیں:

ذوالرحم کا معنی لغت میں مطلقاً ذوالقرابت ہے اور اصطلاح شرع میں ذوالرحم ہر وہ رشتہ دار ہے جس کا حصہ کتاب اللہ میں مقرر ہو نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت میں اور نہ اجماع امت میں اور نہ وہ عصبہ ہو (یعنی میت کے باپ کی طرف سے رشتہ دار، جیسے دادا، چچا، بیٹا، بھائی وغیرہ) اور جب صرف یہی ہو اور اس کے ساتھ ذوی الفروض، عصبہ نسبی اور عصبہ سببی نے ہو تو میت کا کل مال اس کو مل جاتا ہے۔

(شرح السراجیہ ص 145، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرم، 1417ھ)

ذوالارحام کی مثالیں یہ ہیں: جیسے بیٹی کی اولاد (نواسے، نواسی) پوتی کی اولاد، نانا، نانا کی ماں، بہن کی اولاد (بھانجے، بھانجیاں) بھائی کی بیٹیاں (بھتیجیاں) پھوپھیاں خواہ باپ کی سگی بہن ہو یا علاتی یا اخیافی، ماموں، خالہ، اخیافی چچا کی اولاد، ماموں کی اولاد، سگے چچا یا علاتی چچا کی اولاد۔

مقدام بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اہل و عیال کو چھوڑ کر مرا اس کی پرورش میرے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا میں (احق) وارث ہوں، میں اس کی دیت ادا کروں گا اور جس کا

کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث، وہ اس کی دیت ادا کرے گا۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 2899۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 2738)

ابو امامہ سہل بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کو ایک تیر آکر لگا جس سے وہ جاں بحق ہو گیا اور اس کے ماموں کے سوا اور کوئی وارث نہیں تھا۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے اس کے متعلق حضرت عمر کو خط لکھا، حضرت عمر نے ان کے جواب میں لکھا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے جس کا کوئی مولا نہ ہو اس کا اللہ اور اس کا رسول مولا ہے اور جس کا اور کوئی واث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے۔ (سنن دار قطنی رقم الحدیث : 4068، 4067۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2110۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 2737۔ سنن کبری للبیہقی، ج 6، ص 214، المنتقی رقم الحدیث : 264، مسند احمد، ج 1، ص 28) (تفسیر تبیان القرآن)

آج ۲۵ جمادی الثانی ۱۴۴۷ھ بمطابق ۱۷ دسمبر ۲۰۲۵ کو بروز بدھ بوقت فجر سورۃ الانفال کی تفسیر مکمل ہو گئی۔ فالحمد للہ رب العالمین۔ الٰہ العالمین جس طرح آپ نے اس سورت کی تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق دی ہے، قرآن مجید کی باقی سورتوں کی تفسیر کو بھی مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمانا۔ مجھے اس تفسیر میں خطا اور زلل سے محفوظ رکھنا۔ اس تفسیر کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمانا اور اس کو منکرین اور مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنا اور اس کو تا قیامت فیض آفریں رکھنا اور اس کو عقائد اور اعمال میں موثر بنانا۔ اس تفسیر کو میرے لیے صدقہ جاریہ بنا دینا، اور تمام مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کو اس کی طرف متوجہ اور راغب کر دینا۔ اور محض اپنے فضل سے میرے تمام گناہوں کو معاف کر دینا، دنیا اور آخرت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت اور آپ کی شفاعت سے شاد کام کرنا، مجھے میرے والدین اور میرے اساتذہ اور میرے تلامذہ، اس تفسیر کے ناشر، اس کے کمپوزر، اس کے مصحح، اس کے معاونین اور اس کے قارئین کو دنیا اور آخرت کے ہر شر، ہر بلا اور ہر عذاب سے محفوظ رکھنا اور دنیا اور آخرت کی ہر نعمت اور ہر سعادت عطا فرمانا خصوصاً صحت اور سلامتی کے ساتھ ایمان پر خاتمہ کرنا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین وعلی الہ الطاہرین واصحابہ الکاملین وعلی ازواجہ امہات المومنین وعلی علماء ملتہ واولیاء امتہ وسائر المومنین اجمعین۔

کتابیات

تفسیر و تراجم

نمبر	ترجمہ / تفسیر:	نام کتاب-	القاب	نام مترجم-	سال ھ	سال ء
1۔	ترجمہ:	عرفان القرآن-	ڈاکٹر	طاہر القادری صاحب-	(1411ھ	1991ء)
2.	تفسیر:	تبیان القرآن-	مولانا	غلام رسول سعیدی-	(1415ھ	1995ء)
3.	تفسیر:	اشرفی-		سید محمد مدنی اشرفی جیلانی-	(1369ھ	1950ء)
4.	تفسیر:	ابن عباس-	پروفیسر	محمد سعید احمد عاطف صاحب-	(818ھ	1416ء)
5.	تفسیر:	تفسیرات احمدیہ-		ملا احمد جیون-	(1069ھ	1659ء)
6.	تفسیر:	جلالین-		جلال الدین سیوطی-	(911ھ	1505ء)
7.	تفسیر:	خزائن العرفان-	علامہ	نعیم الدین مراد آبادی-	(1364ھ	1945ء)
8.	تفسیر:	در منثور-		جلال الدین سیوطی-	(910ھ	1505ء)
9.	تفسیر:	روح القران-	ڈاکٹر	محمد اسلم صدیقی-	(1433ھ	2012ء)
10.	تفسیر:	الحسنات-	علامہ	ابوالحسنات سید محمد احمد قادری-	(1375ھ	1956ء)
11.	تفسیر:	ابن کثیر-	حافظ	عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر صاحب-	(770ھ	1370ء)
12.	تفسیر:	ابن مسعود-	مولانا	شمس الدین-	(300ھ	913ء)
13.	ترجمہ:	صراط الجنان-		ابو صالح محمد قاسم القادری-	(1430ھ	2013ء)
14.	تفسیر:	ضیاء القرآن-	پیر	پیر کرم شاہ صاحب-	(1333ھ	915ء)
15.	تفسیر:	امداد الکرم-		محمد امداد حسین پیرزادہ-	(1421ھ	2000ء)
16.	تفسیر:	بغوی-		ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی-	(516ھ	1122ء)

17. تفسیر: فہم القرآن- میاں محمد جمیل- (1426ھ 2005ء)
18. تفسیر: احکام القرآن للجصاص- ابو احمد بن علی الرازی- (365ھ 975ء)
19. تفسیر: صراط الجنان- ابو صالح محمد قاسم القادری- (1430ھ 2013ء)
20. ترجمہ لفظی: فہم القرآن- میاں محمد جمیل صاحب- (1425ھ 2005ء)
21. تفسیر: مدارک- ابو البرکات عبداللہ بن احمد محمد بن محمود النسفی- (710ھ 1310ء)
22. تفسیر: مظہری- قاضی ثناء اللہ پانی پتی- (1235ھ 1820ء)
23. تفسیر: قرطبی- ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی- (671ھ 1273ء)
24. تفسیر: مظہر القرآن- مفتی شاہ محمد مظہر اللہ- (1369ھ 1950ء)
25. تفسیر: مفردات القرآن- مولانا محمد عبدہٗ فیروز پوری- (502ھ 1108ء)
26. تفسیر: نورالعرفان- مفتی احمد یار خان نعیمی- (1369ھ 1950ء)
27. تفسیر: گلدستہ تفاسیر- محمد اسحاق- (1428ھ 2007ء)
28. تفسیر: احسن البیان فی تفسیر القرآن- سید فضل الرحمن- (1410ھ 1990ء)
29. تفسیر: احسن التفاسیر- حافظ محمد سید احمد حسن- (1315ھ 1897ء)
30. تفسیر: البیان (الغامدی)- جاوید احمد غامدی- (1412ھ 1992ء)
31. تفسیر: المنار- عبدالکریم اثری صاحب- (1411ھ 991ء)
32. تفسیر: انوار الفرقان- محمد عبدالحکیم شرف قادری صاحب- (1419ھ 1998ء)
33. تفسیر: تدبر قرآن- مولانا امین احسن اصلاحی- (1400ھ 1980ء)
34. تفسیر: تیسیر القرآن- مولانا عبدالرحمن کیلانی صاحب- (1416ھ 1996ء)
35. تفسیر: حقانی- ابو محمد عبدالحق حقانی صاحب- (1388ھ 1969ء)
36. تفسیر: درس قرآن- محمد احمد صاحب- (1397ھ 1977ء)
37. تفسیر: درس قرآن- مرتب محمد اسحاق- (1430ھ 2009ء)
38. تفسیر: ذخیرۃ الجنان- مولانا سرفراز خان صفدر صاحب- (1419ھ 1998ء)
39. تفسیر: عروۃ الوثقی- عبدالکریم اثری صاحب- (1415ھ 994ء)

40. تفسیر: فی ظلال القرآن- سید قطب شہید- (1382ھ 1962ء)

41۔ تفسیر: فیوض القرآن- ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی- (1387ھ 1967ء)

42. تفسیر: کشف الرحمن- مولانا احمد سعید دہلوی- (1382ھ 1962ء)

43. تفسیر: محمود- مفتی محمود صاحب- (1389ھ 1970ء)

44. تفسیر: مدنی- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)- (1433ھ 2012ء)

45. تفسیر: مدنی کبیر- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)- (1433ھ 2012ء)

46. تفسیر: معارف القرآن- مفتی محمد شفیع صاحب- (1388ھ 1969ء)

47. تفسیر: معالم العرفان- مولانا صوفی عبدالحمید سواتی- (1404ھ 1984ء)

48. تفسیر: مکی- مولانا صلاح الدین یوسف صاحب-(1414ھ 1994ء)

49. تفسیر (اہل تشیع): الکوثر (اہل تشیع)- محسن علی نجفی- (1432ھ 2011ء)

50. تفسیر برہان القرآن علامہ قاری محمد طیب (۱۴۳۶ھ ۲۰۱۶ء)

کتب احادیث

صحیح بخاری - محمد بن اسماعیل بخاری) المتوفی 256ھ

صحیح مسلم - مسلم بن حجاج) المتوفی 261ھ

سنن نسائی - احمد بن شعیب النسائی) المتوفی 303ھ

سنن ابی داؤد - ابو داؤد السجستانی) المتوفی 275ھ

سنن ترمذی - ابو عیسی محمد ترمذی) المتوفی 279ھ

سنن ابن ماجہ - ابن ماجہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی)المتوفی 273ھ

کتب صحاح کے علاوہ کتابیں

دیگر بنیادی کتب / اہم مجموعے

موطأ امام مالک - امام مالک بن انس) المتوفی 179ھ

مسند احمد بن حنبل - امام احمد بن حنبل) المتوفی 241ھ

سنن الدارمی - عبدالرحمن دارمی) المتوفی 255ھ
صحیح ابن خزیمہ - امام ابن خزیمہ (المتوفی 311ھ
صحیح ابن حبان - ابن حبان) المتوفی 354ھ
مستدرک علی الصحیحین حاکم - حاکم نیشاپوری) المتوفی 405ھ
معجم الکبیر طبرانی - امام طبرانی) المتوفی 360ھ